

CHAUDHRI
WIRE ROPE



THE TOUGHEST ROPES FOR THE TOUGHEST JOBS

They are using CHAUDHRI steel Wire Ropes on big tough jobs in Civil Engineering. Mechanical Handling, Aerial Ropeways. Trawling In fact, wherever there is fetching and carrying, picking up and putting down, or pushing to be done.



GRAMS : CHAUDHRI CO.

MANUFACTURERS OF ALL KINDS OF
- STEEL WIRE ROPES
- STAY WIRE
- ALUMINIUM ACSR CONDUCTORS

WIRE STEEL GALVANIZED FOR SIGNAL



CHAUDHRI WIRE ROPE INDUSTRIES LTD.

ساختہ پاکستان

—— یہ دو لفظ
بی آئی ایم کی ترجمانی کرتے ہیں!

BIM

ساختہ پاکستان — یہ دو لفظ بی آئی ایم کے مقاصد اور کامیابیوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔

بی آئی ایم ملک کو گراں درآمدات کے بوجھ سے بچانے کے لئے قومی پیداوار کو فروغ دے رہا ہے۔

بی آئی ایم قومی صنعتوں کو وسعت دے کر ملک کی معیشت کو مستحکم کر رہا ہے۔

بی آئی ایم خود کفالت اور قومی خوشحالی کے لئے کوشاں ہے۔

بی آئی ایم اس ترقی کا آئینہ دار ہے جو وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کی قیادت میں عوامی حکومت نے کی ہے۔



بورڈ آف انڈسٹریل مینجمنٹ

• فیڈرل کیمیکل اینڈ سرامکس کارپوریشن • فیڈرل لائٹ انجینئرنگ کارپوریشن • نیشنل ڈیزائن اینڈ انڈسٹریل سروسز کارپوریشن • نیشنل فرٹیلائزر کارپوریشن آف پاکستان • پاکستان آٹوموبائل کارپوریشن • پاکستان انڈسٹریل ڈویلپمنٹ کارپوریشن • پاکستان اسٹیل ملز کارپوریشن • اسٹیٹ سیمنٹ کارپوریشن آف پاکستان • اسٹیٹ ہیوی انجینئرنگ اینڈ مشین ٹول کارپوریشن • اسٹیٹ پٹرولیم ریفائننگ اینڈ پٹروکیمیکل کارپوریشن

نرخنامہ

نافذ العمل از ۲۷-۴-۱۹۷۰

فون: ۳۹

ربڑ کی قومی اور بین الاقوامی سطح پر خوبصورت اور معیاری مصنوعات تیار کرنے والا ادارہ

ڈارسن ربڑ ورکس

پوسٹ بکس نمبر ۵ جی ٹی روڈ۔ وزیرآباد

تار کا پتہ: خواجہ وزیرآباد

برائے اطلاع ریٹیل ٹریڈرز (پرچون فروشان) مارکیٹ کوالٹی کی ربڑ کی اشیا کا نرخنامہ جس میں ایکسائز ڈیوٹی بحساب ۱۰ فیصدی اور قیمت مشمول ایکسائز ڈیوٹی پر سیلز ٹیکس بحساب ۳ فیصد شامل ہیں

واٹر ڈلیوری ہوز

سائز	پلین فی فٹ	آرمرڈ فی فٹ
½"	۱-۲۰ روپے	۱-۸۰ روپے
¾"	۱-۵۳ "	۲-۴۱ "
1"	۲-۸۴ "	۲-۹۹ "
1¼"	۲-۴۱ "	۳-۹۶ "
1½"	۳-۰۷ "	۴-۴۱ "
1¾"	۴-۰۵ "	۵-۸۰ "
2"	۴-۸۱ "	۶-۶۰ "
2¼"	۵-۶۵ "	۷-۸۲ "
2½"	۷-۳۴ "	۹-۶۳ "
3"	۸-۱۱ "	۱۱-۲۳ "
3½"	۸-۹۶ "	۱۱-۸۲ "
4"	۱۰-۴۱ "	۱۳-۷۴ "
5"	۱۲-۸۷ "	۱۸-۰۳ "
6"	۱۶-۱۴ "	۲۲-۰۵ "

واٹر سکشن ہوز

سائز	پلین فی فٹ	آرمرڈ فی فٹ
1"	۴-۹۴ روپے	۶-۸۰ روپے
1¼"	۵-۴۴ "	۷-۳۰ "
1½"	۵-۹۴ "	۷-۸۴ "
2"	۷-۲۶ "	۹-۷۹ "
2½"	۹-۰۷ "	۱۲-۳۷ "
3"	۱۲-۸۶ "	۱۶-۳۹ "
4"	۱۶-۶۶ "	۲۱-۳۸ "
5"	۲۰-۱۲ "	۲۶-۳۸ "
6"	۲۳-۷۹ "	۳۳-۰۸ "
8"	۳۱-۳۳ "	۴۰-۰۹ "

آئیل اینڈ پٹرول ڈلیوری ہوز

سائز	فی فٹ
¾"	۱۰-۱۳ روپے
1"	۱۲-۵۰ "

سائز	
1½"	۱۶-۰۰ روپے
2"	۱۷-۱۶ "
2½"	۲۲-۳۰ "
3"	۲۷-۶۰ "
4"	۳۳-۰۰ "

آئیل اینڈ پٹرول سکشن ہوز

سائز	پلین فی فٹ	آرمرڈ فی فٹ
2"	۲۱-۰۶ روپے	۳۴-۱۲ روپے
2½"	۳۸-۶۰ "	۴۲-۲۷ "
3"	۵۰-۱۲ "	۵۵-۱۳ "
4"	۶۳-۵۲ "	۶۹-۸۶ "

آئیل اینڈ پٹرول سکشن ہوز

سائز	فی فٹ
2"	۳۹-۶۰ روپے
2½"	۵۲-۸۰ "
3"	۶۶-۰۰ "
4"	۷۹-۲۰ "
6"	۱۹۸-۰۰ "
8"	۲۶۴-۰۰ "

ریڈی ایئر ہوز فی پیس ۳ فٹ لمبائی

سائز	فی پیس
¼"	۳-۹۶ روپے
⅜"	۵-۱۵ "
½"	۶-۵۳ "
¾"	۸-۳۲ "
1"	۹-۹۰ "
1¼"	۱۱-۵۱ "
1½"	۱۵-۰۵ "

کار واشس ہوز

سائز	پلین	آرمرڈ
½"	۳-۳۰ روپے	۳-۹۶ روپے
¾"	۳-۶۲ "	۵-۲۸ "

پٹرول پمپ ہوز

سائز	
1½"	۱۲-۲۰ روپے فی فٹ

ہائی پریشر ہوز

سائز	پلین	آرمرڈ
¼"	۱-۷۰ روپے	۲-۷۰ روپے
⅜"	۲-۲۲ "	۳-۲۵ "
½"	۲-۷۷ "	۳-۰۰ "
⅝"	۳-۰۶ "	۴-۲۰ "
¾"	۵-۱۱ "	۷-۰۱ "
1"	۶-۳۶ "	۱۰-۰۲ "
1¼"	۱۰-۶۱ "	۱۳-۵۲ "
1½"	۱۲-۸۷ "	۱۶-۲۲ "
2"	۱۴-۹۶ "	۱۹-۰۲ "

ایئر ڈکٹنگ ہوز FLEXIBLE

سائز	فی فٹ
2"	۷-۹۲ روپے
2½"	۹-۲۴ "
3"	۱۱-۳۰ "
4"	۱۵-۸۴ "
5"	۱۷-۱۶ "

گارڈن ہوز

	½"	⅝"	¾"	1"
فی فٹ	۰-۷۰	۰-۹۲	۱-۲۱	۱-۸۳ روپے

ویلڈنگ ہوز

	¼"	5/16"	⅜"
فی فٹ	۱-۳۴	۱-۴۳	۱-۵۸ روپے

ربڑ وانسرشن سیٹ

	1/16"	⅛"	¼" اور اس سے اوپر
فی گز	۱۱-۶۴	۸-۷۳	۵-۹۲ روپے

سٹیم ہوز

	⅜"	½"	⅝"
فی فٹ	۱۱-۹۸	۱۳-۲۰	۱۴-۹۲ روپے

	¾"	1"
فی فٹ	۱۹-۸۰	۲۳-۷۶ روپے

ٹینکر ہوز

سائز	
2"	۱۶-۸۰ روپے فی فٹ
2½"	۱۹-۲۰ " "
3"	۲۳-۲۳ "
4"	۲۷-۵۲ "

ربڑ ٹیوب

سائز	
1"	۱-۳۲ روپے فی فٹ
1½"	۱-۷۲ "

بریڈڈ گارڈن ہوز

سائز	
½"	۱-۹۸ روپے فی فٹ

ایئر ہوز

سائز	
5/16"	۲-۲۰ روپے فی فٹ
⅜"	۲-۵۰ " "

ٹائر انفلیٹر ٹیوب

سائز	
¼"	۰-۹۱ فی فٹ

بریک ہوز فلیکسیبل

سائز	
½" x 17"	۱۲-[illegible] روپے فی

شیٹ برائے آئیل و HEAT

۱۵-۰۰ روپے فی پونڈ

جملہ پرچون فروشاں براہ راست ہم سے رجوع کریں۔ اسپیشل قسم آئٹموں کی قیمت درخواست آنے پر

رجسٹرڈ ایل نمبر ۷۵۷۹
ٹیلیفون نمبر ۶۹۵۸۰

فنون

لاہور

ماہنامہ

مدیر : احمد ندیم قاسمی

تزئین : موحد

دورِ نو
شمارہ : ۳
اگست، ستمبر ۱۹۷۶ء



سالانہ چندہ : ۲۵ روپے
بذریعہ رجسٹری : ۳۰ روپے
غیر ممالک سے : ۵۰ روپے

موجودہ شمارہ: دس روپے

مقام اشاعت : ۴۷- انارکلی، لاہور (پاکستان)

مندرجات

افسانے

طنز و مزاح

عطاء الحق قاسمی اور اس کا فن

سفرنامہ

غزلیں

اختلافات

تبصرے

سرورق : موجد

حرفِ اوّل

ندیم

اردو اور دیگر پاکستانی زبانوں کے بارے میں آج کل جو بحثیں چل رہی ہیں، ان کے حوالے سے بے محل نہ ہوگا اگر میں آج سے سات برس پہلے کی ایک تحریر قارئین "فنون" کی خدمت میں پیش کر دوں۔ اس تحریر میں اردو سے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے وہ آج بھی درست ہیں اور قارئین کی توجہ کے مستحق ہیں:-

نئے الفاظ اور نئے مفاہیم

جس زبان میں نئے الفاظ، یا مروّجہ الفاظ کے نئے مفاہیم کا داخلہ رک جائے، وہ نیم مردہ ہو جاتی ہے، اور اگر وہ اس طرزِ عمل پر بضد رہے تو مر جاتی ہے۔ مگر زبان میں نئے الفاظ کسی شعوری اہتمام سے داخل نہیں کئے جاتے۔ ہر زبان کا ایک مزاج ہوتا ہے اور نئے سے نئے الفاظ اسی مزاج کی مناسبت سے زبان میں داخل ہوتے رہتے ہیں۔ یہ داخلہ اتنا غیر شعوری اور بے آواز ہوتا ہے کہ لسانیات کے ماہرین کو بھی زبان کے بڑھتے ہوئے ذخیرۂ الفاظ کا احساس بر وقت نہیں ہو پاتا۔ پھر یہ الفاظ گھڑے نہیں جاتے بلکہ علم و فن اور تہذیب و تمدن کی غیر مرئی چھلنیوں میں سے چھن چھن کر آتے رہتے ہیں۔ اسی طرح مروجہ الفاظ جب سلیقے کے ساتھ کسی نئے حوالے سے اور کسی مختلف CONTEXT میں استعمال ہوتے ہیں تو ان کے مروجہ مفاہیم میں ایک نئے مفہوم کا اضافہ ہوتا ہے چنانچہ وہی زبانیں امیر نہیں ہوتیں جن میں الفاظ کا ذخیرہ بہت بڑا ہو۔ وہ زبانیں بھی اس امارت کا دعویٰ کر سکتی ہیں جن کا ایک ایک لفظ متعدد مفاہیم ادا کر رہا ہو——اور یہ مفاہیم اس لفظ کے مزاج اور فضا سے ہم آہنگ ہوں۔ اس ضمن میں بھی زبان کے ماہرین کو کسی قسم کی کاوش کی ضرورت نہیں پڑتی کیونکہ جو زبان بالیدگی کی صفت سے محروم نہیں ہوتی، اس کے الفاظ اپنے بدلتے ہوئے مفاہیم کے خود ذمہ دار ہوتے ہیں اور الفاظ کو خود فریبی نہیں آتی۔

زبانوں کے معمار شعراء

عموماً کہا جاتا ہے کہ علوم——خاص طور سے سائنٹیفک علوم میں ترقی کے ساتھ ساتھ زبان کے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بالکل درست ہے۔ ہر نئی ایجاد، ہر نیا نظریہ خاص الفاظ کا ایک ذخیرہ اپنے ساتھ لاتا ہے جسے زبانیں اپنے اپنے مزاج کے مطابق اپناتی چلی جاتی ہیں۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ زبانوں کو مالا مال کرنے میں جو کردار شعراء نے ادا کیا ہے وہ قطعی بے نظیر ہے۔ دراصل جب کوئی زبان کسی شاعر کا ذریعۂ اظہار بنتی ہے تو سیال صورت اختیار کر لیتی ہے۔ تب اس کے الفاظ اتنے حساس ہو جاتے ہیں کہ شاعر کے فکر کے ذرا سے مس سے بھی ان میں ارتعاش کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے یہی وہ لمحہ ہوتا ہے جب الفاظ کے خول پگھل جاتے ہیں اور نئے سے نئے مفاہیم قبول کرنے کے لئے ان کی آغوش وا ہو جاتی ہے۔ اگر بڑے بڑے شعراء کا مطالعہ اس نقطۂ نظر سے کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہر اہم شاعر زبان کو الفاظ اور ان کے نئے مفاہیم کے سلسلے میں بہت کچھ دے گیا ہے اور دے رہا ہے۔ اب یہ تو ظاہر ہے کہ شعراء شعر کہنے سے پہلے نئی فرہنگیں مرتب نہیں کرتے اور نہ اپنے چار طرف منتخب اور پسندیدہ الفاظ کا انبار لگا کر بیٹھتے ہیں کہ شعر کہتے ہوئے مناسب الفاظ کی جستجو انہیں پریشان نہ کرے۔ اس حقیقت کو ایک شاعر ہی جانتا ہے کہ شعر کا موضوع اپنے الفاظ اپنے ساتھ لاتا ہے۔ پھر جب یہ الفاظ شاعر کے فکر اور جذبے اور احساس کے اظہار میں استعمال ہوتے ہیں تو یہ بالکل ضروری نہیں ہے کہ یہ استعمال ان کے مروجہ مفاہیم کے مطابق ہی ہو۔ البتہ نئے مفاہیم کا مروجہ مفاہیم سے رشتہ ضرور قائم رہتا ہے۔ ایسا نہ ہو تو زبانیں نراج کا شکار ہو جائیں کیونکہ زبانیں تو اسی وقت تک زندہ رہتی ہیں جب تک ان کے سمجھنے والے موجود ہوں۔ اگر کوئی زبان مفہوم کے ابلاغ اور معنی کی ترسیل سے قاصر ہے یا یہ ذمہ داری کما حقہٗ ادا نہیں کرتی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بوڑھی ہو گئی ہے اور اس نے قبر میں پاؤں لٹکا دیئے ہیں۔

نئے مسائل، نئی زبان

علمی اصطلاحوں کی اہمیت مسلم، مگر کوئی زبان، اس وقت تک زندہ اور توانا زبان نہیں بن سکتی جب تک وہ انسانوں کے نازک سے نازک جذبے کے اظہار پر بھی قادر نہ ہو۔ ادھر ترقی پذیر زبان اظہار کی مشکل میں شاعر کا ہاتھ بٹاتی ہے، ادھر شاعر اس زبان کے الفا

کے فنکارانہ استعمال سے اسے نئے مفاہیم سے مالا مال کرتا چلا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ متذکرہ زبان کسی مرحلے پر جامد نہیں ہو پاتی۔ اردو اسی لئے ایک ترقی پذیر زبان ہے۔ صرف آج کی مثال لے لیجئے کہ شاعری کے موضوعات بدل رہے ہیں۔ انفرادی جذبوں نے اجتماعی نوعیت اختیار کر لی ہے۔ انسان کو نئی کامرانیوں اور نئی رسائیوں کے ساتھ ساتھ نئے خطروں اور نئے المیوں کا بھی سامنا ہے۔ انسان جتنا ترقی یافتہ ہو رہا ہے اتنا ہی غیر محفوظ بھی ہو رہا ہے۔ وہ خوش ہے کہ چاند کو چھو رہا ہے مگر ڈر رہا ہے کہ آئندہ جنگ میں چاند بھی ایک محاذ بن سکتا ہے جہاں سے موت کی شعاعیں کرۂ ارض پر ڈالی جا سکتی ہیں۔ وہ حیران ہے کہ سائنس اور صنعت کی اتنی اندھا دھند ترقی کے باوجود ابھی کتنے کروڑوں انسان نانِ شبینہ کے محتاج ہیں اور اسی دور میں ایسے انسان بھی موجود ہیں جو اپنے کروڑوں بھائیوں کی اس احتیاج کو برقرار رکھنے پر بضد ہیں۔ انسان اداس ہے کہ وہ سچائی اور نیکی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد جب عملی زندگی میں پہلا قدم دھرتا ہے تو اسے جھوٹ اور منافقت سے سابقہ پڑتا ہے۔ اس تضاد نے انسان کے ذہن کو مجروح کر رکھا ہے۔ ماضی میں بھی برائی کا وجود یقیناً تھا مگر تب برائی اس انتہا کو نہیں پہنچی تھی کہ انسانی زندگی کا کوئی بھی ادارہ اس سے محفوظ نہ ہو۔ اردو زبان کے جدید شعراء کو ان جدید مسائل کا سامنا ہے، مگر میرے اس دعوے سے شاید ہی کسی کو اختلاف ہو کہ اظہار، ابلاغ اور ترسیل کے معاملے میں اردو زبان نے اپنے نئے شاعروں کے ساتھ بے وفائی نہیں کی۔ غزل ہو یا نظم، انھوں نے ایسے ایسے جذبوں کو فن کا جامہ پہنایا ہے جن سے میر، غالب بلکہ اقبال تک کا دور نا آشنا تھا۔ ساتھ ہی ان نئے شاعروں نے بھی اردو زبان کو گزشتہ چند ہی برس کے عرصے میں نئے الفاظ اور مروجہ الفاظ کے نئے مفاہیم کے سلسلے میں اتنا باثروت بنا دیا ہے کہ صرف بیس پچیس برس پہلے کی فرہنگیں بھی پرانی معلوم ہونے لگی ہیں۔ جو لوگ جدید شاعروں کو محض اس لئے نہیں پڑھتے کہ وہ جدید یعنی کچے ہیں، وہ ایک بہت بڑی نعمت سے محروم ہیں۔ یہ لوگ حکومتی سطح پر اردو زبان کے ساتھ بدسلوکیوں پر رستے ہیں حالانکہ اگر وہ جدید غزل نگاروں اور نظم نویسوں کا مطالعہ کریں تو نہ صرف ان کے آنسو پونچھے جائیں بلکہ انھیں اس زبان کے مستقبل کے سلسلے میں بھی خود اعتمادی حاصل ہو۔

زبان سے دشمنی

اردو زبان (اور شاید ہر بولتی چلتی زبان) کا ایک المیہ بھی ہے کہ جب اس زبان میں کوئی نیا لفظ داخل ہو یا پرانا لفظ نئے مفہوم کے ساتھ استعمال ہو تو ایسے عناصر موجود ہیں، جو احتجاج کرتے ہیں کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ انھوں نے ہر لفظ کا ایک خول بنا رکھا ہے۔ یہ لفظ اگر اس خول سے باہر جھانکے تو اس کا ناموس خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ دراصل یہ لوگ زبان کی نامیاتی خصوصیت سے بے خبر ہیں۔ وہ یہ تک سوچنے کے اہل نہیں ہیں کہ اگر اردو زبان ان اضافوں سے محروم رہ جاتی تو بہادر شاہ ظفر کے دور تک پہنچتے پہنچتے مر جاتی۔ غالب کی غزلوں کی زبان پر لے دے کرنے والے اگر غالب کو خاموش کرنے میں کامیاب ہو جاتے تو اردو شاعری مرزا داغ کے رنگِ تغزل سے آگے نہ بڑھتی۔ اگر نظیر اکبر آبادی کے ساتھ ہم وہی سلوک کرتے جو نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ اور مولانا محمد حسین آزاد نے کیا تو اردو نظم قدیم مثنویوں کی دلکشی میں اسیر ہوتی۔ اگر اقبال سینکڑوں نامانوس الفاظ کو اپنے کمالِ فن سے اس حد تک مانوس نہ بنا دیتے کہ آج وہ ہمیں اردو زبان کا ناگزیر حصہ معلوم ہوتے ہیں تو آج کے شاعر کو اظہار میں بے شمار دشواریاں پیش آتیں۔ یہ لوگ ہمارے فنی ذخائر کے علاوہ ہماری زبان کے ذخائر میں بھی اضافے کرتے رہے اور اضافوں کا یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ ان اضافوں کو زبان کے ساتھ بدسلوکی قرار دینے والے اپنی بے خبری اور سادہ لوحی کے باعث اردو زبان کے ساتھ دشمنی کر رہے ہیں۔ اگر وہ اپنی زبان سے اتنی محبت کرتے ہیں تو انھیں ترقی پذیر زبانوں کے سلسلۂ عمل سے بھی تو باخبر ہونا چاہئے۔

رفتگاں

"فنون" کی گذشتہ اشاعت سے اب تک علم و فن سے متعلق کئی اہم شخصیتیں ہمیں داغِ مفارقت دے گئیں۔ مولانا سید ابوبکر غزنوی وائس چانسلر جامعہ بہاولپور انگلستان میں ٹریفک کے ایک حادثے میں زخمی ہوئے اور وہیں انتقال فرما گئے۔ دینی اور علمی موضوعات پر ان کے مضامین میں ادب کی جو چاشنی ہوتی تھی اس کی وجہ سے وہ دینی اور علمی حلقوں کے علاوہ ادبی اور فنی حلقوں میں بھی مقبول تھے۔ مولانا نصر اللہ خاں عزیز ایک کہنہ مشق شاعر اور پرانے صحافی تھے اور شعر و صحافت پر ان کے متعدد احسانات ہیں۔ جوش افضل الدین نہ صرف یہ کہ پاکستان کی عیسائی آبادی کے ایک محترم رہنما تھے بلکہ پنجابی کے ایک مستند شاعر بھی تھے۔ لاہور کے ایک معروف پبلشنگ ادارے قومی کتب خانہ کے بانی نصیر الدین ہمایوں بھی انہی دنوں انتقال کر گئے۔ ادب اور صحافت کے میدانوں میں ان کے کارنامے بھی ناقابلِ فراموش ہیں۔ ان دنوں اردو اور پنجابی کے تین نامور شعرا بھی ہم سے جدا ہو گئے۔ کشفی ملتانی اپنی ذات میں ایک انجمن تھے اور پرانی نسل کے غزل گوؤں میں ایک منفرد مقام رکھتے تھے۔ رفیق خاور جسکانی ایک نہایت ذہین اور اعلیٰ معیار کے شاعر تھے۔ غزل اور نظم پر یکساں قدرت حاصل تھی اور عمر بھی زیادہ نہ تھی۔ ان کی موت صحیح معنوں میں بے وقت موت ہے۔ معراج دین اختر پنجابی کے ایک ہر دلعزیز، پرگو اور قادر الکلام شاعر تھے۔ ان سب کی رحلت پر ادارہ "فنون" ان کے پس ماندگان سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔

بین السطور

خالد احمد

یہ گنبدِ مینائی، یہ عالمِ تنہائی	مجھ کو تو ڈراتی ہے اس دشت کی پہنائی
تو شاخ سے کیوں پھوٹا، میں شاخ سے کیوں ٹوٹا	اک جذبۂ پیدائی، اک لذتِ یکتائی
اُس موج کے ماتم میں روتی ہے بھنور کی آنکھ	دریا سے اُٹھی لیکن ساحل سے نہ ٹکرائی
ہے گرمیٔ آدم سے ہنگامۂ عالم گرم	سورج بھی تماشائی، تارے بھی تماشائی
اے بادِ بیابانی! مجھ کو بھی عنایت ہو	خاموشی و دل سوزی، سرمستی و رعنائی

ہر وسعت، ہر پہنائی، ہر بے کرانی کا پہلا احساس ہر انسان پر کچھ ایسی کیفیت طاری کر دیتا ہے کہ وہ ایک بار تو اپنی ذات کے تار و پود کو بکھرتا ہوا محسوس کرنے لگتا ہے، مگر جونہی ماحول کا تناظر ناظر کو اُس کا تشخص ارزانی کرنے لگتا ہے تو وہ اپنے ہونے کے پہلے احساس کو مکمل ثبات عطا کرنے کی خاطر فی الفور اپنی ذات کو پوری نوعِ انسانی کے کُل سے ہم آہنگ کر دیتا ہے۔

چاند پر انسانی نقوشِ پا سے مریخ پر انسانی صناعی کی چھاپ تک کے سفر میں ہر وسعت، ہر پہنائی، ہر بے کرانی کے "پہلے احساس" کو مٹا دینے کی خواہش سرگرم عمل نظر آتی ہے۔ آج جب کوئی یہ کہتا ہے کہ "ہے گرمیٔ آدم سے ہنگامۂ عالم گرم" تو "سورج بھی تماشائی، تارے بھی تماشائی" والی بات شاعرانہ تعلّی نہیں رہ جاتی بلکہ ایک ٹھوس حقیقت نظر آتی ہے۔

انسان نے نظامِ شمسی کے واحد حکمراں ہونے کا خواب پورا کر دکھایا ہے۔

زمین انسان کی مشترک میراث ہوتے ہوئے بھی انسانوں کے درمیان جنگ و جدل کے تمام حربوں کا "تجرباتی جزیرہ" بنی ہوئی ہے۔ یہ تناظر ہمیں وسیع تر عالمی محبت کے جذبات اور اپنے قومی تشخص کی برقراری کی توانا تر خواہشات بیک وقت عطا کرتا ہے۔

پاکستان میں حب الوطنی دانشوروں کا محبوب ترین موضوع ہونے کے ناتے پاکستانی دانشوروں کے درمیان سب سے بڑا سبب نزاع بھی رہا ہے۔ اس موضوع پر ہونے والے تمام مباحث کا بنیادی نکتہ حب الوطنی کی تعریف قرار پاتا ہے، مگر بدقسمتی سے یہی وہ نکتہ ہے جس پر سب سے کم توجہ دی گئی۔

ایک گروہ پاکستان، نظریۂ پاکستان اور مضبوط مرکز سے متعلق سیاسی مباحث کو "حب الوطنی" کے بارے میں اپنی آرا، قرار دیتا رہا۔ یہ گروہ کچھ ایسی تاویلیں پیش کرتا رہا کہ معلوم ہوتا تھا، اس گروہ کے نزدیک "حب النظام" اور "حب الوطنی" ہم معنی اصطلاحات ہیں۔

ایک گروہ نے نظریۂ پاکستان کی تاویلات کچھ اس انداز میں کیں کہ عصبیت اور پاکستانیت ہم معنی تراکیب کے طور پر ہمارے سامنے آئے۔

ایک گروہ نے مضبوط مرکز کے سلسلے میں وہ انتہا پسندی دکھائی کہ علاقائی ثقافتوں اور زبانوں کا وجود سرے سے ناپید ہوتا دکھائی دیا۔

یہ تمام نظریات خالصتاً سیاسی سطح پر اٹھائے گئے تھے لہٰذا ان تمام نظریات بے تال میل اور مشترک اقدار کی دریافت کے امکانات بھی معدوم ہوتے نظر آنے لگے۔ لیکن اس تمام صورتِ حال میں یہ امر انتہائی اطمینان بخش رہا کہ ملک کے خلّاق ادبا، اور شعرا مختلف سیاسی جماعتوں کے ترجمانوں کی سطح پر نہیں اترے بلکہ توازن اور تناسب کے حسن کے متلاشی نظر آئے۔

یوں بھی حب الوطنی کا سیاست دانوں کا سا بلند بانگ اظہار سچے ادیبوں کو زیب نہیں دے سکتا کہ سچا ادیب ہر صبح اٹھ کر اپنے محب الوطن ہونے کا اعلان نہیں کرتا اور آخر وہ کرے بھی کیوں کیا ہم میں سے کوئی ہر صبح اُٹھتے کے ساتھ ہی یہ اعلان کرنا پسند کرے گا کہ میں اپنی ماں کا بیٹا ہوں؟ دیکھنے میں آیا ہے کہ نوے سال کی عمر میں بھی لوگ ہر تکلیف میں صرف اور صرف اپنی ماں کو یاد کرتے ہیں، مگر وہ ہر وقت اپنی ماں کے بیٹے ہونے کا اقرار نہیں کرتے۔ پھر یہ کیوں کر ضروری ہوا کہ ہر آدمی ہر وقت اپنی "حب الوطنی" کا اقرار کرتا پھرے۔ ادب میں تو حب الوطنی اُسی سطح پر اظہار پاتی رہی ہے اور اظہار پاتی رہے گی جس سطح پر ادب میں زندگی اظہار پاتی رہی ہے اور پاتی رہے گی۔ وطن اور حیات ہمارے رگ و پے میں ایک ساتھ موجزن ہیں۔ ہم لوگ اپنی زندگی کا ایک سانس بھی اپنی مادرِ وطن سے جدا نہیں کر سکتے۔ اصل فرق تو اپنی مادرِ وطن کی آرائش و زیبائش کے انداز طے کرنے کی خواہشات کا فرق ہے۔ اصل مسئلہ تو حدودِ وطن کے اندر مروج نظام میں تبدیلی یا اُس کی برقراری کا ہے اور یہ بات کہنے میں کوئی باک محسوس نہیں کرنا چاہیئے کہ ہمارے وطن کے تمام ادیب مروج نظام میں معیاری تبدیلیاں چاہتے ہیں — اور یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ ہر معیاری تبدیلی بے شمار مقداری تبدیلیوں کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اور یہ بات بھی جان لینی چاہیئے کہ اس وقت ہمارے ملک میں بے شمار مقداری تبدیلیاں آ رہی ہیں۔

ہم اس وقت من حیث القوم مقداری تبدیلیوں کی بھٹیوں میں گل رہے ہیں۔ یہ تبدیلیاں قومی دفاعی ضروریات کے دباؤ کا نتیجہ ہیں۔ ہماری تمام نجی ملکیت کی قربانیاں ایک مضبوط معیشت کے قیام کے لیئے ہیں۔ کیونکہ ایک مضبوط معیشت ہی ایک مضبوط قومی دفاعی نظام کی پشت پناہ ہو سکتی ہے

یہ امر بھی باعث طمانیت ہے کہ ہمارے ملک کے بیشتر ادیب ایسی تمام تبدیلیوں کو سراہتے دکھائی دے رہے ہیں۔

ضرورت، صرف اس امر کی ہے کہ یہ بات واضح طور پر ذہن نشین کر لی جائے کہ مروج نظام کی نفی پاکستان یا نظریۂ پاکستان کی نفی نہیں کیوں کہ ابھی تک اقبالؒ یا قائداعظم کے کسی خطبے سے کوئی ایسا اقتباس پیش نہیں کیا جا سکا جس میں انھوں نے پاکستان میں سرمایہ دارانہ نظام کی آزادانہ نشوونما کی تبلیغ یا تلقین کی ہو لہٰذا یہ بات بھی ذہن میں رکھ لینے میں کوئی حرج نہیں کہ وہ لوگ جو سرمایہ داری اور جاگیرداری کی مخالفت کرتے ہیں وہ وطن کی حدود کی مخالفت نہیں کرتے بلکہ وطن کی حدود کے اندر بہتر نظام کی خواہش اور مجوزہ نظام کی حمایت کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک حب الوطنی، وطن کی حدود اور وطن کے عوام کی حفاظت کے لئے سینہ سپر ہو جانے کا نام ہے۔ وطن کی حدود کے اندر عوام کے حقوق کے تحفظ کے بارے میں مختلف نظام ہائے فکر کا اختلاف کسی طرح غداری قرار نہیں پانا چاہیے۔

پاکستانی ادیبوں کے اپنے وطن کے بارے میں حقیقی بیٹوں کے سے رویے پر فاضل معترضین کو سیخ پا نہیں ہونا چاہیئے۔ اگر ہم بھی اُن کی طرح "ے بالکا" ہوتے تو اُن کے اعتراضات میں کافی جان ہوتی اور ہمیں ہر صبح اپنی حب الوطنی کے اظہار کے مطالبے پر بھی کوئی اعتراض نہ ہوتا۔

فاضل معترضین کو یاد رکھنا چاہیئے کہ:

یوں ہاتھ نہیں آتا وہ گوہرِ یک دانہ   یک رنگی و آزادی اے ہمتِ مردانہ!
یا سنجر و طغرل کا آئینِ جہاں گیری   یا مردِ قلندر کے اندازِ ملوکانہ
یا حیرتِ فارابی یا تاب و تبِ رومی   یا فکرِ حکیمانہ، یا جذبِ کلیمانہ
یا شرعِ مسلمانی، یا دَیر کی دربانی   یا نعرۂ مستانہ، کعبہ ہو کہ بت خانہ

میری میں فقیری میں، شاہی میں غلامی میں
کچھ کام نہیں بنتا بے جرأتِ رندانہ

جون ۱۹۶۷ء کے بعد کی جدید عربی شاعری

محمد کاظم

جون ۱۹۶۷ء کی چھ روزہ جنگ میں عربوں نے اسرائیل کے مقابلے میں جو ہزیمت اٹھائی، اس کے واقعات سامنے رکھئے تو یوں لگتا ہے جیسے کوئی آفت غیب سے نمودار ہو کر ان پر ٹوٹ پڑی تھی۔ یہ تاریخ کا ایک سانحہ تھا: ناگہاں، پرہول اور اٹل! جیسا کہ اس طرح کے سانحے قوموں کی زندگی میں آتے ہیں، عرب لوگ ذہنی طور پر اس کے لئے بالکل تیار نہ تھے، اور اس لئے اس کی چوٹ (SHOCK) ان کے قومی وجود پر بہت گہری اور ہلا دینے والی تھی۔ عربوں کا وہ زعم کہ ان کے پاس جذبۂ ایمان کی طاقت ہے، اور جدید روسی اسلحہ بھی، ایک فریب نظر (ILLUSION) سے مزید کچھ بھی ثابت نہ ہوا ___ حکومت کے ایوانوں اور فوجی ہیڈ کوارٹروں میں تو اس واقعے کے بارے میں ضابطے کی کارروائی شروع ہو گئی ہوگی، اور اس امر کی تحقیقات کے لئے کمیشن بیٹھ گئے ہوں گے کہ شکست کا ذمہ دار کون تھا اور غلطی کہاں رہ گئی تھی، لیکن عربوں کی قومی آبرو کو اس شکست سے جو دھچکا لگا، اور ان کے ارادے اور منصوبے جس طرح سے مٹی میں مل گئے، اس کا مداوا کوئی کہاں سے کرتا؟ اس صورت حال میں عربوں کے حساس اور باشعور طبقے نے مایوسی، کلبیت اور تشکک کے رویّے میں پناہ لی جن قومی رہنماؤں کو انھوں نے اپنے خوابوں کی تعبیر جانا تھا، ان کے بارے میں وہ اب جذبات سے نہیں عقل سے سوچنے لگے، اور منزل جو کبھی سامنے دکھائی دیتی تھی، اگرچہ دور تھی، اب بادلوں کی اوٹ میں چلی گئی۔

جون کی اس شکست کے اثرات بعد کی عربی شاعری پر کافی نمایاں اور قابل شناخت ہیں۔ عرب شعرا نے کبھی تو حزیران (عربی تقویم میں ماہ جون) کا نام لے کر نظمیں کہیں، مثلاً عبدالوہاب البیاتی کی نظم "بکائیۃ الیٰ شمس حزیران" (آفتاب جون کی نذر ایک نوحہ)، جو اردو میں اپنے منظوم ترجمے کے ساتھ قارئین "فنون" کی نظر سے گذر چکی ہے۔ اور بیشتر ایسا ہوا کہ شکست کے بعد جو نظمیں شعرا نے کہیں ان میں چاہے اس سانحے کا کوئی حوالہ تھا یا نہیں، ان کے تیور ضرور بدلے بدلے تھے۔ ان میں چیزوں کے بارے میں شاعر کا نقطۂ نظر وہ نہیں تھا جو پہلے ہوا کرتا تھا۔ اپنے منہ کا مزا کڑوا ہونے کے باعث اسے ہر چیز میں حنظل کی سی تلخی محسوس ہوتی تھی۔ چمن کا سبزہ جو پہلے اس کی نگاہوں کو طراوت بخشتا تھا، اب اس میں اسے سانپ سرسراتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ محبت کا وہ جذبۂ عظیم بھی، جو شاعر کے الہام کا سب سے بڑا منبع تھا اور جس سے اس کے شعروں میں ایک رسیلا پن اور دل میں اتر جانے والی کیفیت پیدا ہوتی تھی، اب اپنا طلسم کھو بیٹھا تھا۔ دل، جو قومی المیے سے زخم زخم تھے، اب ان میں ___ محبت کے ___ مزید کچھ کے سہنے کی تاب باقی نہیں تھی، اور آپ جانتے ہیں کہ محبت میں اگر دل ساتھ نہ دیں، تو جسم ___ ٹھنڈے، بے جان جسم ___ دو قدم بھی نہیں چل سکتے۔

سب سے زیادہ مایوس کن ردعمل اس عرصے میں یہ دکھائی دیتا ہے کہ شاعر کا خود اپنے وجود کے جواز (JUSTIFICATION) پر سے ایمان جاتا رہا، اور وہ اپنے فن اور اس کی ضرورت و منفعت کے بارے میں سوال اٹھانے لگا۔ اسے بہت شدت سے اس امر کا احساس ہوا کہ الفاظ کی جنگ (حرب الکلمات) جس میں وہ ۱۹۴۸ء کی پہلی شکست کے بعد سے برابر لگا ہوا تھا، مادی اور حقیقی نتائج کے اعتبار سے اس کی قوم اور وطن کے لئے ایک سعی رائگاں ثابت ہوئی تھی ___ ذہنی صدمے کی اس حالت میں وہ یہ بھول بیٹھا کہ یہ اسی کا تپتا ہوا جذبہ ہی تو تھا جس نے پچھلے بیس برس میں اس کے ہم وطنوں کی اس طویل جدوجہد کو حرارت اور توانائی بخشی تھی، اور اسے ٹھنڈا نہیں ہونے دیا تھا۔ اسرائیل کے خلاف جو محاذ لوگوں کے دلوں میں اور

ذہنوں میں کھلا ہوا تھا اس کی ساری شورش اور سرگرمی اسی کے شعروں کے طفیل ہی تو تھی۔

دوسری طرف یہاں وہاں کچھ حوصلہ مند اور پرامید آوازیں بھی ہمارے کانوں میں پڑتی ہیں۔ خاص طور پر اس شاعری میں جو مقبوضہ فلسطین کے اندر ہو رہی ہے۔ محمود درویش اور سمیح القاسم کی نظموں میں مستقبل کی طرف دیکھنے کا ایک جرأت مندانہ رویہ ملتا ہے، جو قنوطیت اور خود سپردگی کی اس فضا میں بہت خوش آئند لگتا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ اسرائیل کے اندر رہنے والے شعرا، اپنے دشمن کو ایک ایسی حقیقت کے روپ میں اپنے سامنے پاتے ہیں جسے چھو بھی سکتے ہیں، اور اس کی ماہیت اور حدود کا تعین بھی کر سکتے ہیں، اس لئے وہ بجائے اس کے کہ اپنی ذات کے بکھیڑوں میں الجھیں اور اس کی شکست و ریخت کے مسائل سے دوچار ہوں، وہ سامنے کے چیلنج کو دیکھتے ہیں اور اس سے عہدہ برآ ہونے اور ایک نئے مستقبل کی طرف بڑھنے کا ولولہ اپنے اندر پاتے

اب ہم مختلف عنوانات کے تحت ۶۷ء کے بعد کی عربی شاعری کے کچھ نمونوں کا جائزہ لیتے ہیں:

عورت اور محبت

اس نئی شاعری میں عورت اب خال خال نظر آتی ہے، اس کا ذکر اگر کہیں ہوتا بھی ہے تو ایک ایسے وجود کے طور پر جس کے بس جنسی اعضا رہ گئے طرح گئے ہیں اور وہ ایک ایسے ماحول میں دکھائی دیتی ہے جس میں اسے مرد کی شہوت کے ساتھ ساتھ اس کی جنسی ناطاقتی سے بھی واسطہ پیش آتا ہے۔ شاعری کی یہ موجودہ فضا اب سے پندرہ بیس برس پہلے کی فضا سے کتنی مختلف ہے، جب عورت شاعر (بدر شاکر السیاب) کے نزدیک زندگی کی طرف کھلنے والا ایک در تھی، اور زندگی کی سب خوشیوں اور نامرادیوں کا ایک جزو لازم! عورت زندگی کا ایسا رخ تھی جس میں ایک شوریدہ سری بھی تھی اور پھر وہ مسرت سے بھرپور بھی تھا۔ وہ اس زمین کا پھیلاؤ تھی، اور شاعر کے وجود کی توسیع (EXTENSION) کہ اس کے بغیر وہ اپنے اندر کوئی کمی پاتا تھا اپنے آپ کو مکمل نہیں سمجھتا تھا! —— اور اب وہ کیا ہے؟ ایک شاعر حسب الشیخ جعفر کہتا ہے کہ اب وہ ٹیکسی میں بیٹھی ہوئی ایک بیسوا ہے، جو اپنی عریانی کے دام وصول کرتی ہے جس کے دانت بھی مصنوعی ہیں اور بال بھی مصنوعی: شاعر نزار قبانی کہتا ہے کہ عورت سدا سے ایک لونڈی ہے جس کا کام یہ ہے کہ وہ سلطان کو جنسی طور پر آسودہ کرے، وہ ایک ایسا رحم ہے جس میں ہر طرح کا جھاڑ جھنکار جڑ پکڑتا ہے، اور ساتویں صدی عیسوی سے اس کا پیشہ ہمیشہ فحاشی رہا ہے۔ صرف کبھی کبھار اس نے اپنے منہ پر ماں کا چہرہ لگا لیا ہے۔ اس بدلی ہوئی عورت کے بارے میں نزار قبانی اپنا ایک تجربہ بیان کرتا ہے:

اُس کے جسم کے خطوط آج بیگانہ تھے
اور بستر سرد تھا
اور ٹھنڈا موسم بھی بہت ٹھنڈا لگتا تھا
اُس کا سینہ ایک مرجھائی ہوئی نارنگی تھی
حزیران کے بعد میری وہ خواہش کیا ہوئی؟
جب وہ نڈھال میری باہنوں میں گری، تو یوں جیسے ایک پھریرا جس میں سو چھید ہوں:

ایک دوسرے شاعر آل دنقل کا تجربہ بھی قریب قریب یہی ہے، کہتا ہے:

خواہش کے لمحۂ شیریں میں میری محبوبہ
میری باہنوں میں ایک بھیگی لاش بن جاتی ہے
اور میرے اندر کا سارا جذبہ اوندھے منہ گرتا ہے، اور خواہش منہ چھپا لیتی ہے!

آج کی عورت کے بارے میں جعفر اور نزار قبانی کے بیانات بہت غیر محتاط (SWEEPING) اور سنکی اور قنوطی ہیں جن سے اتفاق کرنا ہوگا۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ عورت کے معاملے میں شاعر کا اپنا احساسِ جرم جو اس کے پچھلے رویئے کی وجہ سے اس کے اندر کہیں موجود تھا، اس نے شکست کے بعد

اس صورت حال میں شدید ہو کر ایک مریضانہ صورت اختیار کی ہے۔ چنانچہ عورت کے ایک خاص روپ نے جس کو شاعر نے قریب سے دیکھا اور برتا تھا اس کے دل و دماغ کا احاطہ کر رکھا ہے، اور اس کی نگاہ اس سے پرے اُن پاکدامن دوشیزاؤں کی طرف نہیں جاتی جو وطن پر اپنی جان اور آبرو نچھاور کرنے گھر سے نکل کھڑی ہوتی ہیں اور نہ اُن ماؤں اور بہنوں کی طرف جاتی ہے جو اپنے جوانوں کو زادِ راہ دے کر محاذ کی طرف بھیجتی ہیں اور پھر دھڑکتے ہوئے دلوں کے ساتھ ان کے نیک انجام کی دعا مانگتی ہیں! ——— اس معاملے میں نزار قبانی اور اس طرح کے دوسرے شعراء یقیناً ایک انتہائی (EXTREME) ردِ عمل کا شکار ہیں۔

برأتِ ذات

جون ۶۷ء کی شکست کا بوجھ ہر شاعر اپنے وجدان میں محسوس کرتا ہے، اور جب اس بوجھ تلے اس کی قوت برداشت جواب دینے لگتی ہے تو وہ یہ کہہ کر اسے ہلکا کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ اے ہم وطنو! میں نے تو تم کو اپنے شعروں میں اس آنے والی حقیقت کے بارے میں آگاہ کر دیا تھا، لیکن تم نے میری پیش گوئی کو سماعت ہی نہیں بخشی اور اپنے جذباتی نعروں اور خالی دعووں میں مگن رہے۔ شاعر عبدالوہاب البیاتی اس ضمن میں کہتا ہے:

اے بڑا بول بولنے والو!

اور بازاروں میں پھرتے ہوئے وحشیو!

میں نے تمہیں بتلا دیا تھا کہ تمہارے چارے پہ ڈاکو پڑے ہیں

لیکن تم بڑا بول بولا کئے

میں نے تم سے کہا تھا کہ میں ہوا میں

کسی آنے والے طوفان کی اور چار سو چھانے والی وباؤں کی بو سونگھتا ہوں

لیکن تم نے میرا کہا سن کے مجھ پہ ہی تلواریں سونت لیں

اور حماقت کے لنگڑے گھوڑے پہ زینیں کسیں، اور کہیں چل دیئے!

اسی طرح ایک دوسرا بڑا شاعر صلاح عبدالصبور کہتا ہے:

پیشتر اس سے کہ ہر سو

ایک ایسا غبار چھائے، جس کی رنگت خاکستری ہو

ہم نے جتلا دیا تھا!

پیشتر اس سے کہ اسپِ ناگہانی

اپنی ٹاپوں کی صدا اپنی ملائم چال میں چھپائے

یہیں آلے

ہم نے جتلا دیا تھا!

ایک اور شاعر امل دنقل اپنی صفائی میں یہ جوابی الزام لگاتا ہوا دکھائی دیتا ہے:

میں نے کئی بار تم سے کہا تھا

کہ عید الفطر کا یہ پُر شور جشن۔ یہ دھماکے یہ گولے

(اور دریچوں میں کھڑی عورتیں حیرت سے بے دم!)

یہ کوئی فتح کا جشن تو نہیں ہے!
پھر یہ کیا ہے؟ اور اس سارے تماشے کی تقریب کیا ہے؟
مجھ کو جو کہنا تھا، کہہ دیا تھا
لیکن تم نے میری ہفوات کو سُنا اَن سُنا کر دیا
اور پھر آگ نے خیموں اور آبادیوں کا احاطہ کیا
اور ہر طرف خود اور زرہیں دکھلائی دیں
اور لاشوں کے ٹھٹ لگ گئے!

تحقیرِ ذات

حزیران کے المیے کے بعد عربی شاعر کے ہاں ایک دوسرا رویہ، جو زیادہ عام اور ہمہ گیر ہے، وہ خود الزامی (SELF INDICTMENT
اپنی ذات کی تحقیر و تذلیل کا ہے۔ شاعر کا یہ احساس کہ وطن پر آئی ہوئی اس مصیبت میں وہ سوائے لفظوں کے تیر چلانے کے اور کچھ نہیں کر سکتا، اسے ایک
احساسِ کمتری اور بے مائیگی میں مبتلا کرتا ہے، اور شاعر ممدوح عدوان کو یہ کہنے پر مجبور کرتا ہے:

بیس برسوں سے میں حاکموں کے دفاتر میں بیٹھا کاغذوں پر سیاہی بکھیرتا ہوں
یا پھر اُن کی خاطر اپنے اسلاف کی ہڈیوں سے قطرے نچوڑتا ہوں
اور اپنے ناخنوں سے پتھر تراشتا ہوں کہ ان سے فصیلیں اٹھاؤں ——— اور قلعے بناؤں!

. . . . . .

اس وطن میں جہاں یا تو بہتا ہوا خون تھا، یا دعاؤں میں اٹھے ہوئے ہاتھ تھے
ہم غلاظت خانوں میں جاتے کہ کھل کے بے شرمی کی باتیں کریں
نسوانی جسموں کی صورت بنائیں
اور گندی گالیاں دیواروں پہ کندہ کریں!

شاعر امل دنقل کہتا ہے:

مجھ سے انھوں نے کہا چپ رہو تو میں نے زبان بند کی، آنکھیں موند لیں، اور نامردوں کو اپنا آمر بنایا:
میں بیت عبس کے غلاموں میں شامل اُن کے ریوڑ چرانے لگا
میں کچھ بھی نہیں تھا، میں طاقت سے محروم، ایک ناچیز تھا! ایک شے بے سود تھا!

ایک اور ممتاز شاعر ادونیس اپنے دیوان "گلاب اور خاکستر کے درمیان ایک لمحہ" میں یہ حسرت بھرا اعتراف کرتا ہے:

ہمیں نہ آسماں نے جنم دیا، نہ اس خاک نے
ہم نیستی ہیں، ہم ایک وجودِ ناپدید ہیں
ہم لفظوں کے دریا سے اُٹھتا ہوا جھاگ ہیں
ہم آسماں اور اس کی کہکشاؤں سے جھاڑی ہوئی گرد ہیں
ہم زندگی کی اترن ہیں ——— اس کی دھات کا زنگ ہیں

دوسری طرح کی آوازیں

اور اب ہم شاعری کے ایک قدرے مختلف رویّے کی طرف آتے ہیں، جس کے نمونے ہمیں مقبوضہ فلسطین میں بسنے والے دو ہر دلعزیز شاعروں کی نظموں میں ملتے ہیں۔ اس قسم کی شاعری میں خواب اور حقیقت ہاتھ میں ہاتھ دے کر چلتے ہیں۔ اس میں زمین کا ذکر بھی ہوتا ہے اور عورت کا بھی، شکست کا بھی اور اس کے ساتھ انقلاب کا بھی! شاعر دشمن کو اس کے واضح خدوخال کے ساتھ اپنے سامنے دیکھتا ہے، اور اس لئے وہ جو کچھ بھی کہتا ہے ایک ایسے لہجے میں کہتا ہے جس میں توانائی ہے، صفائی ہے، روشنی ہے!

محمود درویش کے تازہ دیوان کا نام ہے: "محاولۃ رقم ۷" (کوشش نمبر سات)۔ اس میں شامل وہ اپنی ایک نظم میں محبوب، محبت اور موت کی ایک ایسی مثلث کا تصور دیتا ہے جس کا ہر خط، ہر حال میں دوسرے دونوں خطوں کے ساتھ پیوستہ ہوتا ہے۔ اس مثلث میں جو محبوب ہے اُسے آپ چاہیں تو شاعر کی زمین سمجھ لیں، اور چاہیں تو شاعر کے دل میں بسنے والی کوئی عورت! نظم کے بول یہ ہیں:

تین چیزیں ہیں جن کی کوئی نہایت نہیں
تو، محبت اور موت:

میں نے تیرے دشنۂ شیریں کو بوسہ دیا
اور پھر تیرے دونوں ہاتھوں کو تھاما، کہ تو
نہ مجھے قتل کرے، اور نہ منزلِ موت سے دور پھینکے!
یہ محبت ہے مری جاں:
جب میں مرتا ہوں، تیری محبت میرے خون میں دوڑتی ہے
اور جب میں تیری محبت کا ہاتھ تھامتا ہوں
تو لگتا ہے میں موت کی وادیوں میں اترنے لگا ہوں
پس تو چاہے تو عورت کا روپ دھا لے!
اور چاہے تو میرا شہر دکھلائی دے!

ارضِ فلسطین کا دوسرا شاعر سمیح القاسم اپنے مرثیوں کے دیوان میں ایک جگہ اپنے گردوپیش کی بہت سی چیزوں سے مخاطب ہوتا ہے: اے میری محبت کے چہرے، اے آنسوؤں میں روشن چاند، اے بارشو، درختو، پھولو! اے روشنیو، گھنٹیو، موسیقی کی مدھر تانو! ہر موت کے بعد ایک میلاد ہوتا ہے، اور میں اس میلاد کا منتظر ہوں، اس نئے جنم کی راہ دیکھ رہا ہوں:

اور میں شاعر سمیح القاسم سے اتفاق کرتا ہوں کہ وہ چاہے روزمرہ زندگی کا نظام ہو یا تاریخ کا ازلی عمل، اس میں ویرانی اور خزاں اور موت کو دوام نہیں ہے۔ ہر خزاں کے بعد موسمِ گل کا آنا لازم ہے اور ہر موت کے بعد ایک نیا جنم ضرور ہوتا ہے۔ اس لئے سمیح القاسم جس میلاد جس نئے جنم کے انتظار میں ہے وہ ایک دن ضرور واقع ہوگا، یہ اور بات ہے کہ وہ خود اسے نہ دیکھ سکے، اس کے بیٹے اور نواسے اس سے مسرور ہوں!

قمر ہاشمی

مُرسلِ آخرؐ

(زیرِ اشاعت طویل نعت کا ایک حصّہ)

ہمیں نے ایثار کے بکھیرے ہیں پھُول عظمت کے راستوں پر
وفا کے معبد ہیں جن کی خوشبو سے
عود و عنبر مہک رہے ہیں
ہماری قربانیوں سے
چہروں کے جگمگائے کنول ہیں تازہ
ہمیں سے امن و امان کی دلکشی ہے قائم
ہمیں رجز خوانِ حرب و ضرب پہ گری ہیں
ہمیں نواگر ہیں آشتی کے

مَیں شاعرِ موجِ نکہتِ گُل
نقیبِ آوازِ جنبشِ سرو و دستِ سُنبل
ہلاکتوں کا پیام کیا دوں
دیارِ دانش کے راہ دانو!
ثباتِ اقلیمِ کلک و قرطاس کے نشانو!
قتیلِ جہدِ بقا ہوں کب سے
ازل سے ہی طبلِ جنگ کی گونج سُن رہا ہوں
یہ ابنِ آدم
جو دو قبیلوں میں منقسم ہے
ستم کش و ظلم کیش
ہابیل اور قابیل کا مقدر
انہی محاذوں پہ صف بصف
جنگ آزما ہے
ضمیرِ حق سے سپاہِ باطل
جہاں لہو کی کشید ہو گی
تجارتِ خوں کے واسطے

زرگری لگائے گی خوں کے میلے

محمدِ مصطفےٰ جو ختم الرسل
دستِ سُبُل تھے
پیغمبرِ فلاحِ حیات بھی تھے
وہ آدمی کی نجات بھی تھے
ضمیرِ عدل و براَتِ کائنات بھی تھے
وہی تو فی الاصل خاتمِ جنگِ زرگری تھے
وہ آدمی کی برابری کے
صحیفہ بردارِ آخری تھے

وہ عہدِ حرص و ہوس میں
انساں کی برتری تھے
مصافِ جنگ و جدال و امن و اماں میں
تکمیلِ رہبری تھے
اُنھیں نہ آیا خیال
انساں کو دو گروہوں میں بانٹنے کا
کہ وہ مساوات کے تھے مبدا

یہ پستی و ارتفاع کے راستے ہیں
ہر شخص جانتا ہے
مگر بایں علم و آگہی بھی
مفاہمت ایک ساتھ دونوں سے چاہتے ہیں
سحر کے برسوں سے منتظر ہیں
مگر اندھیروں سے اتنے مانوس ہو چکے ہیں
کہ ظلمتوں کے ہجوم پر بھی
گماں اُجالے کا ہو رہا ہے
یہ رات حاجب ہے وحشتوں کی
یہ شب ہے چاؤش مرگھٹوں کی
اسے لہو کا خراج کیوں دیں

رشید قیصرانی

روشنی کا پیمبر

آسمانوں میں بکھری ہوئی سلطنت کے سفیروں نے مژدہ سُنا
آسمانوں میں بکھری ہوئی سلطنت کے سلاطیں نے سجدہ کیا
روشنی کے پیمبر کو سجدہ کیا
روشنی آگہی بن گئی
روشنی زندگی بن گئی
آسمانوں میں بکھری ہوئی سلطنت کے سفیروں نے مژدہ سُنا
روشنی روشنی جاوداں روشنی
عالمِ رنگ و بو کا نشاں روشنی
بعثتِ لفظ کی داستاں روشنی
نورِ ناطق کا حرف و بیاں روشنی
اور مکاں سے ہے تا لامکاں روشنی
آج پہنچی کہاں سے کہاں روشنی
آج اتری ہے دوشِ فلک پر سے
کتنی شاداب کتنی جواں روشنی
ظلمتوں کی صفیں سب سمٹ سی گئیں
اور پھیلی کراں تا کراں روشنی
آسمانوں میں بکھری ہوئی سلطنت کے سفیروں نے مژدہ سُنا
روشنی کا پیمبر
زمیں —— اندھی کالی زمیں پر
چمکتی ہوئی نور کی ایک چادر بچھانے چلا ہے

وہ چادر کہ جس پر مقدس ستاروں کی جھالر
چمکتے ہوئے زندہ لفظوں کی بیلیں سجی تھیں
وہ چادر جہاں سات افلاک کے سات رنگوں سے
اک قوس سی بن گئی تھی
اور اس قوس کے دونوں جانب
پرانی زبانوں میں اک لفظ — تنہا دمکتا ستارا اک لفظ لکھا ہوا تھا
وہ چادر جہاں چار کونوں پہ تھے
چار حرفوں کے چہرے
یہی چار حرفی عبارت بنائے جہاں تھی
یہی روشنی تھی — یہی روشنی کے پیمبر کا پیغام بھی تھی

اسی چار حرفی عبارت کو میں نے پڑھا تھا
مجھے "م" سے ماورائی حقائق کی دولت ملی
مجھے "ح" سے حرمت ملی لفظ کی
مجھے "ب" سے آنکھوں کی بارش ملی
مجھے "ت" سے تو مل گیا
روشنی کے پیمبر
ترا نام بھی چار حرفی عبارت
ترا کام بھی چار حرفی عبارت
یہی چار حرفی عبارت تو سرمایۂ کل جہاں ہے
یہی کن فکاں ہے
یہی لامکاں ہے
یہی جاوداں ہے
اسی چار حرفی عبارت کا وجدان دنیا میں پھر عام کر دے
اسی چار حرفی عبارت کا وجدان دنیا میں پھر عام کر دے
روشنی کے پیمبر
روشنی کے پیمبر

میر تقی میرؔ کی منقسم شخصیت

سید علی عباس جلالپوری

میر تقی میر کے کلام کے بارے میں بجا طور پر کہا گیا ہے کہ بلندش غایت بلند و پستش غایت پست۔ ایک طرف اُن کے بہتر نشتر ہیں جو اعلیٰ درجے کی عشقیہ شاعری کے عمدہ نمونے ہیں ان میں از خود رفتگی اور خلوصِ جذبہ کا ثبوت ملتا ہے۔ دوسری طرف اُن کے کلام کا غالب حصہ، ہوسناکی رکاکت اور ہزل و تمسخر سے مملو ہے۔ میر تقی کے پرستاروں نے مدح سرائی کے جوش میں اس دوسرے حصے کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔ راقم الحروف کے خیال میں بلند و پست کے اس گہرے تضاد میں منقسم شخصیت[1] کار فرما ہے۔ یعنی میر تقی میر کے وجود میں دو واضح شخصیتیں جمع ہو گئی تھیں۔ ایک اعلیٰ، دوسری اسفل۔ اُن کا بلند پایہ کلام اعلیٰ شخصیت کی دین ہے اور عامیانہ کلام اسفل کی تخلیق ہے۔ فارسی کے شعراء نے بھی ریاکار ملاؤں کی دین فروشی پر چوٹ کرتے ہوئے یا عشاق کی مواصلت کی وضاحت نگاری کرتے ہوئے کہیں کہیں فحش و ہزل سے کام لیا ہے لیکن اُن کے کلام میں اس نوع کے اشعار اقل قلیل ہیں اور محض ایک روایت کی ترجمانی کرتے ہیں جبکہ میر تقی میر کے دواوین میں سوقیانہ اور رکیک مضامین اس کثرت و تواتر سے ملتے ہیں کہ انہیں محض روایت کا حصہ نہیں سمجھا جا سکتا بلکہ ان کے پیچھے ایک واضح ذہن و کردار کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ بات کو آگے بڑھانے کے لئے ضروری ہے کہ منقسم شخصیت کی توضیح کر دی جائے۔

علمائے نفسیات کے خیال میں منقسم شخصیت اُس وقت نمود پذیر ہوتی ہے جب کسی آدمی کی ذہنی واردات میں ربط و تعلق قائم نہیں رہتا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ انسان کا ذہن ہر وقت حرکت یا سیلان کی حالت میں رہتا ہے حتیٰ کہ سوتے میں بھی اُس کا یہ عمل معطل نہیں ہوتا بلکہ خوابوں کی صورت میں جاری رہتا ہے۔ شعور کی رَو متواتر و مسلسل ہوتی ہے۔ اس کی عام فہم مثال یہ ہے کہ ایک لمحے میں ہم آج صبح کے کسی واقعے کے بارے میں سوچ رہے ہوتے ہیں اور دوسرے ہی لمحے میں آج سے بیس برس پہلے کی کوئی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ اس کے مابعد دفتر جانے کا خیال آ جاتا ہے۔ نارمل ذہن کی ایک سوچ اور دوسری سوچ یا ایک یاد اور دوسری یاد کے درمیان کوئی وقفہ نہیں ہوتا خواہ یہ سوچیں یا یادیں ایک دوسری سے کتنی ہی مختلف و متغائر ہوں ان میں ربط و تسلسل بہر صورت قائم رہتا ہے اور ذہن کی سیلانی حرکت باقی رہتی ہے۔ جب شعور کی رَو بوجوہ کسی ایک نقطہ پر آ کر رک جائے یا ایک خیال دوسرے خیال سے کلی طور پر منقطع ہو جائے تو آدمی خبطِ[2] ذہن کا شکار ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایک پاگل کا شعور ٹکڑوں میں بٹ کر اکائیاں بن جاتا ہے۔ ایک لمحے میں وہ اپنے آپ کو شہنشاہ سمجھتا ہے اور شاہانہ انداز میں مطالبہ کرتا ہے کہ لوگ جھک کر اسے سلام کریں اور دوسرے ہی لمحے میں کسی سے عاجزانہ لہجے میں ایک سگریٹ کی فرمائش کرتا ہے۔ یہ خیالات کی بے ربطی[3] ہے جس نے اُس کا ذہنی توازن درہم برہم کر دیا ہے۔

خیالات کی یہی بے ربطی بعض حالات میں منقسم شخصیت کا سبب بن جاتی ہے جس کے دونوں پہلوؤں کے اپنے اپنے مستقل جذبات ہوتے ہیں، اپنی اپنی پسند و ناپسند ہوتی ہے۔ اپنی اپنی اخلاقی قدریں ہوتی ہیں۔ اس قسم کا آدمی بظاہر نارمل زندگی گزارتا ہے اور اس کے معمولات میں کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن اسے قریب سے دیکھنے والے جان جاتے ہیں کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ ابتدائی صورت میں منقسم شخصیت کی ایک مثال رنگِ مزاج[4] کا بدلتے رہنا ہے۔ ہم کبھی خوشی محسوس کرتے ہیں اور کبھی بیٹھے بٹھائے افسردہ خاطر ہو جاتے ہیں۔ خوشی اور افسردگی کے اسباب ہمارے لاشعور میں ہوتے ہیں۔ ہمارا رنگِ مزاج جامد ہو جائے تو

۱۔ SPLIT PERSONALITY ۲۔ INSANITY ۳۔ DISSOCIATION OF IDEAS ۴۔ MOOD

فتور ذہن کا باعث ہو سکتا ہے لیکن ہماری خوش قسمتی سے ایسا بہت ہی کم ہوتا ہے اور ذہن کی سیلانی حرکت ہمیں خلل ذہن سے محفوظ رکھتی ہے۔[1]

شعوری رَو کی عارضی یا مستقل بے ربطی ذہنی کشمکش کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ہمارا ذہن ناگوار تجربات اور تلخ احساسات سے نجات پانے کے لئے انھیں دبا دیتا ہے اور وہ ہمارے لاشعور میں چلے جاتے ہیں لیکن مٹتے نہیں بلکہ الجھنوں کی صورت میں ہمارے شعور کو متاثر کرتے رہتے ہیں۔ منقسم شخصیت کی ایک مثال ولیم جیمز نے اس روسی شہزادی کی دی ہے جو تھیٹر میں بیٹھی کسی المیہ کے فرضی کرداروں کے مصائب پر آنسو بہا رہی ہو جب کہ اس کا کوچوان تھیٹر کے باہر برف باری کی بوچھاڑ میں اکڑا جا رہا ہو اور شہزادی کو اس کی افتاد کا مطلق احساس نہ ہو۔ منقسم شخصیت کی ایک اور عام مثال ایک ریاکار شخص کی ہے جس کی دو شخصیتیں ہوتی ہیں۔ ایک حقیقی دوسری دکھاوے کی اور یہ دونوں اپنا اپنا مستقل مقام رکھتی ہیں۔ حقیقی شخصیت بدمزاج، بے دین، خود غرض، فرومایہ اور متکبر ہوتی ہے اور دکھاوے کی شخصیت فیاض، متدین، خلیق اور ایثار پیشہ ہوتی ہے۔ اس قسم کے لوگ سیاسیات میں بڑے کامیاب ہوتے ہیں۔ میکیاویلی نے اپنی کتاب میں شہزادے کو تلقین کی ہے کہ خواہ بہ باطن وہ کتنا ہی بے دین ہو اسے عوام کو بہر صورت اس بات کا یقین دلانا چاہیئے کہ وہ دین کا بہت بڑا پاسبان ہے۔

منقسم شخصیت کی ایک عجیب و غریب صورت یہ ہے کہ بعض لوگ اچانک اپنا نام اور ماضی بھول جاتے ہیں۔ دبائی ہوئی خواہشات لاشعور کی تہ سے اچانک ابھر آتی ہیں اور ان کے گرد ایک نئی شخصیت کا تار و پود بُنا جاتا ہے جو نارمل شخصیت سے مختلف ہوتا ہے۔ کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ آدمی اپنے موجودہ طرزِ حیات سے نفرت کرنے لگتا ہے اور اس سے فرار حاصل کرنے کے لئے ایک بالکل نئی شخصیت اختیار کر لیتا ہے۔ منقسم شخصیتیں بدلتی بھی رہتی ہیں۔ کبھی نارمل شخصیت غالب آ جاتی ہے اور کبھی ثانوی شخصیت کا تصرف ہو جاتا ہے۔ فرانس کے ڈاکٹر ژینے نے منقسم شخصیت پر بحث کرتے ہوئے ایک دیہاتی لڑکی کا واقعہ بیان کیا ہے جس کی شخصیتیں بدلتی رہتی تھیں۔ یہ لڑکی اپنی صورتِ احوال کا وقوف رکھتی تھی جب وہ محسوس کرتی کہ اس کی ثانوی شخصیت غلبہ پا رہی ہے تو وہ یادداشت کے طور پر کاغذ پر لکھ لیتی کہ اس وقت وہ کیا کام کر رہی تھی۔ اس کے بعد وہ سب کچھ بھول جاتی۔ جب دوبارہ اس کی نارمل شخصیت برسرِ کار آتی تو وہ اپنے کاغذ پر کی تحریر کو دیکھ کر دوبارہ اپنے معمولات میں جُت جاتی۔ اس کی دونوں شخصیتوں کا اپنا الگ مزاج تھا، الگ یادیں تھیں، الگ احساسات تھے۔ اس کی نارمل شخصیت بدمزاج، لا اُبالی اور ضدی تھی جب کہ ثانوی شخصیت ذہین اور چنچل تھی۔ شروع شروع میں اس کی نسیان کاری کے وقفے کم مدت کے ہوتے تھے لیکن بعد میں خاصے طویل ہو گئے۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اس کی ثانوی شخصیت مستقل بالذات صورت اختیار کر گئی اور نارمل شخصیت دب کر رہ گئی۔

ڈاکٹر مارٹن پرنس کی ایک ہسٹریا کی مریضہ مس بوشمپ کی ایک نہ دو چار مختلف شخصیتیں تھیں جو اپنی اپنی جگہ خود مختار تھیں۔ اس کی اصل شخصیت محنتی، شرمیلی اور فرض شناس تھی اور مذہبی نوعیت کی تھی اور دوسری چڑچڑی، خود نما اور بے دین تھی۔ دونوں کو ایک دوسری کا کوئی شعور نہ تھا۔ نہ ایک دوسری کی واردات اور یادوں کا کوئی علم تھا۔ دونوں بسا اوقات ایک دوسری میں بدلتی رہتی تھیں اور باہم متخالف تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے ایک ہی وجود میں دو ہستیوں نے بسیرا کر لیا ہے۔

ڈاکٹر مارٹن پرنس کی تحقیق سے اس امر کا انکشاف ہوا کہ مس بوشمپ دو بار عشقِ ناکام کے آشوب سے گذری تھی اور اپنی پرجوش آرزوؤں اور سلگتے ہوئے ارمانوں کو دبا دینے سے اس کی شخصیت منقسم ہو گئی تھی۔ ان دونوں میں تیسری کا اضافہ ہو گیا جس کا نام اس نے سیلی رکھا۔ سیلی اس وقت نمودار ہوئی جب ڈاکٹر مارٹن پرنس نے مس بوشمپ پر پنیا تک نیند طاری کی۔ اس حالت میں وہ بچوں جیسی خفیف حرکتیں کیا کرتی تھی۔ مارٹن پرنس کے علاج سے دونوں متخالف شخصیتوں میں مفاہمت ہو گئی تو چوتھی شخصیت پیدا ہوئی جو رفتہ رفتہ منفرد صورت اختیار کر گئی۔

ڈاکٹر آر ایم رگل نے اپنے مجلّے LANCET میں ایک ۲۷ سالہ خاتون کے حالات چھپوائے تھے جس کی سات مختلف شخصیتیں تھیں۔ ڈاکٹر رگل نے پنیاتک علاج سے ان میں مفاہمت تو ایک حد تک پیدا کر دی لیکن وہ عوامل جو ان کی تہ میں کارفرما تھے پوری طرح رفع نہ کئے جا سکے۔ اس عورت کی ایک نمایاں شخصیت صلح جو اور امن پسند تھی جب کہ دوسری باغی اور ہٹیلی تھی اور ہر قیمت پر اپنی خواہشات کی آسودگی پر کمربستہ رہتی تھی۔[3]

---

[1] اصطلاح میں اسے FUGUE کہتے ہیں۔

[2] PSYCHOLOGY OF INSANITY, BERNARD HART

[3] ILLUSIONS AND DELUSIONS, RAWCLIFFE

اپنی انتہائی صورت میں منقسم شخصیت کم دیکھنے میں آتی ہے۔ اس نوع کی شخصیتیں اب تک صرف پچاس ہی دریافت کی گئی ہیں۔ البتہ ابتدائی اور معتدل صورت میں منقسم شخصیتیں عام طور سے ملتی ہیں۔ دنیائے ادب میں آر۔ ایل سٹیونسن نے اپنی کہانی "مسٹر جیکل اور مسٹر ہائڈ" میں غالباً پہلی مرتبہ منقسم شخصیت کو کہانی کا موضوع بنایا تھا۔ اس کہانی کا مرکزی کردار ڈاکٹر جیکل ایک سائنس داں ہے جس کے خیال کے مطابق انسانی فطرت کا خمیر بایہ شر اور خیر کے متضاد عناصر سے اٹھا ہے۔ جیکل شر کو خیر سے جدا کرنے کے لئے ایک محلول تیار کرتا ہے اور اسے پی کر ایک علیحدہ شخصیت مسٹر ہائڈ کا روپ دھار لیتا ہے جو مجسم شر ہے۔ اسی روپ میں وہ ایک آدمی کو قتل کر دیتا ہے۔ اس کا انجام بھی المناک ہوتا ہے۔ اس کہانی میں سٹیونسن نے گہری نفسیاتی بصیرت کا ثبوت دیا ہے۔

متذکرہ تصریحات کی روشنی میں میر تقی میر کی شخصیت کا مطالعہ مفید مطلب ثابت ہوگا۔ میر تقی میر کے والد ایک باکمال خدا رسیدہ صوفی تھے۔ ان کی کرامات کا ہر کہیں چرچا تھا۔ ان کی روحانی توجہ سے متاثر ہو کر ان کے ایک ارادت مند امان اللہ نے اپنا گھر بار چھوڑ دیا تھا اور انہیں کے ہو کر رہ گئے تھے۔ میر تقی میر نے اپنے پاک منش والد اور امان اللہ جیسے زاہد مرتاض کی صحبت میں آنکھ کھولی تھی اور ہر نوخیز کی طرح ان کی شخصیت اور کردار سے متاثر ہوئے تھے۔ بظاہر ان کا پدری نصب العین اعلیٰ وارفع تھا۔ قدرت نے انہیں پرجوش طبیعت ارزانی کی تھی جس کا علم ان کے باپ کو بھی تھا۔ میر تقی میر کے الفاظ میں ان کے والد

"ہرگاہ مرا در بغل کشیدے و بنظر شفقت رنگ کاہی مرا دیدے گفت کہ اے سرمایۂ جاں! ایں چہ آتشے است کہ در دلت نہان است و چہ سوزیست کہ ترا با جان است"

ان کے والد ماجد کو اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ اس "آتش بجاں" کی مناسب تربیت نہ ہوئی تو وہ کج روی کا شکار ہو کر رہ جائے گا۔ لیکن بدقسمتی سے ان کی بے وقت رحلت نے میر تقی میر کو ان کے فیضانِ صحبت سے محروم کر دیا۔ میر کا ایک شعر ہے ؎

اِس دن ہی کو کہتے تھا اکثر پدر ہمارا ہے تیرہ روز اپنا لڑکوں کی دوستی سے

اس سے مفہوم ہوتا ہے کہ میر تقی میر کے والد نے ان کے ہم جنسی رجحان کو بھانپ لیا تھا اور اس کے بارے میں متنبہ بھی کیا تھا۔ بہرحال والد کی وفات کے بعد میر تقی میر کس مپرسی کے عالم میں ترکِ وطن پر مجبور ہو گئے اور دلی کا رخ کیا۔ جب ان کے سرپرست امیرالامرا صمصام الدولہ مارے گئے تو میر اکبرآباد لوٹ آئے۔ انہیں ایام میں وہ ایک "پری تمثال" کے عشق بلاخیز میں مبتلا ہوئے۔ طبیعت میں آشفتگی تو تھی ہی، خود بھی رسوائے دہر ہوئے اور اس عفیفہ کو بھی عبث بدنام کیا۔ عزیزوں کی لعن طعن سے آزردہ ہو کر "با دلے بغل پروردہ حسرت و حرماں و با خاطر ناشاد دست و گریباں" گھر سے نکل کھڑے ہوئے اور "تا بقید حیات بود طوق محبت در گردن و سلسلۂ دیوانگی بپا داشت" دلی جا کر اپنے سوتیلے بھائی محمد حسن کے خالو سراج الدین علی خاں آرزو کے یہاں قیام کیا۔ کچھ مدت کے بعد محمد حسن نے اپنے خالو کو لکھا: "میر محمد تقی فتنۂ روزگار است زنہار بہ تربیت او نہ باید پرداخت"۔

اس شکایت کے باوجود شریف النفس خان آرزو نے میر تقی میر کی تعلیم و تربیت میں سعی بلیغ کی اور انہیں فارسی اور عربی کی کچھ کتابیں پڑھائیں لیکن میر تقی اس یگانۂ روزگار سے پوری طرح استفادہ نہ کر سکے اور دلی کے اوباشوں اور لوطیوں کی صحبتِ بد میں گھومنے پھرنے لگے۔ خان آرزو نے آوارگی اور بدکاری سے منع کیا تو احسان ناشناسی پر خودداری کا پردہ ڈال کر ان کے گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ ان ایام میں ان کی شاعری کی شہرت ہو چلی تھی۔ تلاشِ معاش میں ادھر ادھر بھٹکتے ہوئے لکھنؤ پہونچے جہاں نواب وزیر آصف الدولہ نے معقول مشاہرہ مقرر کر دیا اور فراغت سے گذر بسر کرنے لگے۔

دلی کے دوران قیام میں میر تقی میر کے ذہن میں فتور آ گیا تھا اور وہ چاند میں خوفناک صورت دیکھنے لگے تھے۔ کہتے ہیں:

جگر جورِ گردوں سے خوں ہو گیا مجھے رکتے رکتے جنوں ہو گیا
ہوا ضبط سے مجھ کو ربطِ تمام لگی رہنے وحشت مجھے صبح و شام
یہ وہمِ غلط کاریاں تک کھنچا کہ کارِ جنوں آسماں تک کھنچا
نظر رات کو چاند پر گر پڑے تو گویا کہ بجلی سی دل پر پڑے

۵ ILLUSIONS AND DELUSIONS. RAWCLIFFE.

مہ چاردہ کا یہ آتش کرے
ڈروں یاں تلک میں کہ جی غش کرے

نظر آئے اک شکل مہتاب میں
کمی آئے جس سے خور و خواب میں

کہتے ہیں کہ علاج معالجے اور جھاڑ پھونک سے شفا ہو گئی تھی لیکن اس کے اثرات رفع نہ ہو سکے۔ پژمردگی کے دورے اکثر پڑتے رہے جس کے باعث انھیں گوشہ گیر ہونا پڑا۔ ایک رباعی میں کہتے ہیں ؎

چپکا چپکا پھرا نہ کر تو غم سے
کیا حرف و سخن عیب ہے کچھ محرم سے
آخر کو رکے رہتے جنوں ہوتا ہے
اے میر کوئی بات کیا کر ہم سے

عبدلباری آسی مقدمہ کلیات میر میں لکھتے ہیں۔

"اُن کو اپنے اوائل شباب میں جنوں ہو چکا تھا اور گو وہ علاج ہونے پر اس سے صحت یاب ہو گئے تھے مگر پھر بھی کسی قدر اس کا اثر باقی تھا جس نے انھیں بد دماغ مشہور کر دیا تھا۔"

راقم الحروف کے خیال میں یہ فتور ذہن میر تقی میر کی منقسم شخصیت کی نشاندہی کرتا ہے۔ عبدلباری آسی نے جس کیفیت کو صحت سے تعبیر کیا ہے اس کا مفہوم نفسیات کی زبان میں یہ ہوگا کہ میر تقی میر کے ذہن کی سیلانی حرکت میں جو بے ربطی واقع ہو گئی تھی وہ نرم پڑ گئی اور اُن کی منقسم شخصیت کے دونوں پہلو متبادل صورت اختیار کر گئے جس کے باعث وہ بظاہر ایک نارمل آدمی کی زندگی گذارنے لگے۔ دوسرے الفاظ میں اُن کی اعلیٰ اور اسفل شخصیتوں میں کبھی اعلیٰ غالب آجاتی اور کبھی اسفل قابو پالیتی تھی۔ ان کی اعلیٰ شخصیت بچپن کے صالح ماحول میں تشکیل پذیر ہوئی تھی اور اسفل دلّی کے اوباشوں اور لفنگوں کی صحبت میں پروان چڑھی تھی۔ ان کے اوائل شباب کے عشق صادق کو بلند شخصیت سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔ اُن کی اعلیٰ شاعری اسی عشق کی عطا ہے۔ ان کا یہ کلام معلوم عوام ہے۔ ہم نمونے کے بطور چند اشعار درج کریں گے ؎

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم
اب جو ہیں خاک انتہا ہے یہ

عمر بھر ہم رہے شرابی سے
دل پر خوں کی اک گلابی سے

شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

دیدنی تھی شکستگی دل کی
کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے

ترے فراق میں جیسے خیال مفلس کا
گئی ہے فکر پریشاں کہاں کہاں میری

دوسری طرف ان کا سوقیانہ کلام ہے جو اُن کی شخصیت کے اسفل پہلو کی تخلیق ہے۔ رکیک مضامین سے ان کے دیوان بھرے پڑے ہیں۔ ان کا زمانہ مغلیہ تمدن کا دورِ تنزل تھا جب سلاطین و امرا ناساعد حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی بجائے مجالس ناؤ نوش اور امردوں اور رنڈیوں کے آغوش میں پناہ لے رہے تھے۔ عوام بھی حکمرانوں کی دیکھا دیکھی انھیں مکروہات میں غرق ہو کر رہ گئے۔ میر تقی میر نے ہوا و ہوس کے کوچے کی جی بھر کر سیر کی اور طفلانِ تہ بازار کے پیچھے مارے مارے پھرتے رہے۔ وہ اپنے آپ کو لوطی کہتے ہیں اور اپنی سدومیت کا برملا اعتراف کرتے ہیں ؎

جب نہ تب ملتا ہے بازاروں میں میر
ایک لوطی ہے وہ ظالم سرزنش

پھرے ہے باؤلا سا پیچھے ان شہری غزالوں کے
بیاباں مرگ ہوگا اس چلن سے میر بھی آخر

میر تو طفلانِ تہ بازار میں
دیکھو شاید ہو دہیں وہ دلفروش

طفلِ تہ بازار کا عاشق ہوں میں
دلفروشی کوئی مجھ سے سیکھ لے

کمسنی میں شاہد بازیاں کا ہے کو زیبا تھیں
دیا لڑکوں کو دل میں نے قیامت میں بھی ناداں ہوں

معقول اگر سمجھتے تو میر بھی نہ کرتے
لڑکوں سے خشت بازی ہنگام کہنہ سالی

استخواں سب پوست سے سینے کے آتے ہیں نظر
عشق میں ان نوخطوں کے میر میں مسطر ہوا

کیا اُس آتش باز لونڈے کا ہے اتنا شوق میر
بہ چلی ہے دیکھ کر اُس کو تمہاری رال کچھ

دل سے کے لونڈے دلی کے کب کا پچل گئے
اب اُن سے کھائی پی ہوئی شے کیا وصول ہو

ان پریوں سے لڑکوں کے چھپیٹے میں دل آئے
حیرت زدۂ عشق ہیں دیوار ہیں ہم لوگ

تنگ پوشی تنگ درزی اُس کی جی میں کھب گئی
کیا ہی وہ محبوب خوش ترکیب خوش پوشاک تھا

تنگ بچے سے عشق کیا تھا ریختے کیا کیا میں نے کہے
رفتہ رفتہ ہندستان سے شعر مرا ایران گیا

لڑکے شوخ بہت ہیں لیکن ویسا میر نہیں کوئی
دھوم قیامت کی سی ہے ہنگامہ اُس کے اودھم کا

امیر زادوں سے دلی کے مل نہ تا مقدور
کہ ہم فقیر ہوئے ہیں انھیں کی دولت سے

کیا میر تو روتا ہے پامالیٔ دل ہی کو
ان لونڈوں نے تو دلی سب سر پہ اٹھائی ہے

کہا یہ وضع لوگوں نے جو دیکھا رات کو ملتے
ہوا صحبت میں ان لڑکوں کے ضائع روزگار اپنا

کیا یہ بلا ہے لاگ بھی دل کی کہ میر جی
دامن سوار لڑکوں کے ہو کر نفر رہے

ان نوخطوں سے میری قسمت ہیں تو تھی خواری
کس طرح کی میرا کوئی آ کے منا جاوے

سر جوڑنا ہمارا اُس لڑکے پر نہ دیکھو
ٹک دیکھو اس شکستہ طرز کلاہ کو بھی

میر تقی میر نے اپنے دواوین میں ایک ایک کر کے دلی کے تمام آوارہ منش لونڈے گنائے ہیں۔ معاملہ بندی میں رکاکت اور ابتذال کا رنگ زیادہ گہرا ہو گیا ہے ؎

یار ہیں اُس کے ساق سیمیں کے
دے دے مار دل ہوں ہاتھ رانوں پر

تھی زمانے میں جن کی خرچی روپے
بھانسا کرتے ہیں اُن کو آنوں پر

میں نے جو زمی کی تو رو دونا سرچڑھا وہ بدمعاش
ملانے ہی کو دوڑتا ہے اب مجھے حلوا سمجھ

میر کی عیاریاں معلوم لڑکوں کو نہیں
کرتے ہیں کیا کیا ادائیں اُس کو سادا سا سمجھ

راتوں پاس گلے لگ سوتے ننگے ہو کر ہے یہ عجب
دن کو بے پردہ نہیں ملتے ہم سے شرماتے ہیں ہنوز

سا تو کے پڑھنے والے فارغ تحصیل علمی سے ہوئے
جہل سے مکتب کے لڑکوں میں ہم دل بہلاتے ہیں ہنوز

اوباش بھی ہمارا کتنا ہے ٹیڑھا بانکا
دیکھ اُس کو ہو گئے ہیں کیا کیا کشیدہ مردم

جب بھی کچھ اپنے کنے رکھتے تھے تب بھی صرف تھی لڑکوں کا
اب جو فقیر ہوئے پھرتے ہیں میر انھیں کی دولت ہے

لڑکا عطار کا ہے کیا معجون
ہم کو ترکیب اُس کی بھائی ہے

اڑاتا گڈی وہ باہر نہ آوے
مبادا مجھ کو بھی گڈا بنا دے

عاشق ہو تو رسا بچگاں پر تا کیفیت حاصل ہو
اور کشور کار جو چاہو پیر مغاں کو پیر کرو

ہندو بچوں سے کیا معیشت ہو
یہ کبھو انگ دان دیتے ہیں

حرف شناس نہ تھے جب تم تو بے پرسش تھا بوسۂ لب
ایک اک بات کی مشتاقوں سے سو سو اب تکراریں ہیں

صحبت میں اُس کی کیونکہ رہے مرد آدمی
وہ شوخ و شنگ و بے تہ و اوباش و بدمعاش

کیا شیریں ہے حرف و حکایت حسرت ہم کو آتی ہے
ہائے زباں بھی اپنی ہووے یکدم اُس کے دہن کے بیچ

شب اُس کو میں نے دیکھا سوتے بغل میں اپنے
اس خواب کی نہ کرنی تعبیر ہے مناسب

مختلط ترسا بچوں سے شیرہ خانے میں رہا
کن نے دیکھا مسجدوں میں میر کافر کیش کو

غریبوں کی تو پگڑی جا ہے تک لے ہے اترواتو
مجھے اے سیم بر لے بر میں جو زردار عاشق ہو

گرچہ ملتے ہیں بخنگ غیرت مہ یہ لڑکے
دل جگر دونوں کو یکلخت جلا دیتے ہیں

ناسازی طبیعت کیا ہے جواں ہوئے پر
اوباش وہ ستم گر لڑکا ہی ہے لڑاکا

گو خطِ اُس کے پشت لب کا زہر ہو
بوسۂ کنج دہن تریاق ہے

سماجت جو کی بوسۂ لب پر تو بولا
نہیں خوب یہ مار کھانے کی باتیں

کھول کر بال سادہ رو لڑکے
خلق کا کیوں دبال لیتے ہیں

وہ سیم تن ہو ننگا تو لطف تن پر اُس کے
سو جی کئے ہیں صدقے اک جان وہاں کیا ہے

لڑکے دلی کے تیرے ہاتھ میں کب آئے میر
پیچھے ایک ایک کے سو سو پھریں ہیں ڈاگ گے

بھیڑیں گئیں اُس ابروئے خمدار کے ہلے
لڑکوں میں کیا اُس اوباش نے تلوار چلائی

اک خلق تلاشی ہے تم ہاتھ نہیں لگتے
لڑکے تو ہو پہ سب کو بالا ہی بتاتے ہو

مستم ہیں قہر ہیں لونڈے شراب خانے کے
اتار لیتے ہیں عمامہ ہر نمازی کا

کس طرح اُن سے کوئی گرم ملے
سیم تن پگھلے جاتے ہیں جوں رانگ

سمجھے نہ کہ بازیچۂ اطفال ہوئے
لڑکوں سے ملاقات ہی نادانی ہے

باہم ہوا کریں ہیں دن رات نیچے اوپر
یہ نرم شانے لونڈے ہیں مخمل دو آبا

کیا لڑکے دلی کے ہیں عیار اور نٹ کھٹ
دل لیں ہیں یوں کہ ہرگز ہوتی نہیں ہے آہٹ

دلی کے کج کلاہ لڑکوں نے
کام عشاق کا تمام کیا

کوئی عاشق نظر نہیں آتا
ٹوپی والوں نے قتل عام کیا

جنس بازار میں ہے تجھ سی متاع
بھیڑ ہی رہتی ہے دکانوں پر

کجی اوباش کی ہے وہ در بند
ڈالے پھرتے ہیں بند شانوں پر

پیسوں پر دیکھتے ہیں یہ لڑکے
عشق سیمیں تناں کو زر ہے شرط

میر تقی میر کا ہزل، تمسخر اور فحش بھی اُن کی شخصیت کے اسفل پہلو کی نشان دہی کرتا ہے

لذتِ دنیا سے کیا بہرہ ہمیں
پاس ہے ہر رنڈی وہلے ہے ضعف باہ

شیطنت سے نہیں ہے خالی شیخ
اُس کی پیدائش احتلام سے ہے

کچھ بھی نسبت نہ تھی جب دیر سے تب کیا تھا شیخ
ہم حرم میں بھی رہے تو تیرے داماد رہے

صحبت سے اس جہاں کی کوئی خلاص ہوگا
اس فاحشہ پہ سب کو امساک ہو گیا ہے

گدھا سا لدا پھرتا ہے شیخ ہر سو   کہ جبہ ہے اک بار و عمامہ سربار

کچھ کم نہیں ہیں شعبدہ بازوں سے میکشاں   دارو پلا کے شیخ کو آدم سے خر کیا

عمامہ ہے موذنِ مسجد کہ بارِ خر   قد تو ترا خمیدہ ہو محراب سا ہوا

شیخ کی سی ہی شکل ہے شیطان   جس پہ شب احتلام ہوتا ہے

داڑھی سفید شیخ تو مت نظر میں کر   بگلا شکار ہو وے ہے تو لگتے ہیں ہاتھ پر

کیا تم کو پیار سے وہ اے میرؔ منہ لگاوے   پہلے ہی چومے تم تو کاٹو ہو گال اس کا

بہکے جو ہم مست آ گئے سو بار مسجد سے اٹھا   واعظ کو مارے خوف کے کل لگ گیا جلاب سا

شورِ قلقل کی ہوتی تھی مانع   ریش قاضی پہ رات میں تھوکا

شیخ مت رو کش ہو مستوں کا تو اس ہنگامے پر   لینے اینٹھنے کو ڈھیلا تیری ٹل جاتی ہے ناف

حد سے زیادہ واعظ یہ کودنا اچھلنا   کاہے کو جاتے ہیں ہم اے خرس اب بند حا رو

تو شملا جو رکھتا ہے خصمی ہے دگرنہ   ضرورت ہے کیا شیخ دُم اک وجب کی

شیخ جو ہے مسجد میں ننگا رات کو تھا میخانہ میں   جبہ، خرقہ، ٹوپی سب کچھ مستی میں انعام کیا

یہ جانتا تو اس سے ہم خواب میں نہ ہوتا   بچا خیال جی کا ایسا خیال اس کا

میر تقی میر کی منقسم شخصیت اُن کی بد دماغی اور ذلت پسندی کے تضاد میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ میرؔ کو تنک مزاج، متکبر اور بد دماغ کہا گیا ہے۔ وہ خود بھی اس کا اعتراف کرتے ہیں ؎

صحبت کسی سے رکھنے کا اس کو نہ تھا دماغ   تھا میرؔ بے دماغ کو بھی کیا ملا دماغ

تری چال ٹیڑھی تری بات روکھی   تجھے میرؔ سمجھا ہے یاں کم کسو نے

دوسری طرف شاعری میں وہ اپنے آپ کو اذیت پسندانہ حد تک حقیر و ذلیل کر دکھاتے ہیں۔ کبھی وہ اپنے محبوب کے تلوے آنکھوں سے سہلاتے ہیں، کبھی اس کے آستانے پر سر رگڑتے ہیں، کبھی اس کے کتے کی صحبت پر فخر کرتے ہیں، کبھی ذلت کے مزے لوٹتے ہیں ؎

مزے کو عشق کی ذلت کے جانتا ہے وہی   کسو کی جس نے کبھی لات ٹک کھائی ہو

سر رگڑتے اس آستاں پہ میرؔ   یاری کرتے اگر ہمارے نصیب

مت سگِ یار سے دعوائے مساوات کرو   اس کنے بیٹھنے پاؤ تو مباہات کرو

جب دیکھتے ہیں پاؤں ہی دابو ہو اس کے میرؔ   کیوں ہوتے ہو ذلیل تم اتنا تو مت دبو

گود میں رکھ دیتا ہے میری پاؤں حنائی دینے کو   یوں پامال جو میں ہوتا ہوں مجکو بھی تو دب سی ہے

یہ نہیں میں جانتا نسبت ہے کیا آپس میں لیک   آنکھیں ہو جاتی ہیں ٹھنڈی انجیا کے تلوؤں سے ملے

پاؤں سر پہ رکھنے کی مجکو رخصت دی تھی میر ان نے   کیا پوچھو ہو سر پر میرے منت سی منت ہے اب

وہ دن کیسے جاتے ہیں جو آ کر سوتے پاتے کبھو   آنکھوں سے ہم سہلا سہلا تلوے اس کو جگاتے تھے

بعض ناقدین نے میر تقی میر کے کلام پر المیہ کا اطلاق کیا ہے جو المیہ کے مفہوم سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ المیہ میں انضباط (RESTRAINT) سے تاثیر پیدا ہوتی ہے جیسا کہ یونان قدیم کے تمثیل نگاروں اور احیاء العلوم کے عہد کے فرانسیسی اور انگریز المیہ نگاروں کی تمثیلوں سے ظاہر ہے۔ ہائے وائے

نالہ و بکا، بین کرنا، چھاتی کوٹنا، سر پیٹنا، پچھاڑیں کھانا المیہ کے منافی ہے کیونکہ رقیق جذباتیت مضحکہ خیز (BATHETIC) صورت اختیار کر لیتی ہے جس سے المیہ کا وقار مجروح ہو جاتا ہے۔ اس کی عام فہم مثال یہ ہے کہ ایک شخص اپنے کسی عزیز کی موت پر چیخ چیخ کر رونے اور دیوار سے سر پھوڑنے لگے تو دیکھنے والے چنداں متاثر نہیں ہوتے لیکن وہ باوقار انداز میں چپ چاپ غم و الم کی تصویر بنا بیٹھا ہو تو عزاداروں کی آنکھیں بے اختیار بھیگ جاتی ہیں۔ میر تقی میر اظہار غم میں بسا اوقات رقیق جذباتیت سے کام لیتے ہیں اور اس قدر غلو کرتے ہیں کہ طبیعت مکدر ہو جاتی ہے۔ اس نوع کے کلام کو اُن کی عامیانہ شخصیت سے منسوب کیا جا سکتا ہے ؎

دل جو تھا اک آبلہ پھوٹا گیا
رات کو سینہ بہت کوٹا گیا

گر نوچ لیا منہ کو گئے کوٹ لی چھاتی
دل تنگیِ ہجراں سے اس مغلوب غضب ہم

چھاتی کوٹی منہ نوچا سر دے دے مارا پتھر پر
دل کے خون ہوئے ہیں ہمارے یہی طریق ہے ماتم کا

کیا برچھیاں چلائیں آہوں نے نیم شب کی
رخنے ہیں آسمان میں سارے نہیں ستارے

آستینیں رکھتے رکھتے دیدۂ خونبار پر
حلق بسمل کی طرح لوہو کے فوارے ہوئے

جوش مارا اشک خونیں نے مرے دل سے زبس
گھر میں ہمسایوں کے شب لوہو کے پرنالے پڑے

انھیں گلیوں میں جب روتے تھے ہم میر
کئی دریا کی دھاریں ہو گئی ہیں

دامانِ کوہ میں جو میں دھاڑ مار رویا
اک ابر واں سے اُٹھ کر بے اختیار رویا

کبھو جو آنکھ سے چلتے ہیں آنسو
تو بھر جاتا ہے پانی سب زمیں پر

گزرے ہے لہو واں سر ہر خار سے اب تک
جس دشت میں پھوٹا ہے مرے پاؤں کا چھالا

میر تقی میر بار بار اپنے دل کو پکتا ہوا پھوڑا کہتے ہیں جس سے گھن آنے لگتی ہے۔ ۸

پھوڑا سا ساری رات جو پکتا رہے گا دل
تو صبح تک تو ہاتھ لگایا نہ جائے گا

تھا دل جو پکا پھوڑا بسیاری الم سے
دکھتا گیا وو چنداں جوں جوں دوا لگائی

ایسا نہ ہو کہ چھیڑے یک بار پھوٹ بہیئے
ہم پکے پھوڑے کی اب مانند بھر رہے ہیں

ان چار دن سے ہوں میں افسردہ کچھ وگرنہ
پھوڑا سا دل بغل میں برسوں جلا کیا ہے

دل نے کیا کیا نہ رات درد لیئے
جیسے پکتا رہے کوئی پھوڑا

میر کی منقسم شخصیت کے دونوں پہلوؤں میں تمام عمر کشمکش جاری رہی جس نے انھیں مردم بیزار، سنکی اور کم آمیز بنا دیا۔ اس کشمکش کی تہ میں مجروح پدری نصب العین تھا۔ میر تقی میر اپنے پاک منش باپ کے نقشِ قدم پر چلنا چاہتے تھے اور پدری نصب العین کو پا لینے کے آرزو مند تھے لیکن اُن کی شوریدہ سری، آشفتہ طبعی، اور ہوسناکی انھیں غلط راہوں پر ڈال دیتی تھی۔ جب پدری نصب العین ان کے پیشِ نظر ہوتا تو وہ جذبۂ صدق و صفا سے سرشار ہو جاتے۔ اسی عالم میں انھیں پہلے عشق کا تجربہ ہوا جو بعد میں ان کی اعلیٰ نوع کی شاعری کا ماخذ و مبدء بن گیا لیکن اس کے ساتھ ہوا و ہوس اور کج روی نے کبھی انھیں چین سے بیٹھنے نہیں دیا۔ سٹیونسن کے الفاظ میں ڈاکٹر جیکل امن اور آشتی کی زندگی بسر کرنا چاہتا تھا لیکن اُس کے اندر چھپا ہوا مسٹر ہائڈ اسے پریشان کرتا رہتا تھا۔ اس کشمکش میں فتح بالآخر مسٹر ہائڈ ہی کی ہوتی۔ یہی المیہ میر تقی میر کا بھی ہے۔ ان کے ذہن و قلب میں پاک مشربی و ہوسناکی کے مابین کشمکش جاری رہی جس میں ہوسناکی حریف غالب ثابت ہوتی رہی لہٰذا میر تقی میر کا "غایت بلند" اُن کے "غایت پست" کا عشر عشیر بھی نہیں ہے۔

اقبال، اقبالیات اور ہم

سلیم احمد

اقبال کے بارے میں ہماری تنقید دل میں چور رکھ کر بات کرنے کی عادی ہو چکی ہے۔ اس کی وجہ کچھ اقبال میں ہے کچھ ہمارے ماحول میں اور کچھ خود ہمارے اندر۔ اقبال ہمارے ماضی قریب کی عظیم ترین علمی، فکری اور سیاسی شخصیتوں میں سے ایک ہیں۔ ان کی شاعری اردو کے شعری سرمائے سے الگ ایک ایسی روایت کی شاعری ہے جو فارسی میں تو موجود ہے لیکن اردو میں ایک دوسری دنیا کی آواز معلوم ہوتی ہے یعنی فلسفیانہ افکار کی شاعری۔ اس کے علاوہ وہ مشرق و مغرب کے فلسفوں سے آگاہ اور عہد حاضر کے علوم و مسائل سے باخبر ایک ایسی شخصیت ہیں جن کی نظیر جدید مشرق میں مشکل سے ملتی ہے۔ پھر وہ ایک ایسے تہذیبی اور سیاسی نظریے کے بانی ہیں جس نے ایک ملک کو جنم دیا ہے اور ان کی یہ حیثیت ایسی ہے جو تاریخ عالم میں کسی شاعر یا مفکر کو حاصل نہیں ہوئی۔ تاریخ کوئی ایک مثال بھی ایسی پیش نہیں کر سکتی جس میں کسی مفکر کے سیاسی تصور نے اتنی قلیل مدت میں ٹھوس حقیقت کی شکل اختیار کر لی ہو۔ یہ سب باتیں ہمیں اقبال کی شخصیت سے اتنا مرعوب کر دیتی ہیں کہ ہم ان پر سوچنے کا کام اقبال اکیڈمی کے سپرد کر کے، رسمی طور پر ان کی تعریف کر کے مطمئن ہو جاتے ہیں اور ہر سال ایسے مضامین کی تعداد بڑھتی جاتی ہے جن میں چبائے ہوئے نوالوں کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ ہم اقبال پر باتیں کرتے ہیں مگر اس طرح جیسے ہمارا دل ان میں نہ ہو۔ اقبال پر سچائی سے کچھ نہ سوچنے کی روایت ہمارے ماحول سے اور تقویت پاتی ہے۔ ایک طرف تو اقبال کی سیاسی حیثیت کی وجہ سے ہمارے دل میں یہ خوف بیٹھ گیا ہے کہ اقبال پر سوچنا ایک خطرناک بات ہے۔ کیونکہ خیال بہرحال ایک آزادی کا طالب ہوتا ہے۔ اس کے وجود کی پہلی شرط ہی یہ ہے کہ وہ پہلے سے کسی نتیجہ کا پابند نہیں کیا جا سکتا۔ سوچنے کے معنی اختلاف کرنے کی آزادی کے ہیں۔ خواہ انجام کار ہم اختلاف کرنے کے بجائے اتفاق ہی کریں۔ خیال ہمیشہ دو دھاری تلوار کی طرح ہوتا ہے جس کے دونوں رخ آزادانہ طور پر کھلے ہوتے ہیں۔ ہم اس تلوار کو استعمال کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں نہ ہمت۔ چنانچہ ہمیں اپنی عافیت اسی میں نظر آتی ہے کہ ہم اقبال پر خود غور کرنے کے بجائے ان کے بارے میں دوسروں کی سنی سنائی کو دہراتے رہیں۔ پھر سیاست کی مصلحت تو ایک بات ہوئی۔ ستم بالائے ستم تو یہ ہوا ہے کہ اقبال جیسی آفاقی شخصیت کو ایک مخصوص علاقے سے اس طرح وابستہ کر دیا گیا ہے کہ اقبال کی شخصیت اس مخصوص علاقے کے سیاسی مفادات کی ایک علامت بن گئی ہے۔ اقبال کے معنی ہوتے ہیں پنجاب۔ اور پنجاب کے اسلام اور اردو کی طرح پنجاب کے اقبال کو بھی پنجاب کی سیاسی اور معاشی بالادستی کا مظہر سمجھا جاتا ہے۔ مشرقی پاکستان میں اقبال کے خلاف ردعمل کی وہ شکل جو پہلے نذرالاسلام کو آگے بڑھانے میں ظاہر ہوئی اور پھر ضدم ضدا کے طور پر ٹیگور پرستی تک پہنچی اس کے پیچھے یہی خطرناک تصور کام کر رہا تھا۔ حالانکہ نذرالاسلام اور اقبال کا مقابلہ سورج اور چراغ کے مقابلے سے بھی زیادہ مضحکہ انگیز چیز ہے۔ بعد میں سندھ میں بھی بعض ایسے رجحانات ظاہر ہوئے جن میں پنجاب دشمنی کا اظہار اقبال دشمنی کی شکل میں کیا گیا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اصل چیز اقبال نہیں ہیں پنجاب ہے۔ یا تو ہم پنجاب کے ڈر سے اقبال کے بارے میں چپ سادھ لیتے ہیں یا پھر پنجاب کے ساتھ اقبال کو بھی رد کر دیتے ہیں۔ ایک ایسی قوم جس نے اقبال جیسی شخصیت کو پیدا کیا ہو، اپنے ساتھ اس سے بڑا ظلم اور کیا کر سکتی ہے۔ خوف اور نفرت ہمیشہ ایک ساتھ پیدا ہوتے اور پروان چڑھتے ہیں۔ اقبال کے بارے میں پنجاب سے ڈر کر ہم نے اقبال سے نفرت کرنی سیکھی ہے محبت کرنی نہیں سیکھی۔ ایک اور تیسری چیز جو ہمیں اقبال کے بارے میں آزادانہ طور پر سوچنے سے روکتی ہے ادبی تنقید کے بارے میں ہمارا رویہ ہے۔ بنیادی طور پر ہماری روایت تقریظوں کی روایت ہے یا پھر ہجویات کی۔ تنقید کے بارے میں ہمارا پہلا سوال یہ ہوتا ہے کہ مخالفت میں لکھا گیا ہے یا

موافقت میں یا ہم اختلاف کو مخالفت سمجھتے ہیں اور اتفاق کو موافقت۔ ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ ادبی پرکھ کا کام مخالفت یا موافقت سے مختلف کام ہے اور تنقید کے معنی ہرگز مداحی یا قدحی کے نہیں ــــ اقبال کے بارے میں ہم ابھی مداحی کے رویے سے آگے نہیں بڑھے ہیں جبکہ اندر ہی اندر ہم مخالفت سے بھی زیادہ ایک خطرناک رجحان کا شکار ہو رہے ہیں یعنی لاتعلقی کا۔ مخالفت میں ہم کم ازکم اس چیز کے بارے میں سوچتے تو ہیں جس کی مخالفت کرتے ہیں بلکہ زیادہ زور لگا کر سوچتے ہیں لیکن لاتعلقی؟ اقبال جیسی شخصیت سے لاتعلق ہو کر ہم اپنے انفرادی اور اجتماعی وجود کے کن کن حصوں سے لاتعلق ہو جائیں گے یہ بات شاید ہمارے ذہن میں بھی نہیں آتی۔ اس سلسلے کی آخری بات یہ ہے کہ اقبال پر کچھ سوچنے کی اہلیت ہمارے اندر اس لئے مفقود ہوتی جا رہی ہے کہ ہم خود اپنے بارے میں کچھ سوچنے کی صلاحیت سے محروم ہو گئے ہیں۔ ہم اقبال کے موضوعات پر بات کرتے ہیں، اُن کے خیالات کو دہراتے ہیں مگر اپنے آپ سے یہ سوال کبھی نہیں پوچھتے کہ ان خیالات کا ہم سے، ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی سے کیا تعلق ہے اور اقبال کا تجربہ ہمارے لئے کوئی معنی رکھتا ہے یا نہیں۔ اس طرح اقبال کے خیالات اور تجربات ہمارے خونِ گرم کا حصہ نہیں بنتے اور ہم ان کے بارے میں صرف باتیں بنا کر رہ جاتے ہیں۔

اقبال کے بارے میں سب سے زیادہ لاتعلقی اس طبقے میں پائی جاتی ہے جسے اقبال سے سب سے زیادہ تعلق ہونا چاہیئے تھا یعنی تخلیقی فن کار۔ اردو شاعری کی روایت میں کم و بیش تمام اہم شعراء کے اثرات موجودہ شاعروں تک پہنچے ہیں۔ میر تو بدنامی کی حد تک اتباعِ میر کا شکار ہوئے۔ غالب کا سلسلہ بھی رضا علی وحشت سے فانی اور پھر وہاں سے عزیز حامد مدنی تک پہنچتا ہے۔ داغ کا رنگ ایک زمانے میں پورے ہندوستان کا رنگ تھا۔ اب بھی ان کا سلسلہ نسب سیف الدین سیف تک جاری رہتا ہے۔ آتش، شاد عظیم آبادی اور یگانہ سے گذرتے ہوئے سجاد باقر رضوی اور لاہور کے بعض اور شعراء تک پہنچ جاتے ہیں۔ سودا کا رنگ سخن بھی بالآخر فیض کی غزلوں میں زندہ ہوتا نظر آتا ہے۔ لیکن اقبال کا سلسلہ نسب اس طرح منقطع ہوا ہے جیسے اقبال کی آواز ان کے بعد کے شعرا کی سماعت تک ہی نہ پہنچی ہو۔ اسد ملتانی اور امین حزیں سیالکوٹی کا تو نام لینا بھی فضول ہے۔ لیکن ناصر کاظمی تک اقبال کی طرف سے چل کر میر کی گود میں جا بیٹھے اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہم اقبال سے مرعوب کتنے ہی ہوئے ہوں، لیکن ہمارے شعراء کے تخلیقی وجدان نے اقبال کے اثرات قبول نہیں کئے۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور بات یہ بھی دیکھنے کی ہے کہ ہمارے اہم ترین نقادوں نے اقبال کی طرف اس طرح توجہ نہیں کی جس طرح ہونی چاہیئے تھی۔ مثال کے طور پر فراق صاحب نے اقبال پر دو چار فقروں سے زیادہ نہیں لکھا۔ یہی حال عسکری صاحب کا ہے۔ مجنوں صاحب اور رشید احمد صدیقی صاحب نے اقبال پر ضرور لکھا ہے۔ لیکن اقبال پر ان کی تحریروں کی حیثیت اتنی بھی نہیں ہے جتنی یوسف حسین اور عزیز احمد کی ہے۔ اقبال پر زیادہ تر لکھنے والے ایسے لوگ رہے ہیں جنھیں اردو ادب کچھ زیادہ عزت اور وقعت کے ساتھ نہیں پہچانتا ہے اور اگر ہم سنجیدگی کے ساتھ اپنے آپ سے پوچھیں کہ اقبال پر اردو میں کیا لکھا گیا تو جواب شرمندگی کے ساتھ معذرت ہی میں برآمد ہوتا ہے۔ خیر نقادوں کی بات چھوڑیئے اور صرف یہ دیکھئے کہ ہمارے شاعروں میں سے کتنے لوگوں نے اقبال کے تخلیقی تجربے کو سمجھنے کی کوشش کی ہے ان سب باتوں سے زیادہ تشویش انگیز بات جو مجھے نظر آتی ہے یہ ہے کہ ہم نے اقبال پر بات کرنی بھی چھوڑ دی ہے۔ مجھے کچھ ایسا لگتا ہے جیسے عام طور پر شعرا جب شاعری پر بات کرتے ہیں یا اس کے بارے میں اپنے تصورات اور تجربات پیش کرتے ہیں تو اقبال کو اس سے خارج کر دیتے ہیں۔ ان باتوں کے پیچھے ایک ایسے خیال کی جھلک محسوس ہوتی ہے جس کو شعور کی روشنی میں لے آنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہ خیال کچھ اس قسم کا ہے ـــــ اقبال کی شاعری ایک خاص قسم کی شاعری ہے جو اس شاعری سے مختلف ہے جو جذبات و محسوسات سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ مقصدی اور پیغامی شاعری ہے یا دوسرے لفظوں میں شعوری شاعری جو اس شاعری سے کمتر ہوتی ہے جسے ہم جذبات و محسوسات سے پیدا کرتے ہیں یا لاشعور کی مدد سے وجود میں لاتے ہیں۔ یہ بات اگر صاف طور پر نہیں کہی جاتی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سوچی بھی نہیں جاتی ہے۔ سوچی یقیناً جاتی ہے بس ہم شعوری یا لاشعوری طور پر احتیاط کرتے ہیں کہ شاعری کے بارے میں اپنے تصورات پیش کرتے ہوئے اقبال سے آنکھیں چرا لیتے ہیں۔ مجھے اس بات پر کوئی اعتراض نہیں ہے کہ ہم شاعری کو کوئی خاص تصور کیوں رکھتے ہیں۔ ہر شاعر کو حق ہے کہ وہ شاعری سے جو کچھ سمجھتا ہے سمجھے لیکن شاعری کے بارے میں کوئی تصور ہم اقبال جیسے شاعر سے ہم اپنا حساب کتاب صاف کئے بغیر کیسے قائم کر سکتے ہیں۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ ہم اقبال پر اس لئے بات نہیں کرتے کہ ہم اقبال سے اپنا حساب کتاب صاف کرتے ہوئے ڈرتے ہیں نتیجہ ذہنی بے چینی

ابھی کہہ چکا ہوں۔ اقبال سے تخلیقی فن کاروں کی دلچسپی کم سے کمتر ہوتی جا رہی ہے اور اس کے ساتھ ہی ہمارے فنی نظریات بھی تیزی سے زوال پذیر ہوتے جا رہے ہیں۔

اقبال پر اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا نوے فیصدی حصہ اقبال کے خیالات اور نظریات کی تشریحات پر مشتمل ہے۔ ان تحریروں میں دو بنیادی نقائص پائے جاتے ہیں۔ پہلا نقص یہ کہ یہ تحریریں عموماً اقبال کی شاعری کو زیر بحث نہیں لاتی ہیں۔ دوسرا نقص یہ کہ ان میں اقبال کے خیالات و نظریات کو بنی بنائی چیزوں کی طرح پیش کیا جاتا ہے۔ یہ دوسری بات ذرا تشریح طلب ہے۔ اقبال کے خیالات (اگر یہ خیالات ان کی شاعرانہ شخصیت سے الگ کوئی چیز ہیں بھی تو) اقبال کے وجود کا حصہ ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اقبال کے خیالات اقبال کے تجربات سے پیدا ہوئے ہیں۔ ان خیالات کے پیچھے گوشت پوست کے انسان کا وجود ہے جس کی حسی، جذباتی اور ذہنی زندگی ان خیالات میں ظاہر ہوتی ہے۔ ہم ان خیالات کو اس طرح نہیں دیکھ سکتے۔ جیسے یہ اقبال سے الگ وجود رکھتے ہوں اور انھیں اقبال نے اس طرح استعمال کر لیا ہو جس طرح ہم بازار سے خریدی ہوئی بنی بنائی چیزوں کو استعمال کرتے ہیں۔ یہ خیالات اقبال ہی کی زندگی کا حصہ ہیں اور انھیں کی زندگی سے وجود میں آئے ہیں اس لئے اقبال کے خیالات کو اقبال کی انفرادیت سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اب میرا اعتراض دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ اقبال کے تقریباً سارے شارحین، اقبال کے خیالات کی عمومیت کو تو ظاہر کرتے ہیں لیکن ان کی انفرادیت کو نظر انداز کر دیتے ہیں حالانکہ ادبی تنقید کے لئے سب سے زیادہ اہم چیز یہی انفرادیت ہے۔ اس کے علاوہ ان خیالات کو ان کے مخصوص زمانی اور مکانی پس منظر سے الگ کر کے دیکھنا اور بنی بنائی صداقتوں کے طور پر پیش کرنا بھی ان خیالات کو ان کی زندگی سے محروم کر دینے کے مترادف ہے۔ اب اس سے بھی آگے بڑھ کر میں یہ بات کہوں گا کہ یہ خیالات اگر ہمارے لئے کچھ اہمیت رکھتے ہیں تو اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کے ذریعے اقبال نے بڑی شاعری پیدا کر کے دکھائی ہے یعنی ان خیالات کی اہمیت اقبال کی شاعرانہ شخصیت سے الگ کر کے نہیں متعین کی جا سکتی۔ یہ یا اسی قسم کے دوسرے خیالات پست درجے کی شاعری پیدا کر سکتے ہیں یا اس سے بھی گر کر غیر شاعری کا آلۂ کار بن سکتے ہیں۔ اس لئے اقبال کے خیالات کی اہمیت ان کی شاعرانہ قدر و قیمت میں ہے اور آخری تجزیے میں انھیں کسی طرح بھی اقبال کی شاعری سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ ان معنوں میں اقبالی تنقید بیشتر تنقید کے منصب سے گری ہوئی چیز ہے کیونکہ اس کے دونوں نقائص ایک ہی بنیادی نااہلی سے پیدا ہوئے ہیں یعنی اقبال کو شاعر کی حیثیت سے دیکھنے کی عدم صلاحیت۔ اقبال حکیم الامت تھے۔ اقبال مفسر قرآن تھے۔ اقبال اشتراکیت کے حامی تھے۔ اقبال نیشنلزم کے پرستار تھے ـــــ اقبال اپنی زندگی کے مختلف حصوں میں یہ سب کچھ تھے اور اس سے کچھ اور بھی ہو سکتے تھے۔ لیکن اقبال اگر شاعر نہیں تھے تو کچھ نہیں تھے یہ پہلا سبق ہے جو اقبالیات کو سیکھنا ہے اور اس کی عدم موجودگی وہ چیز ہے جو ادبی نقطۂ نظر سے ساری اقبالیات کو رد کر دینے کا تقاضا کرتی ہے۔ ہم اقبال کے فلسفے، اقبال کے خیالات کو سمجھنے کی کوشش بہت کر چکے، اب ہمیں اقبال کی شاعرانہ واردات کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

ہم اقبال کو اب تک باہر سے دیکھنے کی کوشش کرتے آئے ہیں، اقبال نے خودی اور بے خودی کے بارے میں کیا لکھا ہے۔ اقبال عشق اور عقل کے بارے میں کیا کہتے ہیں، جمہوریت اور اشتراکیت کے بارے میں اقبال کا کیا نظریہ ہے؟ لیکن اقبال کے خیالات کا خود اقبال کے وجود سے کیا تعلق ہے اس کے بارے میں ہم نے کبھی ایک لمحہ بھی سوچنے کی ضرورت محسوس نہیں کی ہے۔ آخر وہ کیا انسان تھا جسے نہ وصل نے شاد کیا نہ ہجر نے ناشاد۔ جو نہ کسی ساعد سیمیں کو ہاتھوں میں لے کر چھوڑ دینے پر پچھتایا، نہ کسی کو لب بام پر زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کئے ہوئے دیکھ کر ہوسناک ہوا جس نے نہ کبھی شب وصل غیر کاٹنے کی داد طلب کی۔ نہ داغ وارفتہ کی طرح کسی کوچے سے کھینچ کر لایا گیا۔ وہ بیتاب ہوا تو قوم کے غم میں۔ نغمہ سرائی پر آمادہ ہوا تو سورج کو مشرق سے ابھرتا پا کر۔ رویا تو جنگ طرابلس کے شہیدوں پر، ہنسا تو فرنگ کو دہ گز ریل بے پناہ میں دیکھ کر۔ یہ آدمی ایسا کیوں تھا؟ اور ہم ایسے کیوں نہیں ہیں؟ اور وہ اگر ایسا تھا تو یہ کوئی اچھی بات تھی یا بری؟ اور ہم ایسے نہیں ہیں تو یہ فخر کا مقام ہے یا شرمندگی کا؟ ہم اقبال کو بھی اندر سے نہیں دیکھتے اور خود کو بھی۔ ہم نہ اقبال کے اقبال ہونے کے معنی پر غور کرتے ہیں۔ ہم اقبال کی شاعری کو کتبوں میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں اور اقبال کی شخصیت کو مجسموں میں۔ مجسمے بھی وہ جنھیں غیر ملکی سیاحوں کے لئے قومی شاہراہوں پر نصب کیا جائے۔ دوسرے لفظوں میں ہم اقبال کو دکھانے کی چیز سمجھتے ہیں۔ ہم اسے اس کی ظاہری سطح پر دیکھتے ہیں اور اپنے وجود کی سب سے اصلی

سطح سے اس کا رابطہ قائم کرتے ہیں اور شاید ہمارے دل میں یہ چور بھی موجود ہے کہ اقبالؔ نے اپنے اصلی مسائل (جن کا قیاس ہم اپنے مسائل پر کرتے ہیں) کو چھوڑ کر شاعری کی ہے۔

اقبالؔ کے مسائل وہ کیوں ہیں جو وہ ہیں؟ اسے ہم اقبالؔ اور ان کے دَور کو سمجھے بغیر نہیں سمجھ سکتے۔ اقبالؔ کے دَور کو سمجھنے کی کوشش اقبالیات کے نسبتاً بہتر حصوں میں کہیں کہیں مل جاتی ہے لیکن اس دَور نے اقبالؔ کو جس طرح متاثر کیا، مثال کے طور پر فانیؔ کو متاثر کیوں نہیں کیا، اس کا جواب شاید آسان نہ ہو۔ دَور ہمیشہ افراد میں ظاہر ہوتا ہے اور فرد کا شعور دَور کے ظہور کی لازمی شرط کی حیثیت رکھتا ہے۔ اقبالؔ کا دور اقبالؔ کے شعور میں ظاہر ہوا ہے اس لئے اصل چیز اقبال کا شعور ہے۔ اقبال کا شعور، اقبالؔ کا تخیل، اقبالؔ کے مخصوص تجربات۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو اقبال کو اقبالؔ بناتی ہیں۔ اس لئے اقبالؔ کے مسائل کو سمجھنے کے لئے ہمیں ان سب چیزوں کا تجزیہ کرنا چاہئے۔ اقبالیات کی سب سے بڑی کمزوری تجزیہ کی عدم صلاحیت ہے۔ ہمیں یہاں تجزیہ کے بجائے بیانات ملتے ہیں اور بیانات بھی ایسے جو صرف سطح کو ظاہر کرتے ہیں، گہرائی کو نہیں۔ اور جنھیں ایک بار دیکھ کے دوبارہ دیکھنا تضیعِ اوقات کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ ہم اقبالؔ کے خیالات کو الگ دیکھتے ہیں۔ اقبال کی زندگی کو الگ، اور اس زندگی سے بھی اس کے انسانی پہلوؤں کو خارج کر دیتے ہیں۔ جبکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ اقبالؔ کے خیالات کو اقبالؔ کی زندگی کی روشنی میں دیکھا جائے اور اقبالؔ کی زندگی کو اقبال کے خیالات کی روشنی میں۔ ان دونوں کو ملا کر ہی ہم اقبالؔ کو ـــــ پورے اقبال کو۔ اس طرح سمجھ سکتے ہیں جس طرح سمجھنا اقبالؔ کے تخلیقی مطالعہ کے لئے ضروری ہے۔

کسی بھی شاعر کی حقیقی قدر و قیمت کا تعین اس کی زبان اور اس کی تہذیبی روایات کے اندر رہ کر ہی ممکن ہوتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ہم اسے اس پوری روایت کے ارتقا کی روشنی میں دیکھتے ہیں، جو اس کی زبان میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس لئے شاعری کا مطالعہ ہمیشہ تقابلی مطالعہ ہوتا ہے۔ کسی شاعر کو اس کی زبان اور تہذیب کی پوری روایت سے الگ کر کے دیکھنے سے ہمیشہ بُری تنقید پیدا ہوتی ہے ـــــ ایک ایسی تنقید جو ذوقِ سلیم کی تربیت کے بجائے اسے گمراہ کرتی ہے۔ اس کے علاوہ ایسی تنقید اس لئے بے معنی ہوتی ہے کہ خود اپنے موضوع کے تقاضے کو پورا نہیں کر سکتی۔ یعنی شاعر کی انفرادیت کے تعین سے قاصر رہتی ہے، جو شاعری کا اولین مسئلہ ہے، کیونکہ انفرادیت ہمیشہ دوسروں کے تقابل ہی میں ظاہر ہوتی ہے۔ اقبالیات میں اقبالؔ کا مطالعہ بیشتر اس طرح کیا جاتا ہے جیسے وہ اپنی زبان اور تہذیب کی روایت سے الگ تھلگ ایک جزیرے کی حیثیت رکھتے ہوں ـــــ میری نظر سے اب تک کوئی تحریر ایسی نہیں گزری جس میں اقبالؔ کو اُردو یا فارسی کے بڑے شعرا کے ساتھ رکھ کر دیکھنے کی کوشش کی گئی ہو۔

ہمیں اقبالؔ کی شاعری میں اُن کے انسان کو تلاش کرنا ہے۔ ہم انہیں فلسفی کی حیثیت سے، مسلمان اور مسلم لیگی کی حیثیت سے بہت دیکھ چکے۔ اب ہمیں گوشت پوست کے اس وجود کو ڈھونڈنا ہے جو ہماری ہی طرح دکھ اُٹھاتا تھا، ہماری ہی طرح خوف اور اندیشوں میں مبتلا ہوتا تھا، ہماری ہی طرح امید اور آرزو سے تڑپتا تھا اور سب سے زیادہ ہماری ہی طرح تنہا اور ٹوٹا ہوا تھا۔ ہم جب اس انسان کو اس کے زندہ اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ، اس کی آرزوں اور امنگوں کے ساتھ، اس کے اندیشوں اور بیتابیوں کے ساتھ، اس کی تنہائی اور مایوسیوں کے ساتھ پہچان لیں گے تو پھر ہم یہ بھی دیکھیں گے کہ اس انسان کا ہمارے انفرادی، قومی اور انسانی وجود سے کیا تعلق ہے اور ہمارے وجود کی کس کس سطح پر ہمارا ساتھ دیتا ہے۔

ہمیں اقبالؔ کو اقبال کے اندر بھی تلاش کرنا ہے اور اپنے اندر بھی اور پھر اقبالؔ کے فلسفہ و فکر، تصورات و نظریات، معتقدات و مسلمات کا تعلق اس انسان سے قائم کرنا ہے۔ یہ کام جیسا کہ ظاہر ہے آسان نہیں ہے۔ اس کے لئے ہمیں اقبالؔ کی شاعری اور زندگی کو ایک نئی نظر سے دیکھنا پڑے گا اور اس کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیل کی مدد سے اقبالی انسان کے استخواں میں زندگی کے خونِ گرم کو محسوس کرنا ہوگا۔ اقبال کو اپنے وجود میں زندہ کرنے کے لئے ہمیں اقبال کی طرح اسی راستے آنا پڑے گا۔ اگلے سال ہم اقبال کا صد سالہ جشنِ ولادت منا رہے ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم میں سے کوئی اس کام کا آغاز کر سکے ـــــ؟

مسلمانوں میں عقلیت پسندی کا عروج و زوال

ڈاکٹر آغا افتخار حسین

ہمارے بیشتر حکماء، علماء، ادباء اور شعراء کی تحریروں سے کئی سو سال سے ہمیں عموماً یہ تاثر مل رہا ہے کہ عقل ناقص ہے۔ ناکام ہے۔ تشکیک پیدا کرتی ہے سکون کی دشمن ہے۔ ذہنی انتشار پیدا کرتی ہے۔ بعض اوقات مذہب کو خطرے میں ڈالتی ہے اور اکثر اوقات انسان کو گمراہ کرتی ہے۔ مختصر یہ کہ عقل کے نقصانات زیادہ ہیں، فائدے کم۔ اس کے مقابلے میں جذبات، وجدان، عشق، جنون، سرمستی وغیرہ انسان کی بہتر رہنمائی کر سکتے ہیں گویا عقل کے مقابلے میں وجدان کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ اس اندازِ فکر کو وجدان پسندی[۱] کہا جا سکتا ہے۔ اس کے زیرِ اثر مسلمانوں میں اعلیٰ پائے کے مذہبی علماء، صوفی، شاعر، موسیقار وغیرہ پیدا ہوئے۔

دوسرا اندازِ فکر یہ ہے کہ عقل انسان کو قدرت کا ایک عظیم عطیہ ہے جو اسے باقی حیوانوں سے ممتاز کرتا ہے۔ تہذیب کی ترقی اور انسان کے فکری ارتقاء میں عقل کی کارفرمائی نے نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔ فلسفہ، سائنس اور اس کی ایجادات وغیرہ عقل ہی کی مرہونِ منت ہیں۔ جذبات اور وجدان کا ایک اہم مقام ہے لیکن اہم دنیاوی مسائل کو حل کرنے میں جذبات و جنون کے مقابلے میں عقل عموماً زیادہ مفید ثابت ہوتی ہے۔ اس اندازِ فکر کے زیرِ اثر مسلمانوں میں اعلیٰ پائے کے فلسفی اور سائنسداں پیدا ہوئے۔ اسے عقلیت پسندی[۲] کہا جا سکتا ہے۔

مندرجہ بالا سطور میں میں نے نہایت مختصر طور پر وجدان پسندی اور عقلیت پسندی کے رجحانات کی وضاحت کی ہے۔ فکر کے یہ رجحانات تقریباً ہر قوم میں کسی نہ کسی دور میں ابھرے۔ کبھی وجدان پسندی کا رجحان غالب رہا، کبھی عقلیت پسندی کا۔ کبھی دونوں بیک وقت مقبول رہے اور کبھی ایک دوسرے سے متصادم ہوئے۔ یہ ایک دلچسپ داستان ہے لیکن اسے بیان کرنے کے لئے ایک مکمل کتاب کی ضرورت ہے۔ میں اس مختصر مضمون میں صرف اس موضوع کا خاکہ پیش کروں گا لیکن سب سے پہلے یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ وجدان پسندی اور عقلیت پسندی فلسفہ کے نہایت دقیق اور پیچیدہ مسائل ہیں۔ میں اس مضمون میں ان بحثوں میں نہیں جا سکتا۔ یہ بحثیں فلسفے کی کتابوں میں بھری پڑی ہیں۔ فلسفے کے متخصصین ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ میں صرف وہی باتیں عرض کروں گا جو ایک عام تعلیم یافتہ قاری کی سمجھ میں آ سکیں۔ البتہ یہ وضاحت کر دوں کہ ان دونوں رجحانات میں انتہا پسند مفکر گذرے ہیں۔ مثلاً وجدان پسندی کے انتہا پسندوں کا خیال تھا کہ عقل و خرد کا استعمال اور علم، فلسفہ، سائنس اور دیگر دنیاوی علوم حاصل کرنا بے سود ہے۔ اصل وہ ہے جو وجدان کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ یوں عقل کو قطعی طور پر باطل قرار دیا گیا۔ اسی طرح عقلیت پسندی کے انتہا پسند مفکروں نے صرف عقل ہی پر انحصار کیا اور وجدان کو باطل قرار دیا لیکن زیادہ تر مفکرین نے بین بین موقف اختیار کیا۔ بعضوں نے وجدان کو عقل پر فوقیت دی۔ بعضوں نے عقل کو وجدان پر فوقیت دی اور بعضوں نے وجدان اور عقل دونوں کو اہم قرار دیا۔ دونوں میں سے کسی ایک کی مذمت نہیں کی۔

قدیم ہندوستان، چین، یورپ اور مسلمانوں کے زیرِ اثر مشرقِ وسطیٰ اور دیگر ممالک میں یہ دونوں رجحانات مختلف ادوار میں جاری و ساری رہے۔ اہم بات یہ ہے کہ وجدان و عقل کے مسائل محض فلسفیانہ مباحث تک ہی محدود نہیں رہے بلکہ ان کے اثرات قوموں کی معاشرت، سیاست اور تہذیب کے تقریباً ہر پہلو پر مرتب ہوئے اور میں یہ عرض کرنے کی جسارت کروں گا کہ قوموں کے عروج و زوال میں ان فکری رجحانات نے نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔

دیگر قوموں کی طرح مسلمانوں میں بھی یہ دونوں فکری رجحانات کارفرما رہے۔ کسی دور میں عقلیت پسندی غالب رہی، کسی دور میں وجدان پسندی۔[۳]

۱۔ INTUITIONISM ۲۔ RATIONALISM ۳۔ اس ضمن میں بعض اوقات غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ مثلاً سید محمد تقی صاحب نے اپنی کتاب "تاریخ اور کائنات، میرا نظریہ" کے صفحہ [illegible] پر لکھا ہے کہ "عرب تہذیب تمام ادوار میں عقلی و فکری رہی"۔ میں نے اپنے ایک مضمون میں جو "نگار" کراچی میں شائع ہوا تھا، سید صاحب کے بیان سے اختلاف کیا۔ سید صاحب نے اپنے ایک مضمون میں جو "فنون" لاہور کے نومبر، دسمبر [illegible] کے شمارے میں شائع ہوا ہے اپنے موقف کا اعادہ کیا اور لکھا کہ یونانی علوم کے بیشتر حصے کا ماخذ عربی کتب ہیں۔ اگر اسے صحیح مان لیا جائے تب بھی اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ عربی تہذیب یا مسلمانوں کے ہر دور میں عقلیت پسندی غالب رہی۔ میں اپنے موقف کی مزید وضاحت اس مضمون میں کروں گا۔

اسلام اور عقلیت پسندی

تاریخ شاہد ہے کہ اسلام ایک روحانی نعمت کے علاوہ ایک فکری اور معاشرتی انقلاب بن کر آیا تھا۔ قرآن حکیم نے کئی رجعت پسندانہ فکری نظاموں کی نفی کی۔ ان میں سے ایک نظریہ یہ تھا کہ قوموں کے عروج و زوال میں انسان کا کوئی دخل نہیں، سب کچھ قسمت اور تقدیر کا کھیل ہے۔ قرآن حکیم نے نہ صرف انسان کو اپنے اعمال کا ذمہ دار ٹھہرایا اور جزا اور سزا کا مستوجب قرار دیا بلکہ قوموں کے عروج و زوال کی ذمہ داری بھی بنیادی طور پر خود افرادِ قوم پر عاید کی، چنانچہ قرآن حکیم کی مندرجہ ذیل آیت نہایت معنی خیز ہے

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ [1]

اس آیت کریمہ میں جس قدر وضاحت کے ساتھ انسان کو فکر و عمل کی تعلیم دی گئی ہے۔ اس کی مثال غالباً کسی اور الہامی کتاب میں نہیں ملتی۔ اس ارشادِ باری سے انسان کا مقام بھی نہایت بلند ہوتا ہے کہ انسان مشین کی طرح مجبور نہیں بلکہ اپنے اعمال کی حد تک مختار ہے اور ظاہر ہے کہ وہ اپنے اعمال کا مختار اسی صورت میں قرار دیا جا سکتا ہے جب اس میں خود فیصلہ کرنے کی صلاحیت ہو اور یہ صلاحیت عقل و خرد اور غور و فکر ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔ اور اس غور و فکر اور عقل و خرد ہی کے ذریعے انسان کو علم و حکمت کی دولت عطا ہوتی ہے جسے قرآن حکیم نے "خیراً کثیراً" کہا ہے۔

انسان کی ہدایت کے لئے قدرت نے عقل کو عام کیا۔ وجدان اور عرفان صرف چند برگزیدہ ہستیوں ہی کو حاصل ہوا اور وحی صرف انبیاء ہی کے لئے مختص قرار دی گئی۔ یہ تھا مختصر طور پر اسلام کا فکری اور اخلاقی پیغام جو نہایت سیدھے سادے الفاظ میں بنی نوع انسان کو عطا ہوا اور جس کے فیضان سے عرب قوم ہی میں نہیں بلکہ پوری تہذیبی دنیا میں فکری اور معاشرتی انقلاب نمودار ہوا۔

رسول اکرمؐ اور خلفائے راشدین کے دور میں مسلمان زیادہ تر فتوحات میں مصروف رہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ آنحضرتؐ کی ذاتِ اقدس کے فیض سے جو روحانی اور فکری روشنی پیدا ہوئی تھی اس سے ان کے اہل بیت اطہار اور صحابہ کرام مستفیض ہوئے اور ان مبارک ہستیوں نے افکارِ تازہ اور عمل صالح سے عوام کے ذہنوں کو اسلام کی فکری روشنی سے منور کیا۔ افسوس کہ خلفائے راشدین کے بعد جب جمہوری خلافت کی جگہ موروثی ملوکیت قائم ہوئی تو سیاسی انتشار کے ساتھ فکری بے راہروی کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ اسلام نے انسان کو اپنے اعمال و افعال کا ذمہ دار قرار دیا تھا۔ اس عظیم نظریہ کی نفی کی گئی۔ اور ایک بار پھر قدیم رجعت پسندانہ افکار کی تشہیر کی گئی اور عوام کو یہ باور کرایا گیا کہ انسان مجبورِ محض ہے اور اس تصور کو نہایت افسوسناک مقاصد کے لئے استعمال کیا گیا ــــ یعنی ملوکیت اور مطلق العنانی جبر و استبداد ظلم و تعدی کو یہ کہہ کر جائز قرار دیا گیا کہ جو کچھ ہوتا ہے اللہ کے حکم سے ہوتا ہے۔ انسان مجبور ہے۔ اس پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی اور اس طرح ظالمانہ سیاست کے لئے اسلام کو استعمال کرنے کی باقاعدہ ابتدا ہوئی، چنانچہ مولانا شبلی لکھتے ہیں:

> "اختلاف عقائد کے اگرچہ سب اسباب فراہم تھے لیکن ابتدا پالٹکس سے ہوئی۔ بنو امیہ کے زمانہ میں چونکہ سفاکی کا بازار گرم رہتا تھا طبیعتوں میں شورش پیدا ہوتی، لیکن جب کبھی شکایت کا لفظ کسی کی زبان پر آتا تھا تو طرفدارانِ حکومت یہ کہہ کر اس کو چپ کرا دیتے تھے کہ جو کچھ ہوتا ہے خدا کی مرضی سے ہوتا ہے۔" [2]

اس طرح تقدیر پرستی کے اندازِ فکر کو فروغ حاصل ہوا اور چونکہ حکومتِ وقت کی سیاسی مصلحتیں اس کی تائید میں تھیں اس لئے ان لوگوں کی حوصلہ افزائی کی گئی جو اس کی نشر و اشاعت میں مدد کر سکیں، چنانچہ قدریہ اور مرجیہ مکاتب فکر پیدا ہوئے جن کا موقف یہ تھا کہ انسان مجبورِ محض ہے۔ جو کچھ ہوتا ہے خدا کی مرضی سے ہوتا ہے۔ انسان کے کئے ہوئے مظالم کو صبر و شکر سے برداشت کرنا چاہیئے۔ اس کے خلاف آواز اٹھانا خدا کے خلاف آواز اٹھانا ہے۔ وغیرہ

عقلیت پسندی کا عروج

تاریخ کی بیشتر فکری تحریکیں ظلم و استبداد کے ردِعمل کے طور پر ابھری ہیں چنانچہ اس ظلم و استبداد کے خلاف بھی ردِعمل ہوا اور مظلوم اہل فکر نے یہ موقف اختیار کیا کہ یہ تو صحیح ہے کہ خدا قادرِ مطلق ہے لیکن خدا عادل بھی تو ہے۔ کیا بے گناہوں پر ظلم عدل پر مبنی ہے؟ ظلم عدل نہیں ہو سکتا، اور اگر ظلم عدل نہیں ہے تو ظلم خدا کا حکم نہیں ہو سکتا۔ خدا عادل ہے ظالم نہیں۔ خدا کے حکم سے کوئی ظلم نہیں کر سکتا۔ اگر کوئی ظلم کرتا ہے تو یہ اس کا اپنا فعل ہے خدا کا حکم نہیں۔ انسان ظلم کرنے پر مجبور نہیں ہے۔ اس اندازِ فکر کو قدریہ کہا گیا۔ قدریہ کا موقف یہ تھا کہ انسان مجبورِ محض نہیں ہے۔ انسان کو اپنے اعمال پر اختیار حاصل ہے۔ اسی لئے وہ سزا و جزا کا مستوجب ہے۔ خدا نے انسان کو فکر و عمل میں رہنمائی کے لئے عقل دی ہے۔ خدا عادل ہے اور اس کے احکام جو اسلام کی تعلیم کے ذریعے ہم تک پہنچے ہیں

---

[1] اللہ کسی قوم کی حالت کو تبدیل نہیں کرتا جب تک وہ خود اپنی حالت کو تبدیل نہ کرے

[2] شبلی نعمانی، علم الکلام اور الکلام، مسعود پبلشنگ ہاؤس کراچی، ۱۹۶۴ء صفحہ ۲۵

ہم سب پر واجب ہیں لیکن ان احکام کی ایسی تاویل نہیں کرنی چاہیئے جو خدا کی مرضی اور اس کی صفتِ عدل کے خلاف ہو۔ خدا اور رسول ؐ کے احکام کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کے لئے عقل کا استعمال ضروری ہے۔

اور اس طرح مسلمانوں میں عقلیت پسندی کی تحریک باقاعدہ طور پر نمودار ہوئی عقلیت پسندی کی تحریک کے سامنے سب سے اہم مسئلہ یہ تھا کہ مذہب اسلام کے احکام اور عقائد کو سمجھنے کے لئے عقل کو دعوت دی جائے اور جہاں تک ممکن ہو ان احکام و عقائد کی صداقت کو عقل کے ذریعے ثابت کیا جائے تاکہ عوام الناس اور خصوصاً غیر مسلم افراد اسلامی نظریات کو قبول کریں اور اسلام کا پیغام جو آفاقی ہے زیادہ سے زیادہ وسعتیں اختیار کرے اور جو اعتراضات مذہبی عقائد پر کئے جاتے ہیں ان کو مدلل جواب دیا جا سکے۔ اس لحاظ سے اس تحریک کی نوعیت شروع میں علم کلام کی تھی۔ اس تحریک کے علم بردار معتزلہ کہلائے۔ معتزلہ نے مذہبی عقائد کو سمجھنے کے لئے عقل کی اہمیت کو واضح کیا۔ لیکن اس کے ساتھ وحی اور وجدان کے اعلیٰ مقام کے بھی ہمیشہ معترف اور معترف رہے۔ اس لئے معتزلہ عقلیت پسندی میں انتہا پسند نہیں تھے۔ معتزلہ تحریک بنو امیہ کے آخری دور میں سخت مخالفت کے باوجود مقبولیت حاصل کر چکی تھی۔ بنو عباس کے دور میں معتزلہ تحریک کو حکومت کی سرپرستی حاصل ہوئی اور وہ بہت جلد عالم اسلام کے بیشتر حصے میں پھیل گئی۔ اس تحریک کی ابتدا بنوامیہ کے دور میں معبد جہنی نے کی تھی جسے عبدالملک اموی کے حکم سے قتل کرا دیا گیا تھا۔ اس کے بعد واصل بن عطا نے معتزلہ تحریک کو آگے بڑھایا۔ تحریک بصرے میں شروع ہوئی تھی لیکن بعد میں معتزلہ نے بغداد کو اپنا مستقر بنایا۔ معتزلہ تحریک کے فروغ میں ابوالہذیل علاف، النظام، ہشام بن الحکم، جاحظ، جبائی، بشر المزدار، خیاط، کعبی وغیرہ نے اہم خدمات انجام دی ہیں۔ فلسفہ اسلام کا بانی یعقوب بن اسحٰق کندی بھی معتزلی عقیدہ کا تھا۔

معتزلہ تحریک کو سب سے زیادہ فروغ مامون الرشید عباسی کے دور میں حاصل ہوا۔ مامون الرشید نے خود معتزلی مسلک اختیار کیا۔ علم و حکمت میں تحقیق و تصنیف کے لئے ایک عظیم ادارہ بیت الحکمت بغداد میں قائم کیا۔ اور اس میں کام کرنے کے لئے مشرق و مغرب سے اہل علم کو بلا کر تدریسی اور تحقیقی عہدوں پر مامور کیا۔ یونانی، پہلوی، سنسکرت اور دیگر زبانوں کی اہم کتابوں کے تراجم کرائے اور کوشش کی کہ دنیا کے تمام قدیم اور جدید علوم کا سرمایہ محفوظ ہو جائے۔ اب اس بارے میں شبہ باقی نہیں رہا کہ بیت الحکمت کا قیام انسانی تہذیب کے ارتقاء میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

آہستہ آہستہ بغداد کو علمی دنیا میں وہی حیثیت حاصل ہو گئی جو آج یورپ میں آکسفرڈ، کیمبرج اور پیرس کو ہے۔ دور دراز ممالک سے طالب علم بغداد آتے تھے اور قدیم اور جدید علوم، فلسفہ، سائنس، ریاضی، انجینیرنگ، فلکیات وغیرہ میں فضیلت حاصل کرتے تھے۔ بغداد تمام متمدن دنیا میں مشہور ہو چکا تھا اور اسلام کی روشنی دنیا کے ان دور دراز گوشوں میں بھی پہنچ چکی تھی جو اس سے پہلے تاریکی میں گھرے ہوئے تھے۔ یہاں یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہو گی کہ مسلمانوں کے اس دور میں جب بغداد میں علم و حکمت اس منزل پر پہنچ چکے تھے یورپ قرونِ وسطیٰ کی تاریکی میں گھرا ہوا تھا۔ فرانس کا شہنشاہ شارلمان تقریباً ان پڑھ تھا اور دستخط بھی مشکل سے کر سکتا تھا۔ فرانسیسی ادب ابھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ یورپ میں کوئی یونیورسٹی قائم نہیں ہوئی تھی، البتہ خانقاہیں تھیں جن میں راہب عبادت کرتے تھے۔ اول تو علم و حکمت کا ذکر ہی نہ آتا تھا اور اگر کبھی بات ہوتی تو نہایت بے سود اور مہمل باتوں پر بحثیں ہوا کرتی تھیں مثلاً یہ کہ ایک سوئی کی نوک پر کتنے فرشتے ناچ سکتے ہیں وغیرہ۔ علمی انحطاط کی وجہ یہ تھی کہ سلطنت روما کے زوال کے بعد یورپ میں انتہا پسند اہل کلیسا لوگوں کے ذہنوں پر چھائے ہوئے تھے۔ ان کی تعلیم میں اس بات پر زور دیا جاتا تھا کہ یہ زندگی محض آخرت کے لئے ہے۔ اس زندگی کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ چنانچہ یونان نے علم و حکمت کا جو سرمایہ چھوڑا تھا اس سے بھی اہل یورپ بے بہرہ تھے۔ اہل کلیسا نے انہیں یہ باور کرا دیا تھا کہ سب کچھ مذہبی کتابوں میں موجود ہے اور کسی اور علم کی ضرورت نہیں عقل و خرد سے مسیحیت خطرے میں پڑ جائے گی۔ کشف و وجدان کافی ہے۔ گویا تاریخ تمدن کے اس دور میں مغرب رجعت پسندی کے انتہائی دور سے گذر رہا تھا بلکہ اس کی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا اور اسی دور میں مشرق نے اسلام کے فیضان سے عقلیت پسندی اور علم و حکمت کے چراغ روشن کئے۔ یہ اور بات ہے کہ مغرب نے ان چراغوں سے روشنی بھی حاصل کی اور نئے چراغ بھی روشن کئے اور مشرق میں کچھ عرصہ بعد یہ چراغ گل ہو گئے جیسا کہ آگے بیان کیا جائے گا۔

معتزلہ تحریک میں اہمیت اس بات کو نہیں کہ ان کے عقائد کیا تھے۔ مسلمانوں نے اس دور میں کئی مذہبی اور علمی مسائل پر سوچنا شروع کر دیا تھا۔ مثلاً یہ کہ خدا کے صفات اس کی ذات کا حصہ ہیں یا اس سے علیحدہ ہیں۔ یہ کائنات ہمیشہ سے موجود ہے یا ایک خاص وقت میں خلق کی گئی۔ قرآن ہمیشہ سے موجود ہے یا ایک خاص وقت میں خلق کیا گیا۔ اس قسم کے مسائل پر بحثیں ہوتی تھیں اور اختلاف رائے موجود تھا۔ مثلاً معتزلہ کہتے تھے کہ خدا صورت شکل سے منزہ ہے اسے دیکھا نہیں جا سکتا۔ بعض دوسرے مکاتب فکر کا عقیدہ تھا کہ خدا انسان کی طرح ہاتھ پاؤں، آنکھ، ناک وغیرہ رکھتا ہے۔ اس قسم کی بحثیں جاری تھیں، اور کبھی کبھی جارحیت کی شکل اختیار کر لیتی تھیں۔ یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے کہ معتزلہ کے تمام نظریات درست تھے یا تمام نظریات غلط تھے۔ اختلاف رائے کی گنجائش ہمیشہ باقی رہتی

ہے۔ لیکن اہم بات یہ ہے کہ معتزلہ تحریک پہلے علم کلام سے شروع ہوئی تھی یعنی احکام و عقائدِ اسلام کو عقلی دلائل سے صحیح ثابت کرنے کے لئے۔ اس کے بعد انھوں نے عقل کو علم و حکمت کے دوسرے شعبوں میں بھی استعمال کیا۔ ان کے نتائج غلط تھے یا صحیح، اس میں اختلاف رائے ہو سکتا ہے لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ معتزلہ تحریک نے ایک عقلیت پسندی کی تحریک کی صورت اختیار کی۔ لوگ علم و حکمت کی طرف متوجہ ہوئے۔ فلسفہ اور سائنس کی ترقی ہوئی۔ یہ ایک عظیم تحریک تھی جس کے اثرات کئی صدیوں تک مہذب دنیا میں قائم رہے۔ یہ حریتِ فکر، فروغِ علم و ہنر اور خرد افروزی کی تحریک تھی۔ اس تحریک کے فیضان سے مسلمانوں میں نہایت عظیم فلسفی اور سائنسدان پیدا ہوئے۔ الکندی، الفارابی، ابن سینا، نصیر الدین طوسی، ابن مسکویہ، خوارزمی، غزالی، البیرونی، اخوان الصفا اور سپین میں ابن باجہ، ابن طفیل، ابن رشد اور تیونس میں ابن خلدون جیسی ہستیاں پیدا ہوئیں۔ تاریخِ عالم شاہد ہے اور اہل مغرب کھلے دل سے اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ یورپ میں احیاءِ علوم؎ کی تحریک کے فروغ کی بنیاد ان عظیم مسلمان فلسفیوں اور سائنس دانوں کے افکار تھے۔ یورپ نے عقل کی نوعیت اور مقام، ارسطو کا فلسفہ، ریاضی، الجبرا، کیمسٹری، طبیعیات، طب، غرض علم و حکمت کے بیشتر بنیادی مسائل مسلمان دانشوروں ہی سے سیکھے۔ اس کے بعد جیسا کہ قارئین جانتے ہیں یورپ میں خرد افروزی؎ کی تحریک ابھری۔ فلسفہ اور سائنس اور ٹکنالوجی کو فروغ حاصل ہوا، صنعتی انقلاب آیا، نئے معاشی افکار مقبول ہوئے۔ آج مغرب سائنس اور فلسفہ میں دنیا پر چھایا ہوا ہے، انسان چاند پر پہنچ چکا ہے۔ معاشی ترقی کی کیفیت یہ ہے کہ آج مغرب کے بیشتر ملک مشرقی ملکوں کو امداد دے رہے ہیں، اور مشرق کا بڑا حصہ آج تیسری یا چوتھی دنیا کی حیثیت رکھتا ہے۔

عقلیت پسندی کا زوال

مسلمانوں میں یہ زوال کیسے آیا۔ اس کے کئی وجوہ ہیں لیکن ایک اہم وجہ فکری زوال ہے۔ مسلمانوں کی فکر نے آہستہ آہستہ تقریباً وہی صورت اختیار کرلی جو یورپ میں قرونِ وسطیٰ کے تاریک دور میں تھی یعنی عقل و خرد کو حکومت اور مذہب کے منافی قرار دے دیا گیا۔ اس کی کیفیت مختصراً اس طرح ہے۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے عقلیت پسندی کی تحریک کو بنو عباس اور خصوصاً المامون کے دور میں فروغ حاصل ہوا تھا۔ غالباً تاریخ تمدن انسانی کا ایک عظیم المیہ یہ ہے کہ بعض اوقات سیاسی مصلحتیں اور ہوسِ اقتدار مختلف بھیس بدل کر علم و حکمت کی ترقی میں حائل ہو جاتی ہیں جب کوئی مطلق العنان حاکم یا کوئی جماعت یہ دیکھتی ہے کہ علم و حکمت کے فروغ سے اس کی بقا کو خطرہ ہے تو وہ علم و حکمت کو کمزور کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ کسی علمی نظریے کو رد کرنے کا صحیح طریقہ تو یہی ہے کہ اس کے مقابلے میں علمی دلائل لائے جائیں لیکن سیاسی مقاصد حاصل کرنے کے لئے عموماً علمی بحث کی زحمت برداشت نہیں کی جاتی بلکہ دوسرے ذرائع استعمال کئے جاتے ہیں۔ علم و حکمت کا تعلق زیادہ تر عقل سے ہے۔ لہٰذا عقل کو چھیڑے بغیر جذبات کو ابھارنے کی کوشش کی جاتی ہے اور جو جنگ عقل کے ذریعے لڑنی چاہیے تھی وہ جذبات کے ذریعے لڑی جاتی ہے۔ جذبات کو ابھارنے کا ایک موثر ذریعہ یہ بھی ہے کہ مذہبی مسائل چھیڑ دیئے جائیں، علم و حکمت کو مذہب سے ٹکرا دیا جائے۔ (حالانکہ اسلام میں علم و حکمت دین ہی کا حصہ ہیں) ایسے ایسے مسائل پیدا کئے جائیں جن کی کوئی علمی اہمیت نہ ہو لیکن انھیں اس طرح پیش کیا جائے گویا ساری قوم کی بقا کا دار و مدار ان مسائل کے فیصلے ہی پر ہے۔ چنانچہ اہل کلیسا نے اہل مملکتِ روما سے انتقام لینے کے لئے کچھ ایسے ہی طریقے استعمال کئے تھے۔ علم و حکمت سے متعلق ہر مسئلے کو مسیحیت کے خلاف قرار دیا جاتا تھا اور لوگوں کے جذبات ابھارے جاتے تھے۔ چنانچہ گبن نے اپنی کتاب "ہبوط و زوال مملکت روما"؎ میں لکھا ہے کہ مملکتِ روما کے زوال کے دو اہم اسباب تھے۔ ایک بربریت اور دوسرے (مسیحی) مذہب۔

کسی معاشرے میں اہل علم و فن ہمیشہ اقلیت میں ہوتے ہیں۔ اکثریت سیدھے سادے عوام کی ہوتی ہے۔ ان کے علاوہ مختلف جماعتیں ہوتی ہیں جو اپنے مفاد اور کبھی کبھی حصولِ اقتدار کے لئے کوشاں رہتی ہیں۔ بنو امیہ کے دور میں عقلیت پسند معتوب تھے۔ بنو عباس کے ابتدائی دور میں عقلیت پسندوں کو حکومت کی سرپرستی حاصل ہو گئی تھی۔ عقلیت پسندوں کا یہ عروج بعض دیگر جماعتوں کو گوارا نہ تھا۔ یہاں میں اس امر کی وضاحت بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ بعض معتزلہ اور عقلیت پسند اقتدار سے قریب ہونے کے بعد فلسفے سے زیادہ سیاست میں دلچسپی لینے لگے تھے۔ وہ بنو امیہ کے دور میں مظالم کا شکار ہوئے تھے۔ اب انھوں نے مظالم کا بدلہ لینے کی کوشش کی۔ یہ انسانی کمزوری ہے اور اس کمزوری کی بدولت بعض بہت اچھے آدمی بہت غلط کام کر بیٹھتے ہیں۔ اس سیاسی آویزش کا فائدہ ان لوگوں نے اٹھایا جو اقتدار سے محروم تھے لیکن اقتدار چاہتے تھے۔ ایسے عناصر نے اربابِ حکومت کو تو یہ سبق پڑھایا کہ عقلیت پسندوں کے مقبول ہونے سے حکومت خطرے میں پڑ جائے گی۔ اور عوام کو یہ سمجھایا کہ عقلیت پسند اسلام کے مخالف ہیں۔ دلیل کا انداز وہی تھا جو قدیم اہل کلیسا کا تھا

DECLINE AND FALL OF THE ROMAN EMPIRE, CH. VIII ؎ ENLIGHTENMENT ؎ RENAISSANCE ؎

کہ اسلام مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ پھر ہمیں علم وحکمت کی کتابیں پڑھنے کی کیا ضرورت ہے؟ جب رسول اکرمؐ کی وحی برحق ہے تو عقل کی کیا ضرورت ہے؟ وغیرہ۔ اس طرح کے بہت سے مذہبی اور فقہی مسائل اُٹھائے گئے اور مسلمانوں میں شدید فکری انتشار پیدا ہوگیا[۱]۔ اور بدامنی اور خونریزی تک نوبت آگئی۔ اس انتشار اور بدامنی کی کیفیت کو مولانا شبلی نے اس طرح بیان کیا ہے:

> "عوام جس کو چاہتے تھے مردود عام کر سکتے تھے۔ سب و دشنام دے سکتے تھے۔ آرام و راحت سے بسر کرنے میں خلل انداز ہو سکتے تھے۔ اس سے بڑھ کر آفت یہ تھی کہ ظاہر پرست فقہا بھی عوام کے ساتھ ہو جاتے تھے اور کفر کے فتووں سے انسان کا زندہ رہنا مشکل کر دیتے تھے۔ امام غزالی، رازی، ابن رشد، شہرستانی اور ابن تیمیہ کے حالات اوپر پڑھ آئے ہو۔ ان میں ایک بھی فقہا کے فتووں کے حملوں سے نہ بچ سکا۔ حالانکہ ان بزرگوں نے بہت کم آزادی سے کام لیا تھا اور کچھ کہتے بھی تھے تو سو پہلو بچا کر کہتے تھے[۲]۔"

خلیفہ متوکل عباسی کے دور میں عقلیت پسندوں کے خلاف مہم نے زیادہ شدت اختیار کرلی اور ان لوگوں پر عرصۂ حیات تنگ کردیا گیا۔ اس کے باوجود بغداد اور دوسرے مقامات پر مسلمان فلسفی، اور سائنس داں اپنے مشاغل میں مصروف رہے۔ کبھی بہت ظلم ہوتا تو خفیہ طور پر زیر زمین علمی کام کرنے کے لئے جماعتیں بنالیتے۔ اخوان الصفا اسی قسم کی ایک خفیہ جماعت تھی جس نے دنیا کی سب سے پہلی انسائیکلوپیڈیا تیار کی اور خرد افروزی کی وہ روایت قائم کی جس کی بازگشت اٹھارویں صدی کے فرانسیسی قاموسیوں میں بھی گونجتی رہی۔

عقلیت پسندوں اور ان کے مخالفوں میں محاذ آرائی عرصہ تک جاری رہی لیکن عقلیت پسندوں کے نظریات کی علمی سطح پر باقاعدہ مخالفت جن منکرین نے کی ان میں اشعری اور امام غزالی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ابوالحسن علی ابن اسماعیل اشعری (وفات ۹۳۵ء) شروع میں معتزلی عقلیت پسند تھے لیکن بعد میں انھوں نے یہ رائے قائم کی کہ مذہبی مسائل کو عقل کے ذریعے حل کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے اور عقل کو صداقت کا معیار بنانا صحیح نہیں ہے۔ انھوں نے معتزلہ کے کئی نظریات کو رد کیا۔ مثلاً صفات الٰہی، قرآن کا قدیم یا حادث ہونے، خدا کے مادی صورت میں نظر آنے یا نہ آنے وغیرہ کے بارے میں جو بحثیں جاری تھیں ان کے بارے میں اشعری نے اپنا موقف بیان کیا۔ اشعری کا موقف مختصراً یہ تھا کہ انسان قیامت کے دن جسمانی حیثیت سے خدا کو دیکھ سکے گا اور یہ کہ خدا عالم بالا میں ایک تخت ایزدی پر متمکن ہے۔ معتزلہ ان تصورات کو نہیں مانتے تھے، خدا کو منزہ تصور کرتے تھے۔ اور صفات کو خدا کی ذات سے علیحدہ نہیں خیال کرتے تھے۔ اشعری نے قرآن حکیم اور احادیث کے حوالوں سے اپنے موقف کی تائید پیش کی لیکن ایک اہم نظریہ جو اشعری نے پیش کیا وہ "کسب" کا نظریہ تھا جس کی رو سے انسان اپنے فعل کا کلی طور پر مختار نہیں۔ خدا ہی ہر شے کا خالق ہے۔ انسان کے فعل کا خالق بھی خدا ہی ہے۔ خدا انسان میں ہر فعل کی استطاعت پیدا کرتا ہے اور انسان کسب کرلیتا ہے۔ یہ نظریہ نہایت پیچیدہ ہے۔ اکثر حکما اسے سمجھنے سے قاصر رہے۔ اس نظریے سے جبر کا تصور بھی اخذ کیا جا سکتا ہے (جس کے منکر معتزلہ تھے) اور اختیار کا پہلو بھی نکلتا ہے (جس کے معتزلہ موافق تھے)۔ واقعہ یہ ہے کہ اشعری اور عقلیت پسندوں کے نظریات میں تمام اختلافات کے باوجود کوئی ایسی بات نہ تھی جو ملت اسلامیہ میں شدید محاذ آرائی کا سبب بن جاتی لیکن افسوس کہ ایسا ہی ہوا چونکہ اشعری نے عقلیت پسندوں کے بعض نظریوں سے اختلاف کیا تھا اس لئے عقلیت پسند ایک طبقے کی نظر میں مردود قرار پائے۔ گویا نظریات سے زیادہ مخالفت افراد سے پیدا ہوگئی۔

کچھ اسی قسم کی صورت حال امام غزالی کے افکار میں بھی پیش آئی۔ امام غزالی (پیدائش ۱۰۵۸ء، وفات ۱۱۱۱ء) ایک غیر معمولی ذہن کے حامل تھے۔ اشعری کی طرح غزالی بھی پہلے عقلیت پسند تھے لیکن بعد میں ایک طویل علالت کے بعد ان کے افکار میں تبدیلی آئی۔ انھوں نے نتیجہ اخذ کیا کہ بعض مسائل ایسے ہیں (خصوصاً مذہب سے متعلق) جن کو عقل کے ذریعے حل نہیں کیا جاسکتا۔ عقل کی کارفرمائی محدود ہے۔ انھوں نے عقل کے حدود متعین کرنے کی کوشش کی۔ یہ ایک نہایت اہم کارنامہ تھا جو آٹھ سو سال بعد کانٹ نے یورپ میں کیا۔ انھوں نے عقل کے مقابلے میں وجدان کو اہمیت دی لیکن عقل کو بالکل رد نہیں کیا۔ غزالی نے سبب اور مسبب (CAUSE AND EFFECT) کا نیا نظریہ

۱۔ یہاں مسلمانوں کی فکری تاریخ کے ایک المیہ کی طرف اشارہ کرنا مناسب ہوگا۔ قرآن حکیم اور رسول اکرمؐ نے تمام بنیادی مسائل پر احکام صادر کئے لیکن بہت کچھ انسانی فکر کے لئے بھی چھوڑ دیا تاکہ حالات سے مطابقت پیدا کی جاسکے۔ چنانچہ فقہ کی تدوین کا عظیم کارنامہ امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام حنبلؒ اور اگر شیعہ فقہ کو بھی شامل کرلیا جائے تو امام جعفر صادقؒ نے انجام دیا۔ ان عظیم مفکروں نے اپنے عقل و فہم کے مطابق قرآن کی تفسیر کی اور ایک دوسرے سے کہیں کہیں اختلاف کیا لیکن اس کی نوعیت محض علمی سطح پر تھی۔ یہ ایک دوسرے کی عزت کرتے تھے بلکہ بعض کی حیثیت تو ایک دوسرے کے استاد و شاگرد کی تھی لیکن افسوس کہ ان اکابر کے پیرو ایک دوسرے کے مخالف اور بعض اوقات ایک دوسرے سے متصادم رہے اور اب تک ہیں۔ کیا ان اختلافات کو ہم دور میں بھی ختم نہیں کیا جا سکتا؟

۲۔ شبلی۔ علم کلام اور الکلام صفحہ ۱۲۱

پیش کیا۔ ان کا موقف مختصراً یہ تھا کہ ہر شے کا ایک سبب ضرور ہوتا ہے لیکن جب تک منشائے خداوندی نہ ہو کوئی واقعہ پیش نہیں آسکتا۔ اس طرح غزالی نے معجزہ کا جواز پیدا کیا۔ اس سے انسان کے مجبور ہونے کا پہلو بھی نکلتا ہے اور سائنس کی ساری بنیاد متزلزل ہو جاتی ہے لیکن مزید غور و وضاحت سے یہ مسائل بھی حل کئے جا سکتے تھے۔ افسوس کہ انتشار پسند اور مصلحت کوش حضرات نے غزالی کے افکار کے صرف ان پہلوؤں کو نمایاں کیا جن سے زیادہ سے زیادہ ہنگامہ کھڑا کیا جا سکتا تھا۔ انھوں نے غزالی کی وجدان پسندی کی تعریف کی اور عقل کی مذمت پر خوش ہوئے لیکن یہ بھول گئے کہ خود غزالی نے جو دلیلیں پیش کی ہیں وہ بھی تو عقلی ہی ہیں۔ لیکن غزالی کی جو تصنیف عام لوگوں میں سب سے زیادہ ہنگامہ خیز ثابت ہوئی وہ ان کی کتاب "تہافۃ الفلاسفہ" ہے۔ اس کتاب میں غزالی نے عقلیت پسند معتزلہ اور دیگر فلسفیوں کے بعض نظریات کو رد کرنے کی کوشش کی ہے اور فلسفیوں کو گمراہ قرار دیا ہے۔ اس ضمن میں ایک اہم بات تو یہ ہے کہ غزالی نے مسلمان فلسفیوں کے چند نظریات سے اختلاف کیا ہے، تمام نظریات سے نہیں۔ اور اگر اس کتاب کو غور سے پڑھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ اختلافات ایسے نہیں کہ ان کی بنا پر ملت میں تفرقہ پڑ جائے۔ غزالی نے وجدان کی اہمیت کو واضح کیا لیکن عقل کو باطل قرار نہیں دیا نہ دیا جا سکتا تھا۔ آخر علوم عقلیہ ــــ سائنس وغیرہ کی بنیاد عقل ہی تو ہے ــــ سائنسی ترقی محض وجدان سے تو نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح غزالی نے فلسفیوں کی مخالفت اس لئے کی تھی کہ وہ عقل کے ذریعے مذہبی مسائل حل کرتے تھے۔ بہت خوب۔ مذہبی معاملات میں عقلی دلائل اگر پسند نہیں تو انھیں نظر انداز کر دیا جائے۔ لیکن غزالی کا ہرگز یہ منشا نہیں ہو سکتا تھا کہ خود فلسفہ اور سائنس کی ترقی روک دی جائے اور فلسفیوں اور عقلیت پسندوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا جائے لیکن افسوس کہ ایسا ہی ہوا۔ اشعری کے افکار کی طرح غزالی کے افکار کی بھی غلط تشریح کی گئی۔ غزالی نے عقل کی حدود متعین کی تھیں اور وجدان کی اہمیت کو واضح کیا تھا۔ مصلحت کوش حضرات نے عقل کو سرے سے رد ہی کر دیا اور سوچا کہ جب وجدان اور کشف موجود ہیں تو عقل کو اہمیت ہی کیوں دی جائے۔ عقل تو گمراہ کرے گی۔ اس سے دور رہنا ہی مناسب ہے اور یہ فلسفی اور سائنسدان جو عقل کی استعمال کرتے ہیں امام غزالی نے ان کی مخالفت کی ہے اس لئے یہ گمراہ اور مردود لوگ ہیں ان کو ابھرنے نہیں دینا چاہئے! اور دل ہی دل میں یہ خیال بھی آتا ہوگا کہ یہ فلسفی اور سائنسداں ہمارے مفاد کے لئے خطرناک ہوں گے) اور اس طرح اس منزل پر عقلیت پسندی کے خلاف فکری اور مذہبی محاذ قائم ہو گیا جس کی نوعیت کچھ یوں تھی۔ ایک طرف وجدان اور اسلام، دوسری طرف عقل اور کفر!!!

اور یہ مسلمانوں کی تاریخ کا ایک المناک باب تھا۔ اسلام عقل و خرد کا انقلاب لے کر آیا تھا لیکن مفاد پرستوں نے اسلام کو عقل و خرد سے متصادم کر دیا۔ اشعری اور امام غزالی کی تصانیف کی غلط تعبیر سے مفاد پرستوں کو خرد دشمنی کا علمی اور مذہبی جواز مل گیا تھا۔ اب ان کے لئے راستہ کھلا ہوا تھا۔ انھوں نے اسلام کے تحفظ کے نام پر ان علم کے لئے عرصۂ حیات تنگ کر دیا۔ عقلیت پسند فلسفی اور سائنسداں خانہ نشیں ہو گئے کیونکہ ان کے لئے گھر سے نکلنا مشکل ہو گیا تھا۔ بعض نے ملک چھوڑ دیا۔ کچھ مکہ چلے گئے اور چند مغربی ممالک کی طرف نکل گئے۔ عقلیت پسندوں پر جبر و استبداد انتہا کو پہنچ گیا تھا۔ ابن سینا اور دیگر فلسفیوں ریاضی دانوں، سائنسدانوں کی کتابوں کو بغداد کے بازاروں میں جلایا جاتا تھا۔ ایسی فضا میں علم و حکمت کو کیا فروغ ہوتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں پر فکری جمود طاری ہو گیا۔ لوگ فلسفہ اور سائنس سے خوف کھانے لگے۔ پھر بھی چند دھن کے پکے ایسے تھے جو آشوب آگہی کے مریض رہے اور علمی کام کرتے رہے۔ ان میں نصیر الدین طوسی بھی تھا جسے عباسی دور کے آخر میں اٹھارہ سال تک بغیر مقدمہ چلائے قید میں رکھا گیا لیکن پابند سلاسل ہونے کے باوجود طوسی نے فلسفہ، ریاضی اور فلکیات میں ایسے شاہکار تصنیف کئے کہ اہل مغرب آج بھی اس کے معترف ہیں۔

جب کوئی قوم فکری انتشار اور محاذ آرائی کی شکار ہو تو نہ اس کی سیاست صحیح رہ سکتی ہے نہ معیشت۔ چنانچہ خلافت عباسی فکری انتشار کی وجہ سے سیاسی اور معاشی حیثیت سے کمزور ہو گئی۔ اور ۱۲۵۸ء میں ہلاکو کے حملے کے نتیجے میں ختم ہو گئی۔ عموماً کہا جاتا ہے کہ زوال بغداد کی وجہ سے مسلمانوں میں فکری اور تہذیبی زوال آیا لیکن میں یہ عرض کرنے کی جسارت کروں گا کہ فکری اور تہذیبی زوال کی وجہ سے بغداد کا زوال ہوا۔ زوال بغداد ہمارے ذہنی انحطاط کا سبب نہیں بلکہ اس کا نتیجہ تھا۔

مشرق میں تو مسلمان مفکرین پر عرصۂ حیات تنگ ہو چکا تھا لیکن سپین میں کچھ عرصہ تک مسلمان مفکرین تصنیف و تالیف میں مصروف رہے چنانچہ ابن باجہ، ابن طفیل اور ابن رشد نے فکر اسلام کو ترقی دی۔ ابن رشد نے امام غزالی کی کتاب "تہافۃ الفلاسفہ" کے جواب میں "تہافۃ التہافۃ" لکھی اور خالص منطقی دلائل سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ فلسفیوں پر امام غزالی کے الزامات محل نظر تھے۔ یہ ایک علمی بحث تھی۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ امام غزالی کے تمام دلائل صحیح تھے

یا ابن رشد کے۔ لیکن دونوں مفکروں کی عظمت مسلّم ہے۔ ابن رشد کے افکار سے اہل یورپ نے صدیوں استفادہ کیا اور پیرس یونیورسٹی (سوربون) میں "ابن رشدیت" ایک باقاعدہ علمی موضوع کی حیثیت سے عرصہ تک مقبول رہی[1]۔ مغربی مفکرین کی نظر میں ابن رشد کی کیا قدر و منزلت تھی اس کا اندازہ اس ایک مثال سے کیا جا سکتا ہے۔ مشہور انگریزی مصنف راشڈیل نے یورپ میں یونیورسٹیوں کی تاریخ لکھی ہے۔ اس کتاب میں پیرس یونیورسٹی (سوربون) کا ذکر کرتے ہوئے راشڈیل لکھتا ہے کہ سوربون میں تعلیم ختم کرنے کے بعد جب ڈاکٹری کی سندِ فضیلت دی جاتی تھی تو ڈاکٹر کو ہدایت دی جاتی تھی کہ تم ارسطو کے فلسفہ کا درس دیتے وقت صرف اس شرح کو تسلیم کرو گے جو ابن رشد نے لکھی تھی[2]۔ ابن رشد اور ابن سینا کی تصویریں آج بھی یورپ کی یونیورسٹیوں میں آویزاں ہیں اور فلسفیانہ اور سائنسی افکار کی کوئی تاریخ ایسی نہیں جن میں مسلمان فلسفیوں اور سائنس دانوں کو خراجِ عقیدت پیش نہ کیا گیا ہو۔

ابن رشد پہلے تو دربارِ حکومت میں مقبول تھا لیکن بعد میں انتہا پسند علما کے اصرار پر معتوب ہو گیا اور جلا وطن کر دیا گیا۔ عمر کے آخری وقت میں ابن رشد کو واپس وطن (سپین) آنے کی اجازت ملی لیکن اس عرصے میں عقلیت پسندی، فلسفہ اور سائنس مسلمان سپین سے جلا وطن ہو چکے تھے۔ یہ دوسری جلاوطنی تھی۔ پہلی جلاوطنی بغداد میں پیش آ چکی تھی۔ ان جلاوطنیوں کے نتیجے میں فلسفہ اور سائنس (عقلیت پسندی) نے پہلے بغداد سے ہجرت کی اور پھر قرطبہ سے۔ اس کے بعد جب ایشیا اور یورپ میں عقلیت پسندی کو جگہ نہ ملی تو شمالی افریقہ میں تیونس کے مسلمان فلسفی ابن خلدون نے اس کا خیر مقدم کیا۔ ابن خلدون ایک خوش عقیدہ مسلمان تھا۔ اس نے قرآن حکیم اور رسول اکرمؐ کے افکار سے فیض حاصل کیا اور فلسفۂ تاریخ کی بنیاد رکھی۔ وہ دین، مذہب، وحی، وجدان سب کا معترف تھا۔ لیکن اس نے اپنے فلسفۂ تاریخ میں عقلی دلائل ہی پیش کئے اور افسوس ظاہر کیا کہ مسلمان علم و حکمت سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ اس نے مسلمانوں کو خبردار کیا کہ اہل یورپ علم و حکمت کی ترقی کی طرف مائل ہیں۔ یہ ایک نہایت اہم پیش گوئی تھی۔ ابن خلدون چودھویں صدی عیسوی میں لکھ رہا تھا ابھی یورپ میں احیاءِ علوم کی تحریک نہیں ابھری تھی۔ لیکن اس عظیم فلسفی نے مسلمانوں کے فکری زوال اور اہل یورپ کے ذہنی عروج کا اندازہ لگا لیا تھا۔ ابن خلدون کے بعد مسلمانوں میں اس پائے کا مفکر پیدا نہیں ہوا۔ عقلیت پسندی اور علم و حکمت کے لحاظ سے اقبالؔ کا یہ مصرع غالباً ابن خلدون پر صادق آتا ہے:

ترکشِ ما را خدنگِ آخریں

ابن خلدون کے افکار مسلمانوں میں بہت دیر سے مقبول ہوئے۔ اُسے بھی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ابن خلدون کے بعد عقلیت پسندی پھر بے گھر ہو گئی اور اس کے بعد سے بے خانماں ہے۔ وہ جس ملک میں گئی اسے ناپسندیدہ اجنبی قرار[3] دیا گیا۔ یوں بعض مفکرین نے انفرادی طور پر عقلیت پسندی کے احیاء کی کوشش کی مثلاً ایران میں صدر الدین شیرازی نے لیکن وہاں بھی انتہا پسند علما نے اسے مقبول نہ ہونے دیا۔ ہندوستان میں سر سید اور امیر علی نے عقلیت پسندی کی اہمیت کے بارے میں آواز اٹھائی۔ سر سید کو کفر کے فتووں سے سرفراز کیا گیا۔ امیر علی زیادہ محتاط تھے وہ انگلستان ہی میں بیٹھے رہے۔ پھر کہیں کہیں عقل کی موافقت میں آوازیں اٹھیں لیکن وہ صدا بہ صحرا ثابت ہوئیں۔ اس آٹھ سو سال سے الا ماشاء اللہ ہمارے علما، حکما، شعرا، ادبا کی تحریروں کا یہی مطلب لیا جا رہا ہے کہ عقل ناقص ہے، گمراہ کرتی ہے اور اسلام کے منافی ہے۔

عقلیت اور وجدانیت میں توازن کی ضرورت

اس مقام پر میں ایک دو امور کی وضاحت کر دوں۔ ایک تو یہ کہ اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کوئی مفکر کسی بات پر زور دیتا ہے اور دوسری بات پر کم زور دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ایک بات حق ہے اور دوسری باطل۔ مثلاً میں اس سے پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اشعری اور غزالی وجدان کی اہمیت واضح کرنا چاہتے تھے عقل کو رد کرنا نہیں چاہتے تھے۔ لیکن ان کے افکار سے جو عام تاثر لیا گیا وہ عقل و خرد، علم و حکمت کی مخالفت تھی۔ اسی طرح غزالی سے اقبالؔ تک علما اور حکما نے اگر وجدان کی اہمیت پر زور دیا ہے تو اس کے معنی یہ نہیں کہ عقل باطل ہے اور علم و حکمت اسلام کے خلاف ہے لیکن عام تاثر یہی ہوا۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ جب تمام مفکرین ایک ہی بات پر زور دیتے چلے آتے ہیں اور دوسری بات پر زور نہیں دیتے تو عوام الناس ایک کو حق اور دوسری کو باطل سمجھنے لگتے ہیں۔ یورپ میں افکار کی تاریخ پر نظر ڈالئے۔ احیاءِ علوم عقلیت پسندی سے شروع ہوا۔ دیکارت اور سپینوزا تک عقلیت پسندی کا

---

[1] اس موضوع پر ایک نہایت دلچسپ کتاب فرانسیسی مفکر رینان نے لکھی۔ نام ہے A VERROES ET AVERROECISM انگریزی اور اردو ترجمہ ہو چکا ہے۔ اردو ترجمہ معشوق حسین نے کیا ہے۔

[2] A. RASHDALE, HISTORY OF UNIVERSITIES IN EUROPE, LONDON, 1923

[3] PERONNA NON GRATA

دور دورہ رہا لیکن اس کے بعد عقلیت پسندی کے خلاف ردعمل ہوا اور شالیت، اور وجدانیت کی تحریکیں ابھریں۔ لاک، بارکلے، ہیوم عقلیت پسندی کے خلاف ردعمل تھے۔ کانٹ نے ... ہاں عقلیت پسندی کی مخالفت بھی ہے اور اس کے خلاف ردعمل بھی۔ اس کے بعد عقلیت پسندی پھر ابھری۔ ہیگل بڑا سخت قسم کا عقلیت پسند تھا لیکن اسی دور میں رومانیت کی تحریک بھی ابھر چلی تھی۔ گویا عقلیت اور وجدان دونوں سے متعلق عمل اور ردعمل کی تحریکیں سرگرم ہوئیں۔ یہی صورت حال اب تک ہے۔ ایک طرف آگسٹ کومٹ، کارل مارکس، ڈارون، آئن سٹائن اور دیگر عقلیت پسند اور سائنسدان ہیں تو دوسری طرف نطشے، شوپنہاور، برگساں اور ژاں پال سارتر ہیں جو وجدان پسندی کی طرف مائل ہیں۔ دراصل کوئی نظریہ بھی اگر ایک حد سے بڑھ جائے تو نقصان دہ ہوتا ہے۔ عقلیت پسندی کی انتہا نقصان دہ ہو سکتی ہے اور یہی صورت وجدان پسندی کی بھی ہے۔ زندہ اور صاحب فکر قوموں میں فکری عمل اور ردعمل کا سلسلہ جاری رہتا ہے اس طرح ان کے ہاں ایک طرف افکار کا توازن قائم رہتا ہے اور دوسری طرف افکار کے تصادم سے افکار تازہ پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اسلام میں عقلیت پسندی اور وجدان پسندی دونوں کی گنجائش ہے لیکن کئی سو سال سے صرف ایک کو مقبولیت حاصل رہی ہے۔ یہی ہمارا فکری المیہ ہے۔

عقلیت پسندی کے مقابلے میں وجدان پسندی کی مقبولیت کی ایک وجہ اور بھی ہے۔ عقلیت پسندی فلسفہ اور سائنس کی طرف لے جاتی ہے یعنی ان عوامل کی طرف جن کی اپیل زیادہ تر عقل سے ہے۔ وجدان پسندی شعر و شاعری، موسیقی، آرٹ یعنی فنون لطیفہ کی طرف لے جاتی ہے جن کی اپیل زیادہ تر جذبات سے ہے۔ انسان فطرتاً آرام پسند ہے، جو مزا شعر و سخن کی محفلوں اور موسیقی کی مجلسوں میں ہے وہ علمی کتب خانوں اور سائنسی لیبارٹریز کی صبر آزما مصروفیات میں کہاں۔ ظاہر ہے عام مقبولیت عقلیت پسندی کو حاصل نہیں ہو سکتی۔ باقی رہی وجدان، سرمستی، جنون، عرفان کے حقیقی منازل، تو وہ بہت بلند ہوتی ہیں اور چند خوش نصیب ہستیوں ہی کے حصے میں آتی ہیں۔ عقلیت پسندی کی مخالفت اور خرد دشمنی کے فروغ کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عوام الناس نہ علم و حکمت کی طرف راغب ہوتے ہیں اور نہ وجدان و عرفان کی بلندیوں تک پہنچ سکتے ہیں۔ وہ ایک ذہنی جمود اور فکری انتشار کا شکار ہو جاتے ہیں جس سے کسی قدر سکون انہیں خوبصورت شاعری اور حسین نغموں ہی سے ملتا ہے۔ شاعری پروان چڑھتی ہے، علم و حکمت طاق نسیاں کی زینت بن جاتے ہیں۔ قوم کا مزاج عالمانہ کم اور شاعرانہ زیادہ بن جاتا ہے حالانکہ قوم کی صحت مند زندگی کے لئے دونوں میں توازن کی ضرورت ہے۔

یہ تھی مسلمانوں میں عقلیت پسندی کے عروج و زوال کی مختصر کہانی لیکن یہ ایک سبق آموز کہانی ہے۔ عقلیت پسندی کے زوال کے نتائج مسلمانوں کی تاریخ ـــــ برصغیر کی تاریخ اور ہماری موجودہ قومی حیثیت پر کس طرح مرتب ہوئے ہیں، اس کے بارے میں پھر کبھی معروضات پیش کروں گا۔ لیکن قارئین کرام خود صاحب بصیرت ہیں، نتائج خود اخذ کر سکتے ہیں۔

اہلِ تحقیق کی واماندگیاں ــ (۲)

رشید ملک

اس سلسلے کی دوسری کڑی وہ کتابچہ ہے[۱] جو نیشنل کونسل نے امیر خسرو کے ہفت صد سالہ جشنِ ولادت کے موقع پر شائع کیا۔ اس کتابچہ کے سرسری مطالعہ سے ہی قاری یہ امر بھانپ لیتا ہے کہ اس کتابچے کا مصنف موسیقی کے علم و فن سے ناواقف ہے، اور اس ناواقفیت کا برملا مگر بالواسطہ اظہار کتابچہ کے صفحے صفحے پر نظر آ رہا ہے۔ مثلاً امیر خسرو کے اس فقرے میں کہ "از تار الاوّن عبدالمومن راز ناری بندند" فاضل مصنف عبدالمومن کی تشریح اسمِ نکرہ سمجھ کر کرتا ہے جس کی رعایت سے امیر خسرو "زنار" کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ لفظی ترجمہ اس فقرے کا فاضل مصنف یہ کرتا ہے SLAVE OF THE ALL FAITHFUL, GOD.

یہ ترجمہ موسیقی کی رعایت سے غلط اور گمراہ کن ہے۔ یہاں حضرت امیر خسرو کا اشارہ دنیائے اسلام کے مشہور مغنی اور ماہر موسیقی اپنے ہم عصر صفی الدین عبدالمومن (وفات ۶۹۳ھ - ۱۲۹۴ء) کی طرف ہے، جو بغداد کے خلفاء کے دربار سے وابستہ تھا، اور ہلاکو خاں نے اس کی جان بخشی محض اس کی ماہرانہ طنبور نوازی کی وجہ سے کی تھی۔ سقوطِ بغداد کے بعد اس نے شمس الدین محمد الجوینی کی ملازمت اختیار کر لی اور باقی ماندہ عمر ایران میں گزار دی۔ وہ صاحبِ کتاب تھا۔ اس کی دو تصانیف ہم تک پہنچی ہیں۔ ایک "رسالۃ الاشرافیہ" اور دوسری کتاب الادوار۔ "رسالۃ الاشرافیہ" وزیر شمس الدین مذکور کے بیٹے شرف الدین ہارون کے لیے لکھی گئی کیونکہ یہ صاحب اور ان کے بھائی بہاء الدین محمد دونوں موسیقی سے شغف رکھتے تھے اور موسیقی کی پرورش کی طرف مائل تھے۔ رسالۃ الاشرافیہ کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں موجود ہے۔ دونوں کتابیں مخطوطات کی صورت میں آکسفورڈ کی بوڈلین لائبریری میں موجود ہیں۔ صفی الدین عبدالمومن کے نام کے ساتھ دو سازوں کی ایجاد یا اختراع بھی منسوب کی جاتی ہے۔ یہ ہیں مغنی اور نزہا۔ قطب الدین شیرازی صاحب درۃ التاج جس میں موسیقی پر سیر حاصل بحث ملتی ہے، اسی صفی الدین عبدالمومن کا شاگرد تھا۔ اسے مغرب میں SYSTEMATIST SCHOOL کا بانی بھی قرار دیا جاتا ہے۔ موسیقی میں اس کے مقام کو مغرب کے حکماء نے بھی تسلیم کیا ہے اور کیزویٹر (KIESWETTER) سر ہیوبرٹ پیری (SIR HUBERT PARRY) اور ہیلم ہولٹز (HELMHOLTZ) جیسے ثقہ لوگ اسے خراجِ عقیدت پیش کر چکے ہیں۔

اگر ہمارے فاضل مصنف موسیقی سے لگاؤ رکھتے تو صفی الدین عبدالمومن کو اس طرح نظر انداز نہ کرتے۔ ان کی اس غلط تشریح سے قاری کا ذہن بدک جاتا ہے اور جب وہ اس فقرے کے دوسرے حصے میں یعنی "بر نیچے باعث باشند کہ ہردم بیکہ مجلس وارہند وانہ سوررے دردل اصحاب شیون رسانند" کے جملے میں لفظ "وار" کو پنجابی زبان کی صنعتِ شاعری سے لانے کی کوشش کرتے ہیں تو دل ان کی بات ماننے سے احتراز کرتا ہے خصوصاً اس وقت جب، دوسرے فارسی داں حضرات لفظ "وار" کی اس قسم کی صراحت سے گریز کرتے نظر آتے ہیں۔

لفظ "وار" کو پروفیسر فاطمی بڑی اہمیت دیتے ہیں اور اس پر شیفتہ معلوم ہوتے ہیں۔ اسی شیفتگی کی وجہ سے وہ امیر خسرو کے متن میں ایسی موشگافیاں کرنے

۱۔ PROFESSOR S. QUDRAT-ULLAH FATIMI, AMIR KHUSRAU'S CONTRIBUTION TO THE INDUS-MUSLIM MUSIC. PUBLISHED ON THE OCCASION OF 700TH ANNIVERSARY OF AMIR KHUSRAU, PAKISTAN NATIONAL COUNCIL OF THE ARTS, ISLAMABAD, OCTOBER 1975. PAGES 39. PRICE. RS. 3.00

نظر آتے ہیں جو شاید خسرو نے خواب میں بھی نہ دیکھی ہوں گی۔ اس بات پر ایک لطیفہ یاد آیا کہتے ہیں کہ ایک دفعہ حضرت شیکسپیئر سول سروس کے مقابلے کے امتحان میں بیٹھے۔ ڈرامے کا پرچہ ان کے اپنے ڈرامے کنگ لیئر سے متعلق تھا، لیکن اس کے باوجود حضرت اس پرچے میں بُری طرح فیل ہو گئے۔ وجہ معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ امتحان کی تیاری کے لئے انھوں نے بریڈلے کی شیکسپیرین ٹریجڈی کا مطالعہ نہیں فرمایا تھا۔

ہمارے پروفیسر صاحب بھی کلاونت، ڈھاڈی اور بھاٹ کے مختلف مفاہیم کو خلط ملط کر دینے کے بعد اس ملغوبے سے رچرڈ برٹن کے ایا "مقدبا" کی مدد سے بھاٹوں کا نقش اٹھاتے ہیں اور اسے لفظ "دار" سے منسلک کر کے تحقیق کا حق ادا کر دیتے ہیں۔ امیر خسرو کے ایک مندرجہ ذیل فقرے کو یعنی

ہندوستانیاں کنگرہ زن چہ معلوم کنند کہ ہماں عجب رود بر سرود ایشاں دنداں سفید می کنند۔

کی تاویل، جو پروفیسر صاحب فرماتے ہیں وہ یہ ہے:

"ان سوالات میں سے جو وہ بدرالدین سے پوچھتے ہیں ایک سوال اس مقامی عجب رود کے بارے میں ہے۔ اس کا تقابل یونانی بربط سے کرنے کے بعد وہ حیرت اور اشتیاق سے پوچھتے ہیں کہ ہندوستانی کنگرہ نوازوں نے کون سی ایسی (رمز) دریافت کر لی ہے کہ وہی عجب رود ان کے ہاتھوں میں ہنستا ہے۔"[1]

یہ ترجمہ سراسر غلط ہے۔ متن کے اس فقرے میں مقامی موسیقاروں کی تضحیک اور تمسخر کا پہلو واضح ہے۔ اس فقرے کے بعد واقع ہونے والے اشعار، جن کی ترتیب فاضل مصنف نے غلط دی ہے، کے فوری بعد جو عبارت شروع ہوتی ہے وہاں مقامی موسیقاروں کو دہقانانِ ہند کہہ کر ان کی تحقیر کی گئی ہے۔

متن کی اہمیت کے پیش نظر خسرو کے اس بیان کو یہاں درج کیا جاتا ہے:

"دقائق ایں علم باریک، کہ مسلک حکمائے روم است چوں دمنح خند کہ از ورق سپید رباب و جدول رود ابریشم نا نبشتہ بتواں خواند ہندوستانیاں کنگرہ زن چہ معلوم کنند کہ ہماں عجب رود بر سرود ایشاں دنداں سپید می کنند شعر

چو ہندو نواز عجب رود خویش   بخندد عجب رود بر دست او

واز معرفت پردہ چناں بیگانہ کہ خاتون ترک از ستر پردہ و دہقانانِ ہند و از علم اصول ایشاں را چہ علم کہ اصول چرا منحصر بر چہار است و پردہ بر دوازدہ و ابریشم بر شش ۔۔۔" وغیرہ

اس دقیق علم کی کہ دانایانِ روم کا مسلک ہے باریکیاں رباب کے سفید ورق اور ابریشم (تاروں) کے رود کی جدول پر بغیر لکھے ہی پڑھی جا سکتی ہیں بھلا ہندوستانی کنگرہ زنوں کو کیا معلوم کہ وہی عجب رود ان کے سرود کی ہنسی اڑاتا ہے۔ شعر

چوں ہندو نواز عجب رود خویش   بخندد عجب رود بر دست او

: جب کوئی اہل ہند اپنا عجب رود بجاتا ہے تو عجب رود اس کے ہاتھوں میں ہنستا ہے۔

اور یہ لوگ پردہ کی شناخت سے اسی قدر بیگانہ ہیں جس طرح ایک ترک خاتون پردہ کے ڈھانپنے سے۔ ان ہندی گنواروں کو بھلا علم اصول کا کیا علم کہ اصول چار پر کیوں منحصر ہے پردہ کا انحصار بارہ پر کس لئے اور ابریشم کا چھ پر کیوں؟"[2]

---

[1] اعجاز خسروی کے اس اقتباس کے ترجمہ کے لئے ملاحظہ ہو دربار ملی اردو ترجمہ از خواجہ عبدالحمید یزدانی مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۶۶ء، ص ۱۷، جہاں مندرجہ ذیل ترجمہ دیا گیا ہے۔
"ہندوستان کے گویوں کو جو ان کے تاروں سے جلد لیر من کو زنار باندھتے ہیں اس طریقے پر برانگیختہ کریں کہ ایک ہی دفعہ مرگ بیری کی سی خوشی رکھنے والوں کے دل میں پیدا کریں۔"
یہاں اس "دار" کا کوئی ذکر نہیں جسے ہمارے فاضل مصنف اعجاز خسروی میں سے نکالنے کی کوشش میں سرگرم ہیں۔
[2] ترجمہ راقم الحروف۔ انگریزی متن کے لئے ملاحظہ ہو کتابچہ کا ص ۷-۸۔
[3] اعجاز خسروی، نول کشور، لکھنؤ ۱۸۷۶ء، رسالہ ثانی، ص ۲۸۷ جہاں سے فارسی متن لیا گیا ہے۔ تقابل فرمائیں دربار ملی، مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۶ء، ص ۵۰۔ ترجمے کے لئے ملاحظہ ہو دربار ملی، اردو ترجمہ محولہ بالا ص ۴۳۔

اس اقتباس کے مندرجہ بالا ترجمے کا تقابل اگر پروفیسر فاطمی کے ترجمے (تاویلات) سے کیا جائے تو ہم مندرجہ ذیل نتائج پر پہنچیں گے۔

(۱) پروفیسر صاحب کی فارسی دانی مشکوک ہے۔

(۲) پروفیسر صاحب نے چند نتائج پہلے سے مرتب کر لیے تھے اور ان کی تائید میں انھوں نے خسرو کے متن کا ایک مسخ شدہ ترجمہ پیش کیا ہے۔

(۳) پروفیسر صاحب موسیقی کے علم و فن سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے۔

(۴) معیاری ترجمے کے ساتھ پروفیسر صاحب کے ترجمے کے تقابل سے ان کی وہ دیانتداری جو علمی کاوشوں سے وابستہ ہوتی ہے، مشکوک ہو جاتی ہے۔

جب ہم اس کتابچے میں دیئے گئے متن کے دیگر حصوں کے تراجم یا تاویلات کو دیکھتے ہیں تو مندرجہ بالا شکوک و شبہات کو مزید تقویت پہنچتی ہے۔ ان میں مثنوی نہ سپہر کے تیسرے سپہر کے اس بند کا کچھ حصہ شامل ہے جس میں خسرو ہندوستان کی باقی ممالک پر برتری کے ثبوت میں دس دلائل دیتے ہیں آٹھویں دلیل کا تعلق موسیقی سے ہے اور اشعار یہ ہیں:

(۱)	حجت ہشت آں کہ سرودِ خوش ما	گوست بسوز دل و جاں آتش ما
(۲)	ہر ہمہ دانستہ کہ در جملہ جہاں	نیست بریں گونہ و ایں نیست نہاں
(۳)	زاں کہ بس نغمہ سرا از ہمہ سو	آمد و آورد روش ہائے نکو
(۴)	آں ہمہ از ہیچ بگر فتند یگاں	تیز دویدند در ویز نگاں
(۵)	ساختہ ہم گشتہ پریشاں قدرے	زاید ازاں زاد بسازش ہنرے
(۶)	لیک رسیدہ بحد ہند درون	گرچہ سی سال و چہل ماند فزوں
(۷)	زہرہ نبود ش کہ یکے صوت سبک	گرم بگیرد زچہ از طبع خنک

ان اشعار کے عام فہم مطالب سے ہٹ کر ہمارے فاضل مصنف نے ان میں بھی حسبِ منشا معنی آفرینی سے کام لیا ہے۔ اس سارے بند میں تیسرا شعر اہم ترین ہے لیکن پروفیسر صاحب کی نظر اس طرف نہیں گئی ورنہ وہ اس قسم کی "تاویلات" پیش نہ کرتے معنی آفرینی کے اس عمل کی انتہا مثنوی "نہ سپہر" کے مندرجہ ذیل شعر کا ترجمہ ہے:

مطرب ہندی الاون زن خوش ـــ خواں براہ ہندوی این پارسیم

اور ترجمہ ملاحظہ فرمایئے:

"THAT PRETTY ALLAWAN PLAYING HINDWI MUSICIAN TO SING HIS GHAZALS IN THE HINDWI WAY."

ترجمہ میں لفظ PRETTY کے اضافے نے وہ بات پیدا کر دی ہے جو خسرو کے خواب میں بھی نہ تھی۔ اس سے صاف طور سے یہ پہلو نکلتا ہے کہ الاون زن ایک خوبصورت خاتون ہے جس کے لیے پروفیسر صاحب PRETTY کی صفت لائے ہیں۔ وہ لفظ "زن" سے غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہیں ورنہ سیدھا سادا ترجمہ یہ ہے کہ اے ہندی مطرب الاون نواز، یا اے ہندی مطرب جو الاون بڑی اچھی بجاتا ہے۔ اصل ترکیب "الاون زن" یعنی بجانے والا ہے۔ جیسے "کنگرہ زن" جو امیر خسرو اکثر استعمال کرتے ہیں۔ صرف یہی ایک مثال ایسی ہے۔ جو پروفیسر صاحب کے استدلال کو خرخرہ کر دیتی ہے۔

اسی طرح جب وہ عبدالحمید لاہوری کے "پادشاہ نامہ" سے اقتباس دیتے ہیں تو وہاں بھی وہ معیاری تراجم سے ہٹ کر اپنی معنی آفرینی سے کام لیتے ہیں اور جہاں کوئی فقرہ انھیں اپنے پہلے سے مرتب شدہ نظریات کے خلاف نظر آتا ہے تو وہ یا تو اسے حذف کر دیتے ہیں یا اسے مشتبہ اور مشکوک قرار دے دیتے ہیں۔ اس رجحان کی نشان دہی ہم "امیر خسرو اور موسیقی" کا جائزہ لیتے وقت پہلے بھی کر چکے ہیں۔ یہاں بھی پادشاہ نامہ کا وہی فقرہ مشکوک کیا گیا ہے جسے جناب سلطان مقصود نے اپنے مضمون میں حذف کر دیا تھا۔ فقرہ ہے:

"دخیال بیش از میر نیز یک چندی بر سرائیدہ اند۔"

یہ فقرہ مولوی کبیر الدین کے مرتب کردہ نسخہ کی جلد دوم[1] میں واضح طور پر موجود ہے اور کتاب پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے۔ لیکن پروفیسر صاحب اس فقرے کو ناقابل فہم قرار دیتے ہیں (ص ۱۶ اور ۱۹۱)۔ اگر وہ ذرا تردد فرماتے تو اس پورے اقتباس کو "دربار ملی" (فارسی)[2] اور اس کے ترجمے[3] میں بھی موجود پاتے لیکن اس صورت میں ان کی تحقیق کے وہ نتائج، جو خیال کی ایجاد سے متعلق ہیں، بے معنی ہو جاتے۔

بادشاہ نامہ کے اس اقتباس کے باقی حصوں کے مفاہیم کو بھی پروفیسر صاحب نے توڑنے موڑنے کی کوشش کی ہے۔ عبد الحمید ترانے کے بارے میں کہتا ہے "سوم ترانہ کہ بے اشعار اساس آن بر یک تال گذاشتہ" ـــــ اور پروفیسر صاحب نے یہ ترجمہ کیا ہے:

(THIRD, TARANA, I.E THE SINGING OF TARANA WITHOUT (WORDS OF) COUPLETS BASED ON A SINGLE TAL.)

متن میں "بے اشعار" کا مطلب "الفاظ کے بغیر" نہیں جیسا کہ پروفیسر صاحب خیال کرتے ہیں۔ اس کا مطلب تو صرف یہ ہے کہ ترانے کے الفاظ کے لئے منظوم ہونا ضروری نہیں جیسے قول کے لئے نظم کی پابندی نہیں جیسا عبد الحمید لاہوری اس سے پیشتر کے فقرے میں کہہ چکا ہے۔ پروفیسر صاحب "الفاظ کے بغیر" کی ترکیب استعمال کر کے ترانے کو موجودہ ترانے کے ساتھ ملانے کی کوشش میں مصروف نظر آتے ہیں حالانکہ اس ترانے میں جو امیر خسرو کے وقت گایا جاتا تھا اور اس ترانے میں جو آج کل مروج ہے، زمین آسمان کا فرق ہے اور استاد امیر خاں بھی یہی کہتے ہیں کہ اس زمانے کے ترانے میں بے معنی الفاظ نہیں ہوتے تھے بلکہ [illegible] کے ساتھ ساتھ چند ایسے الفاظ بھی ہوتے تھے جو مختلف کلمات کی مخفف صورت ہوا کرتے تھے۔ اگر پروفیسر صاحب نے استاد امیر خاں کے مختلف راگوں میں ترانے سنے ہوتے تو شاید وہ استاد مرحوم پر اتنی زیادتی نہ کرتے۔ بہرحال یہ امر واقعہ ہے کہ امیر خسرو کا ترانہ اور آج کل کا ترانہ دونوں مختلف چیزیں ہیں اور سند وہی استاد امیر خاں مرحوم ہیں۔

اس اقتباس کے ایک اور حصے میں لفظ "تصنیف" استعمال ہوا ہے "چہارم تصنیفی کہ بہندوستانی زبان برگزاردہ وآں را خیال نامیدہ" (ص ۱۶)
یہاں "تصنیف" کا مطلب وہ نہیں ہے جو پروفیسر صاحب ہمیں باور کرانے کی کوشش فرماتے ہیں۔ موسیقی کے ضمن میں جہاں بھی تصنیف کا لفظ استعمال ہوا ہے وہاں عام فہم زبان میں اس کا مطلب ہے بول باندھنا جیسے نعمت خاں سدا رنگ نے موسیقی کے مختلف خیالوں کے بول باندھے فیروز خاں ادا رنگ نے مختلف راگوں کے خیالوں کے لئے بول تصنیف کئے۔ موسیقی کی ان تصنیفات کا سلسلہ بڑے عرصہ سے چلا آ رہا ہے۔ تان سین کے بعد بخشو نایک ملتا ہے جس نے مختلف راگوں کے دھروپدوں کے لئے شاہجہاں کے زمانے میں بول تصنیف کئے جو بادشاہ کو اس قدر پسند آئے کہ ان کو کتابی صورت میں مرتب کرنے کا حکم دیا۔ یہ کتاب آج بھی ہمارے ہاں "سہس رس" کے نام سے موجود ہے۔ موجودہ زمانے میں بھی ایسے ماہرین فن ملتے ہیں جنھوں نے مختلف خیالوں، ہوریوں، ٹھمریوں، دادروں، دھروپدوں کے لئے بول تصنیف کئے ہیں۔ ان میں سدا رنگ، ادا رنگ، من رنگ، ہر رنگ، پیا رنگ، سب رنگ اور اختر پیا شامل ہیں ان کی تصانیف آج بھی گائی جاتی ہیں۔

عربی اور فارسی زبانوں میں لفظ تصنیف موسیقی کے ضمن میں انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ تصنیف سے مراد موسیقی کی کسی نئی وضع یا صنف کی ایجاد و اختراع نہیں جیسا کہ پروفیسر فاطمی خیال کرتے ہیں۔ اور جب "تصنیفی" کے بعد "بہندوستانی زبان" کی ترکیب استعمال ہوتی ہے تو مطلب واضح ہو جاتا ہے اور یہ وہی ہے جو اوپر بیان ہو چکا ہے۔ چنانچہ جب "برنی" "موسیقی گفتن و ساختن" کی ترکیب استعمال کرتا ہے تو اس کا مطلب ترانہ، قوالی یا خیال کی ایجاد نہیں بلکہ اس روایت کی رو سے، جو موسیقی میں ہمیشہ چلی آئی ہے، اس کی مراد موسیقی کی مختلف اوضاع یا اصناف کے لئے بول باندھنا ہے اور حضرت امیر خسرو کے شاعر ہونے کی رعایت سے عقل سلیم کو تصنیف کے ان معنوں کو قبول کرنے میں کوئی تردد نہیں ہونا چاہئے۔ ان اقتباسات میں ترانے، خیال، قوالی، سازوں کی

---

[1] مطبوعہ کالج پریس کلکتہ ۱۸۶۸ء۔ جلد دوم ص ۶، ۷

[2] دربار ملی (فارسی) محولہ بالا

[3] دربار ملی۔ اردو ترجمہ محولہ بالا

ایجاد کو ان کے ساتھ منسوب کرنا بہت دور کی کوڑی لانے کے مترادف ہے

موسیقی میں تصنیف کی ہزاروں مثالیں مل سکتی ہیں ذیل میں ہم یہاں تان سین کی بھیروں راگ کی ایک تصنیف پیش کرتے ہیں:۔

دھروپد راگ بھیروں

سگھن بن چھائیو درم بلی مادھو بھون — اتی ہر کاش بدن بدن پشپ رنگ لہیو

کوکل کیر کپوت کھنجن انہی انند کر — چھنون ذز رنگ جھر لائیو

سپت سرن تین گرام اکیس مورچھنا — اکت بکت لاگ ڈاٹ کر دکھائیو

تان سین کہے سنو شاہ اکبر — پرتھم راگ بھیروں میں گائیو

ترجمہ: چاروں طرف جنگل ہرے بھرے ہیں اور مادھو بھون طرح طرح کی بیلوں اور رنگین پھولوں سے روشن ہو رہا ہے۔

اِدھر اُدھر سے کوئل کا میٹھا ترانا سنائی دے رہا ہے۔ چاروں طرف رنگ برس رہا ہے۔

اے شاہ اکبر ایسے خوشگوار ماحول میں میں نے بھیروں راگ سنایا ہے جو پرتھم راگ مانا جاتا ہے[۵۱]

راگ بھیروں کے دھروپد کی یہ تصنیف نامکمل ہے کیونکہ اس میں دھروپد کی استھائی، انترہ، سنچاری اور ابھوگ کے حصوں کی الگ الگ نشاندہی نہیں کی گئی اور نہ ہی یہ بتایا گیا ہے کہ یہ عبارت کس تال میں بندھی ہوئی ہے۔ بہر حال موسیقی کی تصنیف کی یہ ایک مثال ہے۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی کی کتاب "نورس" بھی موسیقی کی تصنیفات کا مجموعہ ہے۔ اس میں سے تصنیف کی مثال ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

در مقام ملار نورس

جھنن جھنن موتی خاں کی تانت گاجے — تال بردنگ بھید سوں نورس باجے

بین

اس جگ میں دو کچھ لیجئے — اک تنبورا اک کامنی کیجے

ابھوگ

ابراہیم جب دوئی برجھے یہ تب بہشت امرت کیا کروں موجھے[۵۲]

ترجمہ: موتی خاں طنبورے کی تانت سے جھنن جھنن کی جو دلکش آواز نکلتی ہے۔ اس سے طرح طرح کے راگ پیدا ہو رہے ہیں۔

اس دنیا میں دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک طنبورا اور دوسری خوبصورت عورت۔

اے ابراہیم جب تجھ کو یہ دونوں چیزیں حاصل ہوں تو بہشت یا آبِ حیات کی کیا ضرورت ہے[۵۳]

یہ تصنیف بھی ناقص ہے کیونکہ اس میں بھی تال کی وضاحت نہیں کی گئی۔

مکمل تصنیف کی مثال مندرجہ ذیل ہے:

دھروپد شدھ کلیان، چوتال (ایک قسم)

(اگانگ محمد علی خاں)

استھائی: ہادی اللہ صاحب سائیں ستار رب کریم رحیم علیم حکیم

انترا: پاک بے نیاز پاک لطیف پاک ذات

پردہ پوش، دانا بینا

۵۱۔ ابن صفا آرٹ کل، بی موسیقی نمبر، اگست ۱۹۵۸ء ص ۹۶ ۵۲۔ نذیر احمد، کتاب نورس، لکھنؤ، ۱۹۵۵ء ص ۸۸ ۵۳۔ ایضاً ص ۸۷

ہو اللہ ہو گہنت برگٹ۔ ہو اللہ ہو۔ انت ہو علیم۔[1]

موسیقی کی تصنیف کی ایک اور مثال یہ ہے:

خیال راگ درباری کانہڑا۔ تین تال۔ مدھیہ لے

استھائی: سائیں کریم رحیم پاک پروردگار
پاک پروردگار گریب کی ربّ دور کرو ڈرت اک چھن میں

انترا: جو مومن نے اچھا ہے سو پوجیو صاحب
سدارنگ دیجو دان دنی کا ہو تا تم

تصنیف: نعمت خاں سدارنگ[2]

تصنیف کی آخری مثال ہمارا قومی ترانا ہے جس کی موسیقی مرحوم احمد جی۔ چھاگلا نے ترتیب دی اور اس موسیقی میں بول حفیظ جالندھری نے بٹھائے موسیقی کی تصنیف کے تحت لکشن گیت بھی آتے ہیں۔ آج کل مقبول ترین لکشن گیت چتر پنڈت کے ہیں۔ جو شری وشنو نارائن بھاتکھنڈے کا قلمی نام تھا جس کے تحت ان کی لکشن گیتوں کی مشہور کتاب "شری ملکشیہ سنگیتم" شائع ہوئی تھی۔ تصنیف کا یہ تصور مغرب میں بھی ہے۔ وہاں لفظ COMPOSE استعمال ہوتا ہے۔ موسیقی کی ترتیب کو COMPOSITION کہتے ہیں۔ اور مرتب کو COMPOSER ۔ مغربی موسیقی کے کمپوزروں میں بڑی بڑی عظیم ہستیاں گزری ہیں جن میں باخ، ہینڈل، واگنر، موتھزارٹ اور بیتھوون شامل ہیں۔

موسیقی میں تصنیف کی ماہیت دیکھنے کے بعد عبد الحمید لاہوری کے مندرجہ بالا فقرہ کی وضاحت ہو جاتی ہے اور یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ پروفیسر فاطمی ہدف سے کتنا دور جا پڑے ہیں۔ امید ہے کہ یہ امر دانستہ نہ ہوگا۔

چنانچہ اس طرح بادشاہ نامہ کے متذکرہ اقتباس سے ایک انتہائی اہم فقرہ حذف کر کے (جس کی نشاندہی ہم اوپر کر چکے ہیں) اور لفظ تصنیف کو اس کے سیاق و سباق سے نکال کر نئی وضع دینے کے بعد آخر کار وہ اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ خیال امیر خسرو کا ایجاد کردہ ہے اور ثبوت کے لئے یہ بول درج کرتے ہیں:

(۱) حضرت خواجہ سنگ کھیلئے دھمال (۲) بیٹھ خواجہ تم بن ٹھن آئے (ص ۱۹)

لیکن اس امر کے لئے وہ کوئی سند پیش نہیں کرتے کہ وہ امیر خسرو کی تصنیف ہیں۔ اس جشن ہفت صد سالہ سے کئی سال پہلے ہی امیر خسرو کی تصانیف کے بارے میں شکوک و شبہات کا اظہار ہو چکا ہے اور کئی امور کے بارے میں محققین نے اپنا فیصلہ دے دیا تھا کہ وہ امیر خسرو سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے۔ ان میں خالق باری، قصہ چہار درویش، کہہ مکرنیاں، انمل، پہیلیاں، دوسخنے، ڈھکوسلے وغیرہ اور "ز حال مسکیں مکن تغافل" والی غزل شامل ہیں۔ چنانچہ ان بولوں کو بھی اگر ہم حافظ محمود شیرانی والے معیاروں پر پرکھیں تو شاید یہ امیر خسرو کی تصانیف ثابت نہ ہوں۔ ہمارے ہمسایہ ممالک میں امیر خسرو پر جو کام ہو رہا ہے اس میں بھی صاف طور پر کہا گیا ہے کہ:

"امیر خسرو کے ہندوی کلام اور ان کی موسیقی سے متعلق بھی متضاد و مختلف مواد کو تحقیق کے نئے اصولوں کی روشنی میں پرکھنے کی ضرورت ہے۔ ہندوی کلام سے متعلق حافظ محمود شیرانی نے جن شکوک و شبہات کا اظہار کیا ہے اور جو اعتراضات اٹھائے ہیں وہ حرف آخر بن کر رہ گئے ہیں۔ ان کو تسلیم کرنا ہوگا یا رد کرنا ہوگا۔"[3]

چنانچہ ان شکوک و شبہات کے پیش نظر سند کے فقدان کی وجہ سے اور خود ان بولوں کی جدید زبان کے پیش نظر ان کو خسرو کی تصنیف ماننا ذرا

---

[1] محمد نواب علی خاں: معارف النغمات، حصہ دوم، لکھنؤ، بے تاریخ ص ۱
[2] وشنو نارائن بھاتکھنڈے: کرامک پستک مالیکا، چوتھا حصہ، ہاتھرس، ۱۹۵۵ء ص ۶۵۳
[3] شیخ سلیم احمد: امیر خسرو، ادارہ ادبیات دلی، جنوری ۱۹۷۵ء مقدمہ ص د

مشکل کام ہے۔ حضرت نظام الدین اولیا کے عقیدت مند صرف امیر خسرو نہیں تھے۔ وہ چشتیہ سلسلے سے تعلق رکھتے تھے۔ اس تعلق کی وجہ سے بیشتر قوال اور موسیقار ان کے عقیدت مند ہیں۔ ممکن ہے موجودہ دور میں کسی ایسے ہی موسیقار نے یہ بول تصنیف کر کے امیر خسرو کے نام جوڑ دیئے ہوں۔ ان سات سو سال میں خسرو کا کلام الحاقی عناصر سے پاک نہیں رہ سکا۔[1]

ہمارے فاضل مصنف کی معنی آفرینی کا شاہکار ابو الفضل کے اس فقرے کی تاویل ہے: "و آنچہ بدہلی خوانند قول و ترانہ نامند روشی است امیر خسرو دہلوی بہمزبانی صامت و تاتار برروئے کار آوردہ و نقش فارسی و ہندی بہ گرفتہ عشرت افزا شدہ۔" ص ۴[2]

اس فقرے بلکہ پورے بیان میں دھرپد کا لفظ استعمال نہیں ہوا اور پروفیسر صاحب نے "سے اپنی طرف سے چپکا دیا ہے۔ اس فقرے کا جو ترجمہ پروفیسر صاحب نے کیا ہے وہ یہ ہے:

(THE STYLES (OF DHRUPAD) THAT ARE SUNG AT DELHI ARE CALLED QAUL & TARANA. THIS IS THE STYLE WHICH WAS INTRODUCED BY AMIR KHUSRAU DIHLAWI HAVING MIXED THE IDIOMS OF SAMIT AND TATAR WITH THAT OF DHRUPAD. THUS BY COMBINING THE PERSIAN AND HINDI FORMS HE CREATED A DELIGHT FUL VARIETY-). P.15.

ابو الفضل "آئین اکبری" میں مختلف علاقوں کی موسیقی کی اوضاع کا بیان شروع کرتا ہے تو اس میں چھند، دھرد، بنگلا، چٹکلا کا ذکر کرتا ہے اور ان کی علاقائی مناسبت بتانے کے بعد دہلی کے نواح کی موسیقی کا تذکرہ کرتا ہے جو اوپر دیا گیا ہے اور اس فقرے کے فوراً بعد ہی وہ بشن پد، لہچاری، چھند، جکری اور کرک کا ذکر کرتا ہے اور ان کی علاقائی مناسبت بتاتا ہے، لیکن وہ اس سارے بیان میں دھرپد کا لفظ استعمال نہیں کرتا۔ دہلی کے نواح میں گائی جانے والی چیزوں کو وہ قول اور ترانے کا نام دیتا ہے، جو دھرپد کا شائل نہیں۔ دھرپد ہماری سنجیدہ ترین موسیقی کی ایک وضع ہے اور قول اور ترانہ دوسری اوضاع ہیں۔ دونوں کا آپس میں کوئی تعلق نہیں۔

لیکن پروفیسر صاحب قول اور ترانے کو دھرپد کا اسٹائل یا اسلوب گردانتے ہیں۔ اس فاش ترین غلطی سے قطع نظر ان کی غلط تاویلات کا کمال صامت و تاتار کی تاویل ہے۔ ابو الفضل کے لئے تو صامت اور تاتار گوشت پوست کے دو موسیقار تھے اور ابو الفضل کے مترجموں نے بھی انہیں ماہرین موسیقی تسلیم کیا۔ لیکن ہمارے پروفیسر فاطمی صاحب انہیں اسلوب یعنی (IDIOM) قرار دیتے ہیں۔ یہ ان دونوں صاحبان کے ساتھ بڑی زیادتی ہے۔ اس کتابچہ میں صرف اسی جگہ ہی نہیں بلکہ ایک اور جگہ پر بھی صامت و تاتار کو (IDIOM) یعنی اسلوب یا روش گردانتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

HE MIXED THE PERSIAN MUSICAL IDIOM NAMELY SAMIT AND TATAR WITH ABOVE MENTIONED HINDWI RAG.............P.25.

موسیقی کی تمام تاریخ میں اس سے زیادہ انوکھی، اس سے زیادہ غلط اور اس سے زیادہ گمراہ کن تاویل آج تک دیکھنے میں نہیں آئی۔ اس کی تفصیل یوں ہے کہ صامت اور تاتار دو موسیقار تھے۔ اگرچہ جیرٹ ان کی نشاندہی کرنے سے قاصر رہا[2]۔ لیکن ہماری دوسری کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ صامت مطربوں کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے لڑکے کا نام حسن بھیدی تھا۔ "یہ باپ بیٹے عجیب قسم کے قوال تھے۔ حسن بھیدی کی آواز میں بلا کا سوز تھا۔ وہ گانا شروع کرتے ہی لوگوں کے دلوں میں آگ سی بھڑکا دیتا تھا۔"[3] افسوس کا مقام ہے کہ ہمارے فاضل مصنف نے انہیں انسان سے IDIOM میں تبدیل کر دیا۔

۱۔ اس ضمن میں ملاحظہ ہو۔ نواب محمد اسحاق خاں کا مقالہ: "ترتیب کلیات امیر خسرو" جو شیخ سلیم احمد کی "امیر خسرو" محولہ بالا میں دوبارہ شائع ہوا، کا حصہ بعنوان "تحقیق تعلقات"۔ "امیر خسرو" محولہ بالا کتاب۔ ص ۵۰۳ تا ۴۰۲ برائے کلام ہندی ص ۴۱۸ خصوصاً

۲۔ آئین اکبری۔ مترجمہ جیرٹ۔ رائل ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ ۱۸۹۴۔ جلد سوم ص ۲۵۲۔ حاشیہ نمبر ۱

۳۔ بحوالہ جلد دوم عروج خسرو۔ خسرو اور عہد خسرو۔ کراچی۔ ۱۹۷۵ء۔ ص ۱۶۰

سیف خاں فقیر اللہ کے "راگ درپن" کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ اس کا تجزیہ کرتے وقت پروفیسر صاحب نے موسیقی کے اوضاع اور مقامات کو خلط ملط کر دیا ہے، ان کی اطلاع کے لئے عرض کر دینا ضروری ہے کہ جن بیس چیزوں کی فہرست سیف خاں فقیر اللہ کے حوالے سے انھوں نے امیر خسرو کی ایجادات کی دی ہے، اس میں سے پہلی آٹھ چیزیں یعنی قول، ترانہ، خیال، نقش، نگار، بسیط، تلانہ اور سوہیلا موسیقی کی اوضاع ہیں اور باقی ایرانی موسیقی کے مقامات ہیں۔

امیر خسرو نے تاروں کے ایک ساز الاون کا ذکر کیا ہے۔ یہ لفظ نظم اور نثر دونوں میں استعمال ہوا ہے لیکن سو سال بعد یہ لفظ بدل کر الائن ہو گیا[۱]۔ اس کے بعد ہمیں اس ساز کا ذکر موسیقی کی کتابوں میں نہیں ملتا۔ پروفیسر فاطمی کے خیال کے مطابق یہ ساز الابو وینا، یا الادو وینا کی کوئی شکل ہے جس کا ذکر ان کے خیال کے مطابق ہمیں سوتروں میں ملتا ہے لیکن اس کے لئے وہ کوئی سند پیش نہیں کرتے اور نہ ہی کوئی حوالہ دیتے ہیں۔ اگر واقعی الاون یا الائن وہی ساز ہے جس کی نشاندہی پروفیسر صاحب کر رہے ہیں تو الابو وینا یا الادو وینا سے اس کا الاون بن جانا حیرانی کی بات ہے۔ الفاظ کی ہیئت بدلتی رہتی ہے خصوصاً جس وقت دو تہذیبیں یا دو تمدن آپس میں متصادم ہوں لیکن الفاظ کی ہیئت کی یہ تبدیلی چند اصولوں کے تحت واقع ہوتی ہے۔ الابو وینا کا الاون اور پھر الائن بن جانا ان اصولوں کے تحت ثابت نہیں ہوتا۔ بہر حال یہ تبدیلی مزید تلاش اور جستجو کی طلبگار ہے۔ ویسے موسیقی کی کتابوں میں الابو وینا کا ذکر دیکھنے میں نہیں آتا۔ اسی الاون کو ہمارے مصنف نے آگے چل کر ایک قسم کے ستار کے مشابہ تسلیم کیا ہے اور اس طرح ایک متنازعہ مسئلہ جس کے بارے میں خسرو خود خاموش ہے، بحث میں داخل ہو جاتا ہے اور قاری غیر شعوری طور پر اس دعوی کو ماننے کے لئے تیار ہو جاتا ہے کہ ستار امیر خسرو کی ایجاد ہے لیکن بین السطور دیکھنے سے یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ تحقیق و جستجو کا آغاز کرنے سے پہلے ہی فاضل مصنف نے چند ایک امور پہلے سے ہی طے کر لئے تھے اور اس طرح ان کی تحقیق ان کے مرتب شدہ نتائج کے لئے دلائل فراہم کرنے تک ہی محدود ہو کر رہ گئی۔

ستار اور طبلہ کا ناتا امیر خسرو سے جوڑنے کے بعد کتاب کے آخر میں وہ ایک طویل زقند بھر کے ماضی کی طرف لوٹ جاتے ہیں جہاں حجری نقوش میں انہیں ستار اور طبلہ نظر آتا ہے۔ سند وہ پروفیسر داآئی سے لاتے ہیں۔ پروفیسر داآئی برعظیم کے ماہرین آثار قدیمہ میں سے پہلے شخص ہیں جنھیں ان حجری نقوش میں ستار اور طبلہ نظر آتا ہے اور وہ بھی اس زمانے کے قریب جب جشن امیر خسرو برپا ہوا، ورنہ اس سے پہلے کسی بھی ماہر آثار قدیمہ کو ان حجری نقوش میں طبلہ یا ستار نظر نہیں آیا۔ اس چیز کے باوجود کہ ان حجری تصاویر میں وینا کے مختلف نقوش، ڈھولوں کے مختلف نمونوں کے نقوش، بانسریوں، تھالیوں، گھنٹیوں کے نقوش اور غنائی ترنم کی ابتدائی صورتوں کی نشاندہی ہو چکی ہے، پروفیسر داآئی کے یہ نتیجہ مرتب کرنے کی وجہ شاید یہ ہو کہ وہ وینا اور اس کی مختلف صورتوں سے ناواقف ہوں۔ وینا کی کئی صورتوں کی نشاندہی ہو چکی ہے جن میں آڑی اور ترچھی رکھ کر بجائی جانے والی وینا ئیں بھی شامل ہیں۔ شاید ان میں سے ہی کسی وینا کے بارے میں دونوں پروفیسر حضرات کو ستار کا گمان گزرا ہے۔ طبلہ تو خیر نام ہی سے مشرق وسطیٰ کی چیز معلوم ہوتا ہے۔ اس کا ان حجری نقوش میں موجود نظر آنا بینائی کی غلطی بھی ہو سکتی ہے۔

ستار کی ظاہری ہیئت اور وینا کی ظاہری ہیئت میں بہت مماثلت ہے۔ لکڑی، تونبے، تاروں اور مضراب کا استعمال مشترک ہے۔ تصویروں یا حجری نقوش میں ستار یا وینا میں امتیاز کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ وینا کی بہت ساری اقسام ہیں اور ان میں بیشتر ہمیں حجری نقوش میں ملتی ہیں اور جن حجری نقوش کا ذکر یہ پروفیسر صاحبان کر رہے ہیں ان میں ستار کی نہیں بلکہ انہی مختلف ویناؤں کی تصاویر ہیں۔ پروفیسر صاحبان کی اطلاع کے لئے یہ عرض کر دینا سود مند ہو گا کہ وینا ہندوستان ہی کا نہیں بلکہ شرق الاوسط کا قدیم ترین ساز ہے۔ ہندوستان میں اس کی نشاندہی رگ وید (۲۵۰۰ ق م سے ۲۰۰۰ ق م) میں کی گئی ہے جہاں لفظ وَنَ استعمال ہوا ہے۔ یہی لفظ ہمیں اتھروید میں بھی ملتا ہے۔ سینٹ پیٹرس برگ ڈکشنری میں وَنَ یا وَانا کا مطلب بانسریوں کی موسیقی ہے۔ لیکن بعد کی سمہتاؤں اور برہمنوں میں اسی لفظ کا مفہوم بدل جاتا ہے اور وہاں یہ بربط یا چنگ کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے جس میں سو تاریں ہوتی تھیں، اور جو بھارت کی مذہبی رسوم میں استعمال ہوتا تھا۔ یجروید کے حوالے سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہاں وینا وادکا بمعنی وینا بجانے والے کے لئے استعمال ہوا ہے، جو پرسامیدھ (انسانی قربانی) یگ کے وقت دوسرے قربان ہونے والے لوگوں میں شامل تھا۔ مختلف سمہتاؤں اور برہمنوں میں لفظ وینا استعمال ہوا ہے۔ اتریا ایرانیکا سے پتہ چلتا ہے کہ اس ساز پر بالوں والی کھال

---

[۱] بحر الفضائل (مخطوطہ) مخزونہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری۔ باب دوازدہم فصل سوم

منڈھی ہوا کرتی تھی۔ اسی سے اس وقت کی وینا ؤں کے مختلف حصوں کا پتہ چلتا ہے، یعنی سر گردن، خلا (یعنی کدو یا تو نبا) تاریں یا مضراب۔ ست پتھا براہمن میں وینا کو "اترا مندیرا" بھی کہا گیا ہے جو وینا کے علاوہ کسی سا گتی کا نام بھی ہو سکتا ہے۔ اسی براہمن میں "وینا گا تا گن" سے مراد سازوں کا امام یا کنڈکٹر ہے۔ باقی براہمنوں میں "وینا گاتھن" سے وینا بجانے والے مراد ہیں۔ وینا کا ذکر مندرجہ ذیل قدیم کتابوں میں ملتا ہے:

تے تریہ سمہتا: چہارم ۱-۳-۱

کتھکا سمہتا: سی و چہارم ۵

میتریانی سمہتا: سوم-۶-۸

ست پتھا براہمن: سوم ۲-۴-۶

سانکھیانا سوروتا سوترا: ہفدہم-۳-۱......وغیرہ

ایتریا براہمن میں ہمیں دو قسم کی وینا ؤں کا ذکر ملتا ہے۔ دائیوی اور مانوشی یعنی دیوتاؤں کی اور انسانوں کی وینائیں۔

رامائن (۴۰۰ ق م) میں بھی وینا کا ذکر آتا ہے۔ پانینی نے بھی اپنے "است ادھیائے" میں وینا کا ذکر کیا ہے۔ اس نے لفظ "اپ وینا تی" استعمال کیا ہے جس سے اس کی مراد وینا کے ساتھ ساتھ گانا ہے۔ اس زمانے میں وینا شاید گلوکاری میں ساتھ کے طور پر استعمال ہوتی ہوگی کیونکہ پانینی لفظ "اپاوینم" بھی استعمال کرتا ہے جس کا مطلب ہے وینا کے بغیر گانا۔

جتا کا لٹریچر میں بھی وینا کا ذکر آتا ہے۔ ان مذہبی کتابوں سے قطع نظر ہندوستان میں موسیقی کا ادب بھی مرتب ہوتا رہا "ذرنٹ شاستر" کے بعد سے لگاتار اور مسلسل ہر زمانے میں موسیقی پر نظریاتی اور نصابی کتب مرتب ہوتی رہیں۔ چنانچہ موسیقی کی ان کتابوں میں وینا کا تذکرہ بڑی باقاعدگی سے آتا رہا اور ہر مصنف نے اپنے زمانے کی وینا ؤں کا ذکر کیا ہے۔ "نٹ شاستر" میں وینا شرتیوں اور گراموں کے مسائل حل کرنے کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ "نٹ شاستر" کے کافی بعد یعنی تقریباً بارھویں یا تیرھویں صدی میں پرسادیو نے چالا وینا، کناری وینا، گھوپوروکیا وینا اور ورہت کناریکا وینا کا ذکر کیا۔ اس نے وینا بجانے کے دس اسلوب بھی بتائے ہیں جن میں سے کچھ درج ذیل ہیں:

چندا، کامرکلا، واسوپوروکیا، گج لیلا، پاری وادنم۔

ناردُ سنگیت مکرند میں مندرجہ ذیل وینا ؤں کا ذکر کرتا ہے:

کچاپی، کب جیکا، چتارا، پاری وادنی جایا، گھوساوتی، جیے سیتا، ناکلی، مہانی، ویشناوی، براہمی، رردرا، رادنی، سرسوتی، کناری، سوزندری، گھوشکا وغیرہ۔

سارنگ دیو کے ہاں ہمیں اس کے زمانے کی مخصوص وینا ؤں کا ذکر ملتا ہے۔ وہ وینا ؤں کو دو مختلف زمروں میں تقسیم کرتا ہے۔ شروتی وینا اور سُور وینا۔ ان دو مختلف اقسام کے تحت وہ مندرجہ ذیل وینا ؤں کا ذکر کرتا ہے:

اکتری، نکولا، ترانی، تنتری چتارا، وی پانچی، ماتا کو کیلا، الاپنی، کناری، پناکی۔

اس نے خود بھی ایک وینا کا ڈیزائن تیار کیا تھا جس کا نام اس نے بسانکا وینا رکھا تھا۔

ان وینا ؤں کے علاوہ ہمیں اس ساز کے دیگر مختلف صورتیں بھی نظر آتی ہیں جن کے نام یہ ہیں:

کچاپی وینا، ادمبری وینا، کشونی وینا، گودھا وینا، ہنگا وینا، دانا وینا، پی پورا وینا، دراوی وینا، گاتری وینا، مہاتی وینا، چتارا وینا، وی پانچی وینا، ردرا وینا، ناد لہر وینا، کت یایانا وینا، کھدرا وینا، سپت تنتری وینا، سرسوتی وینا، سوک تاکا وینا، گوٹے وادیم۔

ان کوائف سے پتہ چلتا ہے کہ وینا ایک ایسا ساز ہے جس کی کئی قسمیں ہیں اور ان کی تعداد کے پیش نظر ان کے مشاہدہ میں دھوکا اور غلط فہمی کا

کافی امکان ہے۔ خصوصاً اس وقت جب دیکھنے والے کے ذہن میں اس ساز کا پس منظر نہ ہو۔

انڈس وَیلی کی تہذیب (یعنی چار ہزار ق م سے تین ہزار ق م تک) ہمیں وینا کے آثار ملتے ہیں۔ برعظیم میں مختلف مقامات پر حجری نقوش میں جا بجا وینا کے آثار ملتے ہیں۔ بھرہت، اجنتا، سانچی، امراوتی، بھوبنیشور، ناگرجا ناکنڈ، مہاولی پورم، چیدمبورم اور بنگال کے کئی حصوں میں ایسے نقوش کی نشاندہی ہو چکی ہے۔ بھروہت کے آثار دوسری صدی قبل مسیح سے تعلق رکھتے ہیں۔ اجنتا کا زمانہ دوسری صدی سے ساتویں صدی عیسوی ہے۔ کمان کی شکل کی وینا کے نقوش ہمیں سمدرگپت کے سکوں پر ملتے ہیں جس کا تعلق چوتھی صدی عیسوی سے ہے۔ دویرکے مقام پر بنی ہوئی وینا برآمد ہوئی ہے۔ ان آثار کا تعلق دو ہزار قبل مسیح سے لے کر ۲۰۰ عیسوی تک ہے۔ گندھارا اور امراوتی کے حجری نقوش میں وینا کی شکل قدرے مختلف ہے اور وہ سرود سے زیادہ مماثل ہے۔ اسی قسم کی وینا کے نقوش ہمیں ناگرجاناکنڈ میں بھی نظر آتے ہیں۔ یہی وینا چین اور وسطی ایشیائی ممالک کے آثار قدیمہ میں بھی نظر آتی ہے۔ شرق الاوسط میں بھی وینا ایک مقبول ساز تھا۔ گالپن کے خیال کے مطابق یہ سمیریائی تہذیب سے متعلق ایک اہم ساز تھا۔ اور اس کا نام بھی (یعنی "ون" یا "بن" سمیریائی زبان سے تعلق رکھتا ہے۔ مشرقی ایشیائی ممالک میں بھی ہمیں وینا کا سراغ ملتا ہے۔ مہاولی پورم اور بنگال کی ویناؤں میں دو کدوؤں کا استعمال ہوا ہے۔

ان کوائف سے وینا کی اہمیت، قدامت اور مقبولیت واضح ہو جاتی ہے۔ پتا نہیں ان ویناؤں میں ہمارے پروفیسر صاحبان کو ستار کیسے نظر آگیا جب کہ ستار کا تذکرہ پہلی دفعہ المسعودی "مروج الذہب" میں کرتا ہے اور اس کے بعد اس کی نشاندہی "کنز التحف" میں ہوتی ہے۔

ستار خراسان کا عوامی ساز تھا۔ جب یہ ہمارے ہاں آیا تو سنجیدہ موسیقی میں اس کا کوئی مقام نہ تھا لیکن مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ اس کی نغمگی کے امکانات دریافت ہوتے چلے گئے اور اس کو بجانے کی تکنیک میں بتدریج اضافہ ہوتا چلا گیا۔ پہلے پہل یہ عوامی نغمات کے ساتھ سنگت کے لئے استعمال ہوتا ہوگا (جیسے آج بھی ہلکی پھلکی موسیقی کے ساتھ نغمے کے بول ستار پر ساتھ ساتھ بجائے جاتے ہیں) امتداد زمانہ اور تکنیک کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس کی اپنی گتیں تصنیف ہونی شروع ہوئیں تو یہ اس مقام پر پہنچی جہاں یہ آج ہے۔ ستار کا تذکرہ ہمیں سترھویں اٹھارویں صدی تک کہیں نظر نہیں آتا۔ بعینہٖ یہی سازوں کے اندر پوشیدہ امکانات کے بتدریج انکشافات کی کہانی ہمارے دوسرے ساز یعنی شہنائی، بانسری، الغوزہ دہراتے نظر آتے ہیں۔

شہنائی بہت پرانا ساز ہے۔ مسلمانوں کے ساتھ یہ برعظیم میں داخل ہوا لیکن یہاں کی سنجیدہ موسیقی کا حصہ نہ بن سکا۔ شادی بیاہ اور نوبت خانوں میں تو یہ ضرور بجائی جاتی تھی لیکن ہماری کلاسیکی موسیقی کا جزو نہ بن سکی تا آنکہ یہ استاد بسم اللہ خاں کے ہاتھ لگی جس کی خصوصی توجہ سے آج یہ ہماری کلاسیکی موسیقی کا جزو بن گئی۔

بانسری وینا کے قدیم ترین سازوں میں سے ہے۔ ہندوؤں کے ہاں اس کا مقام مذہبی روایات کی وجہ سے بہت اونچا ہے لیکن مہابھارت کے زمانے سے لے کر بیسویں صدی تک یہ کلاسیکی موسیقی کا حصہ نہ بن سکی۔ پنالال گھوش نے بانسری کو وہ مقام عطا کیا کہ شہنائی کی طرح یہ کلاسیکی موسیقی کے اظہار کا ذریعہ بن گئی۔

لہ وینا پر مزید تحقیقات کے لئے ملاحظہ ہو:

(۱) سوامی پراجنانن آنند، ہسٹاریکل ڈویلپمنٹ آف انڈین میوزک۔ راماکرشنا ویدانت مٹھ، کلکتہ۔ ۱۹۶۰ء۔ باب دہم

(۲) بیوارا ماموری کا مضمون "ہندوستانی موسیقی کے ساز" (انگریزی) مطبوعہ پروگرام سنگیت سمیلن۔ ۱۹۵۰ء ص ۵ تا ۱۰

(۳) سمبھا موری: ساؤتھ انڈین میوزک۔ مدراس ۱۹۵۴ء جلد چہارم ص ۲۴۵ اور جلد پنجم ۱۹۵۱ء ص ۱۵۶

(۴) ویناؤں کی مختلف صورتوں کے لئے سوامی پراجنانن آنند کی محولہ بالا کتاب کے علاوہ دیبابرتا مکرجی کے ویناؤں کے خاکے جو ولیم جونز اور ایس دلرڈ کے مقالات کے ساتھ بعنوان "میوزک آف انڈیا" سوسیل گپتا نے کلکتہ سے ۱۹۶۲ء میں شائع کئے۔

الغوزہ بھی مسلمانوں کا ساز ہے اور ہمارے ہاں عوامی موسیقی کا ایک اہم ساز، لیکن کلاسیکی موسیقاروں نے اسے اپنانے کی کوشش نہ کی۔ رفتہ رفتہ جب اس کے غنائی امکانات روشن ہوئے تو صدیوں کے بعد استاد خمیسو خان کے ہاتھوں اسے کلاسیکی موسیقی کے لئے منتخب ہونے کا اعزاز نصیب ہوا۔

جس طرح یہ ساز ترقی کی منازل طے کر کے کلاسیکی موسیقی کا حصہ بنے اسی طرح ستار بھی کہیں سترھویں صدی کے اواخر میں اس منزل پر پہنچی۔ یہی وجہ ہے کہ امیر خسرو سے لے کر اٹھارویں، انیسویں صدی عیسوی تک ہمیں نہ تو کہیں ستار کا ذکر نظر آتا ہے اور نہ ہی کسی معروف ستار نواز کے نام کا پتہ چلتا ہے لیکن انیسویں صدی میں بڑے بڑے اور معروف ماہرین فن کا نام اس ساز کے ساتھ منسلک ہو جاتا ہے۔

زیر نظر کتابچہ کے اس حصہ میں فاضل مصنف نے علم الانسان یعنی ANTHROPOLOGY سے بھی استنباط کیا۔ ہماری موسیقی میں اس زاویہ سے اس علم کو دیکھنا ابھی رائج نہیں ہوا۔ علم الانسان کا اطلاق علم موسیقی پر باقی ممالک میں نہایت عمدہ اور صحت مند نتائج برآمد کر چکا ہے۔ اس کتابچہ کے فاضل مصنف نے اس امر میں ہمارے ہاں پہل کی ہے اور وہ اس کے لئے مبارک باد کے مستحق ہیں۔ باقی محققین بھی اگر موسیقی پر اس زاویہ سے نگاہ ڈالیں تو کوئی وجہ نہیں اس قسم کے اُلجھے ہوئے مسائل حل نہ ہو سکیں۔

ہماری تاریخ کے ہر دور میں، خصوصاً مغلوں کے ہاں تصویر سازی کا بڑا چرچا رہا ہے۔ ان تصاویر کے مختلف مرقعوں میں ہمیں ایسی تصاویر بھی ملتی ہیں جن میں جشن برپا ہیں اور جا بجا موسیقی کے مختلف ساز نظر آتے ہیں۔ موسیقی میں راگ مالاؤں کا سلسلہ بھی برسوں سے باقاعدگی کے ساتھ جاری ہے۔ لیکن آج تک موسیقی کے کسی محقق کی توجہ اس طرف نہیں گئی۔ ان تصاویر کا مطالعہ اور مشاہدہ اس قسم کے متنازعہ مسائل کے حل کرنے میں کافی سود مند ہو سکتا ہے۔ کم از کم ہمیں ان تصاویر کو گہری نظر سے دیکھنے سے مختلف مزامیر کی تاریخ کو مرتب کرنے میں کافی سہولت ہو سکتی ہے۔

اس کتابچہ کے فاضل مصنف نے "غرۃ الکمال" میں واقع ہونے والے مشہور قطعہ کا صرف حوالہ دینے پر اکتفا کیا ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ اس قطعہ کو اتنی اہمیت نہیں دی گئی جتنا کہ اس کا حق تھا۔ موسیقی پر امیر خسرو کی یہ اہم ترین تحریر ہے۔ یہی ایک قطعہ ہے جس سے ان کا نظریہ فن، ان کا شاعری اور موسیقی سے رشتہ، ان دونوں کی اہمیت اور باہمی رشتہ، ان کی اپنی موسیقی دانی کا اعلان اور اس پر لکھنے اور نہ لکھنے کے بارے میں شہادت، موسیقی اور الفاظ کا رشتہ وغیرہ کے بارے میں استنباط کیا جا سکتا ہے اور موسیقی کی ان روایات کے انبار جو پچھلے تین سو سال سے ان کی ذات گرامی کے ارد گرد بلیشہ ور لوگوں نے لگا رکھے ہیں، منطق کی صرف ایک ہی ضرب سے تنکوں کی طرح بکھر جاتے ہیں اور تمام غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جاتا ہے۔ اس قطعہ سے زیادہ اہم داخلی شہادت ہمیں آج تک دستیاب نہیں ہوئی۔ لیکن افسوس کہ پروفیسر قاسمی نے اسے بالکل نظر انداز کر دیا اور اس کی تحلیل و تجزیہ سے گریز کیا۔ جس کی وجہ شاید یہ ہو کہ پروفیسر صاحب موسیقی کے نہیں بلکہ علم کلام کے میدان کے غازی ہیں۔ وہ نتائج پہلے مرتب کرتے ہیں اور ان کے ثبوت میں دلائل و براہین بعد میں فراہم کرتے ہیں۔ وہ ایک سائنس داں اور محقق کی طرح سراسر معروضی معیاروں پر انحصار کرتے تو ان تمام نتائج سے جو انھوں نے پہلے سے مرتب کر رکھے تھے، ایک بے نیاز اور بے پروا حقیقت پسند کی طرح، سچائی کے راستے پر گامزن ہو جاتے۔

مثال کے طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس قطعہ میں امیر خسرو کے خیال کے مطابق موسیقی الفاظ کی محتاج ہے۔ اگر یہ نظریہ درست ہے تو ساز اور سازندوں کا موسیقی میں کوئی مقام نہیں۔ ان کی حیثیت سراسر ثانوی ہو جاتی ہے۔ اس صورت میں وہ ستار کی ایجاد کی طرف کیونکر راغب ہو سکتے تھے۔

اسی طرح ان کا یہ کہنا کہ موسیقی الفاظ کی محتاج ہے اس زمانے کی موسیقی پر ایک اہم فتویٰ ہے۔ اور اگر ایسا ہی تھا تو ترانہ اور خیال کا اس صورت میں جس میں آج یہ ہمارے ہاں موجود ہیں، وجود نہ تھا۔ اس لئے ان کی ایجاد ان کی ذات سے منسوب کرنا ایک غیر منطقی فعل ہے۔

موسیقی الفاظ کی قید و بند سے اس وقت آزاد ہوئی جب خیال وجود میں آیا اور ترانے نے موجودہ وضع اختیار کی ورنہ امیر خسرو کے زمانے کی موسیقی، جو بقول برنی قول، غزل، حب اور کیلانی تک محدود تھی، الفاظ کی گرفت سے آزاد تھی۔ موسیقی کو یہ آزادی بہت بعد میں حاصل ہوئی اور اس کے کئی عوامل تھے۔

بہر حال یہ زاویہ ہائے نظر ہیں جن کی ایک نہایت عمدہ بنیاد یہ قطعہ فراہم کر سکتا ہے۔ اور اگر پروفیسر فاطمی ان زاویوں سے اس زمانے کی موسیقی اور ماحول کو دیکھتے تو شاید اس قسم کے نتائج مرتب کرنے سے گھبراتے جن کا پرچار وہ اس کتابچے میں کرتے ہیں۔

پہلے بھی کہا جا چکا ہے کہ انسان اپنے دوستوں سے پہچانا جاتا ہے اور مصنف اپنی کتابیات سے۔ اس کتابچہ کی تیاری میں ہمارے فاضل مصنف نے بندو پادھیائے، منشی کرم امام خاں، سیف خاں فقیر اللہ، نقی محمد خاں خورجوی، نرگس ناہید، ایس۔ این۔ جید رضوی، شاہد احمد دہلوی اور قاضی ظہور الحق وغیرہ قسم کے مصنفین کی آرا پر بھروسہ کیا ہے۔ نتیجہ ان کے سامنے ہے۔ ان حضرات میں سے ایک صاحب بھی ایسے نہیں جنھوں نے موسیقی کا مطالعہ بحیثیت ایک شعبۂ علم کے کیا ہو اور کوئی واضح نتائج مرتب کئے ہوں۔ ان میں سے اکثر نے صدیوں پرانی، سینہ بسینہ روایات کی تکرار مسلسل کا اعادہ کیا ہے اور جیسا ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں ان میں اکثر تو علمی قزاقی کی بدترین مثالیں ہیں اور باقی ماندہ موسیقی کی صرف مبادیات تک محدود ہیں۔

دراصل امیر خسرو سے متعلقہ تحقیقاتِ موسیقی پر قلم اٹھانے سے پہلے فارسی ادب اور شاعری کے علاوہ علم تاریخ اور علم موسیقی سے مناسب واقفیت ضروری ہے کیونکہ اس مقام پر تینوں علوم کی سرحدیں ملتی ہیں۔ ان تینوں علوم میں سے کسی ایک سے بھی عدم واقفیت کی بنا پر آدمی بھٹک سکتا ہے اور تاریخ اس امر کی شاہد ہے۔

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اس کتابچہ میں اور کتاب امیر خسرو اور موسیقی میں جسے ادارہ تحقیق موسیقی لاہور نے شائع کیا، ہماری موسیقی کی تاریخ کو ایک غلط تناظر میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگر مصنف ذہنی سہل انگاری کو بالائے طاق رکھ کر اور عقیدت مندی کے جذبات سے مغلوب ہوئے بغیر اقلیم موسیقی کے مختلف شعبوں پر محققانہ نظر ڈالتے تو انہیں اپنے قومی احساس برتری کی تسکین کے لئے ایک نہیں کئی امیر خسرو مل جاتے۔ ان میں شیخ باجن، قاضی محمود دریائی، شیخ احمد نہروانی، آدھین بھدوی، میراں مدھو نایک، شیخ بہاء الدین ذکریا ملتانی، نعمت خاں سدا رنگ، فیروز خاں ادا رنگ، جیلی بنگوری، موجود الدین اور عبد الکریم خاں شامل ہیں۔

یہ کتابچے حکومت کے ایما پر مرتب ہوئے ہیں۔ اگر حکومت انہیں واپس لے کر تلف کر دے تو موسیقی پر یہ ایک بہت بڑا احسان ہوگا۔ اس سے آئندہ نسلوں کی گمراہی کا اندیشہ جاتا رہے گا اور ہم جگ ہنسائی سے بچ جائیں گے۔

سجناں وی مرجانا

حسین شاہد

بس کوچ سٹیشن وکٹوریہ (لندن) سے نکلی، چند منٹوں تک ٹیمز کے کنارے کنارے چلتی رہی، ایک جگہ ٹریفک کا سرخ سگنل تھا۔ وہاں بس رکی تو ٹیمز کا ایک پُل فنکارانہ ترغیب لیے کر میری نظروں کے سامنے تھا۔ میں نے اس لمحے کو فوراً کیمرے میں بند کر لیا۔ کیمرہ پاس ہو تو پل کو قلمبند کرنا میری کمزوری ہے۔ مجھے لندن کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں تھیں۔ میں نے سوچا کیا معلوم چلتے چلتے بس لندن برج کے پاس سے بھی گزرے لیکن وہ دو تین منٹ کے بعد ہی مغرب کو مڑ گئی۔

میں اس بس کے مسافروں میں سے ایک تھا اور میری منزل لندن سے کوئی سو میل دور ایک قصبہ چیلٹنہم[1] تھی جہاں ن۔م۔ راشد کی بیوہ شیلا راشد اپنے بیٹے نذیل راشد کے ساتھ مقیم ہیں۔ اس قصبے کو جاتے ہوئے آکسفورڈ راستے میں پڑتا ہے جسے بس کے اندر سے دیکھنے کا شوق میرے رگ و پے میں بھرا ہوا تھا۔

یہ چھ جنوری ۱۹۷۶ء کا واقعہ ہے۔ راشد صاحب کے انتقال کو تین مہینے ہو چکے ہیں۔ میرے سفر کا مقصد بیگم راشد کو پرسا دینا اور کچھ ایسی معلومات حاصل کرنا ہے جن سے راشد صاحب کے قاری کو دلچسپی ہو سکتی ہے۔ اس سے پہلے میں ایک شام ساقی فاروقی کے گھر پر گزار چکا ہوں۔ دونوں خاندانوں کے آپس میں انتہائی دوستانہ مراسم تھے۔ اتفاق سے دونوں خواتین غیر ملکی ہیں، بیگم ساقی آسٹریا کی رہنے والی ہیں اور بیگم راشد نیم اطالوی اور نیم انگریز ہیں۔ اس اشتراک کے علاوہ راشد مرحوم اور ساقی کے درمیان شاعر ہونے کی سانجھ بھی تھی۔ پھر بقول ساقی آخری ڈیڑھ سال میں راشد صاحب ان کے اتنے قریب آ چکے تھے جتنے دو دوست ممکن حد تک قریب ہو سکتے ہیں۔ دونوں خط و کتابت کے ذریعے اردو شاعری پر ایک کتاب بھی لکھ رہے تھے۔ سو میل کا فاصلہ درمیان میں ہونے کے باوجود دونوں بہت جلدی جلدی ایک دوسرے سے ملا کرتے تھے اور ساری ساری رات بحث و مباحثہ میں گزار دیتے تھے۔ ٹیلیفون پر تو تقریباً ہر روز ہی ہیلو ہو جایا کرتی۔ جس دن راشد صاحب کا انتقال ہوا اس دن ان کا فون پر آخری مکالمہ بیگم ساقی ہی سے ہوا تھا۔

بات چیت کے دوران ہماری نظریں کارنس پر سجی ہوئی راشد صاحب کی تصویر پر جا پڑیں جس میں وہ پائپ بدست مسکرا رہے ہیں۔ بیگم ساقی نے بتایا کہ یہ تصویر بقول ان کے راشد کی پوری شخصیت کی نمائندگی کرتی ہے اس لئے بہترین تصویر قرار دی جا سکتی ہے۔ میری وضاحت طلبی پر بتایا کہ ایک تو پائپ یہاں موجود ہے اور دوسری مسکراہٹ۔ راشد کی مسکراہٹ ایک معصوم بچے کی مسکراہٹ تھی معلوم ہوتا تھا یہ شخص دل سے مسکرا رہا ہے۔ ان کی مسکراہٹ میں منافقت یا ریاکاری نام کو نہیں تھی۔ ان کی مسکراہٹ سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس آدمی کا ظاہر و باطن ایک ہے اور یہ آدمی باہر کی دنیا سے اپنی محبت یا نفرت کا ایماندارانہ اظہار کر سکتا ہے۔ آج کی دنیا میں یہ بہت بڑی خوبی ہے۔

تہران میں راشد صاحب سے میری ملاقات ہوئی تو میں نے ان کے قریب ہونے کی اپنی سی کوشش ضرور کی تھی لیکن کچھ وجوہ کی بنا پر، جن کا ذکر میں سابقہ مضمون میں کر چکا ہوں، مجھے کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ مجھے تو انہوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا تھا کہ "میں اپنے آپ کو آپ کیوں ننگا کروں"۔ لیکن ساقی کے سامنے بقول اس کے انہوں نے تمام کپڑے اتار دیئے تھے۔ ساقی ان کی شخصیت اور فن پر کام کر رہا ہے اور ہم لوگ اس کی تحریروں کے منظر عام پر آنے کے بیتابی سے منتظر ہیں۔ پچھلی ملاقات پر جو ہماری زندگی میں پہلی ملاقات تھی، ساقی نے مجھے کچھ باتیں بتائیں اور کچھ تحریریں بھی پڑھ کر سنائیں لیکن اس وعدے کے ساتھ کہ میں ان کی اشاعت تک مہر بلب رہوں گا اور اس بات سے کوئی بھی اختلاف نہیں کرے گا کہ کیا ہوا وعدہ نبھانا چاہیئے۔

میں نے اپنے آنے کی اطلاع بیگم راشد کو فون پر کر رکھی تھی۔ انہوں نے نہ صرف میرے ملنے کی خواہش کو شرفِ پذیرائی بخشا بلکہ دوپہر کے کھانے کی دعوت بھی دے رکھی تھی۔ اس کے علاوہ میری جائے قیام سے وکٹوریہ کوچ سٹیشن اور پھر منزل پر پہنچ کر اپنے گھر تک کا راستہ بھی سمجھا دیا تھا۔

[1] CHELTENHAM

بس پروگرام کے مطابق چیلٹنہم کو رواں دواں تھی۔ آج موسم خلافِ معمول صاف تھا۔ میں لے لندن کے گلی کوچوں میں سے گزرتے وقت کئی ایک فلک بوس عمارتوں کو گھیرہ بند کر لیا تھا۔ عمارتوں کے سمندر میں مچھلی کی طرح تیرتی ہوئی بس جب شاہراہ ایم چالیس پر چڑھی تو جیسے پانی سے خشکی پر آ گئی۔ یورپ کے کنٹری سائیڈ کا حسن سردیوں میں ماند پڑ جاتا ہے۔ اس کے باوجود اس شاہراہ کے دونوں جانب کا منظر اتنا خوبصورت تھا کہ سرما کی یلغار کے باوجود اپنے حسن کو دبنے نہیں دے رہا تھا۔ لندن سے آکسفورڈ اور پھر چیلٹنہم تک کا لینڈ سکیپ سرما کی برگ گُنی اور رنگ خوردی کے باوصف اپنے حسن کی موجودگی کا احساس دلانے پر قادر تھا راستے میں ایک مقام ایسا بھی آتا ہے جہاں سے دائیں ہاتھ شمال کو مڑ جائیں تو شیکسپیئر کے گاؤں پہنچا جا سکتا ہے۔ لیکن میں تو کال گڑھ ضلع گوجرانوالہ کے اُس شیکسپیئر کے گاؤں جا رہا تھا جو اُس کا گاؤں نہیں تھا۔ جس کا اب اپنا کوئی گاؤں نہیں ہے۔ البتہ دنیا بھر کے گاؤں اسے اپنا کہہ سکتے ہیں۔ جہاں جہاں انسان بستا ہے وہاں وہاں راشد بھی بستا ہے۔ راشد کی شعری عظمت کو زمانہ جلد نہیں پہچان پائے گا اور جب پہچان گیا تو اس کے مقابلے میں اچھے اچھوں کی ہوا اکھڑ جائے گی۔

بس جس وقت آکسفورڈ میں سے گزر رہی تھی تو مجھے خیال آیا کہ اس شخص نے کہ نام جس کا نذر محمد راشد تھا کہیں چیلٹنہم میں رہائش اس لئے تو اختیار نہیں کی تھی کہ وہ جب بھی گھر سے نکلے تو آکسفورڈ دو دفعہ راستے میں پڑے۔ وہ دانش گاہوں کا شیدائی تھا اور عالمی سطح پر تخلیق ہونے والے ادب سے خود کو ہر وقت باخبر رکھتا تھا۔ تہران کی ملاقاتوں کے دوران میں نے ان کے مطالعہ کے کمرے میں عالمی قارئین کے مخاطب جریدے اکثر دیکھے تھے جن میں متنوع موضوعات پر مضامین ہوا کرتے تھے۔ ادب کی کوئی بھی نئی تحریک چاہے وہ دنیا کے کسی بھی ملک میں ہو راشد صاحب کے علم میں ہوتی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ علم و حکمت کی قدیم دانش گاہ آکسفورڈ سے گزر کر چیلٹنہم جانا مجھے بڑا معنی خیز سا لگا۔

چلتے چلتے جب آکسفورڈ بہت پیچھے رہ گیا تو میرے دل پر بوجھ بڑھنا شروع ہو گیا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ جب میں راشد صاحب کے گھر پہنچوں گا تو میری ملاقات اور کسی بھی فرد سے ہو سکتی ہے سوائے راشد صاحب کے۔ جب وہ مل جایا کرتے تھے تو کسی اور سے ملنے کی ضرورت باقی نہیں رہا کرتی تھی۔ اب وہ نہیں ملیں گے تو ان سے ملنے کے لئے نہ جانے کس کس سے ملنا ہو گا۔ بس کا رُخ مغرب کی جانب تھا۔ اچانک مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے میں گوجرانوالہ سے اکال گڑھ جا رہا ہوں جسے اب علی پور کہا جاتا ہے۔ اکال گڑھ سے چیلٹنہم تک کا کتنا فاصلہ ہے۔ صرف ایک سانس کا! سانس چلتی رہے تو دونوں کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں۔ سانس بند ہوتے ہی دونوں اتنے فاصلے پر جا پڑتے ہیں جسے طے کرنا عمر بھر میں بھی ممکن نہیں۔ پہلی سانس پنجاب میں اور آخری سانس انگلستان میں لینے والے راشد صاحب کا نام جس دن میں نے پہلی دفعہ "نقش فریادی" کے دیباچے میں دیکھا تھا اُس روز کا خیال آتے ہی مجھے عجیب سی کیفیت سے دوچار ہونا پڑا۔ اُس روز میرے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ کوئی تیس برس کے بعد میں خود اس انوکھے نام والے آدمی کی اُس بیوہ کو پرسا دینے جا رہا ہوں گا جسے اس کی بیوی بننے میں بھی ابھی اٹھارہ سال باقی ہیں اور پھر پرسا دینے کی رسم ہزارہا میل کے فاصلے پر ادا ہو گی۔ انسان کی مستقبل سے بے خبری ہی شاید اس دنیا کی سب سے بڑی دلچسپی بھی ہے اور سب سے بڑا عذاب بھی۔

ایک جگہ پہنچ کر سامنے کا لینڈ سکیپ اچانک نیچا ہو گیا جیسے ہم کسی وادی میں اتر رہے ہوں۔ سڑک پر نصب پتھروں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ چیلٹنہم اسی وادی میں ہے ـــــ پتھروں کی خبر ہمیشہ مستند ہوتی ہے ـــــ چمکتی ہوئی دھوپ نے جو یورپ کے سرما میں وصلِ یار سے بڑھ کر نشاط انگیز ہوتی ہے۔ پورے منظر کو رنگوں کی نمائش گاہ بنا دیا تھا۔ کسی بھی لینڈ سکیپ پر ابر سایہ بردار ہو تو اس کے رنگ ماند پڑ جاتے ہیں۔ سورج کی کرنیں ان رنگوں کو گویا ٹہوکا دے کر جگا دیتی ہیں۔ اُس وقت بھی کرنوں کے جگائے ہوئے رنگ وادی میں انگڑائیاں لے رہے تھے اور میں رنگوں کی اس سولی پر لٹکا جا رہا تھا۔

اندازے کے عین مطابق جلد ہی بس چیلٹنہم کے جوار میں پہنچ گئی اور ٹریفک کے وہ اشارے شروع ہو گئے جو یورپ کے شہروں میں داخل ہوتے وقت راہنمائی کرتے ہیں کہ اطرافِ شہر میں کسی طرف جانا ہو تو یہ راستہ لیجئے اور اگر شہر کے مرکز میں جانا ہو تو اس راستے سے جائیے۔ ہماری بس مرکزِ شہر کو جا رہی تھی۔ چھوٹی اور بڑی، سیدھی اور بل کھاتی ہوئی چند سڑکوں سے گزر کر آخر کار بس کوچ سٹیشن میں داخل ہو گئی۔ لیجئے سفر تمام ہوا حالانکہ سفر کبھی تمام نہیں ہوتا۔

اپنی چیزیں سنبھال کر میں نیچے اُترا اور دفتر کی جانب چل دیا۔ میں نے واپسی کے لئے آخری بس پر سیٹ بک کروا رکھی تھی۔ مزید اطمینان کے لئے چاہتا تھا کہ وقت وغیرہ کی تصدیق کروں۔ چند ہی قدم چل کر کیا دیکھتا ہوں کہ ایک خاتون میری طرف آ رہی ہیں۔ میں نے اس چہرے کی اس سے پہلے صرف دو دفعہ محض جھلک ہی دیکھی ہوئی تھی پھر بھی میں نے فوراً پہچان لیا اور اپنے سراپا میں تعظیم بھر کر کہا: "گڈ مارننگ مسز راشد"

"گڈ مارننگ مسٹر قاسمی۔" خاتون نے میری جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

بیگم راشد نے کوچ سٹیشن پر آ کر مجھے جو عزت بخشی تھی اس کا شکریہ ادا کرنا اور وہ بھی غیر زبان میں! مجھے رٹے رٹائے ہوئے لفظوں کو منمنا کر رہ جانا پڑ رہا تھا ـــــ

اچانک وہ کہنے لگیں: "نذیل بھی آیا ہوا ہے"

دفتر کے ایک ستون کی اوٹ میں لگے ہوئے بنچ پر نذیل بیٹھا ہوا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی دوڑ کر ہماری طرف آیا۔ پونے دو سال کے عرصے میں وہ خاصا بڑا ہو چکا تھا۔ فاصلہ زیادہ نہیں تھا اس لئے ہم پیدل ہی گھر کو چل دیئے۔ گھر تک شہر کا جتنا حصہ بھی راہ میں پڑا وہ بہت خوبصورت تھا۔ بیگم راشد مجھے بتا رہی تھیں کہ یہ قصبہ نذری کو بہت پسند تھا ۔۔۔۔ وہ راشد صاحب کو اسی نام سے پکارا کرتی تھیں۔ راستے میں پڑنے والی عمارتوں اور دفتروں کے بارے میں بتاتے بتاتے اچانک کہنے لگیں "میں ابھی تک اس شک سے باہر نہیں نکل سکی مجھے یقین نہیں آرہا کہ نذری زندہ نہیں۔ اکثر اوقات مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ ابھی لندن سے فون آجائے گا اور نذری مجھے اطلاع کر رہے ہوں گے کہ فلاں ٹرین یا کوچ سے پہنچ رہا ہوں۔ جو کچھ بھی ہوا ہے سب ناقابل یقین ہے ۔۔۔۔۔"

میرے احساسات بھی اسی قسم کے تھے۔ میں تو تادم تحریر اپنے آپ کو یہ ماننے پر آمادہ نہیں کر سکا کہ راشد صاحب سے اب تا قیامت ملاقات نہیں ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ بیگم راشد کی آہوں کے جواب میں میرے پاس بھی آہوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ ہم دونوں اپنی آوازوں پر قابو پاتے ہوئے جا رہے تھے۔ بیگم راشد نے اس کیفیت کا شاید پہلے سے اندازہ کر لیا تھا۔ اسی لئے کوچ سٹیشن سے نکلتے ہی انھوں نے نذیل کو کوئی کام کہہ کر الگ روانہ کر دیا تھا۔ اب جبکہ قریب تھا کہ ہم دونوں آبدیدہ ہو جاتے، نذیل دوڑتا ہوا ہمارے ساتھ آن ملا اور وہیں بات کا رخ موڑنا پڑا۔

گھر پہنچ کر ماں بیٹا مجھے مکان دکھانے لے گئے۔ ہم مکان کے ہر کمرے میں گئے اور جہاں جہاں راشد صاحب جو کچھ کیا کرتے تھے اس کی خبر مجھے دی گئی۔ مکان میں گھومتے ہوئے مجھے ساتھ ساتھ قدموں کی ایک چاپ سنائی دیتی رہی۔ کبھی کوئی دھیما سا قہقہہ کان میں پڑتا اور کبھی کوئی مصرع گونج اٹھتا۔ جیسے میں ن۔م۔ راشد کے مکان میں راشد ہی کے لفظوں میں راشد ہی سے مخاطب ہوں ؎

مجھے سنگ و خشت بتا رہے ہیں کہ کیا ہوا
مجھے گرد و خاک سنا رہے ہیں وہ داستاں
جو زوال جاں کا فسانہ ہے
ابھی بوئے خوں ہے نسیم میں
تمہیں آن بھر میں خدا کی چیخ نے آ لیا

جو ہر صدا سے ہے زندہ تر
کہیں گونج کوئی سنائی دے
کوئی بھولی بھٹکی فغاں ملے
میں پہنچ گیا ہوں تمہارے بستر خواب تک
کہ کہیں سے گم شدہ راستوں کا نشاں ملے

۔۔۔۔ وہ خدا کی چیخ

میں دیکھتا ہی رہ گیا کہ ابھی کسی گوشے سے ایک پیکر مجسم صورت میں ہمارے سامنے پائپ بدہن آ کھڑا ہو گا۔ قدموں کی چاپ میرا پیچھا نہیں چھوڑ رہی تھی۔ میں نے بیگم راشد سے کہیں بیٹھ جانے کی درخواست کی یہ کہہ کر کہ ہمارے پاس وقت کم ہے۔ میں ریح راشد سے نبرد آزما تھا کہ بھاڑ کی خبر لگنے چھوٹی بچی آ گئی تھی۔

چائے کی پیالی پی کر ہم راشد صاحب کے اسٹڈی روم میں جا بیٹھے۔ ان کا بستر اسی طرح لگا ہوا تھا۔ بستر کے سرہانے دیوار پر ڈریسنگ گاؤن ٹنگ رہا تھا۔ تین دیواروں کے ساتھ کتابوں کے بھرے بڑے شیلف تھے۔ ایک طرف میز لگی ہوئی تھی جس کے ساتھ دو کرسیاں رکھ کر ہم بیٹھ گئے۔ بیگم راشد کہنے لگیں۔

"اب ہم اپنی بات چیت شروع کر سکتے ہیں۔ درمیان میں پنچ کے لئے اٹھنا ہو گا یا مجھے ان لوگوں کو چائے کی پیالی دینا ہو گی جو آج کھڑکیوں اور روشندانوں کے شیشے صاف کرنے آئے ہوئے ہیں۔ امید ہے آپ اس کا برا نہیں مانیں گے۔"

اخلاق بھرے اس جملے تلے پستے ہوئے میں نے فل سکیپ کا وہ کاغذ ان کی طرف بڑھایا جس پر میں نے چند سوال ٹائپ کر رکھے تھے اور ان سے کہا کہ اگر وہ کسی سوال کا جواب نہ دینا چاہیں تو وہ سوال ریکارڈ سے خارج سمجھا جائے گا۔ انھوں نے ایک نظر سوالوں کو دیکھا اور کہا کہ وہ سب سوالوں کے جواب دیں گی۔ میرے سوال اور ان کے جواب بالترتیب کچھ اس طرح تھے۔

سوال: مسٹر راشد سے آپ کی ملاقات کب، کہاں اور کن حالات میں ہوئی؟

جواب: میری اور ان کی ملاقات اکتوبر ۱۹۶۲ء میں نیویارک میں ہوئی۔ ان کی سب سے چھوٹی بچی میری شاگرد تھی۔ میں نے اپنے طور پر محسوس کیا کہ یہ بچی والدین کی پوری توجہ سے محروم ہے۔ اس کا لباس تک اس عدم توجہی کا غماز ہوا کرتا تھا۔ تعلیم میں بھی کمزور تھی۔ کچھ عرصے تک میں فرانسیسی پڑھانا شروع

کرنا چاہتی تھی لیکن بچی کی انگریزی اتنی کمزور تھی کہ اسے فرانسیسی شروع کرانا زیادتی ہوتی۔ ضمناً یہ بتا دوں کہ یہ سکول اقوامِ متحدہ کا تھا جہاں نذری ملازم تھے۔

میں نے بچی کے معاملات پر انھیں آگاہ کرنے کے لئے خود ان سے ملاقات کی تھی اور لگی لپٹی رکھے بغیر انھیں صاف صاف بتایا کہ بچی والدین کی توجہ سے محروم ہے۔ اور یہ اچھی بات نہیں ہے۔ وہ میری اس اطلاع پر میرے سپاس گزار ہوئے اور کہا کہ وہ ان باتوں سے حقیقتاً بے خبر تھے۔ ان کا خیال تھا کہ بڑی بہنیں اس چھوٹی بچی کے لئے ماں کا نعم البدل ہوں گی لیکن ماں بہرحال ماں ہوتی ہے۔ ان کی زبانی یہ معلوم کر کے مجھے افسوس ہوا کہ ان کی اولاد ماں ہی سے محروم ہے۔ ماں کی عدم موجودگی میں تو یہ شکوہ ہی بیکار ہے۔

بعد میں نذری نے بتایا کہ وہ پہلی ہی ملاقات میں میری دیانت داری سے متاثر ہوئے تھے۔ کوئی ایک ہفتہ بعد جب وہ خود سکول میں آئے تو میں اس خیال سے ان کے ساتھ بہت اچھی طرح پیش آئی کہ انھوں نے نہ صرف میری بات غور سے سنی تھی بلکہ اس پر عمل کرتے ہوئے سکول بھی چلے آئے تھے۔ میرے اس دن کے رویہ نے ان پر مزید اثر کیا۔ اپنی جگہ میں یہی کہوں گی کہ میں نے انھیں اچھا آدمی ضرور سمجھا لیکن ان ملاقاتوں میں ان کے لئے کوئی جذباتی وابستگی محسوس نہیں کی۔

سوال: آپ کا پورا نام اور قومیت کیا ہے؟ اگر پسند کریں تو اپنی کوالی فکیشن اور عمر بھی بتا دیں۔

جواب: میرا نام شیلا کارمینا آگنیز انجلینی ہے SHEILA CARMINA AGNESE ANGELINI پہلے تین نام کرسچین ہیں اور آخری نام خاندانی ہے۔ میں باپ کی طرف سے اطالوی اور ماں کی طرف سے انگریز ہوں۔ میرے باپ کا مکان ابھی تک سرے میں موجود ہے جہاں میری والدہ رہتی ہیں۔ اسی طرح اٹلی میں بھی ہمارا گھر موجود ہے۔ میرے والد زندگی کا زیادہ حصہ انگلستان ہی میں رہے چنانچہ میں ۲۹ جنوری ۱۹۱۹ء کو لندن میں پیدا ہوئی گویا تئیس دن کے بعد سینتالیس برس کی ہو جاؤں گی۔ میں فروبل (FRÖBEL) نام کے جرمن ماہرِ تعلیم کی تربیت یافتہ استانی ہوں۔ اسے FRÖBEL TRAINED TEACHER یا مختصر طور پر ایف۔ ٹی۔ ٹی بھی کہا جاتا ہے۔ سرے میں ہمارے گھر کا پتہ یہ ہے: WOODLANDS' CHIPSTEAD WAG;

BANSTEAD, SURREY-ENGLAND.

سوال: ایک دوسرے کو ملنے کے بعد آپ لوگ کتنی مدت میں شادی کے فیصلے پر پہنچے؟ شادی کب ہوئی؟

جواب: ہمیں ملے ہوئے ابھی چھ ہفتے ہی ہوئے تھے کہ نذری کی طرف سے شادی کی پروپوزل آ گئی۔ ہوا یوں کہ ابتدائی ایک دو ملاقاتوں کے بعد ہی انھوں نے مجھے چائے کی دعوت دے ڈالی۔ امریکی اخلاق کے مطابق یہ دوستی کی دعوت ہوتی ہے۔ میں نے یہ دعوت قبول کر لی۔ وہ اب کسی نہ کسی بہانے بار بار ملنے لگے۔ مجھے مس انجلینی کی بجائے شیلا کہہ کر پکارنا شروع کر دیا اور مجھ سے مصر ہوئے کہ انھیں نذری کہہ کر پکاروں۔ یہ انتہائی بے تکلفی اور قربت کی علامت ہوتی ہے ان ملاقاتوں میں میں خود بھی ان کے اخلاق سے متاثر ہوتی رہی۔ ایک دفعہ انھیں کسی جلسے میں لیکچر دینا تھا۔ مجھے اس جلسے میں آنے کی خاص طور پر دعوت دی نہ صرف یہ کہ بلکہ لیکچر کے بعد ڈنر پر بھی مدعو کر لیا۔ یہ دعوت دوستی کی انتہا پر ہی دی جا سکتی ہے۔ میں نے یہ دعوت بھی قبول کر لی۔

ان ملاقاتوں کے دوران کرسمس کی چھٹیاں آ گئیں۔ میں چھٹیاں منانے نیویارک سے باہر جانا چاہتی تھی۔ وہ مجھے جانے سے پہلے ملے اور شادی کی پروپوزل دے دی۔ وہ وقت، ان کا انداز، ان کے الفاظ، آج بھی یہ سب کچھ کسی روشن تصویر کی طرح میرے سامنے ہے۔ انھوں نے کہا تھا۔

چھٹیوں کے دوران ٹھنڈے دل سے غور کرنا کہ تم مجھ سے شادی کر سکتی ہو یا نہیں۔ اگر تمہارا فیصلہ مخالفانہ ہو تو اس ملاقات کو آخری ملاقات سمجھنا ......

بیگم راشد یہاں تک پہنچی تھیں کہ ان کے ضبط کا دامن چھوٹ گیا۔ وہ زار زار رونے لگیں، یہاں تک کہ ان کی ہچکی بندھ گئی۔ میرا اپنا گلا رندھا ہوا تھا۔ میں انھیں دلاسہ دینے کے لئے بول تک نہ سکتا تھا کیونکہ مجھے خود اپنی آواز پر قابو نہ تھا۔ میں سر نیہوڑائے بیٹھا رہا۔ یہاں تک کہ انھوں نے اپنے آپ کو خود ہی سنبھالا اور میری طرف متوجہ ہو کر کہنے لگیں۔

"یوں تو انھوں نے کہہ دیا تھا کہ میرا فیصلہ مخالفانہ ہو تو اس ملاقات کو آخری ملاقات سمجھوں لیکن بعد میں ایک ساتھ گزری ہوئی زندگی کے تجربہ کی بنا پر میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ اگر میرا فیصلہ مخالفانہ ہوتا تو وہ ملاقات آخری ملاقات کبھی ثابت نہ ہوتی۔ وہ ہر حال میں مجھے حاصل کر کے رہتے۔

کیونکہ زندگی میں ان کا وطیرہ یہی تھا۔ وہ جس چیز کے حصول کا فیصلہ کر بیٹھتے اسے حاصل کر کے رہتے۔ بہرحال چھٹیوں کے دوران میں نے مسئلے پر بڑے ٹھنڈے دل سے غور کیا اور جب نیویارک واپس آئی تو شادی کے حق میں فیصلہ کر چکی تھی۔

یہاں اس بات کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ گفتگو کے آغاز میں انھوں نے نذیر کو کسی کام پر لگا دیا تھا اور دروازہ بند کرتے ہوئے مجھے بتایا تھا کہ ہرچند یہ صدمہ ان کی برداشت سے باہر ہے تاہم نذیر کے سامنے انھیں بڑی بہادری کا ثبوت دینا پڑتا ہے۔ بچے کو بھی باپ سے بے حد وابستگی تھی لیکن مجھ سے متاثر ہو کر وہ بھی پورے ضبط و تحمل کا ثبوت دے رہا ہے۔ میں کسی صورت نہیں چاہتی کہ وہ صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ میں خود اس کے سامنے مثال بنوں۔

اس احتیاط کے پیچھے یقیناً ان کے دل کی کیفیت کام کر رہی تھی جس کا حال خود ان کو معلوم تھا۔ اب جب وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں تو ان کی پیش بندی کا جواز خود بخود نکل آیا تھا۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ان کی احتیاط نے بچے پر اچھا اثر کیا تھا۔ بہرحال بیگم راشد نے کہا:

"جب ہم نے شادی کا فیصلہ کر لیا تو نذری نے سب سے پہلے اس کا ذکر اپنی بیٹیوں سے کیا۔ انھوں نے کہا ہمیں اس شادی پر کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن بہتر ہوگا کہ سب سے پہلے بڑی بیٹی نسرین کی شادی کی جائے جو اس وقت پاکستان میں تھی اور اس کی سگائی ہو چکی تھی۔ ہم نے بچیوں کی خواہش کا احترام کیا۔ چنانچہ میں اور نذری اکٹھے لندن پہنچے جہاں میں رک گئی اور وہ پاکستان چلے گئے۔ ان کی واپسی پر ۴ ستمبر ۱۹۶۳ء کو لندن میں ہماری شادی ہوئی جس میں میرے بھائی فیڈیلے کارل انجلینی (FEDELE CARL ANGELINI) اور میرے والدین نے بھی شرکت کی۔"

اس کے بعد مجھے شادی کی تصویریں اور "پاکستان ٹائمز" کا تراشہ دکھایا جس میں شادی کی خبر لگی ہوئی تھی۔

سوال: جب آپ نے ان سے شادی کی تو وہ بلند مرتبے پر فائز تھے۔ کیا آپ کو اس بات کا شعور بھی تھا کہ سماجی مرتبے کے ساتھ ساتھ وہ بڑے آدمی بھی ہیں؟

جواب: شادی کرنے تک مجھے یہ تو معلوم ہو چکا تھا کہ وہ شاعر ہیں لیکن کتنے بڑے شاعر ہیں اور کتنے بڑے آدمی ہیں۔ اس کا احساس مجھے ۱۹۶۵ء میں جا کر ہوا جب میں ان کے ساتھ پاکستان گئی۔ ضمنی طور پر میں نے پوچھا کہ آپ ان کے آبائی قصبے اکال گڑھ بھی گئی تھیں یا نہیں۔ اس پر انھوں نے بتایا کہ نذری کے اہل خاندان نے وہاں والا مکان بیچ ڈالا تھا اس طرح وہاں جانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ نذری کو اس مکان کے بیچنے کا ہمیشہ افسوس رہا۔ بہرحال پاکستان پہنچ کر اور لوگوں سے مل کر مجھے پہلی دفعہ احساس ہوا کہ وہ صرف بلند سماجی رتبے پر ہی فائز نہیں بلکہ بہت بڑے شاعر اور بہت بڑے انسان بھی ہیں۔ درمیان میں مرحوم کے والد صاحب کا ذکر بھی آیا تو بتانے لگیں کہ ان کے والد ۱۹۶۲ء تک زندہ رہے۔ وہ چھوٹے بیٹے فضل محمد ماجد کے ساتھ رہا کرتے تھے۔

سوال: آپ کے ساتھ شادی سے کتنا عرصہ پہلے ان کی پہلی بیگم کا انتقال ہوا؟ کیا آپ سے پہلی بیگم کا ذکر کرتے تھے؟ اور اگر کرتے تھے تو کن الفاظ میں؟

جواب: ان کی پہلی بیوی کا انتقال ۱۹۶۱ء میں ہوا۔ اس وقت نذری اقوام متحدہ کے کراچی آفس میں انفارمیشن آفیسر تھے۔ اسی حیثیت سے ان کا تبادلہ نیویارک ہو چکا تھا۔ تیاریوں کے دوران ہی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ صفیہ راشد غالباً میٹرک تک تعلیم یافتہ تھیں اور نذری کی فرسٹ کزن تھیں۔ شادی والدین کی طرف سے طے پائی تھی۔ مجھ سے اکثر پہلی بیوی کا ذکر کرتے رہے اور بڑے اچھے الفاظ میں۔ بقول ان کے صفیہ بےحد وفادار، ان سے محبت کرنے والی اور سراپا ایک مشرقی عورت کا نمونہ تھیں۔ ان کی موت کو نذری نے اپنا بہت بڑا نقصان گردانا تھا۔ مختصراً میں کہوں گی کہ: HE WAS DEEPLY FOND OF HER BUT NOT IN LOVE WITH HER! وہ بیوی کے بے حد مشتاق تھے لیکن اس سے عشق نہیں کرتے تھے۔

وہ ذہنی طور پر محبت کی شادی کے قائل تھے۔ اسی لئے اکثر مجھ سے کہا کرتے کہ کاش تم مجھے پہلے مل جاتیں۔ اس کا جواب میں نے ہمیشہ یہی دیا کہ اگر پہلے مل جاتی تو ہماری شادی نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ میں پہلی بیوی کی موجودگی میں آپ سے شادی کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ پھر پہلے ملتی تو کتنا عرصہ پہلے۔ کیونکہ ہماری عمروں میں اٹھارہ سال کا فرق تھا۔ ضمناً بتایا کہ پہلی بیوی سے ان کے پانچ بچے تھے۔ پیدائش کے حساب سے ان کے نام یہ ہیں: نسرین، یاسمین، شاہین، شہریار اور تزئین یعنی چار لڑکیاں اور ایک لڑکا۔

سوال: شادی سے پہلے آپ نے مستقبل کے جیون ساتھی کا خواب تو دیکھا ہی ہوگا۔ کیا مسٹر راشد اسی خواب کے مطابق تھے؟

جواب : یہ بات تو میں خواب میں بھی نہیں سوچ سکتی تھی کہ کسی پاکستانی سے شادی کروں گی۔ پھر عام حالات میں عمر کے اتنے تفاوت کی وجہ سے نذری جیسا آدمی میرے خوابوں میں کہاں آسکتا تھا۔

سوال : شادی کے بعد آپ نے صحیح ان کو اپنے خوابوں والا مرد پایا یا نہیں؟ کیا یہ آپ کی پہلی شادی تھی؟

جواب : میں نذری کے ساتھ شادی پر آخری دم تک مطمئن رہی۔ مجھے اپنے فیصلے پر کبھی پچھتاوا نہیں ہوا، تاہم عام حالات میں وہ میرے لئے "نادر فگر" تو ہو سکتے تھے، لیکن ان کی ذات میں مجھے مستقبل کے خاوند کا خواب نہیں آسکتا تھا ـــــ ان سے شادی میری پہلی شادی تھی۔

سوال : کیا آپ ان کی شاعری کے موضوعات سے جزوی یا کلی طور پر واقف ہیں؟

جواب : میں جزوی طور پر ان کے موضوعات اور شعری معرکوں سے واقف ہوں۔ جب وہ کوئی نئی نظم لکھتے تو مجھے انگریزی میں اس کا مفہوم بتایا کرتے۔ ہمارے درمیان بحث و مباحثہ بھی ہوتا تھا۔ اس گفتگو کی وجہ سے اور ان کے دوستوں کی وجہ سے مجھے معلوم ہے کہ انھوں نے موضوع اور ہیئت میں انقلاب برپا کیا۔ وہ نوآبادیاتی نظام کے شدید مخالف تھے۔ انھوں نے طرزِ اظہار میں روایت شکنی کی اور نئی طرح ڈالی۔

سوال : آپ کے درمیان اختلافات ہوا کرتے تھے؟ یہ اختلافات سنگین نوعیت کے ہوتے تھے یا معمولی قسم کے؟ آپ ان اختلافات کو کیسے دور کیا کرتے تھے؟

جواب : جب دو مضبوط شخصیتیں ایک ساتھ رہ رہی ہوں تو اختلافات کا پیدا ہونا ناگزیر ہے۔ واضح رہے کہ میں بھی خود کو مضبوط شخصیت کہنے کی دعویدار ہوں۔ اختلافات بعض اوقات شدید بھی ہو جایا کرتے تھے لیکن ان کی موت تک ہمارا ایک ساتھ رہنا ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ ہم ہمیشہ اختلافات دور کرنے پر قادر رہے۔ ہمارے درمیان ابلاغ کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوا۔ یہ ابلاغ پورے زور و شور سے قائم رہتا تھا۔ کبھی کبھی زبانوں کے اختلاف کی وجہ سے تصادم کی صورت پیدا ہو جاتی تھی۔ نذری انگریزی کے ماہر تھے۔ پھر بھی اہلِ زبان نہیں تھے۔ ایک دفعہ میں نے کہا: YOU SHOULD NEVER TAKE ME FOR GRANTED! اس پر ہمارے درمیان خاصی تلخی پیدا ہو گئی۔ انھوں نے نہ جانے کیا مطلب لیا، جبکہ میں صرف ہر لحاظ سے اپنی برابری کا دعویٰ کر رہی تھی۔ ہمارے معاشرے میں کسی کو FOR GRANTED لینا بہت بڑی زیادتی ہوتی ہے۔

سوال : کیا آپ کبھی پاکستان گئی ہیں؟ اگر گئی ہیں تو کب اور کہاں؟ کیا آپ پاکستان میں اپنے تجربات پر کوئی تبصرہ کرنا پسند کریں گی؟

جواب : میں تین دفعہ پاکستان جا چکی ہوں۔ پہلی دفعہ ۱۹۶۵ء میں۔ پھر ۱۹۶۶ء میں اور آخری دفعہ ۱۹۶۷ء میں۔ ہر دفعہ میرا قیام مہینہ ڈیڑھ مہینہ ہی رہا۔ میں کراچی، لاہور، ملتان، راولپنڈی، اسلام آباد، مری اور پشاور گئی تھی۔ پاکستان کے لوگوں کو میں نے مہمان نواز پایا۔ اس کے علاوہ وہ مذہبیت کے شکار ہیں۔ پاکستان میں بمقابلہ ایران مذہبیت کہیں زیادہ ہے۔ ایسی کوئی غیر معمولی بات نہیں جو مجھے اچھے یا برے تجربے کے طور پر پیش آئی اور جس کے بارے میں مجھے یہ کہنے کی ضرورت ہو کہ فلاں واقعہ میں کبھی نہیں بھلا سکتی۔

سوال : کیا آپ کے پاس ان کی کوئی غیر مطبوعہ کاوش موجود ہے؟ اگر نہیں تو آپ نے اس انمول خزانے کو کیا کیا؟

جواب : ان کی ایک نوٹ بک میرے پاس موجود ہے جس کو میں نے ان کی نشانی سمجھ کر سنبھالا ہوا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس میں ان کی تمام غیر مطبوعہ تحریریں موجود ہیں یا نہیں۔ زیادہ تر مواد میں نے ان کے عزیز دوست ساقی فاروقی کے سپرد کر دیا ہے۔ ایک کتاب کا مسودہ نذری موت سے پہلے اعجاز حسین بٹالوی کو دے چکے تھے۔ اس میں غالباً اکتیس نظمیں ہیں۔ اس مسودے کے علاوہ تمام تر غیر مطبوعہ مواد ساقی کے پاس ہے۔

یہاں ضمناً کچھ لوگوں کا ذکر آگیا جو راشد صاحب کے جیتے جی اس خاندان کے قریبی دوستوں میں شمار ہوتے تھے لیکن ان کی موت پر افسوس کے دو کلمات بھی بیگم راشد کو نہ لکھ سکے۔ جن لوگوں سے انھیں بہت زیادہ گلہ تھا، ان میں جناب فیض احمد فیض، جناب احمد فراز اور جناب ضیا محی الدین شامل ہیں۔

سوال : ان کی پہلی بیوی سے آپ کتنے بچوں کو مل چکی ہیں؟ کیا آپ ان کے بارے میں کچھ کہنا چاہیں گی؟

جواب : میں تمام بچوں سے مل چکی ہوں۔ اس ضمن میں مجھے خاص طور سے کچھ نہیں کہنا۔

سوال : بطور آدمی، بطور خاوند اور بطور باپ راشد صاحب کے کردار کی وہ نمایاں خصوصیات کیا تھیں جن سے آپ زیادہ متاثر ہوئیں؟

جواب : ان کے کردار کی تین چیزیں میرے نزدیک بڑی قابلِ تعریف تھیں۔ ایمانداری، نفاست پسندی اور فراخ دلی۔ یہ چیزیں ہر حیثیت میں ان کی ذات

کا حصہ تھیں۔ فراخ دلی کے بارے میں یہ وضاحت نہایت ضروری ہے کہ وہ کسی کو ایک دو دفعہ تو بڑی فراخ دلی سے معاف کر سکتے تھے لیکن اس کے بعد دنیا کی کوئی طاقت ان کو معافی پر آمادہ نہیں کر سکتی تھی۔ جہاں وہ انسانی کمزوریوں کو فراخ دلی سے نظر انداز کر سکتے تھے وہاں دو تین دفعہ کی تکرار کے بعد ان پر گرفت بھی پوری شدت سے کیا کرتے تھے۔

ضمناً پوچھا گیا کہ کوئی ایسی بات بھی ان کے کردار میں تھی جس کے بارے میں آپ کہنا چاہتی ہوں کہ کاش یہ نہ ہوتی کہنے لگیں ان کی VIOLENT - TEMPER - مجھے ناپسند تھی۔ کاش ان میں یہ بات نہ ہوتی جب وہ برہم ہوتے تو مجھے خیال آتا کہ جیسے یہ شخص پوری طرح میچیور نہیں ہے حالانکہ عام حالات میں ان کی بالغ نظری کے بارے میں دو آرا ہو ہی نہیں سکتی تھیں بشرطیکہ برہمی کا دورہ انھیں کبھی کبھار ہی پڑتا تھا یہ بات ان کے معمولات میں شامل نہیں تھی۔

بحیثیت باپ میری ایماندارانہ رائے یہ ہے کہ انھوں نے اپنی پہلی اولاد پر وہ توجہ نہیں دی جو میرے نزدیک باپ کو دینی چاہئے۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ وہ بڑے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ سماجی مرتبے میں بھی بڑے تھے اور ان کے پاس وقت کی کمی تھی یا یوں سمجھئے کہ استاد ہونے کی وجہ سے میں اس معاملے میں زیادہ حساس ہوں۔ بہرحال مجھے یہ دعویٰ ضرور ہے کہ میں کسی بھی بچے کو دیکھتے ہی بتا سکتی ہوں کہ اس کے ساتھ والدین کا رویہ کیسا ہے۔ میرا اپنا بیٹا پیدا ہوا تو میں نے شروع ہی کو صاف صاف کہہ دیا تھا کہ انھیں نذیل کو مناسب وقت دینا ہوگا۔ انھوں نے مجھ سے پورا تعاون کیا۔ نتیجتاً کوئی بھی دیکھ سکتا ہے کہ نذیل اپنی عمر کے حساب کہیں زیادہ میچیور ہے۔

راشد صاحب کی برہمی مزاج کے بارے میں میں نے عرض کیا کہ ہر انسان کے اندر ایک KID تمام عمر موجود رہتا ہے جو اس سے بچگانہ حرکتیں کرواتا ہے راشد صاحب اس ضمن میں مستثنیٰ قرار نہیں دیئے جا سکتے۔ کہنے لگیں کہ کچھ بھی ہو اپنے KID کو سنبھال کر رکھنا بھی تو انسان کا اپنا فرض ہے۔ یہ کام دوسرے تو نہیں کر سکتے

سوال: ان کے لکھنے کی عادت کیسی تھی؟ کیا لکھنا ان کے لئے روٹین کا معاملہ تھا یا لکھنے کی آمد کے بعد ان کا رویہ غیر معمولی ہو جاتا تھا؟ کیا آپ کو بھی ان لمحات کا شعور ہوتا تھا

جواب: میں مری جا رہی تھی کہ کوئی مجھ سے یہ سوال پوچھے۔ جواب یہ ہے کہ لکھنا ان کے لئے روٹین کا معاملہ ہرگز نہیں تھا۔ وہ ہمیشہ آمد سے لکھا کرتے تھے لیکن آمد کے وقت ان سے گزارہ کرنا کار دارد تھا: - WHEN HE WAS HATCHING A POEM, HE WAS A DIFFICULT - MAN TO LIVE WITH!

نظم کا حمل ہوتے ہی موڈی اور چڑچڑے ہو جایا کرتے۔ بات بات پر غصے میں آ جاتے کئی دنوں تک خود بھی جیسے "دردِ زہ" میں مبتلا رہتے اور دوسروں پر بھی برسا کرتے۔ آخرکار جب جنم کی گھڑی آتی تو اپنے آپ کو مطالعہ کے کمرہ میں بند کر لیتے جب "لیبر روم" سے باہر نکلتے تو بڑے ہشاش بشاش ہوتے جس کمرے میں ہم بیٹھے ہیں یہ ان کی لائبریری بھی ہے اور لکھنے کا کمرہ بھی اور جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں ان کا بستر بھی یہیں لگا ہے تخلیقی عمل کے وقت وہ دن رات اسی کمرے میں رہا کرتے

سوال: وہ بہت مدت تک اپنے ملک سے باہر رہے۔ کیا وہ اس بنا پر ناسٹلجک تھے یا اتنی دیر وطن سے باہر رہنے کی بنا پر ان کا عام رویہ کیسا تھا؟

جواب: وہ بہت زیادہ ناسٹلجک تھے۔ اپنے آپ کو ثقافتی طور پر تنہا اور کٹا ہوا محسوس کرتے تھے اپنے ثقافتی ماحول سے دوری کی بنا پر انھیں INTELLE-CTUAL STIMULATION کا سامان میسر نہیں تھا۔ یہ کیفیت ایران میں زیادہ تھی۔ انگلستان میں آنے کے بعد انھیں مرضی کے دوست اور مطلوبہ ماحول میسر آ گیا تھا اس لئے وہ یہاں بہت خوش تھے۔ البتہ بود و باش کے معاملے میں وہ جس طرح کی زندگی کے عادی ہو گئے تھے اس کے پیش نظر اب ان کے لئے پاکستان میں رہنا مشکل تھا۔

سوال: کیا آپ ان کے نظریات کے بارے میں کچھ بتا سکتی ہیں؟ وہ کون سے سیاسی یا مذہبی نظام پر اعتقاد رکھتے تھے؟

جواب: وہ آزادی کے چیمپئن تھے۔ فرد کی آزادی پر پابندی کے سخت مخالف تھے۔ آزادیٔ فکر اور آزادیٔ اظہار کے علمبرداروں میں سے تھے۔ آمریت کے دشمن تھے جمہوریت پر پختہ یقین رکھتے تھے۔ مذہب کے معاملے میں کسی بھی لیبل کو پسند نہ کرنے کے باوجود مسلمان اور محض مسلمان تھے۔ سؤر نہیں کھاتے تھے۔ خدا کا تصور ان کے نزدیک ایک اعلیٰ طاقت (SUPERIOR FORCE) کا تھا جو تمام توانائی کا سرچشمہ ہے۔ میں نے زور دے کر پوچھا کہ دہریہ تو نہیں تھے۔ بیگم راشد نے زور دے کر کہا ہرگز نہیں۔ البتہ روایتی مذہبیت کے خلاف تھے۔ قرآن پر ان کی گہری نظر تھی۔ اکثر قرآن میں سے کوٹ کیا کرتے تھے۔ قرآن کی توجیہات بھی روشن فکری سے

کیا کرتے تھے۔ اسلام کے بارے میں ان کا علم اچھے اچھوں سے بڑھ کر تھا۔ دیگر مذاہب کے بارے میں بھی خاصے باخبر تھے۔ وہ حقیقتاً بہت بڑے عالم اور بہت بڑے انسان تھے۔ فرد کی آزادی پر ایمان ہی ان کو کمیونسٹوں سے بہت دور لے گیا تھا۔

سوال: کیا آپ لوگ زندگی بھر کے لئے انگلستان بس گئے تھے؟ چیلٹنہم میں ٹھہرنے کی کیا وجہ تھی؟

جواب: ہم بہت حد تک ہمیشہ کے لئے ہی انگلستان میں بس گئے تھے۔ میں جولائی ۱۹۷۳ء میں یہاں آئی۔ نذری ایک ماہ بعد اگست میں پہنچے۔ پہلے چھ ماہ ہم لندن میں رہے۔ پھر نذیل کی پڑھائی کے پیش نظر چیلٹنہم آ گئے اور یہیں پر یہ مکان بھی خرید لیا تھا۔ ہم نے ایران ہی میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ نذیل کو یہاں کے سکول میں داخل کرانا ہے۔ ہمیں یہ سکول بہت پسند ہے۔ یہ ایک پرائیویٹ قسم کا اقامتی ادارہ ہے۔ نذری اس شہر میں آ کر بہت خوش تھے کیونکہ یہ بڑے شہروں کی تمام قباحتوں سے پاک ایک خوبصورت چھوٹا سا قصبہ ہے اور پھر لندن سے زیادہ دور بھی نہیں۔

سوال: جلائے جانے کے بارے میں ان کی وصیت تحریری تھی یا زبانی؟ کیا انھوں نے اس معمول سے ہٹ کر عمل کی کوئی وجہ بھی بتائی تھی؟

جواب: جلائے جانے کی وصیت تحریری نہیں تھی۔ زبانی انھوں نے مجھ سے دو دفعہ اس خواہش کا اظہار کیا تھا۔ میں پھر کہوں گی کہ وہ عقیدے کے لحاظ سے مسلمان تھے اس کے باوجود جب کبھی چرچ جاتے تو وہاں کا ماحول انھیں متاثر کیا کرتا تھا۔ یہ مذہبی نہیں بہت حد تک ثقافتی پسندیدگی تھی۔

ان کی موت سے کوئی چھ ماہ پہلے میرے والد کا انتقال ہوا تھا۔ ہم رومن کیتھولک عیسائی ہیں۔ جو پہلے مُردوں کو نہیں جلایا کرتے تھے۔ اب کہیں کہیں جلانے لگے ہیں۔ چنانچہ میرے باپ کی لاش بھی جلائی گئی تھی۔ آپ کی اطلاع کے لئے جلانے کا کام عزیزوں کی موجودگی میں نہیں ہوتا بلکہ دعاؤں کے بعد لاش کے سامنے ایک پردہ گرا دیا جاتا ہے جس کے بعد اعزا و اقارب باہر چلے جاتے ہیں۔ جب یہ پردہ میرے والد کی لاش کے سامنے گرایا گیا تو ہم سب باہر چلے گئے لیکن نذری کسی نہ کسی طرح آخر تک وہیں موجود رہے اور لاش کو جلتے ہوئے دیکھا۔ ادھر ہم ڈھونڈتے پھر رہے تھے کہ نذری کہاں گئے۔ جب آخرکار وہ ہم سے ملے تو کہنے لگے "مجھے یہ طریقہ بہت پسند آیا ہے کیونکہ یہ بہت زیادہ ہائی جینک ہے۔" غالباً ان کی نفاست پسندی ہی نے ان کی اس خواہش کو تحریک دی اور انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں تم سے پہلے مر جاؤں تو مجھے بھی اسی طرح جلا دینا۔ اس کے بعد ایک اور موقع پر اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تھا۔

سوال: کیا آپ کے بیٹے نے بھی کوئی فنی رجحان وراثت میں پایا ہے؟ باپ کی موت پر اس کا ردعمل کیا ہے؟ کیا اسے اپنے باپ کے بڑا آدمی ہونے کا شعور ہے؟

جواب: یقیناً نذیل نے اپنے باپ سے بہت کچھ ورثے میں لیا ہے۔ وہ انگریزی نظمیں لکھتا ہے۔ اس کے علاوہ مصوری اور موسیقی میں بھی درک رکھتا ہے۔

جب نذری کا انتقال ہوا تو یہ سکول کے بورڈنگ میں تھا۔ ہم نے لندن سے فون پر سکول کے بورڈنگ میں تو خبر کر دی لیکن ساتھ تاکید کر دی کہ نذیل کو نہ بتایا جائے۔ ہم خود آ کر بتائیں گے۔ ۳۰ اکتوبر کو میں، نذریا اور میری والدہ یہاں پہنچے تو ہمیں دیکھتے ہی نذیل نے پوچھا "ڈیڈی کہاں ہیں؟" ہم سب کے دل بھرے ہوئے تھے پھر بھی ہم دونوں نے پورے ضبط سے کام لیا۔ پھر میں نذیل کو دوسرے کمرے میں لے گئی اور اسے دل پر جبر کر کے یہ خبر سنائی۔ سنتے ہی کہنے لگا "میں نے تو سمجھا تھا کہ انکل کا انتقال ہوا ہے اور آپ کہہ رہی ہیں کہ ڈیڈی کا۔" میں نے بتایا کہ دونوں کا انتقال ہو گیا ہے۔ اس پر اس کی چیخ نکل گئی لیکن ہماری امید سے کہیں جلدی وہ سنبھل گیا اور پھر اسی دن یا دوسرے دن باپ کے مطالعے کے کمرے میں جا کر ان کے ٹائپ رائٹر پر کچھ ٹائپ کرنے لگ گیا۔ میری ماں نے کہا کہ بیٹے نے باپ کی جگہ سنبھال لی ہے۔ کچھ دنوں کے بعد مجھ سے کہنے لگا "امی۔ آؤ وعدہ کریں کہ ہم یہ صدمہ پوری بہادری سے برداشت کریں گے۔" وہ ابھی تک اپنے عہد پر قائم ہے لیکن میں چھپ چھپا کر کبھی کبھی رو لیتی ہوں۔

بچے کو نہ صرف اپنے باپ کے بڑا ہونے کا احساس ہے بلکہ وہ خود بھی بڑا آدمی بننا چاہتا ہے۔ اس کی تاریخ پیدائش ۵ جون ۱۹۷۱ء ہے۔ گویا اس نے بارہویں برس میں قدم رکھا ہی تھا کہ باپ سے محروم ہو گیا۔

یہاں پہنچ کر نذیل کو آواز دی گئی کہ وہ اپنی نظمیں اور خاکے دکھائے۔ وہ اپنی چار نظمیں اور ایک مصوری کا دفتر لے آیا۔ پہلی نظم ۲۶ اکتوبر ۱۹۸۲ء کی ہے جس کا عنوان محبت ہے۔ پانچ سطروں کی یہ چھوٹی سی نظم یوں ہے:

LOVE IS NOT THE THING
THOU LET SLIP USELESS AWAY,
I USE IT IN EVERY WAY,
LOVE IS TO BE USED AND THOU

اس نظم کو نذری نے خود ہی صوت بند بھی کیا ہوا تھا۔ دوسری نظم ۲ر فروری ۱۹۶۵ء کی ہے۔ عنوان ہے "زندگی کیا ہے؟" تیسری ۱۰ر اکتوبر ۱۹۶۵ء کو لکھی گئی۔ عنوان "چھینٹے"
چوتھی ۲۰ر جون ۱۹۶۶ء کی ہے۔ اس کا عنوان "سائے" ہے گویا چار نظمیں بابا کی زندگی میں لکھی گئیں۔ بقول بیگم راشد نذری کے بارے میں راشد صاحب کہا کرتے تھے ... ماسٹر ہیں۔ یہ بیاسی تھا۔ ... میں صدر نکسن اور ہنری کیسنگر پر پھبتی کسی گئی ہے۔

سوال: راشد صاحب کا انتقال کن حالات میں ہوا؟ ان کی موت ناگہاں تھی یا متوقع؟

جواب: میرا ایک ہی بھائی تھا اور میں اس کی ایک ہی بہن۔ اکتوبر ۱۹۷۵ء کے پہلے ہفتے میں اسے کار چلاتے ہوئے دل کا دورہ پڑا اور وہ کار کے اندر ہی وفات پاگیا۔ ہمیں خبر کچھ اس طرح ملی کہ اس کو کسی کے حادثے میں انتقال ہوا ہے۔ اس خبر کا نذری پر بھی گہرا اثر ہوا۔ وہ میرے بھائی کے بے حد مداح تھے کسی زمانے میں نذری کی دیہی بچی جو ہماری ملاقات کا سبب بنی لندن میں پڑھا کرتی تھی اور میرے بھائی نے اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا تھا۔

نذری کو رونے دھونے سے سخت نفرت تھی۔ اس لئے میں نے ان کے سامنے اپنے آپ کو بڑی مشکل سے سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ وہ خود بھی بے حد غمگین تھے۔ پھر اس روز ان کی طبیعت بھی کچھ خراب تھی۔ اس لئے میں نے سوچا کہ ہم لوگ ایک دو دن کے بعد آرام سے اٹلی چلے جائیں گے لیکن ۸ر اکتوبر کو میری بھابی نے فون کیا اور مجھ سے کہا کہ جتنی جلدی ہو سکے اٹلی پہنچو۔ اس نے بتایا کہ میرے بھائی کا انتقال گھر سے بہت فاصلے پر ہوا ہے اور اس کے پاس کوئی مددگار نہیں۔

دوسری طرف جانے سے پہلے یہ بھی ضروری تھا کہ ہم سرے ... کو بھی ساتھ لیتے۔ ایک رکاوٹ یہ بھی تھی کہ نذری ویزا لئے بغیر اٹلی نہیں جا سکتے تھے۔ ان حالات میں بالآخر فیصلہ یہ ہوا کہ میں تو اسی روز پہلی پرواز سے چلی جاؤں۔ نذری شام تک سرے پہنچ جائیں۔ دوسرے دن لندن سے ویزا لے لیں اور پھر میری والدہ کو ساتھ لے کر اٹلی آ جائیں۔ اس پروگرام کے مطابق وہ مجھے الوداع کہنے ریلوے اسٹیشن تک گئے۔ ریل گاڑی چلنے تک مجھے دلاسا دیتے رہے۔ ان کی طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے میں بے حد پریشان تھی لیکن یہ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ ملاقات زندگی کی آخری ملاقات ہے۔

نذری کے دل کی نسیں کبھی کبھی پھول جایا کرتی تھیں۔ خاص طور پر جب وہ کھانے کے بعد آرام نہ کرتے اور بدن کسی قسم کی کسرت سے دوچار ہوتا تو تکلیف بڑھ جایا کرتی تھی۔ اسی لئے جب انہیں سفر پر نکلنا ہوتا تو کچھ کھائے پیے بغیر نکلا کرتے۔ اس روز بھی چونکہ سرے جانا تھا اس لئے وہ بھوکے پیٹ نکلے تھے یا نکلنے والے تھے۔ ایک گولی ہمیشہ ان کے پاس رہا کرتی تھی جو تکلیف کے وقت کھانے سے افاقہ ہو جاتا۔

میرے چلے جانے کے بعد انھوں نے کسی وقت ٹرین پکڑی اور رات کو ساڑھے سات بجے سرے میں میری والدہ کے ہاں پہنچ گئے۔ یہ جگہ لندن سے بالکل قریب ہے۔ میری والدہ اپنی جگہ غم سے نڈھال تھیں لیکن نذری کی طبیعت کا خیال کر کے وہ بھی اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے تھیں۔ نذری گھر میں داخل ہوئے تو ماں نے کہا "نذری! آتش دان کے قریب کرسی پر بیٹھ جاؤ۔" لیکن وہ یہ کہتے ہوئے ایک صوفے پر بیٹھ گئے کہ وہاں گرمی زیادہ ہوگی۔ صوفے پر بیٹھتے ہوئے میرے بھائی کی موت کے بارے میں کہا: "IT IS A TERRIBLE DEATH!" میری ماں نے دلاسا دیا اور کہا کچھ کھا لو بیٹے! کہنے لگے "نہیں کیونکہ میں نے گولی کھا رکھی ہے۔" اس کے بعد میری ماں نے کوئی بات کی لیکن نذری کی جانب سے کوئی جواب نہیں آیا۔ ماں نے پلٹ کر دیکھا تو وہاں خاموشی کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر گال تھپتھپائے، آوازیں دیں لیکن نذری حرف و صوت سے بے نیاز ہو چکے تھے۔ یہ ۹ر اکتوبر ۱۹۷۵ء رات پونے آٹھ بجے کا واقعہ ہے۔

ادھر میں اٹلی میں اپنے گھر رات دیر سے پہنچی اس لئے میں نے ماں کو فون کرنا مناسب نہ سمجھا۔ دوسرے دن صبح جب میں نے فون کیا تو میری ماں نے چھوٹتے ہی پوچھا "تم نے نذری کے بارے میں سن لیا ہے؟" میں نے جواب دیا "نہیں تو۔ مجھے کس کو کچھ بتانا تھا؟" ماں نے جواب دیا "پولیس نے؟ بہرحال نذری مر گئے ہیں۔ لاش اس وقت ہسپتال میں ہے۔ کل رات پولیس بڑی مددگار ثابت ہوئی۔ انھوں نے نہ صرف یہاں میری مدد کی بلکہ یہ بھی کہا کہ وہ اٹلی کی پولیس کو اطلاع کر دیں گے تاکہ وہاں سے آپ کی بیٹی کو خبر دی جا سکے۔

کوئی آٹھ بجے کے قریب اٹلی کی پولیس نے بھی مجھے اس سانحہ کی اطلاع دے دی۔

یہ موت اتنی اچانک اور غیر متوقع تھی کہ مجھے ابھی تک اس کا یقین نہیں آ رہا ہے۔ بعض اوقات مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ نذری پاکستان گئے ہے

ہیں اور کسی وقت بھی مجھے تار مل سکتا ہے کہ فلاں تاریخ کو آ رہا ہوں۔

آخری سوال: کیا آپ کے لئے ممکن نہیں کہ آپ ان کی شخصیت پر یا ادب ضمن میں خود بھی کچھ لکھیں؟

جواب: میں لکھاری نہیں ہوں، اس لئے ان کے بارے میں کچھ لکھنا مشکل ہے۔

اس پر میں نے کہا کہ ایک بیوی کو اپنے خاوند کے بارے میں لکھنے کے لئے لکھاری ہونے کی کیا ضرورت ہے خصوصاً جب وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی ہو۔ کہنے لگیں "آپ کا سوال نامہ دیکھ کر اور آپ سے گفتگو کرنے کے بعد میں سوچ رہی ہوں کہ مجھے لکھنا چاہئے۔ دیکھیں عملاً کچھ کر پاتی ہوں یا نہیں" میں نے پھر پرزور الفاظ میں لکھنے کا مشورہ دیا اور کہا: "آپ تو جو کچھ بھی ان کے بارے میں یاد آتا جائے جسے آپ لوگوں تک پہنچانا چاہتی ہوں اسے اپنے انداز میں قلمبند کرتی جائیں۔ کچھ عرصے کے بعد آپ کو احساس ہوگا کہ یہ راشد صاحب کی کتنی بڑی خدمت ہے۔" یہ مشورہ میں ان سے رخصت ہونے تک دیتا رہا۔

اس کے بعد میں نے پوچھا کہ کچھ اور کہنا چاہتی ہیں۔ کتابوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگیں: "انگریزی کتابیں تو میں اپنے پاس رکھوں گی، البتہ فارسی اردو اور پنجابی کتابیں میں چاہتی ہوں پاکستان میں کسی لائبریری کو دے دوں۔ اس کے لئے میں نے کئی لوگوں کو لکھا ہے لیکن کسی نے جواب دینا گوارا نہیں کیا[5]......"

بیگم راشد اٹھ کر باہر گئیں تو میں نے لائبریری کا جائزہ لینا شروع کیا۔ "فنون" اور "اوراق" کی تقریباً مکمل فائل۔ اس کے علاوہ "ساقی" اور "نیا دور" کے بے شمار پرچے۔ "افکار" کا "ندیم نمبر"۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی کتابیں۔ "یادوں کی برات"۔ ارشاد پنجابی کا "پنجابی نامہ" اس سے آگے "پنجابی زبان و ادب کی تاریخ"...... اور پھر دیکھتے دیکھتے میری اپنی کتاب "لا مریت" دوسری شاعری "بورنے" کہیں نظر نہیں آئی۔ میں نے "لا مریت" کو باہر نکال کر دیکھا۔ اپنے ہاتھ سے ان کی نذر کیا ہوا یہ نسخہ لائبریری میں دیکھ کر میں نے اپنا قد غیر معمولی طور پر بڑھتا ہوا محسوس کیا۔ پیش کرتے وقت مجھے یونہی خیال سا آیا تھا کہ جلد ہی یہ کتابیں ڈسٹ بن میں چلی جائیں گی۔ نذر کرنے کی تاریخ ۵ مئی ۱۹۷۲ء تھی اور مقام تہران! آج دو سال اور آٹھ مہینے کے بعد اس نسخے سے کن حالات میں ملاقات ہوئی۔ یہ سوچتے ہوئے اگر بیگم راشد کمرے میں واپس نہ آ جاتیں یا کچھ دیر ٹھہر کر آتیں تو میری آنکھوں کی چوری پکڑی جاتی۔

اتنے میں نذیل دوڑتا ہوا آیا اور مجھے ایک رسالہ دیتے ہوئے کہنے لگا: "یہ ابھی ابھی ڈاک سے آیا ہے۔" یہ "پاکستانی ادب" کا اکتوبر نومبر کا شمارہ تھا جس میں راشد صاحب کی ایک نظم اور امیر خسرو پر مضمون تھا۔ دراصل یہ شمارہ امیر خسرو نمبر تھا۔ اس کے علاوہ ایک اور پارسل آیا پڑا تھا۔ یہ "نیا دور" کے کئی شماروں پر مشتمل تھا۔ پارسل ابھی بند تھا۔ میں نے لیبل کو غور سے دیکھا۔ ان کی موت سے چند روز پہلے پاکستان سے روانہ ہوا تھا۔ علم و ادب کی یہ ندیاں اس سمندر کی جانب ابھی تک رواں تھیں۔

واپس آکر میں نے بیگم راشد کو مندرجہ ذیل خط لکھا:

ڈیئر مسز راشد!

سب سے پہلے میرا فرض ہے کہ تہہ دل سے آپ کی مہمان نوازی اور حسن سلوک کا شکریہ ادا کروں جس کا اعزاز مجھے چھ جنوری کو آپ کے ہاں ملا۔ جب آپ جیسا کوئی بڑا انسان میرے جیسے معمولی آدمی کو عزت سے نوازتا ہے تو مؤخر الذکر ممنون ہونے کے ساتھ ساتھ کچھ بعید نہیں کہ خود کو خوشامد کا مستحق سمجھ بیٹھے۔

اگر آپ مجھے کوئی مشورہ دینے کا اہل سمجھیں تو بیگم راشد میں یہی درخواست کروں گا کہ آپ اپنے معزز خاوند کے بارے میں کچھ لکھیں۔ میں نے آپ کے ساتھ جو مصاحبہ کیا اس کی بنا پر میں کوئی چھوٹا موٹا خاکہ بنا ہی لوں گا لیکن اگر آپ میرے سوالوں کا مفصل جواب ضبط تحریر میں لانا شروع کریں تو مجھے یقین ہے کہ یہ سوال آپ کے قلم سے کوئی سوا ایک صفحات ضرور کھینچ لیں گے۔ اس خدمت کے لئے اردو ادب کا تاریخ دان آپ کا ممنون ہوگا۔ علاوہ ازیں یہی بہترین خراج عقیدت ہے جو آپ اس عظیم انسان کو پیش کر سکتی ہیں۔ اس مقصد کے لئے آپ کا عرف عام میں لکھاری ہونا کچھ ضروری نہیں......

....

نیک تمناؤں اور نذیل کو محبت کے ساتھ

آپ کا مخلص

حسین شاہد

---

[5] یہ پیغام میں نے محترم احمد ندیم قاسمی تک پہنچایا تو [illegible]

کوی جسیم الدّین

رياض انور

کوی جسیم الدین رخصت ہوگئے اور ان کے ساتھ بنگالی ادب کا ایک عہد ختم ہوگیا۔ ٹیگور اور نذرالاسلام کے بعد کوی جسیم الدین بنگالی کے سب سے ہردلعزیز شاعر تھے۔ ان کی کتابوں کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ وہ کتابوں سے حاصل کردہ رائلٹی پر انکم ٹیکس ادا کیا کرتے تھے اور گھر کا تمام خرچہ اسی سے چلتا تھا۔ وہ اٹھارہ کتابوں کے مصنف تھے اور ان میں کوئی کتاب بھی ایک درجن سے کم ایڈیشنوں میں شائع نہیں ہوئی۔ "نکشی کا تھر ماٹھ" کا چھبیسواں ایڈیشن اور "پدما بار" کا بیسواں ایڈیشن میرے پاس موجود ہے۔ ان کے کلام کے علاوہ ان کی شاعری اور شخصیت کے بارے میں تنقیدی کتابیں یونیورسٹی کے نصابوں میں شامل ہیں۔ وہ جس شہر میں جاتے ان کی قیام گاہ پر لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگ جاتے۔ ایک بار میں اور کوی سید پور سے کھلنا جا رہے تھے۔ ہمیں ایشردی جنکشن پر گاڑی بدلنی تھی۔ ہم دونوں وقت گزارنے کے لئے پلیٹ فارم پر ٹہل رہے تھے۔ ایک نوجوان طالب علم میرے قریب آیا اور پوچھا کہ کیا میرا ساتھی کوی جسیم الدین ہے؟ جب میں نے اثبات میں جواب دیا تو اس نے بڑی لجاجت سے کہا کہ میں کوی سے کہوں کہ وہ اس سے ہاتھ ملالیں۔ جب وہ کوی سے ہاتھ ملا چکا تو میں نے دیکھا کہ اس کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا ہے اور اس کی آنکھوں میں عقیدت کے آنسو لرز رہے ہیں۔ پھر وہ بھاگ کر اپنے کالج گیا اور آدھے گھنٹے کے اندر اساتذہ اور طلبا کا ایک ہجوم اسٹیشن پر پہنچ گیا اور جب تک ہم لوگ وہاں سے روانہ نہیں ہوئے ان لوگوں نے اسٹیشن سے جانے کا نام نہیں لیا۔ ان کی گفتگو تو میری سمجھ میں نہیں آئی لیکن ان کی آنکھوں میں عقیدت اور محبت کی جو لہریں تڑپ رہی تھیں وہ مجھے کبھی نہیں بھول سکتیں۔ یہی منظر کھلنا اور جیسور میں دیکھا۔ ہم دونوں سکون اور آرام کی تلاش میں وہاں گئے تھے لیکن کوی کے عقیدت مندوں نے ہمیں اس طرح "گھیرا" کر لیا کہ دو دن بعد ہی ہمیں وہاں سے بھاگنا پڑا۔ ہم دونوں ایک بار باریسال گئے۔ کوی نے کسی کو اپنی آمد کی اطلاع نہیں دی تھی کیونکہ اتنی مہلت ہی نہیں تھی۔ ہم چپکے سے اسٹیمر کے ٹکٹ لے آئے تھے۔ اور ہم دونوں کمبل اٹھا کر چل پڑے تھے۔ ہم گھاٹ سے رکشا میں بیٹھ کر ریسٹ ہاؤس پہنچے۔ رکشا والے کو جب یہ معلوم ہوا کہ کوی جسیم الدین آئے ہیں تو اس نے کرایہ لینے سے انکار کر دیا۔ جب ہم نے اصرار کیا تو وہ روہانسا ہوگیا۔ دوپہر ہوتے ہوتے لوگوں کا تانتا بندھ گیا۔ رات کو کوی سمیلن کا اہتمام ہوگیا۔ ڈسٹرکٹ کونسل ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ بہت دیر تک کوی اپنی نظمیں سناتے رہے اور لوگ عقیدت سے جھومتے رہے۔ مقامی کالج کے طلبا اور طالبات نے کوی کے گیت موسیقی کے ساتھ سنائے اور بہت رات گئے تک یہ محفل جمی رہی۔ ایک بار پھر ہم دونوں کا تفریحی سفر غارت ہوگیا۔

کوی جسیم الدین عوامی سطح پر نوجوانوں اور بزرگوں میں یکساں مقبول تھے۔ شانتی نکیتن کے HIGH BROW CRITICS مشرقی پاکستان کے شاعروں میں سے صرف کوی جسیم الدین کو بڑا شاعر تسلیم کرتے تھے۔ ۱۹۶۴ء میں شانتی نکیتن میں ان کے اعزاز میں ایک خاص ادبی جلسے کا اہتمام کیا گیا جسے مشرقی اور مغربی بنگال میں بڑی اہمیت دی گئی کیونکہ شانتی نکیتن والے خال خال ہی ایسے جلسوں کا اہتمام کرتے تھے۔ دوسرے مشہور شعرا کو وہ صرف نظمیں سنانے کے لئے مدعو کرتے ہیں۔ یہ بھی ایک بڑا اعزاز سمجھا جاتا ہے۔ مشرقی پاکستان سے انھوں نے ایک بار صرف کوی شمس الرحمٰن کو نظمیں سنانے کے لئے دعوت دی تھی اور یہ بات ان کی شاعری کے لئے سند سمجھی جاتی ہے۔

کوی ایک بڑے شاعر تھے اور ان کی خوش قسمتی ہے کہ ان کی زندگی میں ہی ان کی بڑائی کو تسلیم کیا گیا اور بنگالی عوام نے ان کی بڑی قدر و منزلت کی۔

کوی کی اس غیر معمولی شہرت کی وجہ سے نوجوان بنگالی شعراء ان سے کچھ کھچے کھچے رہتے تھے۔ ایک بار حسن حفیظ الرحمن سے میں نے پوچھا کہ کس شاعر کی کتابیں زیادہ مقبول ہیں۔ اس نے کہا کہ کتابیں تو صرف کوی جسیم الدین کی بکتی ہیں لیکن شاعری ہم اچھی کرتے ہیں۔ یہ "لیکن" والی بات صرف حسن کی شاعرانہ انا تھی۔ کوی کے بارے میں یہ تاثر دینے کی کوشش بھی کی جاتی تھی کہ انھوں نے لوک گیت چرا کر اپنی شاعری کا تانا بانا بنا ہے۔ ان کی شاعری صرف لوک گیتوں کا پرتو ہے اور ان کی زبان عوامی زبان کی طرح کھردری اور غیر ترقی یافتہ ہے۔ یہ بات بھی درست نہیں۔ میں نے بنگالی ادب کے کئی مستند نقادوں اور اساتذہ سے استفسار کیا تو انھوں نے بتایا کہ کوی کی شاعری ہر لحاظ سے اعلیٰ درجے کی جدید شاعری ہے لیکن ان معنوں میں جدید نہیں ہے جیسے ایلیٹ کے پیرو سمجھتے ہیں۔ (بنگالی کے تقریباً تمام نوجوان شعراء ایلیٹ سے متاثر ہیں) کوی نے اپنے عہد کی پوری ترجمانی کی ہے۔ عوام کے دکھوں اور ان کی خوشیوں کو شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ البتہ ان کی زبان جدید سنسکرت زدہ بنگالی سے مختلف ہے۔ ان کی زبان صرف بنگالی ہے جو ٹیگور کی زبان بھی ہے اور نذرالاسلام کی زبان بھی۔ کوی نے لوک گیتوں پر بہت کام کیا ہے۔ تخلیقی عمل سے ہٹ کر یہ ان کی تحقیقی کاوش تھی جو دورانِ ملازمت ان کی ایک ASSIGHNMENT تھی۔ انھوں نے بستی بستی گھوم کر لوک گیت جمع کئے۔ انھیں کاٹ چھانٹ کر سنوارا اور ضبطِ تحریر میں لائے اور پھر معروف فن کاروں کی آوازمیں انھیں محفوظ کیا۔ لوک گیتوں کا یہ ذخیرہ گیارہ جلدوں میں چھپ چکا ہے اور ہزاروں ریکارڈوں کی صورت میں گھر گھر پھیلا ہوا ہے۔

اس تحقیق کے دوران کوی کئی بے نام فنکاروں کو بستیوں سے اٹھا کر کلکتہ اور ڈھاکہ لائے اور ان کی تربیت کر کے انھیں شہرت کی بلندیوں تک پہنچایا۔ ان فنکاروں میں عباس الدین احمد، فردوسی بیگم کے والد، سچل دیو برمن اور عبدالحلیم خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ عباس الدین احمد ضلع فرید پور کی بستیوں میں گھوم گھوم کر اکتارے پر گیت سنایا کرتے تھے۔ ان کی آواز نے کوی کو متاثر کیا اور وہ انھیں کلکتہ لے آئے جہاں انھوں نے شہرۂ آفاق لوک گیت "نودیر کول نا ہیں کینارا نائیں رے" ان کی آواز میں ریکارڈ۔ یہ گیت اپنی رسیلی دھن اور عباس کی آواز کی جادوگری کی وجہ سے اتنا مشہور ہوا کہ ہر پڑھے لکھے بنگالی کے گھر میں آپ کو یہ ریکارڈ ضرور ملے گا۔ اسی گیت کی بدولت عباس الدین کو شہرت ملی اور انھیں ایک عظیم فنکار تسلیم کیا گیا۔ اسی طرح سچل دیو برمن کو کوی میمن سنگھ کے ایک دور افتادہ گاؤں نترکونا سے لائے تھے۔ انھوں نے ایک دوسرا عظیم لوک گیت "اے ماجھی رے جھوڑ طوفانے چالاؤ توری ہوشیار" ان کی آواز میں ریکارڈ کیا تو برمن دنوں ہی میں ملک گیر شہرت کے مالک ہو گئے۔ ایک بار میں اور کوی چاند پور کے آس پاس دریائے میگھنا میں سفر کر رہے تھے تو انھوں نے اس گیت کے بارے میں ایک دلچسپ واقعہ سنایا۔ انھوں نے کہا کہ ۲۵ برس قبل وہ اور سچل دیو برمن ایک کشتی میں دریائے میگھنا میں سفر کر رہے تھے کہ طوفان نے آ لیا۔ کشتی شدت سے ہچکولے کھانے لگی۔ میں نے برمن سے کہا کہ یہ گیت گاؤ۔ برمن نے اپنی پاٹ دار آواز میں یہ گیت چھیڑا اور جیسے جیسے طوفان کی شدت بڑھتی گئی برمن کی آواز بلند سے بلند تر ہوتی گئی۔ جب برمن کی آواز بادلوں کی گرج سے ہم آہنگ ہوئی تو طوفان تھمنے لگا اور گیت ختم ہوا تو طوفان تھم چکا تھا اور کشتی دھیرے دھیرے پانی کی سطح پر بہنے لگی تھی۔ یہ تھا لفظ اور آواز کا اعجاز!

کوی کو اس بات پر بڑا فخر تھا کہ تینوں کسی نہ کسی طرح ان کے شاگرد تھے۔ کوی کو بنگالی لوک موسیقی پر بڑی دسترس تھی۔ ہر چند ان کی اپنی آواز بہت بے رس تھی اور اس آواز سے وہ دوران سفر یا ڈھلتی شام کے سمے مجھے اکثر پریشان کیا کرتے تھے لیکن سر اور تال درست ہوتا تھا۔ وہ بڑے بڑے فنکاروں کو لوک موسیقی کی باریکیاں سمجھایا کرتے اور انھیں دھنیں یاد کراتے رہتے تھے۔ جس کو بھی کبھی کسی لوک گیت کی دھن کے بارے میں کوئی مشکل آن پڑتی وہ فوراً ان کے پاس پہنچتا۔ اس سلسلے میں کوی نے کبھی کسی کو مایوس نہیں کیا تھا۔

کوی جسیم الدین ایک دردمند پاکستانی تھے۔ انھوں نے تحریک پاکستان میں سرکاری ملازمت کے باوجود بھرپور حصہ لیا تھا۔ تقسیم سے قبل انھوں نے ہندوؤں کے ہاتھوں ڈھاکہ یونیورسٹی میں بڑے دکھ اٹھائے تھے اور انھیں پاکستان کی [illegible] حمایت تھا وہ صحیح معنوں میں مشرقی اور مغربی پاکستان میں یکجہتی اور افہام وتفہیم کے خواہاں تھے۔ وہ مغربی پاکستان کئی بار آئے اور [illegible] تاثرات انھوں نے ایک سفرنامے کی صورت میں شائع کئے تھے۔ یہ کتاب بہت مقبول ہوئی۔ اس سفرنامے کے کچھ حصے [illegible] مجھے سنائے تھے [illegible] ڈوبا ہوا تھا۔ اسی جذبے کے تحت انھوں نے میری

طویل نظم "آوازوں کا بھنور" کا بنگلہ میں ترجمہ کیا تھا۔ آفتاب پرویز نے اس نظم کے کچھ حصے انھیں بنگلہ میں ترجمہ کر کے سنائے تھے جن سے وہ بہت متاثر ہوئے کچھ عرصہ بعد ان کا خط آیا کہ وہ اس نظم کا ترجمہ کرنا چاہتے ہیں اور اس سلسلے میں ملتان آنا چاہتے ہیں جہاں وہ آفتاب پرویز کی مدد سے کام کر سکتے تھے۔ میں نے انھیں کبھی یہ کام کرنے کو نہیں کہا تھا کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ عمر کے اس حصے میں یہ کام ان کے لئے بے حد مشکل ہے لیکن وہ اپنی مرضی سے لاٹھی ٹیکتے ہوئے ملتان آئے۔ اور کتاب کا ترجمہ کر کے ہی واپس گئے۔ یہ ایک عجیب بات ہے اور میرے لئے سامانِ فخر بھی ہے کہ سوائے اس کتاب کے کوی نے زندگی بھر کسی اور زبان سے کوئی ترجمہ نہیں کیا۔ وہ اس کام کو تضیع اوقات اور تخلیقی عمل کے لئے نقصان دہ سمجھتے تھے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران انھوں نے بے شمار قومی نغمے لکھے جو فوراً ریکارڈ ہو کر ڈھاکہ ریڈیو سے نشر کئے جاتے تھے۔ کوی اور دوسرے نامور فنکار سارا سارا دن سٹوڈیو میں گزارتے۔ جب میں جنگ کے فوراً بعد ڈھاکہ پہنچا تو لوگوں نے مجھے بتایا کہ جنگ کے دنوں میں عوام کا جذبۂ حب الوطنی ابھارنے میں کوی کے نغموں نے بڑا کام کیا ہے لیکن بعد میں وہ حالات کے رُخ سے خاصے مایوس ہو گئے تھے۔ ۱۹۶۹ء میں ایک رات ہم دونوں بہت دیر تک جاگتے رہے، باتیں کرتے کرتے کوی یکدم خاموش ہو گئے اور دکھ بھری آواز میں کہنے لگے:

RIAZ—PAKISTAN IS BREAKING UP—NEITHER YOU NOR I CAN STOP IT. EVERY BODY HAS GONE MAD.

میں نے دیکھا ان کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے تھے۔ وہ کرسی سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس جا کھڑے ہوئے۔ گھر کے سامنے جھیل میں جھل مل کرتے ستاروں کو بڑی دیر تک خاموشی سے دیکھتے رہے اور پھر ہم دونوں ایک دوسرے سے بات کئے بغیر اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

۱۹۷۱ء کے درمیانی مہینوں میں کوی نے جو خطوط مجھے لکھے ان کے ہر لفظ سے دکھ اور درد کا زہر ٹپکتا ہے۔ حالات سے جس طرح حکومتی سطح پر نمٹا جا رہا تھا وہ اس سے انتہائی دل برداشتہ تھے۔ ہر بار انھوں نے مجھے ڈھاکہ آنے اور حالات اپنی آنکھوں سے دیکھنے کو کہا، لیکن میں اپنی مالی دشواریوں کی وجہ سے ڈھاکہ نہ جا سکا۔ ان کا آخری خط اکتوبر ۱۹۷۱ء میں آیا۔ انھوں نے خلافِ عادت مجھے طعنہ دیا کہ میں کیسا بنگال کا دوست ہوں۔ بنگال جل رہا ہے اور میں ریستورانوں میں بیٹھا دوستوں سے گپ لڑا رہا ہوں۔ اس دن میں اپنی بے چارگی پر بہت رویا۔ کاش میں کوی کی آخری خواہش پوری کر سکتا۔

جب ہندوستانی جارحیت نے بنگلہ دیش کو جنم دیا تو کوی جسیم الدین آزردہ ہو کر اپنے لڑکے کے پاس جرمنی چلے گئے اور مجیب کی عبرتناک موت سے صرف چند ماہ قبل اپنے بچوں کے اصرار پر واپس آئے۔ مجیب کی موت پر ان کا یہ بیان NEWS WEEK میں چھپا۔

PEOPLE HAD THOUGHT THAT THIS SUPERMAN WILL BRING THEM PROSPERITY BUT THIS SUPERMAN HAD LED US FROM MISERY TO RUINATION.

۱۹۷۲ء سے لے کر بنگلہ دیش کے فوجی انقلاب تک کے درمیانی تاریک دور میں ہم ایک دوسرے کو کوئی خط نہ لکھ سکے۔ جب مواصلات کا سلسلہ بحال ہوا تو میں نے انھیں پاکستان آنے کی دعوت دی لیکن افسوس میرا یہ خط اس دن ڈھاکہ پہنچا جب وہ موت کی نیند سو چکے تھے۔ میں نے انھیں لکھا تھا کہ تاریخ کے اندھیرے میں اترنے سے پہلے ہمیں ایک دوسرے سے ضرور ملنا ہے۔ یہ ہمارا مقدر ہے۔ لیکن قدرت کے نزدیک میرا مقدر تو صرف ایک دائمی جدائی کا غم تھا۔ جب کشور ناہید نے مجھے فون پر بتایا کہ کوی مر گئے ہیں تو مجھے کمرہ گھومتا ہوا نظر آیا لیکن میری آنکھ سے کوئی آنسو نہیں ٹپکا۔ شاید دکھ کی ایک منزل یہ بھی ہوتی ہے جب آنسو آنکھوں میں سوکھ جاتے ہیں۔

کوی جسیم الدین ایک امیر آدمی تھے۔ انھوں نے ڈھاکہ کی ایک اضافی بستی کملا پور میں چار بیگھے پر پھیلی ہوئی ایک خوبصورت دو منزلہ کوٹھی بنائی تھی۔ اس گھر کے آگے ایک خوبصورت جھیل تھی جس میں کوی کی خوبصورت بطخیں اور کنول کے گلابی پھول تیرتے رہتے تھے۔ پائیں باغ میں آم اور لیموں کے درخت تھے جن کی مہکار چاروں اور پھیلی رہتی۔ وہ دوستوں کی مدارات پر بہت خرچ کرتے تھے لیکن اپنی ذات کے لئے وہ بے حد کنجوس تھے۔ ۱۹۶۲ء میں مغربی

پاکستان کے ادیبوں کے اعزاز میں انھوں نے جو دعوت دی تھی اور رقص و موسیقی کا جو اہتمام کیا تھا وہ لوگوں کو ہمیشہ یاد رہے گا۔ وہ خود شراب نہیں پیتے تھے لیکن دوسروں کا وسکی کا بل وہ اکثر ادا کیا کرتے تھے۔ البتہ اپنی ذات پر ایک روپیہ خرچ کرنا بھی ان کے لئے بڑی زحمت کا باعث ہوا کرتا تھا۔ ایک دن میں اور صلاح الدین محمد ان کے گھر گئے تو سینکڑوں دھلے ہوئے کپڑے دھوپ میں سوکھ رہے تھے۔ میں نے صلاح الدین سے کہا کہ کوی تو بہت امیر آدمی معلوم ہوتے ہیں لیکن صلاح الدین نے یہ کہہ کر مجھے مایوس کر دیا کہ ان کپڑوں میں کوی کا کوئی کپڑا نہیں۔ ان کے بچے نت نئے کپڑوں میں ملبوس نظر آتے لیکن کوی اپنی تھیلا نما پتلون، ملگجی بشرٹ یا بوسیدہ کوٹ کو کبھی اپنے سے جدا نہ کرتے اور ان کے بوٹ غالباً سال میں ایک آدھ بار ہی پالش کے ساتھ سے گزرا کرتے تھے۔ ایک بار وہ میرے ہاں آ کر ٹھہرے تو اپنے ساتھ ایک زنگ آلود جستی ٹرنک لائے۔ اس ٹرنک کی کنڈی ٹوٹی ہوئی تھی اور کوی نے اسے رسی سے باندھ رکھا تھا۔ میری بیوی نے یہ ٹرنک اٹھا کر باہر پھینک دیا اور کوی کو نیا اٹیچی نذر کر دیا لیکن کوی کو وہ اٹیچی کیس پسند نہ آیا اور جب تک ملتان میں رہے اپنے بوسیدہ ٹرنک کو برابر یاد کرتے رہے۔ میری بیوی نے تنگ آ کر کہا کہ کوی جی یہ ٹرنک آپ کے شایان شان نہیں تھا اس لئے ہم نے اسے پھینک دیا ہے لیکن کوی نے جواب دیا۔ "بٹیا آپ کیا بات کرتی ہیں۔ یہ ٹرنک تو ہمارے ساتھ امریکہ، چین اور روس تک گیا ہے۔"

راجشاہی یونیورسٹی کے ایک پروفیسر نے کوی جسیم الدین کی ذات اور شاعری پر ایک ضخیم کتاب لکھی۔ گلڈ نے اس کتاب پر مصنف کو دس ہزار روپے انعام دیا۔ جب کوی کو یہ معلوم ہوا تو انھوں نے بڑی سنجیدگی سے مجھے خط لکھا کہ میں گلڈ سے کہوں کہ اس انعام کا نصف حصہ کوی کو دیا جائے۔ میں یہ خط پی گیا۔ جب ڈھاکہ گیا تو انھوں نے پھر یہ بات چھیڑی۔ میں نے انہیں سمجھایا کہ انعام تو مصنف کو دیا جاتا ہے اور آپ چونکہ اس کتاب کے مصنف نہیں اس لئے آپ کا مطالبہ غلط ہے۔ لیکن ان کا استدلال یہ تھا کہ اگر میں نہ ہوتا تو پھر یہ پروفیسر کیسے کتاب لکھتا لہذا وہ آدھے انعام کے حقدار ہیں۔ ان کے اصرار پر میں نے گلڈ کے نام ایک نوٹس لکھ دیا کہ کوی کو انعام کا نصف حصہ دیا جائے ورنہ ان کے خلاف مقدمہ کیا جائے گا۔ کوی کے جانے کے بعد میں نے یہ نوٹس پھاڑ دیا۔ بعد میں جب کوی ملتان آئے تو انھوں نے پوچھا کہ گلڈ نے کیا جواب دیا ہے۔ میں نے شرارتاً کہا کہ گلڈ کو تو کوئی اعتراض نہیں لیکن جمیل الدین عالی مخالفت کر رہا ہے اس لئے کام نہیں بن سکتا۔ حیرت کی بات ہے کہ کوی نے اس بات کو صحیح سمجھ لیا اور آخری دم تک عالی کا یہ قصور انھوں نے معاف نہیں کیا۔

کوی بڑی لگن کے آدمی تھے۔ ہمہ وقت شاعری کے نشہ میں مست رہتے۔ وہ سارا ڈھاکہ پیدل گھوما کرتے حالانکہ ان کے پاس دو کاریں تھیں۔ وہ پیدل چلتے چلتے شعر کہنے کے عادی تھے۔ جگہ جگہ رک کر وہ کاغذ کے پرزوں پر شعر کہتے اور یہ پرزے جیب میں ٹھونستے جاتے۔ ان کی جیبیں ہمیشہ کاغذوں سے بھری رہتیں۔ اسی لگن کے باعث وہ کئی بار سڑکوں پر رکشا سے ٹکرائے اور کئی مرتبہ سڑک سے ہٹ کر گڑھوں میں گرے اور چوٹ کھائی لیکن ان کی یہ عادت ان سے نہ چھوٹ سکی۔ شاید اسی لگن کی وجہ سے وہ اپنے کپڑوں، بالوں اور جوتوں کی ہیئت کذائی سے مستقلاً بے نیاز رہتے تھے۔ ایک بار میں شام کے وقت جلسے سے واپس آیا۔ ہلکا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ میں لان سے گزرا تو اجلے کپڑوں اور تراشیدہ بالوں والا ایک شخص لیموں کے پودے کے پاس کھڑا دیکھا۔ میں سمجھا کہ شاید کوئی مہمان آیا ہے۔ میں چپکے سے پاس سے گزر گیا۔ جب برآمدے کی سیڑھیاں چڑھنے لگا تو مجھے خیال آیا کہ کہیں یہ کوی نہ ہوں۔ میں رک گیا اور پلٹ کر دیکھا تو کوی سمجھ گئے ہنس کر کہنے لگے "کل جیسور گیا تھا وہاں لوگوں نے بال کٹوا دیئے اور کپڑے دھلوا دیئے اسی لئے تم نے نہیں پہچانا ——"

آخری دس برسوں میں کوی کی بیگم ان کے لئے ایک بڑا تکلیف دہ مسئلہ بن کر رہ گئی تھیں۔ یہ خاتون کوی کی تیسری بیوی تھیں اور ان سے عمر میں قریباً بیس برس چھوٹی تھیں۔ بنگالی ادب میں ایم اے تھیں اور کوی کی شاعری کے چکر میں آ کر ان سے شادی کر بیٹھی تھیں۔ انھیں یہ شکایت تھی کہ ساٹھ سال کے پیٹے میں آ کر بھی وہ عشقیہ نظمیں کیوں لکھتے ہیں۔ یہ ضرور کسی عورت سے عشق کرتے ہیں اور اس کی تعریف میں یا اس کے فراق میں شعر کہتے ہیں۔ کوی دکھ قسمیں کھاتے کہ ان کا کسی عورت سے کوئی تعلق نہیں اور یہ صرف شاعری ہے لیکن وہ کوی کی کسی بات کا اعتبار نہ کرتیں۔ ایک بار جھگڑا اتنا بڑھا

کہ اس نے کوی کی غیر مطبوعہ نظموں کے دو مجموعے آگ میں ڈال دیئے۔ کوی کو اس کا بڑا غم تھا۔ کئی روز بیمار رہے لیکن جو کچھ ہو چکا تھا اس کا کوئی مداوا نہ تھا یہ نظمیں دوبارہ نہ لکھی جا سکیں اور اعلیٰ ادب کا ایک بڑا ذخیرہ ایک خاتون کی حماقت سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آگ کی نذر ہو گیا۔ دوسری بار جھگڑا اتنا بڑھا کہ نوبت طلاق تک جا پہنچی۔ قدرت اللہ شہاب کو جب یہ معلوم ہوا تو وہ بھاگم بھاگ ڈھاکہ پہنچے اور بیچ بچاؤ کرا دیا لیکن کوی عشقیہ نظمیں لکھنا ترک کر سکے کیونکہ بنیادی طور پر رومانی شاعر تھے اور صرف بیوی کی ضد کی وجہ سے "خودکشی" نہیں کر سکتے تھے۔

کوی جب بیگم سے تنگ آ جاتے تو پیٹ میں نفخ کا بہانہ بنا کر میڈیکل کالج ہسپتال میں داخل ہو جاتے۔ اساتذہ، طلبا اور طالبات میں ان کے لاتعداد عقیدت مند تھے۔ وہاں انھیں ایک آرام دہ کمرہ مل جاتا۔ ہر وقت نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کا جمگھٹا رہتا اور کوی بڑے مزے سے گپ لڑاتے اور شاعری کرتے رہتے۔ کوی نوعمر لڑکیوں کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرنے کے بہت شوقین تھے۔ کہتے تھے اس طرح دل جوان رہتا ہے۔ اور آدمی بوڑھا نہیں ہوتا۔ ہسپتال میں ان کی فراوانی ہوتی۔ ہر نرس اور ہر طالبہ دن میں ایک بار ان کے کمرے کا چکر ضرور لگاتی۔ کوی ان پر ہاتھ پھیرتے شعر سناتے اور انھیں پاس بٹھا کر اپنی تازہ نظموں اور ڈراموں کی نقول تیار کرتے اور یوں صبح سے شام کر دیتے۔ یہ سلسلہ ہفتوں چلتا۔ کوی کے اس "فراڈ" کا علم ان کے تمام دوستوں کو تھا۔ میں کئی بار ان سے ملنے ہسپتال گیا۔ میں ان سے کہتا، کوی جی بڑے مزے میں، وہ آنکھ مار کر کہتے "تم بھی داخل ہو جاؤ۔ پھر دیکھو کیسی شاعری ہوتی ہے!"

کوی بڑی باغ و بہار طبیعت کے مالک تھے۔ سخت حسن پرست تھے۔ حسین چیزیں دیکھ کر ان پر مستی کا عالم طاری ہو جاتا۔ ایک بار ہم جیسور ایرپورٹ پر کھڑے ہوئے تھے کہ ایک بے حد خوبصورت بنگالی لڑکی نے کوی کو آٹوگراف بک دی کہ اس پر کچھ لکھ دیں۔ کوی نے ایک نظر اسے دیکھا اور ایک شعر اس پر لکھ دیا۔ اس لڑکی نے از راہ مروت وہ آٹوگراف بک میری طرف بڑھائی۔ میں نے کوی سے پوچھا کہ انھوں نے کیا لکھا ہے انھوں نے ترجمہ کر کے مجھے بتایا اور میں نے فوراً اس کا اردو ترجمہ لکھ دیا۔ وہ شعر یہ تھا۔

اے جیسور کے سندر، لوگو سدا رہو آباد
پون کی صورت آئے تھے ہم رکھنا ہم کو یاد

اس لڑکی نے کوی کا جب یہ شعر پڑھا تو اس کے خوبصورت چہرے پر سرخی کی ایک لہر دوڑ گئی اور وہ بھاگ گئی۔

کوی کی شامیں بہت خوبصورت اور رنگین ہوا کرتی تھیں۔ رقص اور موسیقی ان کی روح کی غذا تھی۔ وہ اس کی تلاش میں شام کو گھر سے نکلتے اور رات گئے لوٹتے۔ وہ ہر شام اپنے کسی مداح کے گھر جاتے، وہ پہنچتے تو گھر میں شور مچ جاتا کہ دادا آ گئیں! دادا آ گئیں! تمام گھر والے ان کے گرد جمع ہو جاتے۔ پہلے چائے کا دور چلتا، کوی کسی کو شعر سناتے، کسی پر فقرہ کستے۔ پھر لڑکیاں پاؤں میں گھنگھرو باندھ لیتیں، لڑکے طبلہ اور ہارمونیم سنبھال لیتے اور یوں رقص و موسیقی کی پھواریں برسنے لگتیں۔ بنگال کی ہر لڑکی ناچنا اور گانا جانتی ہے اور بیشتر گھروں میں ہر شام یہ عالم ہوتا ہے:

شام ہوئی اور دیپ جلے
گھنگھرو چھنکے، سُر جاگے

کوی کی شامیں یوں رقص و موسیقی کی لہروں پر تیرتی ہوئی گزرتیں۔ میں جب بھی ڈھاکہ میں ہوتا، وہ ہر شام مجھے اپنے ساتھ لے جاتے۔ وہ مجھے لوگوں سے ملواتے اور رقص و موسیقی کی باریکیاں سمجھاتے۔ یوں میں ڈھاکہ کی سحر آلود راتوں سے آشنا ہوا جنھیں میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

میں کوی سے آخری بار ۲۱ فروری ۱۹۷۰ء میں ملا تھا۔ جس روز میں ڈھاکہ پہنچا وہ یوم شہدا تھا۔ جانے کیوں اس دن خلاف معمول وہ مجھے ایرپورٹ پر لینے آئے تھے۔ ایرپورٹ سے سیدھے وہ مجھے شہید مینار لے گئے۔ ڈوبتے ہوئے سورج کے سائے میں ہم نے وہاں پھول چڑھائے اور بڑی دیر تک خاموش کھڑے رہے۔ میں نے شہید مینار کے بارے میں اپنی نظم کا یہ ٹکڑا انھیں یاد دلایا ؎

ان شہیدوں کی امر یادہیں یہ پانچ منار

جس طرح سولیاں استادہ ہوں چوراہے پر

ڈوبنے لگتا ہے جب مرافق کے اس پار

مرمریں فرش نے ٹکرا کے شعاعیں اس کی

خون کے دھبوں کی صورت ہیں بکھر جاتی ہیں

کوئی خاموش رہے۔ پھر کہنے لگے کہ اگر شروع سے ہی بنگلہ کو اس کا جائز مقام دے دیا جاتا تو آج اس طوفان کا سامنا تو نہ کرنا پڑتا۔ ان کی آواز میں دکھ تھا۔ وہ کچھ خوف زدہ نظر آتے تھے۔ دوسرے دن ایئرپورٹ جانے سے قبل میں چند لمحوں کے لئے ان کے گھر گیا۔ وہ کچھ کھوئے کھوئے اور خاموش خاموش سے تھے۔ میں جب واپس آنے لگا تو وہ کوٹھی کے گیٹ تک مجھے چھوڑنے آئے۔ خلافِ عادت مجھے بھینچ کر گلے لگایا اور دوسری طرف منہ کر کے کہنے لگے "خدا معلوم پھر کب ملیں۔ جب ہماری گاڑی کوی حسیم الدین روڈ کا آخری موڑ کاٹ رہی تھی تو میں نے پلٹ کر دیکھا۔ کوی ابھی تک گیٹ پر کھڑے ہوئے تھے اور مجھے اوجھل ہوتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ جانے کیوں میرا رونے کو بہت جی چاہا لیکن اس روز بھی آنسو آنکھوں میں سوکھ گئے تھے ———!

"سرِ دلبراں" حمید کوثر اور حفیظ

ابوالاثر حفیظ جالندھری

پروفیسر حمید کوثر کی غزلیات اور نظمیات کا مجموعہ ۱۲ ستمبر ۱۹۷۳ء سے میری توجہ کا مرکز بنا۔ یہ کتاب اپنے قلم سے "ہدیہ مبارک" لکھ کر شب برات پر مجھے مصنف نے اپنے ہاتھوں عنایت کی تھی۔ بعد میں ٹیلیفون پر مجھ سے اس کتاب پر رائے کا تحریری مطالبہ بھی کیا گیا تو میں نے محض سرسری نظر ڈالتے ہوئے چند سطور لکھ بھیجی تھیں جن میں کتاب میں مندرجہ اشعار یا نثریات پر نہیں بلکہ حمید کوثر کی طرف سے چند افراد کو مخاطب کرنے کے انداز پر چند ایسے الفاظ لکھ دیئے تھے جو مصنف کو پسند نہیں آئے۔ اُن کی ناپسندیدگی کا ایک خط ملتے ہی مجھے مناسب معلوم ہوا کہ میں حمید کوثر سے معافی طلب کر لوں کیونکہ یہ کتاب اُس حمید کوثر نے مجھے ہدیہ مبارک کے طور پر نہیں دی تھی جو اس سے پہلے مدتِ مدید تک مجھے اپنی تحریروں میں اباجی کہہ کر مخاطب کیا کرتا تھا۔ یہ کتاب اباجی کو نہیں بلکہ ابوالاثر حفیظ جالندھری کو احسان کی گئی تھی۔ لہٰذا اباجی کی طرف سے اپنے فرزند کو کوئی مشورہ دینا جس کو اس کی انا مناسب نہ سمجھے غلطی تھی لہٰذا مجھے اس کتاب کا ایک ایک حرف پڑھ کر اظہار رائے کرنا ضروری ہو گیا جو ایک شاعر دوسرے شاعر سے طلب کرتا ہے۔ چنانچہ میں نے اس کتاب کو اول سے آخر تک اپنی بساط کے مطابق پرکھا ہے اور جتنا ذوقِ ادب و شعر میرے وجود میں باقی ہے اُس کی رو سے آج ایک مہینہ اور اٹھائیس دن بعد یہ سطور اپنے اظہار رائے کے طور پر لکھ رہا ہوں:

(۱) نام "سرِ دلبراں" ہے۔ سرورق پر پاکستان کے نوجوان مصوروں میں سے بہترین مصور نے اُن دلبران کے تصویری نقوش لکیروں میں ظاہر کر دیئے ہیں جن کے راز یعنی اسرار اس کتاب میں کھلیں گے۔ میرے خیال میں سرورق کی شکلیں بجا طور پر تجریدی ہیں اور دورِ موجودہ کی مصوری کے بہترین مظہر۔ مصور موجد کا نام ان نقوش کی تحسین خود بخود کر رہا ہے۔ یہ نقوش جلدِ کتاب کے گرد پوش نہ ہوتے تو میں ان کو مستقل پا کر زیادہ خوشی کا اظہار کرتا۔ گرد پوش اگر کتاب مطالعہ میں آتی رہے تو ضائع ہو جایا کرتے ہیں جس طرح چھپے ہوئے لفافے اندرونی مکتوب کو بار بار پڑھنے اور لفافے کے سپرد کرنے سے ایسی صورت اختیار کر لیتے ہیں جس کو جالندھری پنجابی میں "بڑل مڑل" کہتے ہیں۔

اس گرد پوش نے جلد کے دوسرے صفحے کو بھی دامن میں لے رکھا ہے اور یہ دامن بہت ہی اہم ہے بلکہ اسی دامن پر کتاب کا مطالعہ کرنے والے کے لئے مکمل رہنمائی ہے اور مجھے سب سے پہلے حمید کوثر کا فوٹو دیکھ کر جب بھی جی چاہے اپنا سر صد سینہ پر جھکانے سے نہیں بلکہ اس کتاب کا پہلا ہی ورق اُلٹنے سے ملاقات نصیب ہو جانے کا اس گوشہ نشینی میں فائدہ حاصل ہو گیا ہے۔ اپنی تصویر کے اوپر حمید کوثر نے اپنا ایک ایسا شعر ثبت کر دیا ہے جو اُن کے اندازِ گفتار کا ہمیشہ کے لئے شاہدِ عادل رہے گا۔ شعر یہ ہے:

شوخیٔ طرزِ بیاں دیکھ کہ ہم سے کوثر — کچھ اگر عرض بھی کرتا ہے تو فرماتا ہے

اس شعر کو پڑھنے کے بعد میں اُس حمید کوثر کا کلام نہیں دیکھوں گا جو سالہا سال اپنے کلام پر مجھ سے اصلاح چاہا کرتا تھا اور میں جو کچھ بطور اصلاح کہہ دیتا تھا اُس کو قبول بھی کر لیا کرتا تھا۔ اس وقت اُس کا عرض کرنا فرمانا نہیں تھا، عرض کرنا ہی تھا۔ اب میرا کام عرض کرنا ہے۔ کیونکہ میں ابھی تک شاعروں کے اُسی زمرے میں ہوں جو فرماتے بھی ہیں تو عرض کرنے ہی کی صورت اختیار کرتے ہیں بلکہ عرض کرتے ہوئے بھی شرماتے نہیں۔

اب عرض یہ ہے کہ اس نوٹ کے نیچے حمید کوثر نے چار اہم اقتباسات اس طرح درج کردیئے ہیں کہ ساری غزلیات اور نظمیات کے بارے میں کسی بھی اور اظہار رائے کی ضرورت یا ہمت باقی نہیں رہتی۔ سید امتیاز علی صاحب تاج مرحوم کی رائے ایک زندہ رائے ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر عبادت بریلوی پی ایچ ڈی کا ایک ہی فقرہ حمید کوثر کی قومی اور ملی مسائل پر شاعری کی اہمیت بیان کر رہا ہے۔ ایک خاتون ادیب رضیہ فخری صاحبہ حمید کوثر کی شاعری کو ایسا جام جہاں نما دکھا رہی ہیں جس میں زندگی کا کوئی پہلو نہیں جو نظر نہ آرہا ہو۔

میں سمجھتا ہوں کہ آغاز مطالعہ سے پہلے اپنی شاعری کے بارے میں مصنف کی اپنی رائے ایک ہی شعر کے ذریعے وہ سب کچھ بیان کرتی ہے جو شوق مطالعہ پیدا کرنے کے لئے مکتفی ہے۔ پھر ان چار آرا میں تیسرے درجے پر میری اُس رائے کا بھی تو اقتباس موجود ہے جو میں نے اُن کی محض غزل و نظم ہی نہیں بلکہ نثریات پر بھی لکھ کر حمید کوثر کے حوالے کر رکھی ہے۔ اب میں اگر اپنی اسی رائے کو ایک لمبے مقالے کی صورت دیدوں تو گویا دودھ میں بہت سا پانی ملانے کا عمل کرتا ہوا نظر آؤں گا۔ اس لئے کہ میں بہرحال کچھ بھی ہوں لاہور کے گوالوں میں سے تو ایک نہیں ہوں۔

تاہم مجھے لازماً سرِ دلبراں پر اپنی رائے کا اظہار کرنا ہے۔ کیوں کرنا ہے؟ اس لئے کہ یہ کسی اور مصنف کی کتاب نہیں جناب حمید کوثر کی ہے اور ان کا اصرار ہے کہ میں ضرور لکھوں۔

اے کاش حمید کوثر کتاب شائع کرنے سے پہلے اس کتاب کی غزلیات و نظمیات کا مجموعہ دکھا دیتے تو میرے لئے اُن کی فرمائش کی تعمیل آسان ہوتی جو آج انتہائی مشکل نظر آرہی ہے۔

مشکل اس لئے نظر آرہی ہے کہ تعارف کے زیر عنوان ہمارے موجودہ دور میں سید وقار عظیم، غالب پروفیسر (ریٹائرڈ) شعبۂ اردو پنجاب یونیورسٹی لاہور جیسے استاد اور نقاد کے قلم سے سوا تیرہ صفحات پر محیط نثری دیباچہ ہے جس میں تعارف نویس نے اس کتاب میں مندرجہ کلام ہی نہیں مصنف کی ذات و صفات ہی نہیں تمام دنیا میں فن شاعری کے رموز و غوامض سرِ دلبراں کے ذریعے ہم سب شاعروں متشاعروں کو درس نظر کی صورت میں جمع کردیئے ہیں۔ میں نے اُن کی اس تحریر کا بار بار مطالعہ کیا ہے اور سرگرداں ہوں کہ آخر وہ کون سی بات باقی رہ گئی ہے جس پر میں اظہار رائے کروں۔ سید وقار عظیم نے جن کو لوگ جید اہل زبان اور ناقد فن اسلوب و بیان کا ماہر مانتے ہیں، جو کچھ اس دسترخوانِ ادب پر رکھ دیا ہے میں اُس کو نگل تو سکتا ہوں لیکن اُسی کو اُگل دینا کچھ گھناؤنی سی بات ہے۔ اُن کے اس تعارفی تحریر نے تو فی الحال خود مجھے اپنی ہی ذات کی تلاش میں گم کر رکھا ہے اور نہیں سوجھتا کہ میں خود کیا ہوں؟ شعر و شاعر دونوں کی بست و کشاد کے بارے میں دوسرے نقادوں کے اختلافی محاکمات پر سید وقار عظیم کا محاکمہ یہ ہے کہ شعر کے ساتھ اُسی کے شاعر کی شخصیت و فنکارانہ تخلیق اور تخلیق کے اسلوب میں ایسے ایسے گہرے گہرے رشتے ہیں کہ اُن میں منطقی ربط اور تسلسل پیدا کرنے کے لئے تجزیے کے بہت سے پیچ در پیچ مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ وغیرہ۔

اب اگر میں اُن پیچ در پیچ مراحل میں گم ہوں تو مجھ ایسے ساتویں جماعت تک بھاگے ہوئے جو بہتر برس کے عشق کو ڈھونڈنے نکلیں تو شاید کسی قدر پا لیں ورنہ مجھے تو اس کان نمک میں ایک ذرہ نمک ہی سمجھ لیجئے۔ میں کیا میر و مرزا، انشا و مومن، انیس و ذوق، غالب و حالی، بلکہ اقبال تک اگر اس تعارف کو مطالعہ فرمائیں تو یہی حال ہوگا جو اس وقت میرا ہے اور حمید کوثر اگر ان میں سے بھی کسی کو سرِ دلبراں کے اندر مندرجہ اپنے کلام پر چند سطور لکھنے کی فرمائش کریں گے تو بے چارے بغلیں ہی جھانکیں گے۔

اس لئے کہ استاد جمیع نقاد وقار عظیم نے غیر شاعر کیا کسی بڑے سے بڑے شاعر کے لئے بھی چند حرف لکھنے کی گنجائش ہی کہاں چھوڑی ہے۔ کمال یہ ہے کہ یہ سارا زور تحریر دوسرے شاعروں کو حیران و پریشان اور فرار اختیار کرنے کے لئے نہیں۔ یہ ساری تمہید تو اس لئے ہے کہ سید وقار عظیم کو کوئی آسان اور سیدھی صورت آسان اور سیدھے شاعر حمید کوثر کو پیش کرنے کی نظر نہیں آئی۔ یا ایک پرانا پروفیسر ہے جو اردو زبان ہی کے اپنے سے کم عمر پروفیسر اور نقاد کو اپنا کمال فن اور جلال علم دکھائے بغیر نہیں رہ سکا۔ اور یہ ساری تمہید جس میں ہر شاعر کو اپنا اپنا مقام تلاش کرنے کی پڑ جائے گی، مندرجہ ذیل کا ایک فقرہ سامنے لانے کے لئے ہے:

"اگر آپ کو شاعر کے جذبات اور احساسات اور اُس کے مخصوص مزاج اور افتاد طبع کا اندازہ ہے تو پھر کلام پڑھ کر اُس میں شاعر کا عکس دیکھنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی۔ (لہٰذا) حمید کوثر کے سرِ دلبراں کے سلسلے میں میرا پروفیسر سید وقار عظیم صاحب کا یہی محاکمہ ہے۔"

اللہ کا شکر ہے کہ اب میں نے ایک ٹھنڈا سانس بھرا ہے کیونکہ یہاں سے سید وقار عظیم نے حمید کوثر کو سالہا سال سے جاننے اور طویل مشاہدے کی رو سے کتاب کا مطالعہ کرنے والوں کو جو کچھ بتایا ہے اتنا ہے کہ ایک پہلو بھی ایسا نہیں چھوڑا جس کو میں بیان کر دوں تو کمی پوری ہو جائے۔ میں اگر پہلے لکھتا تو شاید اس اندازے سے چار فقرے بھی نہ لکھ سکتا۔

مصنف کے بعد زیرِ نظر مجموعہ سرِّ دلبراں کو دو برابر کے حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے غزلوں اور نظموں کی تخیلی، تصوراتی، فکری، جذباتی، قومی اور دینی سبھی حوالے اپنی رائے کے ساتھ اس تعارف میں اس عمدگی سے سجا دیے ہیں کہ اگر میں انہی اشعار کو اپنی رائے کے اظہار کا ہدف بنا کر دہرا دوں تو آخر کونسا تیر ماروں گا۔

لیکن حمید کوثر کی خفگی میرے سامنے ہے۔ میں نے اوپر اپنی جس معافی طلبی کا ذکر کیا ہے اس کے جواب میں، جو مکتوب حمید کوثر کے قلم سے مجھے ملا اس کا سب سے پہلا تاثر یہ ہے کہ مجھے فرمودۂ سعدی یاد آگیا۔

گاہ باشد کہ کودکے ناداں　　بغلط بر ہدف زند تیرے

اس کو دہراتا ہوا آگے بڑھا تو ایک اور پہاڑ میرے رہوارِ قلم کی راہ میں حائل ہو گیا۔

پروفیسر حمید کوثر نے اپنے بزرگ ہم پیشہ سید وقار عظیم کی تعارفی تحریر کو نہ جانے کیوں غیر مکتفی گردانا اور خود اپنے قلم سے بھی ایک دیباچہ یا درس نامہ لکھ دیا ہے۔ یہ محض غیر شاعر مطالعہ کرنے والوں کے لئے نہیں بلکہ اس کتاب کا مطالعہ کریں یا نہ کریں اس دور کے تمام زندہ شاعروں کے لئے مزید سبق ہے جو رہنمائی کرتا ہے فن کی مقاصدِ فن کی۔ اس کو پڑھنے کے بعد تو میں "کودکے ناداں" سے بھی اپنے آپ کو گیا گزرا محسوس کر رہا ہوں۔ گر میری گذارش ماننے والا ہزاروں میں سے کوئی ایک شاعر بھی ہوں تو اسے چاہیئے کہ سرِّ دلبراں کے صفحہ ۱۱ سے ۱۳ تک نثر کی وہ سطور لازمًا اپنے تہ درتہ اوراقِ دل پر ثبت کر لے کیونکہ اس سے بہتر مشورہ شاید ہی کوئی اور دے سکے۔ اور مجھے یہ فخر ہے کہ یہ مشورہ اس حمید کوثر نے دیا ہے جو اس کتاب سے پہلے تک میرا فرزندِ معنوی تھا لہذا آج مجھ سے زیادہ اور کون ہے جس کو اپنے آخری دنوں میں مسرت اور فخر کا ایسا سامان نصیب ہو جائے جس سے وہ زندگی بھر محروم رہ چکا ہے۔

حمید کوثر کے اس نثریے کا عنوان ہے ثباتِ آثار۔ اس کا پہلا فقرہ ہی وہ سبھی کچھ ہے جو ہر شاعر کو درسِ حیات دے سکتا ہے:

"آج کے شاعر کو یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرنی چاہیئے کہ مادیت کے بوجھ تلے دب کر انسان مر چکا ہے اور اب اسے از سرِ نو زندگی عطا کرنا اس کا (یعنی شاعر کا) کام ہے۔ تاہم یہ کام قم باذن اللہ کہہ دینے سے پورا ہونے والا نہیں۔۔ شاعر پیغمبر نہیں ہوا کرتا۔ اس لئے پیغمبر سے رہنمائی حاصل کئے بغیر مردے میں جان ڈالنے کا معجزہ ظہور میں نہیں آئے گا۔"

مجھے یہ فقرہ پڑھنے کے بعد علامہ اقبال کی آواز سنائی دی اور شعر میری زبانِ قلم پر خود بخود آگیا ہے:

بمصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست　　اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی ست

اس سے آگے حمید کوثر کے نثریے میں تکنالوجی کی وجہ سے انسان کا اعلیٰ جذبات سے محروم ہو جانا وغیرہ بیان ہوا ہے اور شعر و شاعری کی افادیت بھی اور یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ موجودہ علم و ہنر کی ترقی کے زمانے میں فن کو زندہ رکھنا کیوں ضروری ہے۔ حمید کوثر ہم سب کو بتاتے ہیں کہ شعر کی عظمت منوانے اور شاعر کو قومی مسیحا تسلیم کرانے کی واحد صورت بین الاقوامی فریم میں ایسے ماحول کی تصویر کشی ہے جو روح و جسم کو مسرت بخش جذبات بخشے تاکہ انسان جی اٹھے۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس نثریے کے آخر میں بتایا گیا ہے کہ آدمی کی حیاتِ نو اس کتاب سرِّ دلبراں کا اصل محور ہے اور اس ایوانِ شعر میں گونجتی ہوئی ایک بالکل نئی نہایت دل کش آواز ہے جو حسنِ قبول کے سمعی آلات سے ہوتی ہوئی روح کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے۔

ب

آئیے اور دیکھئے کہ اب میرے سامنے اصل سرِّ دلبراں ہے۔

غزلیں ہیں۔ ہر غزل کے اختتام پر تاریخِ گفتن بھی درج ہے۔ ان میں سے ایک غزل کے نیچے ۳ نومبر ۱۹۴۶ء لکھا ہوا ہے اور آخری نظم ۲ مارچ ۱۹۷۳ء

کی تاریخ کاغذ پر لائی ہوئی ہے یعنی یہ مجموعۂ کلام حمید کوثر نے چھتیس برس کے دوران وقتاً فوقتاً تخلیق کیا ہے۔

۲- میں نے ان غزلوں اور نظموں کا متعدد بار مطالعہ کیا اور نظر آیا کہ غزلوں میں سے اکثر برائے مشورہ و اصلاح میری نگاہ سے گزاری جا چکی ہیں اور چند نظمیں بھی ایسی ہیں جن پر طلب کردہ اصلاح پیش کر دی گئی تھی۔ اب اگر میں ان تمام غزلوں اور نظموں کی بے تحاشا مدح سرائی پر اتر آؤں تو کیا یہ حمید کوثر کے پردے میں اپنی مدح سرائی نہ ہوگی جیسے اپنے اُس برخوردار کے حکم کی تعمیل میں شرم کا یہ حجاب دور بھی کر دوں تو جو کچھ سید وقار عظیم کہہ چکے ہیں اور جس طرز و روش سے کہہ چکے ہیں کیا میں اُن سے بہتر کہہ سکتا ہوں؟ نہیں میں اُن سے بہتر نہیں کہہ سکتا۔ میں تو ایک پنجابی ہوں۔ ساتویں جماعت کا امتحان دے کر سکول ہی سے نہیں گھر سے بھی بھاگ نکلا تھا۔ آج حمید کوثر ترقی یافتہ جوان اور بلند پایہ شاعر ہے۔ شاعر ہی نہیں اُردو زبان کا استاد، نثر نگار، مصنف اور نقاد ہے۔ میرے لئے تو یہی بڑی مسرت اور فخر کافی تھا۔

اب اگر تعمیل کروں، سر دلبراں یعنی حمید کوثر کے کلام اور طرزِ کلام پر کچھ لکھوں۔ اور وہ نہ تو سید وقار عظیم کے پائے کا ہو اور نہ خود حمید کوثر کے معیار پر قابلِ قبول اترے تو یہ ضیاعِ اوقات ہی نہیں بلکہ بے محل خود شکن جسارت ہوگی۔ اس لئے میں مناسب سمجھتا ہوں۔ بلکہ اگر وقار عظیم مجھ ایسے کا مشورہ ناپسندیدہ خیال نہ کریں تو ان کو اپنی نگاہ سے اختیار کردہ راہ بتانے کی بجائے کتاب کا مطالعہ کرنے والوں کے قلب و نظر کو بھی قابلِ اعتماد گردانا چاہیے تھا۔ اس کتاب کے اشعار کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ مطالعہ کرنے والے اگر مذاق سلیم رکھتے ہیں تو جو کچھ سید صاحب نے بیان کیا ہے یا جس کی رہنمائی خود حمید کوثر نے کی ہے سخن فہم حضرات خود بھی ان اشعار سے جو تاثرات در کار ہیں حاصل کر سکتے ہیں۔ اگر یہ پروفیسر لوگ بُرا نہ مانیں تو میں یہ کہوں گا کہ شاعر کا کلام اگر خود کسی استاد نقاد کی فہمی کے بغیر دلوں میں نہیں سماتا تو وہ کلام بے مودہ ہے۔

البتہ اتنا کچھ پڑھ لینے اور لکھ دینے کے باوجود میرے لیے ایک راہ [ا]تی ہے اور وہ ہے اُن تعلقات کا تذکرہ جو میرے اور حمید کوثر کے درمیان سالہا سال سے مسلسل جاری ہے۔

یہاں میں یہ بیان کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ جب حمید کوثر نے اس کتاب پر لازماً مجھے اپنی رائے کا اظہار کرنے پر زور دیا تھا تو میں نے اپنی حالتِ علالت کی وجہ سے التجا کی تھی کہ چونکہ دماغ کی رگیں پھٹ جانے کے سبب میں کچھ زیادہ تحریر کرتے ہوئے ذہنی ربط توڑ بیٹھتا ہوں۔ اس لئے مناسب ہے کہ آپ اپنے قلم سے اس کتاب کے بارے میں جو کہوانا چاہتے ہیں لکھ دیں میں آپ کی رہنمائی سے اُس تحریر کو اپنے رنگ سے رنگ دوں گا۔ چنانچہ مجھے دو فل سکیپ کاغذ ان کے قلم سے لکھے ہوئے مل گئے تھے۔ دن تھے رمضان کے۔ عید کے بعد لکھنے کا وعدہ میں نے ایک مکتوب کے ذریعے حمید کوثر تک پہنچا دیا تھا جس کا جواب ایسا ملا کہ میں مزید غور و فکر کرنے لگا۔

اگرچہ حمید کوثر کی بیتابی میری سمجھ سے باہر ہے لیکن باپ بوڑھا ہو جائے۔ فرزند جوان ہی نہیں جوان ہمت بھی ہو اور اُس کی فرمائش کی تعمیل میں دیر ہو جانے یا کچھ کمی رہے اور فرزند خفگی سے بھی باز نہ رہے، تو آخر پوت کپوت ہو سکتے ہیں، باپ کباپ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کتاب کے اشعار اور دیباچوں سے استفادہ تو آپ خود کیجئے اور مجھے اجازت دیجئے کہ اپنے پرانے تعلقات کو بحال رکھنے کی سعی کر ڈالوں۔

7.

پاکستان کی تحریک، تسخیر اور تعمیر کا میں بھی ایک مزدور رہ چکا ہوں، ہر محاذ پر جہاں مجھے طلب کیا گیا، کار ہو یا بیکار میں موجود رہا۔ جن دنوں میں افواج پاکستان کا ڈائرکٹر آف مورال تھا۔ زیادہ تر راولپنڈی اور ملیر چھاؤنی کراچی میرے ہیڈ کوارٹر تھے لیکن میرے دورے افواج کو مخاطب کرنے کے لئے مشرقی اور مغربی پاکستان کے ہر اس مقام پر جاری رہتے تھے جہاں جہاں فضائی، بحری اور بری مجاہدین متمکن تھے۔ اس دوران لاہور ماڈل ٹاؤن اپنے پرانے ٹھکانے پر بھی گاہے ماہے آنا جانا رہتا تھا۔ اغلباً ۴۸ء یا ۴۹ء میں ایک لڑکا ماڈل ٹاؤن میں میرے غریب خانے پر آیا۔ اپنا نام حمید کوثر اور یہ بتایا کہ جالندھر کے راجپوت خاندان میں سے ہے۔ اُس کے والد، چچا اور دوسرے رشتے دار عمارات وغیرہ کی ٹھیکیداری کرتے ہیں پاکستان میں آ گئے ہیں چھاؤنی لاہور میں مقیم

ہیں لیکن ٹھیکیداری کے ساجھیوں میں مقدمہ بازی چل رہی ہے اور یہ خاندان کچھ لُٹا پٹا سا رہ گیا ہے۔ میرے پاس آنے کی وجہ شعر و سخن کا شوق اور (شاید) جالندھری ہونے کی وجہ سے مجھ سے اپنے اشعار پر مشورہ حاصل کرنے کی ضرورت کے سوا اور کچھ نہیں۔ استفسار پر یہ بھی بتایا کہ وہ ساتھ ساتھ اسکولی تعلیم بھی حاصل کر رہا ہے۔ مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی کہ یہ تو کچھ میرا اپنا ہی سا حال ہے۔ میں تو نالائق تھا کہ تعلیم سے بھاگ گیا اور محض شاعری ہی کو اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ لیکن یہ حمید جس نے اپنا تخلص کوثر رکھا ہے، تعلیم کو بھی نہیں چھوڑنا چاہتا۔ یہ تھا آغاز ____!

اس آغاز نے محبت اور باہمی اخلاص کی صورت میں ایسی ترقی کی کہ حمید کوثر مجھے اباجی کہنے لگا اور میں نے اسے واقعی فرزند گردانا۔ یہ فرزند سعادتمند نکلا۔ شعر شاعری ہی نہیں، میرے ذاتی، دنیوی، آفاقی جھگڑوں، قضیوں میں بھی اُس نے اِس طرح معاونت کی جیسے مرد پیر کے لئے ایک عصا کا سہارا ہو۔ اس کی شعر گوئی کے نمونے اور خطوط میرے ہیڈ کوارٹر میں بھی پہنچتے رہے۔ میری انگیخت پر اُس نے چند انعامی شاعرانہ مقابلوں میں بھی حصہ لیا اور مجھے اُس کی کامیابی سے اچھا خاصہ استحصالِ مسرت کا تعلق رہا۔ مجھے لاہور میں چند کچہری اور عدالتی معاملات بھی درپیش ہوئے تو حمید کوثر جو اپنے بزرگوں کی مقدمات کی پیرویوں کی وجہ سے قانونی نکات ذہن نشین کر رہا تھا میری امداد وکیلوں کی طرح کرتا رہا۔ اور اس طرح کرتا رہا کہ اگر میرا کوئی صلبی بیٹا ہوتا تو اتنی سعادت مندی سے شاید نہ کر سکتا تاہم یہ سال چھ ماہی کے معاملات تھے۔ شعر و شاعری کے مشورے تو خط و کتابت ہی سے زیادہ ہوا کرتے تھے۔ میں جب بھی لاہور آتا۔ کڑی دھوپ ہو یا ٹھٹھرانے والا جاڑا، حمید کوثر میری آواز پر فوراً پہنچ جاتا رہا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ جو کچھ میں نے اُس کی شعر و شاعری میں مشورہ دیا اُس نے ہر مرتبہ اُس کو سمجھنے کی کوشش کی اور یہ کوشش بھی شاید شعر میں ترقی کا باعث بنی ہو۔ لیکن کوئی بھی ترقی نہیں کر سکتا اگر اُس کے اندر خداداد صلاحیت موجود نہ ہو۔ ایسے سینکڑوں نوجوان میرے پاس آئے۔ ان میں سے فقط چند ____ پنڈت ہری چند اختر۔ دوارکا داس شعلہ۔ اگر میں چوہدری حمید (مالک کارواں) کا نام بھی لوں تو شاید وہ انکار نہ کریں کیونکہ وہ اپنی خداداد صلاحیتوں کے سبب قادر الکلام ہو گئے ہیں۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ کسی کا مشورہ کسی غیر شاعر کو شاعر نہیں بنا سکتا۔ "بچھیرے کو ڈکی، ابو یہ یا رداں چال سکھائی جا سکتی ہے۔ لیکن کچھوے کو گھوڑا بنانا ممکن نہیں۔"

۲

حمید کوثر نے اپنی مالی عسرت کی حالت، اپنے بزرگوں کی پے در پے موت کو برداشت کرتے ہوئے، اپنے خاندان کو پالتے سنبھالتے ہوئے، تعلیم جس ذوق و شوق کے ساتھ جاری رکھی، اردو ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ اسلامیہ کالج لاہور جیسے کم پرس مگر بلند ادارہ تعلیمات میں اردو لٹریچر سکھانے کی پروفیسری پر فائز ہوا۔ بہت کم ایسے ہیں جو ہمارے اس دور میں ایسی عمدہ مثال پیش کر سکیں۔

یہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ نثر کی انشا پردازی، نظم نویسی حالاتِ زمانہ کے مطابق اپنے تاثرات کا ایسی طرز سے اظہار جو سادہ بھی ہو اور سہل بھی خود مجھے حمید کوثر پر فخر کرنے کا شرف دیتا ہے لیکن یہ شرف اس کتاب سترِ دلبراں پر اظہارِ رائے میں تغافل سمجھئے یا تساہل یا حجاب کچھ شرمندۂ معنی سا ہو گیا ہے۔ اگر اپنا نثری دیباچہ کتاب میں شامل کرنے سے پہلے مجھ پر اعتماد کرتے اور دکھا دیتے تو میں اُن کو یہی مشورہ دیتا کہ کتاب کے گرد پوش پر اُن کا شعر اور چاروں اہم اقتباساتِ آرا کافی ہیں۔ سید وقار عظیم صاحب کا لکھا ہوا تعارف بحسن و خوبی بہت کچھ ہے مگر سترِ دلبراں کا دیباچہ نہیں ہے البتہ اس دیباچے کی شاعروں کو نہیں اس کتاب کے پڑھنے والے غیر شاعروں کو ضرورت ہے۔

صدیق سالک اور "ہمہ یاراں دوزخ"

سید ضمیر جعفری

صدیق سالک میرا دوست ہے۔ دوستی کا ایک ناتا یہ بھی ہے کہ اس کے گاؤں کا نام منگیہ ہے اور میرا گاؤں منگلا بند کی سرنگ نمبر ۲ کے سامنے واقع ہے۔

عربی شاعری میں دوست کو جام شراب اور گیتوں کی کتاب سے بھی تشبیہ دی گئی ہے۔ صدیق سالک کو ہم نے مسکراہٹوں کی کتاب پایا۔

سالک سے اپنی پہلی ملاقات کی ہمیں دو چیزیں ہی یاد رہ گئی ہیں۔ بلند و بالا قامت اور دلنواز مسکراہٹ، یا وہ کھردرا پن جو دساور کی عورتوں میں زیادہ مقبول ہے۔

یہ مسکراہٹ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں بھی اس کے ہونٹوں دیکھی...... سقوط ڈھاکہ سے کچھ دیر پہلے بنگال کے جلتے بجھتے شب و روز میں بھی دیکھی......

قید سے اس کے خطوط بھی مسکراتے ہوئے ملے اور اب اس کی کتاب کو بھی مسکراتی ہوئی کتاب پایا۔

وہ کوئی ہوائی جہاز کی ساخت کا آدمی نہیں کہ بیرونی ہوا کا دباؤ اندر کی فضا پر اور اندر کا ہیجان باہر کی فضا پر اثر انداز نہ ہو سکے۔ یہ ظرف اور حوصلے کی بات ہے خدا جس کو بخش دے۔

اب تو خیر برسوں کی چکنی چپڑی استری شدہ شہری زندگی نے اس کے چہرے پر ہلکا سا "پوچا" اردو شاعری کا بھی پھیر دیا ہے۔ مگر جب وہ تازہ تازہ گاؤں کے کھیتوں سے کٹ کر جنرل موسیٰ کے ہیڈکوارٹر میں وارد ہوا تھا تو سنگ موسیٰ ہی کا ایک مجسمہ معلوم ہوتا تھا مگر مسکراتا ہوا مجسمہ۔ کشادہ دست اور کشادہ جبیں، سر سے پاؤں تک فی انچ سپاہی (فٹ ۵، انچ) ہو بہو ویسا جیسے فرنٹیئر فورس یا ہماری دوسری رجمنٹوں، رسالوں، عسکری شعبوں کے فولادی ٹوپی پہن کر پوچ (POUCH) میں ریوالور اڑس کر سینہ تان کر چلنے والے گبھرو ہوتے ہیں۔

فوج کے شعبۂ تعلقات عامہ میں کیپٹن صدیق سالک سے جب ہماری ملاقات ہوئی تو وہ فوج میں داخل ہو رہا تھا اور ہم نکل رہے تھے۔ ہمارے اور اس کے درمیان فوجیوں کی ایک پوری نسل بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ ایک طویل جنگ عالمگیر، آٹھ دس انگریز کرنیل جرنیل اور بہت سی خبریں حائل تھیں۔

دوسری عالمی جنگ ہم لوگوں نے کرنل مجید ملک، لیفٹننٹ کرنل فیض احمد فیض اور بالخصوص اردو زبان کے یگانۂ روزگار ادیب میجر مولانا چراغ حسن حسرت کی سرکردگی میں کاٹی۔ "لانگ مارچ" کے بعد باوردی صحافیوں، ادیبوں کے اس محکمے کی جوتوں کو اردو شاعری کی فضا میں اچھا خاصا فٹ کر لیا تھا۔ مگر اب جو سالک کی طرح کے بظاہر ایڑی سے ایڑی بجانے اور پنجوں کے بل "بھمبیری" کی طرح گھومنے والے فوجی جوان کو دیکھا تو ماتھا ٹھنکا کہ یہ لوگ تو اس محکمے کو پھر فولادی ٹوپی پہنا دیں گے۔

مگر قیس جب تصویر کے پردے سے مکمل برآمد ہوا تو ہمارے فاضل دوست عبدالعزیز خالد کے الفاظ میں کتابوں کا معین و معاد اور حمید و ندیم نکلا۔

وہ اردو کا ایک شگفتہ رقم ادیب تھا۔ انگریزی اس کی معاش تھی، اردو لباس اور پنجابی اساس۔ اس کے فکاہی مضامین ادبی حلقوں کو چونکا رہے تھے۔ اس کی ظرافت توپ والی گرجتی گنگارتی چیز نہ تھی، ایک قسم کی ذہنی بشاشت تھی۔ پھلدار جھاڑیوں میں جیسے ایک ٹہنی سے دوسری ٹہنی تک اڑتی رنگین چڑیاں نہیں ہوتیں بس — بس ویسی ہی ہلکی، چہچہاتی سی ظرافت۔ طنز میں بھی لکڑی کا پتلا سرا وہ اپنے ہاتھ میں رکھتا تاکہ ضرب تو لگے مگر زخم نہ آنے پائے۔

لکھنے کا اسلوب کچھ ایسا کہ خود آگے آگے اور موضوع پیچھے پیچھے۔ بعض اوقات خود اتنا آگے نکل جاتے ہیں کہ کسی نقطے پر اباؤٹ ٹرن (ABOUT TURN) ہو کر موضوع کو بگل بجا کر بلانا پڑتا ہے کہ:

آواز دے کہاں ہے

مجموعی طور پر سالک کا مزاج بشاشت کی ایسی کیفیت کا نام ہے جو مسرت و بہجت، عالی حوصلگی اور دردمندی کی "فیملی پلاننگ" سے پیدا ہوتا ہے۔

ہمہ یاراں دوزخ میں سالک کے اسلوب تحریر کی ان خصوصیات کا پہلے سے کہیں زیادہ دم خم [illegible] نظر آتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ اتنی سنگین

حکایت شب کو ایسے شگفتہ لہجے میں لکھ گیا ہے کہ جیسے دوزخ کا سفر بہشت کے گائیڈ کی معرفت طے ہو رہا ہو۔ سالک نے جس انداز میں یہ کتاب لکھی میرے خیال میں وہ اس کے موضوع کے لئے موزوں نہ تھا۔ اگر کتاب پڑھنے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ اسی انداز نے تو جسم واقعہ میں جان ڈال دی ہے۔ شگفتگی سالک کی شخصیت کا جزو ہے۔

۱۹۶۵ء کی جنگ میں ہم تو آگرہ کیمپ کے میجر گلاب سنگھ کی طرح "ہلا شیری کرنے والوں" میں سے تھے۔ صف اول کی ڈیوٹی عموماً کیپٹن صدیق سالک یا ہمارے دوسرے نوجوان رفقائے کار ہی انجام دیتے تھے۔ یہ جنگ دوسری جنگ عالمگیر کے آزمودہ کاروں کے واسطے بھی نئی جنگ تھی۔ یہ اندازہ پہلی مرتبہ اسی جنگ سے ہوا کہ اپنی سرزمین پر اپنی جنگ کیا معنی رکھتی ہے۔ دوسری عالمی جنگ میں تو بعض جنگی "تھیٹروں" (THEATERS) میں مہینوں یہی پتہ نہ چلتا کہ لڑائی اصل لڑی کہاں جا رہی ہے۔ محاذ طرابلس میں، جنگ دیوالی میں، سپاہی آگ کے بگھ میں اور خود حضرت چرچل مدظلہ العالی لندن میں۔

اپنی جنگ کے شعلے تو ہمارے گھروں، ہماری منڈیروں پر لپک رہے تھے۔ اس کی مٹی تو اڑ اڑ کر ہماری ماؤں بہنوں بیٹیوں کی مانگوں میں پڑ رہی تھی۔

اس جنگ کا نتیجہ تو اخباروں کے علاوہ ہمارے ماتھوں پر بھی چھپنا تھا۔ یہی احساس تھا کہ:

شعلہ محمود از خاک ایاز آید بروں!

ہمارے محاذ ہماری دہلیز ہی پر تو تھے کیپٹن سالک کو جب دیکھا صحافیوں کی مہار تھامے "انگریزوں، فرانسیسیوں سے پنجابی میں انگریزی بولتا" محاذ کو جاتا یا محاذ سے آتا نظر آتا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو واقعات کے بین درمیان رہتے ہیں اور بحران کے زمانے میں جب کوئی "مشن" ان کے سپرد کیا جاتا ہے تو وہ "مشن" کو سنگینوں سے جا پکڑتے ہیں۔ سالک کی خصوصیت یہ تھی کہ اس کی پیشانی کو ہمیشہ خنداں پایا۔ محاذ سے آتا تو خبروں کے علاوہ چٹکلوں کا تھیلا بھی بھرا لاتا ورنہ جرنیل اپنی آدمی کی ناک پر رکھا رہتا ہے سقوط سنگاپور کے بارے میں کہ ستر اسی ہزار اتحادی فوج نے وہاں ہتھیار ڈالے تھے ہم نے یہ لگ گپ سنی تھی کہ جنرل پرسیول اور جنرل بینٹ اتنے چڑچڑے ہو گئے تھے کہ جاپانیوں سے لڑنے کے بجائے ایک دوسرے سے لڑتے رہتے تھے۔

سالک نے یہ کتاب ابواب باندھ کر لکھی ہے۔ اسی طرح زندگی میں بھی وہ ٹارگٹ بعد ٹارگٹ طے کرتا ہوا چلا جا رہا ہے۔ بس ایک شاعری کا اونٹ ابھی تک کسی کروٹ نہیں بیٹھ سکا۔ محمد صدیق نے غالباً نوجوانی کی کسی رومانی ترنگ کے زیر اثر یا انتہائے شوق کی گھبراہٹ میں یا یونہی از راہ احتیاط تخلص رکھ لیا تھا کہ

اے معشوق وصبولے کے چلو ساتھ قدم   غیر کے گھر میں کبھی رات بھی ہو جاتی ہے

یوں آزاد شاعری وہ کر سکتا ہے۔ مگر شارٹ کٹ کا وہ قائل نہیں، اگر ہوتا تو سقوط ڈھاکہ کے مرحلے پر جب سقوط سے پہلے پرواز کی صورت نکل آئی تھی یا بعد میں ایک مہربان و محب بنگالی خاندان نے ان کو اپنے ہاں خانہ نشینی کی پیش کش کر دی تھی کہ یہاں مزے سے بیٹھے رہیں۔ مزے کھاتے رہو، تو آپ قید و بند کا گرم سرد چکھنے کا فیصلہ نہ کرتا

وادہ و رسن تعلق خاطر کی بات ہے   ورنہ قریب تر تھا شبستاں کھلا ہوا

کل کی خبر نہیں مگر آج تک تو وہ شاعر نہیں بن سکا البتہ تخلص کو اس نے بالکل بنجر بھی نہیں رہنے دیا۔ جو شخص ایسی شاداب نثر لکھتا ہو میں سمجھتا ہوں اسے تخلص رکھنے کا حق مل جانا چاہئے۔ ویسے شعروں کی ذخیرہ اندوزی کا اسے بڑا لپکا تھا۔ مشرقی پاکستان بار ذرا یہ شوق بجائے خود ایک ٹارگٹ بن گیا تھا۔ راولپنڈی میں شفیق الرحمان اور مشتاق یوسفی ان کے تکیے کے نیچے رہتے۔ ڈھاکہ میں غالب اور فیض اس کے پہلو میں پایا۔ حجامت بھی "زنداں نامے" میں گھڑے ہو کر بنتا!

سقوط ڈھاکہ قیامت کا سانحہ تھا

دوسری جنگ عالمگیر میں ہم نے کئی قیدی کیمپ دیکھے ہیں۔ کلیان کیمپ میں تو اطالوی قیدیوں کا پورا لشکر ہمارے پڑوس میں پڑا تھا۔ ان کی نفری دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ اٹلی میں دو شتے اور مارشل گریزیانی ہی رہ گئے ہوں گے۔ بہرحال ان کی بارکیں ہماری بارکوں جیسی ہی تھیں غسل خانے ہم سے اچھے، راشن چوکھا بیٹھنے پر کوئی خاردار تار بھی منڈھا ہوا نہ تھا۔ وہ کیمپ کے شاداب کھلے میدان میں مرغابیوں کی طرح گھومتے رہتے۔ مگر ایسا لگتا تھا کہ جیسے روشنی ان کی آنکھوں سے ہمیشہ کے لئے بجھ گئی تھی۔

دشمن کی قید محض بھی روح فرسا ہوتی ہے۔ بھارت کی قید تو ماکشتوں کی قید تھی۔ وہ تو ہماری روح کو کچلنا چاہتا تھا۔ اس کی کوشش تو یہ تھی کہ ہم کبھی سر اٹھا کر نہ جی سکیں۔

سالک کا پہلا خط اردو کے ایک پہلے گھوارے فورٹ ولیم سے آیا۔ پھر ان کے خط آگرہ کیمپ نمبر ۴۱ سے آنے لگے۔ جنگی قیدی خطوں میں لفظوں کے

ہزار طوطے مینا بناہیں، ڈھارس تھوڑے بندھتی تھی تاہم سالک جن بانکے ادبی کنایوں میں "نئی دنیا غم دیدہ گاں" کا نقشہ کھینچا اس میں اس کی ذہنی بشاشت، دل آویزی صاف جھلکتی ہے۔ خطوط میں "انہیں مارتے" ہوئے شعروں کا استعمال اتنا بڑھ گیا تھا کہ بعض خطوط میں تو نذیر احمد شیخ کے بقول:

اشعار کی بھرمار تھی، احوال ندارد

ہمیں یقین تھا کہ جنگی اسیروں میں سے سول کے پڑھے مسعود مفتی اور فوج کے کوٹے سے میجر صدیق سالک ضرور کتابیں لکھیں گے۔ یہ دونوں تو خیر علم و فن کے مذاکروں کی زبان میں ہمارے ملک کے جانے پہچانے دانشور ہیں۔ اس بات کی توقع رکھنی چاہئے تھی کہ ہمارے ان سابقہ "شہان بے کمر اور خسروان بے کلاہ" میں سے کئی نئے شمس و قمر طلوع ہو کر فکر و فن کی راہوں کو روشن کریں گے۔ دلوں کا یہ انجماد درد زبان پر آ کر بہہ رہے گا ـــــ "ہمہ یاراں دوزخ" اسی موج درد کی پہلی جنبش ہے:

سوچ کا کارواں رکا نہ کبھی ہم جہاں بھی رہے سفر میں رہے

سقوط ڈھاکہ کے بعد دیوانوں پہ کیا گزری؟ ایک بہت وسیع نہایت نازک اور بڑا پیچیدہ موضوع ہے۔ یہ تاریک راہوں میں مارنے اور مرنے والوں کی کہانی ہے۔ سالک کی مشکل یہ ہے کہ وہ جانتا زیادہ ہے، بتاتا کم ہے۔ بہت سا مال اس نے الگ باندھ کے رکھ چھوڑا ہے۔ ذہنی اور سیاسی نوعیت کے مباحث کو تو میجر صاحب نے پیش لفظ ہی میں جوتے کی لکیر کھینچ کر اپنے لئے "آوٹ آف باونڈ" (OUT OF BOUND) کر لیا ہے۔ یوں بھی المیہ اتنا وسیع اور اس قدر تازہ ہے اور اس کے عسکری، تاریخی اور نفسیاتی دھاگے اتنے نازک اور اتنے الجھے ہوئے ہوں تو اتنی اور اس انداز کی کتاب میں بہت سے گوشوں کا تشنہ رہ جانا لازمی تھا۔ اسے سالک کی تخلیقی اور تنظیمی صلاحیت کا کمال سمجھنا چاہئے کہ ان اوراق میں المیے کا ایک خاصا کشادہ "ایریل ویو" نگاہوں کے سامنے کھل جاتا ہے۔ سالک کا آرٹ یہ ہے کہ وہ اس کی گہرائی ڈالتے ڈالتے چپکے چپکے سالہا اونچے اونچے اور گہرے گہرے مسئلوں پر بھی ڈال جاتا ہے۔ کتاب کی بڑائی اور اس کی سندرتا بھی چھوٹے چھوٹے واقعات سے ابھرتی ہے۔ سالک واقعات کے چھوٹے چھوٹے محدب شیشے کاٹ کاٹ کر ایک فریم میں جوڑتا چلا گیا ہے۔ "ہمہ یاراں دوزخ" چہروں کا ایک رنگا رنگ نگار خانہ ہے۔ ہر کتاب میں ایک "طلسمی مندری" ہوتی ہے جس میں جھانکے بغیر آپ کتاب کی روح میں نہیں جھانک سکتے۔ اس کتاب کی طلسمی مندری اس کے محدب شیشے ہیں، اگر آپ ان ہی سے شست باندھ کر دیکھیں گے تو آپ بہت کچھ دیکھیں گے۔ آندھیاں اور طوفان بھی چہرے اور کردار بھی۔ اسیروں کے چہرے، صیادوں کے چہرے، ہمارے تمہارے اور میر صاحب ـــــ سب خواتین و حضرات کے چہرے ـــــ ان واقعات نے کتاب کو اتنا متحرک اور زندہ بنا دیا ہے کہ سالک کے ہمراہ قاری خود بھی کیمپ نمبر ۴۴ کی چٹائی پر جا بیٹھتا ہے اور جب میجر راٹھور ڈوگری کی گھات کھودی کر کے ہاتھ میں پکڑتے ہیں تو ڈوری کے ساتھ ساتھ قاری کا دل بھی ہلنے لگتا ہے۔

سالک کا قلم قاری کو مکمل طور پر اپنے سحر میں جذب کر لیتا ہے۔ اس نے اپنے موضوع پر سامنے سے نہیں پہلوؤں سے حملہ کیا ہے:

بازی بازی کف نہادند شوخی شوخی زسر گرفتند

خالص ادبی محاذ پر یہ کتاب "عسکری مزاح" کے اس "خاندان ایبک" سے تعلق رکھتا ہے جس کی تیر بہدف مثال اردو ادب کے جنرل ریٹائرڈ کرنل محمد خان کی کتاب "بجنگ آمد" میں نظر آتی ہے۔ فرق یہ ہے کہ "بجنگ آمد" پرائی جنگ کی کہانی ہے اور "ہمہ یاراں دوزخ" اپنی جنگ کی آپ بیتی۔ اور یہ بہت بڑا فرق ہے ـــــ "نائن کیمپ" کا البیلا کپتان رنگوں کے بھرے ہوئے میلے سے گزر رہا تھا۔ مگر "ہمہ یاراں دوزخ" آگ کے دریا میں سے ڈوب ڈوب کر گزرنے کی روداد ہے چنانچہ اس کی سطریں ـــــ اپنی تمام تر شگفتگی کے باوجود ـــــ اوپر اوپر ٹھنڈی ہوا میں سانس لینے کے باوجود ـــــ دہکتے ہوئے انگاروں پر چلتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔

سالک نے جسم کے زخموں سے زیادہ روح کی خراشوں کی نشاندہی کی۔ یہ جسم کے زخم تو مندمل بھی ہو جاتے ہیں کہیں کہیں پاسپورٹ کا کام بھی دے جاتے ہیں مگر روح کا خسارہ گنتی میں نہیں آتا:

کوئی پروانوں کو بتلا دو کہ جلنے کے سوا اور بھی چند مقامات وفا ہوتے ہیں

بھارت نے زمین اور ذہن دونوں محاذوں پر حملہ کیا تھا۔ زمین پر وہ توپ ٹینک وغیرہ اور ذہن پر وہ پروفیسر مجیب، انفارمیشن سکرٹری قدوائی اور اسی کاٹ کا دوسرا لکھا پڑھا "اسلحہ" استعمال کر رہا تھا۔ گولہ بارود کے محاذ پر تو جنگ اسی لمحے ختم ہو گئی تھی جب ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کی ڈھلتی ہوئی سہ پہر کو ڈھاکہ کے رمنا ریس کورس میں پاکستان

کے جنرل امیر عبداللہ خاں نیازی نے اپنا ریوالور بھارت کے جنرل جگجیت سنگھ اروڑہ کے حوالے کر دیا تھا، مگر ہمارے جنگی قیدی اعصاب کی یہ شدید جنگ مسلسل دو برس تک بھارت کے بندی خانوں میں لڑتے رہے، اور اس شان سے لڑتے رہے کہ زمین پر ہاری ہوئی بازی ذہن کے محاذ پر جیت کر وطن واپس آئے۔ اس کتاب کو کیمپ نمبر ۴۴ کے حوالے سے ۱۹۷۱ء کی جنگ کے اس خاموش محاذ کی فرنٹ لائن ڈسپیچ (FRONT LINE DESPATCH) سمجھنا چاہیئے۔

قیدی زندگی کا مختلف پرتوں میں انفرادی یا اجتماعی تجزیہ کرنا ایک قسم کا دشوار ترین عمل ہے۔ اس عمل میں خود اپنے اوپر بھی "چاند ماری" کرنی پڑتی ہے۔ قید کے لمحات کو ابھی وقت کی چھلنی سے بھی گزرنا ہے۔ سالک نے نفسیاتی کشمکش کے پہلوؤں کو نہ صرف یہ کہ بطور خاص اپنا مرکزِ نگاہ بنایا ہے بلکہ احساسات کو جذبات سے الگ ہو کر پرکھنے کی کوشش بھی کی ہے۔

اس نے کمزوریوں اور خوبیوں کو چھاج میں پھٹکا، کرکان کے الگ الگ "ڈھیل" نہیں لگائے لیکن خود احتسابی کی ایک رو میں سوالات کی ایک "پوری نسری" ابھرتی چلی گئی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ کتاب تاریخ کے ایک عظیم المیے کے سائے میں سوچی اور لکھی گئی ہے۔ مگر مصنف نے کمال بالغ نظری سے روشنی کے ان دروازوں کو کھلا رکھا ہے جن سے مستقبل کی دھوپ، ذہن کے "نہاں خانوں" میں داخل ہوتی ہے اور یہ وہ خصوصیت ہے جس نے اس دلچسپ "رپورتاژ" کو ایک دیرپا پورٹ بھی عطا کر دی ہے۔

"ہمہ یاراں دوزخ" مزاح کی کتاب نہیں، مگر ظرافت اس کو سر آنکھوں پر بٹھائے گی ـــــ یہ ادب کی کتاب نہیں، مگر اردو ادب اس کو سینے سے لگائے گا ـــــ یہ تاریخ کی کتاب نہیں، مگر تاریخ اسے نظر انداز نہیں کر سکے گی۔

صدیق سالک بجھ مت لیکچرر ہے ہیں۔ مگر وہ ابواب کے خاتمے پر سبق نکال کر دکھانے کے قائل نہیں ہیں۔ پوری کتاب کا کوئی ورق سبق سے خالی نہیں، اور جس سبق پر میرا دل سب سے زیادہ دھڑکا، وہ سالک کے الفاظ میں یہ ہے:

"اگر کسی پاکستانی لیڈر کے بیان سے، پاکستان دشمنی کی بو آئی تو خون کھولنے لگتا کہ اس ناشکرے انسان کا گریبان پکڑ کر بھرے بازار میں پوچھا جائے ـــ کیا تجھے آزادی کی قدر نہیں ہے یا کیا تجھے معلوم نہیں کہ اگر یہ ٹکڑا بھی ہم سے چھن گیا تو ہمیں نہ زمین جگہ دے گی نہ آسمان ۔۔۔"

اور ہاں ـــ کتاب میں الفاظ کے زیر و بم سے ایک "نغمہ خوں گشت" کی آواز بھی تو سنائی دیتی ہے:

ادھر مٹا بھی دیا داغِ قتل تک گوہر
ادھر ابھی کفِ قاتل پہ ہے سرِ مقتول

(راولپنڈی میں "ہمہ یاراں دوزخ" کی تعارفی تقریب میں پڑھا گیا)

شریف کنجاہی

موسپیدی کی یاسمن

بے تکلف سے ایک ہم سن نے
آہ بھر کر کہا، شریف! اپنی
زندگی ان سفید بالوں کی
برف نے منجمد سی کر دی ہے
اب کسی آفتاب کی بھی کرن
زمہریرِ بدن نہیں چھوتی
اپنے چہرے کا دشتِ سینائی
جلوۂ برق کو ترستا ہے
ابرِ تیرہ دراز بالوں کا
شہرِ آغوش سے پرے ہی پرے
مسکراتا ہوا برستا ہے
اور وہ دوست ٹھیک کہتا تھا
تا بامروز باغِ ہستی میں
ایک ہی پھول اُس نے سُونگھا تھا
ایک لذت سے آشنائی کی
کاسۂ جسم لے کے بستی میں
در بدر عمر بھر گدائی کی

رابطوں کی دھنک سی دنیا میں
ایک ہی رنگ سے رہا مانوس
اور وہ رنگ جب پڑا پھیکا
اس کو ہونے لگا خلا محسوس
موسپیدی کی یاسمن میں بھی
ورنہ اک اپنی جاذبیت ہے
— ڈھلتے سُورج کا چارم اپنا ہے
میٹھی میٹھی سی دھوپ میں اس کی
پھُول کھل کر نئے علائق کے
صحنِ جاں عطر بیز کرتے ہیں
حلقۂ قدس اپنا پھیلا کر
برگ ریزی کے زخم بھرتے ہیں

ابنِ انشا

اِنشا جی بہت دن بیت چکے

انشا جی بہت دن بیت چکے
تم تنہا تھے، تم تنہا ہو
یہ جوگ بجوگ تو ٹھیک نہیں
یہ روگ کسی کا اچھا ہو؟
کبھی پورب میں، کبھی پچھم میں
تم پُروا ہو، تم پچھوا ہو؟
جو نگری نگری بھٹکائے
ایسا بھی نہ من میں کانٹا ہو
کیا اور سبھی چونچال یہاں؟
کیا ایک تمھی یہاں دُکھیا ہو؟
کیا ایک تمھی پر دھوپ کڑی
جب سب پر سکھ کا سایا ہو
تم کس جنگل کا پھول میاں
تم کس بگیا کا بیلا ہو؟
تم کس پونم کا اجیارا
کس اندھی رات کی اُوشا ہو
تم کن ہاتھوں کی مہندی ہو
تم کس ماتھے کا ٹیکا ہو
تم کس ساگر کی لہر بھلا
تم کس بادل کی برکھا ہو
کیوں شہر تجا، کیوں جوگ لیا
کیوں وحشی ہو، کیوں رسوا ہو
ہم جب دیکھیں بہروپ نیا
ہم کیا جانیں تم کیا کیا ہو

(۲)

جب سورج ڈوبے سانجھ بھیے
اور پھیل رہا اندھیارا ہو
کسی ساز کی لے پر چھنن چھنن
کسی گیت کا مکھڑا جاگا ہو
اِس تال پہ ناچنے پیڑوں میں
اِک چُپ چُپ بہتی ندیا ہو
ہو چاروں کوٹ سگندھ بسی
جیوں جنگل پہنا گجرا ہو
یہ امبر کے مکھ کا آنچل
اس آنچل کا رنگ اُودا ہو
اک گوٹ روپہلے تاروں کی
اور بیچ سنہرا چندا ہو
اس سندر شیتل شانت سمے
ہاں بولو بولو پھر کیا ہو؟
وہ جس کا ملنا ناممکن
وہ مل جائے تو کیسا ہو؟

(۳)

کیوں ایسے سپنے دیکھتے ہو
انشا جی تم آپ بھی سپنا ہو
اک بیتیں لکھنے شاعر ہو
اک آگ میں اگنی بسنا ہو
یہ باتیں من میں وہ سوچے
جو کیا بتلائیں کیسا ہو؟
وہ جس کے ہاتھ میں قسمت کی
اک لمبی گہری ریکھا ہو
وہ شخص پرانے قصوں کا
اک مدماتا شہزادہ ہو
جو شہر کا رستہ بھولا ہو
اور جنگل میں آ نکلا ہو
وہ راجا کاشی نگری کا
یا والیٔ بلخ و بخارا ہو
کچھ اُس کے تاج پہ کلغی ہو
کچھ اُس کا چاند سا چہرہ ہو
وہ مالک محل اٹاریوں کا
یا روپے پیسے والا ہو
یا کوئی انوکھا گُن والا
وہ جس کا جگ میں چرچا ہو

یا کوئی سجیلا بنجارا
جو نگری نگری گھوما ہو

(۴)

ہم نگری نگری گھومے تو
جب نکلے تھے آوارہ ہو
وہ لندن ہو، وہ پیرس ہو
وہ برلن ہو، وہ روما ہو
وہ کابل ہو، وہ بابل ہو
وہ جاوا ہو، وہ لنکا ہو
وہ ساحلِ سین و راین ہو
یا ساحتِ نیل و دجلہ ہو
وہ چین کا دیش و شال کہیں
یا پچھم دیس امریکا ہو
وہ چوٹی فیوجی یا ماکی
یا ایلپس کا پربت اونچا ہو
وہ چھتیں گلابی لیڈن کی
یا نیلا آبِ جنیوا ہو
دن استنبول کی گلیوں میں
یا شب کی سیرِ پراہا ہو
کچھ صورتیں تھیں، کچھ مورتیں تھیں
کچھ اور بھی شاید دیکھا ہو
جہاں نظریں ٹھہری ٹھٹکی ہوں
جہاں دل کا کانٹا اٹکا ہو

اک عالم تھا، کیا عالم تھا
وہ سچا ہو، یا جھوٹا ہو
پر ہم کو تو کچھ یاد نہیں
کچھ کھویا ہو، کچھ پایا ہو
ان باتوں میں، ان گھاتوں میں
سنجوگ کا کوئی لمحہ ہو
ہم اپنے جو خود آپ نہیں
پھر بولو کون ہمارا ہو
یوں سمجھو شہر سرائے میں
شب بھر کے لیے کوئی اترا ہو
کوئی پردیسی، کوئی سیلانی
وہ جس کا دور ٹھکانا ہو
شام آئے سویرے کوچ کیا
جب دھندلا دھندلا رستہ ہو
جب دھرتی سونی سونی ہو
جب انبر پھیکا پھیکا ہو

ہم اپنے آپ میں ڈوب گئے
خود پتھر بن، خود دریا ہو
جیوں گھاس کا تنکا جنگل میں
جیوں آندھی میں کوئی پتا ہو
ہم کس سے کہیں کس طور کہیں
کوئی بات ہماری سمجھا ہو؟
ہم اس سے ملیں جو اپنا ہو
ہم اس سے کہیں جو ہم سا ہو
جب یہ بھی نہیں جب وہ بھی نہیں
کیا بات بنے، کیا رستہ ہو
اس زنداں میں کوئی روزن ہو
اس گنبد میں دروازہ ہو

(۵)

اے جوگی، اے درویش کوئی
کیوں عمر گنوائے رمتا ہو
کیوں تن پر راکھ بھبوت ملے
تو گورکھ ناتھ کا چیلا ہو
یہ پورب پچھم کچھ بھی نہیں
یہ جوگ بجوگ بھی دھوکا ہو
جو تجھ سے جدا سب مایا ہے
پا اپنے کو گر پانا ہو
کیوں اور یہ جی کو رجھاتا ہے
یہ پیت کی ریت تو پھندا ہو
جو ہارا جان سے ہار گیا
جو جیتا وہ بھی رسوا ہو
دھونی نہ رما، بسرام نہ کر
بس الکھ جگا کر چلتا ہو
تو اپنا رہ، تو اپنا بن
تو انشا رہ، تو انشا ہو

ظہور نظر

یہی وہ موسم ہے

دلوں کی رنجور وادیوں میں —
گرج گرج کر
برس برس کر
سیاہ گھنگھور جبر کا ابر چھٹ رہا ہے
ہر ایک قاتل کے راستے میں
لہو لہو صبر کی چٹانیں پھسل رہی ہیں
جہاں جہاں بھی —
نشیب تھا۔ خوف کا، خطر کا، فرار کا
چوٹیوں سے بہہ بہہ کے آنے والے غصیلے پانی سے بھر گیا ہے

یہی وہ ساعت ہے
جب لہو کھولتا ہے
آنکھیں سلگنے لگتی ہیں
ہاتھ ان گردنوں کی جانب لپکنے لگتے ہیں
خونِ عالم لکھا ہو جن پر —

یہی وہ موسم ہے
جب وفا کے
جلے ہوئے جنگلوں میں اشجار پھوٹتے ہیں
جمی ہوئی راکھ کی تہوں سے نئی ہری دوب جھانکتی ہے

اختر حسین جعفری

امتناع کا مہینہ

اس مہینے میں غارت گری منع تھی، پیڑ کٹتے نہ تھے
تیر بکتے نہ تھے
بے پرِ پرواز محفوظ تھے آسماں
بے خطر تھی زمیں مستقر کے لئے
اس مہینے میں غارتگری منع تھی، یہ پرانے صحیفوں میں مذکور ہے
قاتلوں، رہزنوں میں یہ دستور تھا
اس مہینے کی حرمت کے اعزاز میں دوش پر گردنِ خم سلامت رہے
کربلاؤں میں اترے ہوئے کاروانوں کی مشکوں کا پانی
امانت رہے

میری تقویم میں بھی مہینہ ہے یہ
اس مہینے کئی تشنہ لب ساعتیں، بے گناہی کے کتبے اٹھائے ہوئے
روز و شب بین کرتی ہیں دہلیز پر اور زنجیرِ در تجھ سے کھلتی نہیں
فرشِ ہموار پر پاؤں چلتا نہیں
دل دھڑکتا نہیں
اس مہینے میں گھر سے نکلتا نہیں

اختر حسین جعفری

بھور سمے اور وافر پانی

بھور سمے اور وافر پانی
میرے قد سے، میرے سائے سے بالا آبی دیواریں
اک دیوار کے سائے میں اس جسم سے دُکھ کی کالک دھولوں
سارے شہر سے چھپ کر رولوں

مٹھی میں جس خواب کا زر ہے
جس سندیس کی خوشبو میرے دیس گئی تھی
وہ کاغذ، وہ پہلا آنسو، دور کہیں پاتال میں نا محرم
پتھر کے نیچے رکھ دوں

باہر نکلوں تو ساحل پر
ہنستے چہروں کی جگ مگ میں
عریاں نظروں کی بارش میں
روئی آنکھ کی سرخی کوئی اور نہ دیکھے

اعجم اعظمی

شجرِ بے سایہ

جھوٹ تھی خواب کی سرگوشی بھی
(خواب ہی ٹھہری آخر)

یہ در و بام —— سراب
آج کچھ یاد نہیں
کس کے وعدوں کی طرح ان کا یکیں سہے
شجرِ بے سایہ
چھاؤں کا نشہ بہت گہرا تھا
لگتا تھا کتنا خنک

لطف میں وہ بادۂ ناب

باندھ لو رختِ سفر
آگے بڑھو
تشنگی ایک سمندر ہے —— نظر صحرا ہے
دُور تک کوئی بھی منظر نہیں
منجدھار نہ ساحل کوئی

(خیر یونہی سہی)
لنگر تو اُٹھانا ہوگا
بادباں کھول دو
آنے دو ہوا جو آئے
ناؤ جس سمت بھی جائے اُسے جانا ہوگا

شناسا

کوئی شناسا ہو، دل یہ چپکے سے کہہ رہا تھا
وہ چپ ہو یا محوِ گفتگو ہو
خوشی کے لمحوں میں، غم کی گھڑیوں میں
روشنی بن کے جگمگائے
ملے تو اپنے وجود سے موسموں کے جادو جگاتا جائے
رُکے تو یہ وقت ٹھہر جائے

یہ زندگی
انتظار تھی، جس کی اوٹ میں تھے
ہزار چہروں کے منتشر خواب
اور کتنے سراب —— لیکن
مجھے بتاؤ کہ تم کہاں تھیں

گھٹا گھِر آئی ہے، ابر کھُل کر برس رہا ہے
جنم جنم کی
جو پیاس ہم میں چھپی ہوئی تھی
وہ آج سیراب ہو رہی ہے

شبنم رومانی

ایمان

کوئی شبیر بنے
کوئی شیر افگن
کوئی پیار کا اندھا بیوپاری
کوئی دھن کے دوزخ کا ایندھن
کوئی بن مانس
بستی میں ناچے چھنن چھنن

کوئی شیخ
برہمن کے ماتھے کا لال تلک

کوئی بالک
دکھ چادر اوڑھے
گلیوں میں روئے بلک بلک

کوئی من کا راجا
راجاؤں کی بھرے چلم
کوئی ویر
اُٹھائے ہاتھوں میں ڈر کا پرچم

کوئی راج سپیرا
بنیا میں پھنکار بھرے
کوئی اپنے مان کا رکھوالا
خود ہی اپنا ایمان کرے۔

کوئی سانپ اُتارے — "تن اُترن"
اور جھل جھل چمکے
زہر نہایا اُس کا بدن

بول اے مرے من!
بول اے مرے من!
اب چُپ رہنا ہے پاگل پن!!

آفتاب اقبال شمیم

سُرخ پرچم نہر

سب نے محنت کی تقدیس کا اسمِ اعظم پڑھا
چانگ دریا کا پانی سوا نیزہ اوپر اٹھا
بے گیاہ آسماں لہلہانے لگا
کوہِ عریاں کو بہتی ہوئی روشنی کا کمر بند باندھا گیا
دودھ کے رس سے پھٹتی ہوئی چھاتیاں
سبز پوشاک سے ڈھک گئیں
مسکرایا کساں دیوتا
بھوک کی ڈائنیں مر گئیں، بیلچوں کی
کدالوں کی ضربات سے
اور بچوں کو سوتیلی ماؤں کی غراہٹوں سے رہائی ملی
خشک پربت پہ تازہ رگیں پھیل کر
بن گئیں سرخیاں کل کے منشور کی

(پیکنگ)

سفارتیا

آسماں سے کٹ کے آ کر گر پڑی
صحن میں دن کی پتنگ
تیر جو آخیل کا مقدور تھا
اس کی ایڑی پر لگا
اور شاید نیم عمری تھی ہلاکت آفریں
ایک پایے کی ضرورت تھی جھکی چھت کے سہارے کے لئے
اس نے اپنے واسطے دتیانت کا نسخہ لکھا
بہہ گئی ڈھلوان سے ساری تمازت دھوپ کی
بے کراں تھا وہ، اسے
سوئیوں کی گردشوں میں وقت نے سمٹا دیا

اور اب
جسم کے قلعے میں وہ محصور ہے
ڈھونڈتا رہتا ہے روز و شب ربڑ سی بزدلی کی نرم نرم آسائشیں
یاد ہیں اس کو پہاڑے کی طرح
فارمولے نفع و نقصان کے
ریگزار رہتا ہے ساحل کے قریب
کیکر

(پیکنگ)

آفتاب اقبال شمیم

جو ہیں اور نہیں ہیں

جمود ٹوٹے گا جب زمیں کا
تو برق رفتار حادثوں کے سموں سے چنگاریاں اڑیں گی
نہتے اور پُر غرور لڑکے
اُڑائیں گے کنکروں کی آندھی
کھنڈریں اپنی ہزیمتوں کے اُکھڑ کے جالوت جا گرے گا
کھِلیں گی پھر شہر شہر تازہ بشارتوں کی
نئی رُتوں کی لہکتی فصلیں
فضا میں بے نام مرنے والوں کی عظمتوں کے علَم کھُلیں گے
مگر یہ مفروضہ واردات ہمارے جانے کے بعد ہوں گی
چلو چلیں منجمد سڑک پر حشیش پینے
طمانیت کی تلاش کرنے
گریں گے آنکھوں سے جب شرارے
اُتر کے آئے گا دیوتاؤں کے آسماں سے
سکوں کا بے سایہ دار لمحہ
چلو چلیں انتقام لینے کسی سے بیٹھک کے معرکے میں
ہدف کو ہم قہقہوں کی بوچھاڑ سے اڑائیں
فراغ ہو تو
بچھائیں آنگن کے بیچ میں دھوپ سردیوں کی
بڑھے ہوئے ناخنوں کو کاٹیں
پڑھیں رسالہ
کہ جس کے رنگین سرورق پر
چھپی ہے تصویر شاعرہ کی

(پیکنگ)

دراز سایہ سہ پہر

ایک لڑکی ابابیل سی
دھوپ میں دس بجے پرفشاں
ایک خوشبو کے جھونکے کے ہمراہ اڑتے ہوئے
راستے میں ملی اور اک آن میں بے نشاں ہو گئی
آنکھ میں تتلیوں سے چراتے ہوئے رنگ ٹپکا گئی
اک شرارا گرا اس کی جانب لپکتے ہوئے ہاتھ پر
انگلیاں جل گئیں
دن کی آواز مغرب میں ڈھلنے لگی
اور احساس میں
اک دھواں سا، زیاں سا دھندلکے بنانے لگا
کتنی بھاری تھیں اشیاء کی اصلیتیں
کھردرے جسم کے پرتوں پر ابھرتا کہاں
عکس کھویا ہوا
اور اب تیز قدموں سے سہ پہر کی
سیڑھیوں سے اترتے ہوئے
دیکھتا ہوں کہ میں ہوں کھڑا
دم بہ دم ڈوبتے شہر کی غیر مانوس شکلوں کے انبوہ میں
وہ کہیں بھی نہیں، وہ کہیں بھی نہیں
شام ہونے کو ہے —
ڈوب جا، ڈوب جا
ایک ہی دن میں دوبار سورج نکلتا نہیں

(پیکنگ)

نورؔ بجنوری

پتھروں کے محافظ

وہ سورج کی پہلی برہنہ کرن کے سہارے
بگولے کی مانند ٹیلے پہ اُتری
اور ایک ایک کر کے
حریری لبادوں کے پُرزے اُڑانے لگی
یہاں تک کہ اس کا بدن
لہو کی تمازت سے گلنار ہو کر
چٹخنے لگا تمتمانے لگا
پھر انگڑائی لے کر
قبیلے کے صف بستہ لوگوں سے بولی
"سنو اے روایاتِ کہنہ کے اندھے اسیرو
سنو اے شرافت کے غیرت کے فالج زدہ پاسبانو
مری کوکھ میں ایک آتش کدہ سنسناتا ہے
میری نسوں میں جہنم کی سیالِ آتش رواں ہے
تم اک لکۂ ابر ہو، میں سمندر کی پیاسی
بھلا تم مری پیاس کیسے بجھاؤ گے، بولو!!
مرے واسطے سب بدن برف میں ڈھل چکے ہیں
اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں
کہ میں خود ہی اپنی مسیحا بنوں اور مُردہ رگوں میں
نئی روح پھونکوں
نکیلے دہکتے ہوئے پتھروں سے چمٹ کر
مئے وصل کے خم لنڈھاؤں
پیوں اور پلاؤں!
تو دیکھو!
میں اس طرح تم پر تمہارے قوانین پر تھوکتی ہوں"....

قبیلے کے سب مرد و زن جیسے مسحور ہو کر
بڑھے اور نعرے لگانے لگے:
کیا حقیقت پسندی ہے، کتنی لطافت ہے، کیا حسن ہے
واہ وا، مرحبا، زندہ باد
تُو جرأت کی عظمت کی دیوی ہے
ہم تیری پُوجا کریں گے

یہی شور برپا تھا جب کوئی پیچھے سے بولا
تو کیا اب قبیلے کے سارے جواں
اپنی ٹوٹی کمانیں سنبھالے
انہی پتھروں کی حفاظت کریں گے
جنہیں دولتِ وصل سونپی گئی ہے
تو کیا، خواہشیں جب بھی شبخون ماریں گی
یہ لوگ
محرومیوں کے اندھیرے میں
اپنے ہیولوں پہ جھپٹیں گے
خود اپنے جسموں کو اپنے ہی نیزوں سے چھلنی کریں گے!!

حسن اکبر کمال

ترکِ زمیں کا سفر

تو کیا سب داستاں سے اُس کی واقف ہیں ؟
وہ اک آبی پرندہ
جس نے دیکھے خواب اَن دیکھے جزیروں کے
جہازوں، کشتیوں اور ساحلوں پر
عمر بھر منڈلاتے رہنے کی روایت توڑ کر
اونچا بہت اونچا اُڑا
آسماں چھونے کی خواہش
اُس جنوں پیشہ پرندے کو
زمیں سے فاصلے پر لے گئی
اور ساحلوں پر ناریل کے پیڑ تنکے بن گئے
شہروں، جہازوں، کشتیوں کی صورتیں بدلیں
وہ ذرّے بن گئے !
تنفس کی طرح پیہم سفر جاری تو بے شک تھا
مگر پرواز کی منزل وہ اَن دیکھے جزیرے کب تھے
خطِ افق کے پار پھر خطِ افق تھا
وہ پرندہ آسماں تو چھو نہ پایا
ہاں زمیں سے اُس کا رشتہ بھی ٹوٹا
اب تھکن سے چُور تھے بازو
بکھرنے کو بدن تیار
اور طاقت سے باہر
آخری ایسی اُڑان
جو اُسے خطِ افق کے پار لے جائے
مگر خطِ افق کے پار پھر خطِ افق
اور پھر پرندے کو زمیں کی مہرباں آغوش میں گرنا پڑا !

وفا پیشہ

ستون سے یہ جو بیل لپٹی ہوئی ہے، اس کو
یہ علم بھی ہے
کہ جب خزاں اس کے ریشے ریشے سے
زندگی یوں نچوڑ لے گی
کہ اس کے پھولوں میں رنگ ہوگا نہ تازگی
اس کی سرد باہوں میں زندگی کی تڑپ نہ گرمی
یہ اپنی رعنائیوں سے محروم ہو کے عبرت نشاں بنے گی
ستون سے اس کے عشق کی داستان بنے گی
ستون بے حس کھڑا رہے گا !!

پروین فنا سیّد

حمد

تری عنایت ــــ
کہ تُو نے مجھ کو
خود آگہی کے سفر میں
اپنے قریب رکھا!

تری عطا ــــ
مجھ کو درد کی بے پناہ دولت میں
دُکھ کی پُر شور آندھیوں میں
دیا وفا کا دھرے ہتھیلی پہ
اجنبی راہ پر بھٹک کر بھی
چین بخشا!

ترا کرم ــــ
تُو نے سحرِ فن کے رموز و اسرار سے مجھے باخبر رکھا
مجھ کو حرف کی خامشی میں کھونے کا گُر بتایا
وحی کے ــ الہام کے معانی سے
داوری کے ــ پیمبری کے ــ سکندری کے ــ قلندری کے
تمام رازوں سے

ذہن کو آشنا کیا
میری کور آنکھوں کو
روشنی دی

سُورج تھک کر چُور ہُوا

سُورج تھک کر چُور ہوا
اب اس کو سو جانے دو
صبح سے لے کر شام تک
دن بھر چلنا ہے
اپنے الاؤ میں جلتا ہے
مَیں نے تو کرنیں آنچل میں بھر لیں ــ دیکھو
شب بھر ان سے کھیلوں گی
ایک کرن کی لَو میں
پھوٹتی کونپل کی نکہت کو
دمکتے پھولوں کی رنگت کو
رُوح کے آئینے میں دیکھوں گی
ایک کرن کی زد میں
محور کے اطراف
طواف کروں گی
روشنیاں ہی روشنیاں ــ پلکوں کے جھروکوں میں رکھ کر
پھر سو جاؤں گی

پروین فنا سیّد

یہی شہر ہے

یہی شہر ہے
علم کا
حُسن کا
عشق کا شہر
جس کے مقفل دریچوں کے پٹ کھول کر جھانکنے کی تمنّا میں
کتنے کڑے کوس طے کر کے تم آ رہے ہو...
انا کا یہ مینار کتنا توانا ہے لیکن
ذرا نیچے اُترو
کہ محراب و منبر کے دامن میں
کچھ فاصلے پر
تعفن کی دلدل ہے
جس سے گزر کر ہی
اِس علم کے شہر میں تم قدم رکھ سکو گے
کہ تم اپنے ہی شہر میں اجنبی ہو

مرے پاس کچھ بھی نہیں

مرے پاس کچھ بھی نہیں ہے
کہ میں نے
طلسمات کے رنگ در رنگ حیرت کدے میں سے
ہر حرف
ہر رنگ
ہر نقش
روحِ ازل میں اُتارا
مرے دل کے آئینہ خانے میں شاید
امانت تھی یہ
عکس در عکس آئینۂ رنگ و بُو کی
جو لوٹا بھی دی
اَن گنت
پیچ در پیچ زینوں سے
تلوار کی دھار پر چل کے اب تم
میرے پاس کیوں آ رہی ہو؟

تاشیر وجدان

پیکر کی تخیل کا نوحہ

زرد بکھرتے ہاتھ کی پوریں
تنہائی کی ریت پہ جو بھی حرف بنائیں
تیز ہوا سے مٹتے جائیں
ریت پہ بنتے اور بگڑتے میرے خوابوں کے سب چہرے
ہار گئے ہیں
تیز ہوائیں جیت گئی ہیں
یونہی صدیاں بیت گئی ہیں

حرفوں کی بے ربط لکیریں، پیکر کی تخیل کا نوحہ
ٹوٹی قوسیں، میرے دکھ کی وہی پرانی ایک کہانی
بے شکلی کے اس تودے سے باہر آؤں
اپنی آنکھیں، اپنا ماتھا، راکھ کی صورت جھڑتی ہیئت
قریہ قریہ گھومنے والی تیز ہوا سے واپس لاؤں
اس سے اپنا ہونا مانگوں اور کہوں
لاحد سے مجھ کو حد کے اندر آ جانے دے

روزِ ازل سے بھیگی آنکھ کا ایک ہی سپنا
خود کو دیکھوں
گل کے گونگے ڈھیر کی تہ سے اپنی بچھڑی شکل نکالوں
خود کو پا لوں۔

پیر اکرم

برگد

عظیم رشتوں کے سلسلوں کا علَم اٹھائے
سیاہ صرصر کی آندھیوں میں قدم جمائے
تھکن سے ماندے مسافروں کے سروں پہ تانے
گھنیرا چھاتا
وہ جانے کب سے یونہی کھڑا ہے
ہر ایک لحظہ بدلتے رنگوں کو، چشمِ حیرت سے تک رہا ہے
نہ جاگتا ہے، نہ خواب میں ہے
عجب انوکھے عذاب میں ہے

نئی ہواؤں کی زد میں آ کر
اک ایک پتہ پرانی شاخوں سے کٹ گیا ہے
کبھی تناور تھا جو بدن
اب وہ تیشۂ عہدِ زر کے ہاتھوں
قدیم، گہری جڑوں سے کٹ کر
حقیر ٹکڑوں میں بٹ گیا ہے
کہ یہ صد ہا ریاضتوں کا پہاڑ اٹھائے
زمیں کے سینے سے والہانہ لپٹ گیا ہے

مراتب اختر

نظمیں

(۱)

مہنوال آئے ہیں اِس پار، دریا کے اُس پار سے
مال اپنا چرانے
بھرے گاؤں میں پھیلتے جا رہے ہیں فسانے
مرے بھید اللہ جانے
مہینوال اِس پار آئے — یہاں اُس چراگاہ میں
دُور — اس پار کے ایک گاؤں سے
جس میں ہری گھاس کا کال ہے
ہر مہینوال! انکا جواں سال ہے
اک مہینوال! انکا جواں سال ہے
دل دھڑکنے لگا کیا مرا حال ہے
لہلہاتی ہری گھاس
اُس گاؤں میں آ گئے ہیں مہکتے زمانے
وہ سامان کیوں باندھتے جا رہے ہیں نجانے
بھرے گاؤں میں پھیلتے جا رہے ہیں
— فسانے مرے
بھید اللہ جانے مرے

(۲)

!کھڑ کھڑانے والی
ہاں اک کھڑ کھڑانے والی
کیا معلوم تم کو، کھڑ کھڑانے والی ساعت آئے گی
اور پھر بکھر جاؤ گے تم سب (مضطرب ہو اب) پتنگوں کی طرح
نیلے اونچے پہاڑوں کے اُڑیں گے روئی کے گالوں کی صورت
دن بہت بھاری ہُوا!
بدشکل چہرے آگ کا ایندھن بنیں گے
دن بہت، بھاری ہُوا
(سب، لوگ اک جیسے نہیں ہوتے)
جو چہرے روشنی ہوں گے چمکتی گھاس پر
دائم چمکتی گھاس پر
چھاؤں تلے
اُن بے خزاں اشجار کی چھاؤں تلے
نہروں کنارے
جاوداں بیٹھی رواں نہروں کنارے سوئیں گے

آزار سے محفوظ ہوں گے
آئے گی، انصاف کی زندہ علامت آئے گی
وہ کھڑ کھڑانے والی ساعت آئے گی

(۳)

پھر شام ہوئی
چرواہے ریوڑ لے کر، لوٹے بن سے آئے گاؤں میں
چڑیاں، چہ چہ چہ چہ — ڈال ڈال پر ادھر اُدھر
گھبرائے ہوئے سے ڈھور ڈنگر ہیں ادھر اُدھر
جینے — جیتے رہنے کی علامت
آوازوں کے بکھرے بکھرے پات گرے ہیں ادھر اُدھر
یہ ہنگامے — ہر شام یہی کچھ ہوتا ہے

ہر رات یہی کچھ ہوتا ہے
ہر رات ہرے تالاب کے ٹھہرے پانی پر
اک کنکر آ کر گرتا ہے، لہروں کو مدوّر کرتا ہے
اور دائرے پھیلتے جاتے ہیں
آواز کہیں پاتال میں گم ہو جاتی ہے
ہر رات یہاں اک کنکر اس پانی پر آ کر گرتا ہے
ہر رات یہی کچھ ہوتا ہے
ہر رات کوئی تالاب کنارے سوتا ہے

(۴)

دھند میں ڈوب گئی شام، ہزاروں شامیں
پھر وہ منظر نہ ملا
بیت گیا سال تعاقب میں کئی سال لیے

ایک آواز بہت دُور سے آتی ہے
مسلسل دن رات
جیسے ہر سمت وہی ہے جو مسلسل دن رات
پاس آتا ہے — ٹھٹھکتا ہے — گزر جاتا ہے
پیاس آنکھوں میں رکتی ہے، بجھاؤں کیسے
اُس کو دیکھوں — اُسے یوں دیکھوں کہ اُس میں کھو جاؤں
جو لیے ساتھ مرا دل، مری شامیں، مرے گیت
کھو گیا تھا اسی دن رات کی دیوار کے پار
بھول کر پھر نہ کبھی لوٹ سکا
اور مری منتظر آنکھوں میں ہے اک شام
وہی دھند میں ڈوبی ہوئی شام

(۵)

اگر وہ مر چکا ہے پھر نہ آئے گا
کہیں وہ جھاڑیوں میں چھپ کے سو گیا ہو
آس پاس ڈھونڈ لے
وطن اُسے کبھی بھلا نہ پائے گا
شراب خور تھا تو کیا ہوا، اُسے
تمام لڑکیوں نے اپنے دل دیے
تمام دوستوں نے اپنے قہقہے
تمام قہقہے، تمام فرصتیں
اسی کے نام وقف کیں — اُسے سدا
ہر اک بزرگ نے دعائیں دیں، اگر
وہ مر گیا تو لوٹ کر نہ آئے گا
مگر یہ جھاڑیوں کے جھنڈ دیکھ لے
کہیں وہ مجھ سے اور تجھ سے روٹھ کر
یہیں چھپا ہوا نہ ہو

(۶)

غافل لوگو!
مٹی منہ کھولے تیار سدا
معلوم نہیں ہو جائے گا
(وہ دن ہے بہت نزدیک) ادھورے دولت
کے دیوانو!
کھل جائے گا سب معلوم نہیں ہو جائے گا
اس افسانے کا انت
جو کچھ تم جانو اُس کو پہچانو
دیوانو! اُس کو پہچانو
جب آگ جلے گی تب اس کو پہچانو گے؟
دیوانے لوگو!
کب اس کو پہچانو گے؟
اس افسانے کا انت تمہیں معلوم ہے
...... اور معلوم نہیں

لیث قریشی

شمع و صرصر

پردۂ ذہن پہ ادبار کے آثارِ مہیب
ولولے پست، طبیعت کی روانی موقوف
ایسی لب بستہ ہے مبہوت ہے تخئیلِ لطیف
جیسے اک لفظ میں اک حرف ہو یکسر محذوف
نخلِ احساس تمدن کی چٹانوں کے تلے
دب گیا ایسے کہ ہے جوشِ نمو بھی ماؤف
وقت نے گوشۂ عزلت میں چھپایا ہے انھیں
جن سے واقف تھا زمانہ، تھے جو کل تک معروف
روشنی جن سے ملا کرتی تھی کل تک ہم کو
خود وہی آج ہیں ظلمت کی ردا میں ملفوف

پھر بھی جیتے ہیں کہ جینا ہے بہر حال ابھی
جبرِ فطرت ہے کہ گنتے ہیں مہ و سال ابھی

ایسی افسردہ مزاجی سے مگر کیا حاصل
زندگی سلسلۂ گریۂ شبنم تو نہیں
مسئلے اور بھی ہیں ناخنِ انساں کے لیے
حاصلِ شوق فقط گیسوئے برہم تو نہیں
دل سے یک گونہ تعلق سہی نومیدی کو
ایک نسبت ہے، کوئی رشتۂ محکم تو نہیں
جادہ پیمائی میں اک یہ بھی مقام آتا ہے
منزلِ یا[illegible]ں مگر منزلِ آدم تو نہیں
سینۂ اہلِ وفا زخم رسیدہ ہی سہی
شکر صد شکر کہ منت کشِ مرہم تو نہیں

راستے جب بھی کبھی مسدود نظر آتے ہیں
جوہرِ پائے جنوں اور چمک جاتے ہیں

شادمانی کا گزر راہِ مصائب میں کہاں؟
روشنی ظلمتِ خاموش سے کتراتی ہے
یہ بھی جینے کا ہے اک طرز کہ ہر شمعِ نشاط
صرصرِ تیز سے خود بڑھ کے لپٹ جاتی ہے

تقدیسِ ضمیر

اپنے ماحول کا جب جائزہ لیتا ہوں کبھی
ہر نفس مجھ کو دل آزار نظر آتا ہے
جسم ویسے تو صحت مند و جواں ہیں، لیکن
ذہن ہر شخص کا بیمار نظر آتا ہے
دیکھنا یہ ہے کہ ہیں جتنے وفا کے حامی
کیا کوئی ان میں وفادار نظر آتا ہے
میں نے انساں کو انساں سے بھی جلتے دیکھا
دل میں جذباتِ خباثت کو بھی پلتے دیکھا
کس قدر مجھ کو ستایا ہے ریاکاروں نے
کتنے اخلاص گزیدہ ہوں، یہ کس کو معلوم
کتنی معصوم اداؤں نے مجھے مارا ہے
معصیت کوش نظر آتے ہیں کتنے معصوم
صرف اک جھوٹی سی تسکینِ انا کی خاطر
پیکرِ جبر نے کتنوں کو بنایا مظلوم
کیا یہ ممکن نہیں، پاکیزہ ہو دنیا کا خمیر
کیا بشر کو نہ ملے گی کبھی تقدیسِ ضمیر؟

حسن اختر جلیل

درویش کا خواب

بھرے شہر میں ایک ہی آنکھ تھی
جس نے وہ خواب دیکھا
جو ان ہونیوں کو
حقیقت کے خلعت میں ملبوس کر کے
ابدتاب سُورج کی دہلیز کا اک جیالا محافظ بنا دے

جمی برف کے مردہ سینے میں شعلے جگانا بھی اک خواب ہے
روایت کی بے رحم سنگی چٹانوں کے نیچے دبے
بے سہارا غلاموں کی آنکھوں میں
چنگاریاں کوندجانا بھی اک خواب ہے
بلندی کو پستی کے آگے جُھکا کر
مساواتِ آدم کا تابندہ پرچم اُڑانا بھی اک خواب ہے
یہ سب دلربا خواب
تعبیر کی چلمنیں ڈھونڈتے ہیں
یہ بارش سے لبریز بادل
زمیں پر برسنے کا حق مانگتے ہیں

کبھی تم نے سوچا
اگر یہ گھٹائیں
دلوں کی زمیں بانجھ ہونے سے پہلے
اُمڈ کر نہ برسیں
تو دورِ زماں کی نئی گردشوں میں
یہ سُورج کی دہلیز سنولا نہ جائے؟
یہ درویش کا خواب
تعبیر کاروں کی بے اعتنائی سے
دھندلا نہ جائے؟

امجد اسلام امجد

لفظِ پسِ لفظ

کہیں قدر لفظ ہیں
جو ہم بولتے ہیں
رولتے ہیں
کون سا لفظ ہے، کھولے گا جو درِ معنی کا
اس کا پتہ کون کرے
تم تو خوشبو ہو، ستاروں کی گذرگاہ ہو تم
تم کہاں آؤ گے اس دشتِ پُر اسرار کی پہنائی میں
کیسے اُترو گے تمناؤں کی گہرائی میں

رہ گیا میں
سوائے جانِ وفا
میں تو جو کچھ ہوں تمہارے ہی خمِ چشم سے ہوں
تم ہی جب لفظِ پسِ لفظ سے آگاہ نہیں
کس طرح سحرِ مفاہیم کا دروازہ کُھلے
لفظ کی کوکھ میں تاثیر کہاں سے اُترے
تم مرے ساتھ ہو، ہمراہ نہیں

کون سے خواب کے جنگل میں نہاں ہیں ہم تم
کیسے گردابِ تمنا میں رواں ہیں ہم تم
لفظ کے پار جو دیکھیں تو کوئی راہ نہیں
اور تم لفظِ پسِ لفظ سے آگاہ نہیں

پروین شاکر

دوست چڑیوں کے نام کچھ حرف

(۱)

بھولی چڑیا!
میرے کمرے میں کیا لینے آئی ہے؟
یہاں تو صرف کتابیں ہیں!
جو تجھ کو ترے گھر کا نقشہ تو دے سکتی ہیں — لیکن
تنکے لانے والے ساتھی
ان کی پہنچ سے باہر ہیں

(۲)

چڑیا پیاری!
میرے روشن دان سے اپنے تنکے لے جا
ایسا نہ ہو کہ —
میرے گھر کی ویرانی — کل —
تیرے گھر کی آبادی کو کھا جائے
تجھ پر میری مانگ کا سایہ پڑ جائے!

(۳)

گوریا!
کیوں روتی ہے؟
آج تو تیرے گھر میں سورج ہوا کا قاصد بنا ہوا تھا
گرچہ تیرے سب بچوں کی انگلی تھامے رقصاں تھیں
ننھے پہلی بار ہوا سے گلے ملے تھے!
اور ہوا سے جو اک بار گلے مل جاتا ہے
پھر وہ پنچھی گھر واپس کب آتا ہے

(۴)

سجے سجائے گھر کی تنہا چڑیا!
تیری تارہ سی آنکھوں کی ویرانی میں
پچھم جا بسنے والے شہزادوں کی ماں کا دکھ ہے!
تجھ کو دیکھ کے اپنی ماں کو دیکھتی ہوں
اور سوچتی ہوں
ساری مائیں ایک مقدر کیوں لاتی ہیں!
گودیں پھولوں والی!!
آنگن پھر بھی خالی!!!

پروین شاکر

رقص

آئینہ سے فرش پر
ٹوٹے بدن کا عکس
آدھے چاند کی صورت لرزتا ہے
ہوا کے دامن کی نرم موسیقی، خنک تاریکیوں میں
چاہنے والوں کی سرگوشی سی بن کر بہہ رہی ہے
اور ـ ہجومِ ناشناساں سے پرے
نسبتاً کم روشنی تنہائی میں
اجنبی ساتھی نے میرے دل کی ویرانی کا ماتھا چوم کر
مجھ کو یوں تھاما ہوا ہے
جیسے میرے سارے دُکھ اب اُس کے شانوں کے لیے ہیں
دونوں آنکھیں بند کر کے
میں نے بھی ان بازوؤں پر جھک کے سر یوں رکھ دیا ہے
جیسے غربت میں اچانک چھاؤں پا کر، راہ گم گشتہ مسافر
پیڑ سے سر ٹیک دے!

خواب صورت روشنی
اور ساز کی دلداریئے
اُن کی سانسوں سے گزر کر
میرے خوں کی گردشوں میں سبز نغمے بو رہی ہے
رات کی آنکھوں کے ڈورے بھی گلابی ہو رہے ہیں
اُس کے سینے سے لگی
میں کنول کے پھول کی وارفتگی سے
سرخوشی کی جھیل پر آہستہ آہستہ قدم یوں رکھ رہی ہوں
جیسے میرے پاؤں کچی نیند میں ہوں اور ذرا بھاری قدم
رکھے تو پانی ٹوٹ جائے گا

روح پر سے
غم کے سارے پیرہن
ایک اک کر کے اُترتے جا رہے ہیں
لمحہ لمحہ
میں زمیں سے دُور ہوتی جا رہی ہوں
اب ہوا میں پاؤں ہیں
اب بادلوں پر
اب ستاروں کے قریب
اب ستاروں سے بھی اُوپر . . . .
اور اُوپر . . . . . اور اُوپر . . . . اور . . . . . .

شہناز پروین سحر

ریسپشنسٹ ٥

ہر طرف میری شبیہہ
ہر طرف میرا ہی عکس
میرے چاروں اور دُنیا بھر کی آنکھیں
میرے ہر ہر زاویے کو منتشر کرتی ہوئی
آسماں کی سمت دیکھوں تو
ستارے اپنی اپنی پتلیوں میں چھین لیتے ہیں مجھے
میں جو نظریں بھی جھکاؤں تو
زمیں کا ذرہ ذرہ گھورنے لگتا ہے وحشت سے مجھے
ساری دنیا کی نگاہیں
تیز تلواریں
جو میری روح کو، میرے بدن کو کاٹتی ہیں اتنی تیزی سے
کہ میں گرتی نہیں
لیکن اس سب کچھ سے بڑھ کر اک اذیت اور ہے
میرا خود اپنی ہی جانب دیکھنا
کتنا کٹھن ہے
کس قدر تکلیف دہ احساس ہے
میں بھلا اپنی طرف دیکھے بغیر
کتنے دن زندہ رہوں گی
میں
کہ جو بس آئینوں ہی آئینوں کے درمیاں ہوں

RECEPTIONIST ٥

زندہ مقتول

یہ مسئلہ ہی نہیں ہے
کہ کس کی جیت ہوئی
مرے حصار کو توڑا تو تُو نے پایا اسے
وہ مجھ سے چھینا گیا
میں نے کب گنوایا اسے
میں اس کے دل میں بہت پہلے جگمگائی تھی
تو مجھے بجھا کے جلی
یہ میری منزلیں ہیں تیرے پاؤں کے نیچے
کہ جن کے واسطے پیروں کے بدلے سر رکھ کر
میں تمام عمر چلی
تُو گل کی ڈال تھی لیکن تجھے ہی پھول لگے
میں کتنے برسوں سے تھی منتظر
مگر نہ کھلی
تمام عمر کی میری ریاضتوں کا صلہ
تجھی کو ملا
کہ میری سانس ترے تن سے آنے جانے لگی
مری بہار تری گود لہلہانے لگی
یہ میرے نام کے سُکھ
جو ہیں تیری مٹھی میں
یہ میرے حصے کی خوشیاں
جو تجھ کو حاصل ہیں
انھیں خیال سے رکھنا
سنبھال کر رکھنا
یہ تیرے پاس سہی
پہ مری امانت ہیں
کہ تیرے وار سے میں قتل ہو چکی ہوں
مگر ___ کبھی کبھی ہی سہی
سانس اب بھی لیتی ہوں

شہناز پروین سحر

ڈراپ سین

اک ڈرامہ ہے
جس کے ہیں کردار دو
ایک میں ایک وہ
وہ ڈرامہ جو سوچا نہ سمجھا گیا
جیسے کچھ اُلٹی سیدھی لکیریں بناتے ہوئے
ایک تصویر سی
آپ ہی بن گئی
اور مبہم سوالوں کی دہلیز پر
ایک مفہوم آکر کھڑا ہو گیا
کیسے پردہ اٹھا
وہ بھی میری طرح کچھ نہیں جانتا
ایک "ہیرو" اور اک "ہیروئین" کی طرح
رول کرنا تھا دونوں کو
لیکن
خدا جانے کیونکر ہوا
وہ "وِلن" بن گیا۔ خود مرا روپ بھی "ویمپ" جیسا ہی تھا
اُلٹی سیدھی لکیروں میں تصویر گم ہو گئی
وہ جو مفہوم تھا
اُلجھے اُلجھے سوالوں کی دہلیز سے بھی پرے
اُس طرف جا چھپا
جیسے کچھ بھی نہ تھا
چند بچوں کی آہ و بکا کے سوا

تین مختصر نظمیں

زندہ رہنے کی خواہش

دانے تک
جب پہنچی
چڑیا جال میں تھی
زندہ رہنے کی خواہش نے مار دیا

گواہی

آج کی شام کا ٹھنڈا ٹھنڈا نیلا موتی
وقت کی ڈھلوانوں پر جیسے
بھاگتے بھاگتے ٹھہر گیا تھا
ہم نے خود چھو کر دیکھا تھا

سیکنڈ ہینڈ

دن بھر کی سانسوں کو مجھ سے چھین لیا
پھر مجھے ہراساں چھوڑ گیا
آج کا دن بھی
کل جیسا تھا

صائمہ خیری

دو نظمیں

(۱)

بکھری سوچیں
بے رس آنکھیں
خوف ہزاروں
نسلوں نسلوں
دھواں اڑاتے گلیوں گلیوں
علم و فن کے سب شہزادے
کانچ کے ٹکڑے
گھاؤ ہزاروں
جھوٹے گہنے
سچے موتی
ٹی وی، پکچر اور رسالے
یکساں دن اور یکساں راتیں

(۲)

کون ہے وہ جو میرا ہوگا
میرے من کا
سپنا ہوگا
میری خطائیں
میرے آنسو
میرے دکھ جو پیتا ہوگا
نرم دلی ہو جس کا شیوہ
جس کا تن من اُجلا ہوگا
میں ہوں جیسی
اُس سے کہوں گی
میرے سچ جو سنتا ہوگا
دوست نہ ہوگا صرف اک پل کا
زندگی بھر جو اپنا ہوگا

جمیل یوسف

وہ ایک لمحہ

گرچہ اب تجھ سے ملاقات کا امکان نہیں
پھر بھی میں سوچتا ہوں
کیا عجب تو جو سرِ راہ کبھی مل جائے
کیا خبر وقت ہمیں پھر وہی لمحہ دے دے
تیرے دیدار کا روشن لمحہ
وہی لمحہ جو ترے لمس کی خوشبو سے کبھی مہکا تھا
رنگ بن کر لبِ عارض میں ترے دہکا تھا
شام گلنار ہوئی جاتی تھی
میری آغوش شفق زار ہوئی جاتی تھی
اک ترا لمس حقیقت تھا
اور ہر شے کا وجود —
وہم و گماں تھا گویا
از اُفق تا بہ اُفق
کوئی دستک تھی نہ کوئی آواز
اک ترے لمس کا لمحہ تھا کہ جو زندہ تھا
یہ حسیں لمحہ نہیں مر سکتا
اک ترے لمس کا لمحہ ہے کہ جو زندہ ہے

گرچہ اب تجھ سے ملاقات کا امکان نہیں
پھر بھی میں سوچتا ہوں
کیا عجب تو جو سرِ راہ کبھی مل جائے

حسن رضوی

دو نظمیں

کلیئرنس سیل

مال روڈ پر
لفظوں کی دکان سجی ہے
نظم، غزل تو ختم ہیں — لیکن
نثری نظمیں ڈھیر پڑی ہیں
کالی پیلی اور عنابی
سُرخ بھی، سبز بھی اور گلابی
آدھی جاگی، آدھی "خوابی"
جتنی رعایت چاہو، اس پر مل سکتی ہے

اکلاپا

سونے پیڑ پہ
تنہا کوئل کوک رہی ہے
جیسے کوئی برہ کی ماری نئی سہاگن
اُجڑے گھر میں
اپنے آپ کو کوس رہی ہے

یوسف حسن

دو نظمیں

شعور

اک انقلاب حرفِ زباں ہو گیا تو کیا
اک آفتاب گردِ گماں ہو گیا تو کیا
اب بھی لہو کی لہر رواں ہے بدن بدن
اک انقلاب خاک کے اندر ہے موجزن
اک آفتاب آنکھ سے اوجھل سفر میں ہے
انسان کا شعور مسلسل سفر میں ہے

بوالعجبی

جس شخص نے مٹی پہ کبھی پاؤں نہ رکھا
انساں کی طرح ذائقۂ زیست نہ چکھا
جو شہر میں بھی گرد کے طوفاں کی طرح تھا
اے ارضِ وطن! اُس نے بھی یہ بات کہی ہے
"مٹی کو یہاں پاؤں پکڑنا نہیں آتا"

سجاد بابر

دو نظمیں

پسِ درد

مرہم لحہ لحہ مرہم
اور یہ کچا درد، طوائف!
اِس نے بند دریچے
(جن کو تہہ کر کے بھولے تھے)
آخر سلوٹ سلوٹ سارے کھولے
اب ہر جشمک،
بات،
یہ لذت خیز ہنسی
شب، راہگذر
(بے مہر تنا سا راہگذر)
اُدھ کھُلے دریچے پھاند کے
بسنتی خوشبوئیں
سوغات بنا کر چھوڑ گئی

عارضہ

رات گھری
چاند کتر کر
تارے بنائے
پھر اس کھیل پہ خود اترائے

عاصی کرنالی

کھری بات

مرا جسم تیرا تھا، تیرا ہے، تیرا رہے گا
مگر ذہن کی بات کچھ مختلف ہے

مرا ذہن تیرا بھی ہے، دوسروں کا بھی ہے
دوسری رنگتوں، خوشبوؤں، تتلیوں کا ٹھکانا بھی ہے

میں منافق نہیں
ورنہ یوں اعترافِ حقیقت نہ کرتا

مرا جسم اک آسماں ہے
جہاں تو ہی تو نیلی چادر کے مانند پھیلی ہوئی ہے

مرا ذہن بھی آسماں ہے
جہاں تو فقط ایک تارے کے مانند اک نرم گوشے

میں تابندہ ہے

تو بُرا مانتی ہے، مگر کیوں بُرا مانتی ہے؟

ترے جسم اور ذہن کا بھی یہی ماجرا ہے
ترا جسم میرا تھا، میرا ہے، میرا رہے گا
مگر ذہن کی بات کچھ مختلف ہے
ترا ذہن میرا بھی ہے، دوسروں کا بھی ہے
تُو منافق تو ہرگز نہ ہو گی
مگر تجھ میں میری طرح اعترافِ حقیقت کی جرأت

نہیں ہے

خالد شریف

خود رو گلابوں کی خوشبو

تتلیوں نے کہا

ہم کہ آہوئے رم خوردۂ زیست ہیں
تم نے دھاگوں کے سارے سرے اپنے ہاتھوں میں رکھے ہیں اور
غم کا بارِ گراں ہم نے بے جان چہروں پہ ایسے سجایا ہے
جیسے کہ بکھری چٹانوں پہ خود رو گلابوں کی خوشبو عبث پھیلتی ہے
نہ ہم شہر یارِ زماں ہیں کہ زنجیر کھینچے کوئی
اور ہم داد رس بن کے اونچے جھروکے سے اپنی انائے حکومت

کو تسکین دیں

نہ ہم آرزوؤں کے کوہِ گراں ہیں
کہ جن تک رسائی تمہارے خیالوں کا عنقا و ملجا و ماویٰ ہے
اور اندھی آنکھوں کے خوابوں کی تعبیر ہے
(ایسے خوابوں کی تعبیر کب سچ بنی ہے)
نہ اپنے بدن میں لہو کے سمندر رواں ہیں
کہ جن کی شفق رنگ لہریں، دھنک رنگ لہریں، تمہارے
خیالوں میں اُڑتے پرندوں کے پر کھولتی ہیں

کہ ہم پُتلیاں ہیں
جنھیں صبحِ تخلیق سے وقت کی خشک لکڑی نے بے جان

چہرے ودیعت کیے ہیں

کہ ہم تو تمہارے بدن کے بھرے شہر میں صرف ان

انگلیوں کے نشاں ہیں

کہ جن کے اشاروں پہ ہم ناچتی ہیں

سیّد حسن ناصر

ٹیکسلا ۔ واہ ۔ حسن ابدال

مہ و سال کی ریزہ ریزہ شبیہیں
اُداسی کے سنسان بنجر نظاروں میں رقصاں
مہ و سال کی دُوریاں
اور مہ و سال کی قربتیں
عمر کے آئینوں میں
کچھ اس طرح گڈ مڈ ہیں
جیسے فسانوں کے انجام
لفظوں کی ترتیب سے ماورا
حسیاتی نظر میں تلاطم سا پیدا کریں
وقت اور فاصلوں کی چٹانیں
سروں کو جھکائے ہوئے
عہدِ رفتہ کی ساری امانت چھپائے ہوئے
گیان میں ہیں
سبھی زلزلے دھیان میں ہیں

ذرا فاصلے پر
نئے آدمی کی بقا
چمنیوں کے دھوئیں کی طرح پھیلتی ہے سُکڑتی ہے
ہر روز قبروں سے کابوس اُٹھ کر
نئے دن کی حُرمت کا نغمہ سناتے ہیں
اور روشنی کی ٹنل میں
اُداسی کے سیّال میں تیرتے ہیں
پسینہ پسینہ ہوئے
اپنے ہاتھوں میں دن بھر کے اعمال تھامے
نئے ہُوٹروں کی صدا پر
نئے معرکے کے لیے شام کو
لڑکھڑاتے ہوئے اپنی قبروں کو رُخ موڑتے ہیں

ذرا فاصلے پر
زمیں کے خزانوں کی جوئے رواں موجزن ہے
مگر نارسا ہاتھ اب بھی وہی نارسا ہیں
فقط اپنے دل کی تسلی کی خاطر
پہاڑی پہ چڑھتے اُترتے ہوئے
اپنے جسموں کو نمکین کرتے ہوئے
لوگ ہیں
اور پہاڑی کے اُوپر بھی اک دیوتا ہے
پہاڑی کے نیچے بھی اک دیوتا ہے
ایک ہی شکل ہے
ایک ہی رنگ ہے
ایک ہی ڈھنگ ہے
مگر ان میں کوئی مسیحا نہیں ہے

استخواں چیختے ہیں
زباں ملتجی ہے
کوئی تینوں شہروں کے تعویذ کھولے
انھیں تازگی بخش دے
اور ہواؤں کی خوشبو سے مانوس کر دے

سیّد حسن ناصر

"جگنو" کے نام

بیٹے!
میں نے نام ترا
جگنو رکھا تو سوچا تھا
جگ مگ کرتا جگنو رات کی تنہائی میں
اپنے ہونے کا احساس دلاتا ہے
زندہ رہنے کی تحریک دلاتا ہے

لیکن نام میں کیا رکھا ہے
میں تو اپنے خوابوں کی تسکین کی خاطر
خود اپنی پہچان کی خاطر
تجھ کو جگنو کہتا ہوں

تماشے والا

چھُری گھونپ کر جب وہ اُٹھا
تو اُس نے زمیں پر گرے سارے سکّے اُٹھائے
گِنے اور کہا:

صاحبو!
یہ معمول ہے اور میں عامل ہوں اس کا
مگر اس بھرے شہر میں میری قیمت ہی کیا ہے
یہی چند سکّے (میری اولاد کے خوں سے رنگے)
جو میرے بھی عامل ہیں

چھُری کھینچ کر زرد پڑنے لگا
اور بولا
چلو بیٹا! اُٹھو، چلیں دوسرے چوک میں
آج کے واسطے ہم کو اک اور مجمع لگانا پڑے گا

افتخار عارف

دُعا

یہ جبرِ ماہ و سال میں گھری ہوئی زمیں مری گواہ ہے
نشاط کی ابد کنار منزلوں میں ایک عمر سے میں ان کریم اور جمیل
ساعتوں کا منتظر ہوں
جن کی بازگشت سے مرے وجود کی صدا قتوں کا انکشاف ہو
لہو کی وسعتوں کا انکشاف ہو
لہو کی عظمتوں کا انکشاف ہو
خدا کرے بشارتیں سنانے والے خوش کلام طائروں کی ٹولیاں
افق سے شاخِ گل تک علامتِ وصال کی لکیر کھینچ دیں
ہوا کی نرم نرم دستکوں سے ننھے منے موتیے کے پھول بن کے لجا کے
دھیمی دھیمی لے میں گنگنا اٹھیں
خدا کرے خیامِ گل میں رنگ و آہنگ خوشبوئیں
دعائے مستجاب کی طرح جواں لہو کی روشنی میں سجدہ ریز ہوں
تو ماہ و سال کے تمام تو خم خواب بن کے مسکرا اٹھیں
لہو کی وسعتوں کا انکشاف ہو
لہو کی عظمتوں کا انکشاف ہو
لہو کے راستے وجود کی صداقتوں کا انکشاف ہو

ایک سوال

میرے آبا و اجداد نے حرمتِ آدمی کے لئے
تا ابد روشنی کے لئے
کلمۂ حق کہا
مقتلوں، قید خانوں، صلیبوں میں بہتا لہو، ان کے ہونے کا
اعلان کرتا رہا
وہ لہو حرمتِ آدمی کی ضمانت بنا
تا ابد روشنی کی علامت بنا
اور میں پابرہنہ سرِ کوچۂ احتیاج
رزق کی مصلحت کا اسیر آدمی
سوچتا رہ گیا
جسم میں میرے ان کا لہو ہے، تو پھر یہ لہو بولتا کیوں نہیں ؟

خاقان خاور:

چار مختصر نظمیں

اِس سے کیا ہے

وہ تو اِک گلدان ہے جس میں
روز ہی تازہ پھول سجیں گے
اک گلدان کو اس سے کیا ہے
کونسا پھول ہے اِس کا ساتھی
کونسا اس سے بچھڑ گیا ہے

بے چہرہ لوگوں کا عکس

تیرے اندر جو شخص بیٹھا ہے
کیا وہ پہچان لے گا اب تجھ کو
آئینہ دیکھ کر بتا مجھ کو

اپنے ہونے کا خوف

میرے ہاتھ کی ساری لکیریں
اُس پتے سے ملتی ہیں
جو ٹہنی سے ٹوٹ گیا

مامتا

دو رویہ پیڑوں کا جھرمٹ
راہگزر پر
دھوپ نہیں ہے

اقبال کوثر

تین مختصر نظمیں

قطرہ

کبھو ایک سرکش انا ساز پانی کا قبہ
اُسی کی مقید ہوا توڑ ڈالے
تو بنتے ہوئے او قیانوس کو
کون "قطرے" کا مفہوم پہنائے گا؟

مَیں

کہیں بیکراں پانیوں کا گزر
کو ہساروں کے بازو سمیٹے ہوئے ہوں
تو ہم جانتے ہیں، ندی بہہ رہی ہے
یونہی زندگی اپنے ڈھانچے کو میرا بنا کر
مرے نام سے رہ رہی ہے

پھول

کوئی پھول جب اپنی خوشبو اُڑا بیٹھتا ہے
تو اک حادثہ ہے کہ صرف اس کی تجسیمی ہیئت ـ
اور اقلیدسی جسم کا نام بھی پھول ہے
عجب بھول ہے
کہاں سے اب آئے وہ بُقراط جو
محض خوشبو کو بھی کہہ سکے پھول ہے

عبدالستار سیّد

دشتِ ہجر میں یاد کے منظر

خواب خواب آنکھوں کو
دودھ رنگ جسموں کے
ذائقے نہیں بھولے

کس کو مَیں نے چاہا تھا
کون مجھ سے بچھڑا تھا
کون سے وہ موسم تھے
جب یہ خواب دیکھے تھے

یاد کے دریچے ہیں
دشتِ ہجر کے منظر
یوں اُبھر کے آتے ہیں

جس طرح ہواؤں میں
قافلے پرندوں کے
ڈوب ڈوب جاتے ہیں

جیسے لوگ ساحل کے
ڈوبتے مسافر کا
حوصلہ بڑھاتے ہیں

حسن عسکری کاظمی

یادوں کے نیم وا دریچے

مرے تصوّر کی سرزمین پر
تمہارے لہجے کی روشنی ہے
جسے میں اپنی نظر سے اوجھل نہ ہونے دوں گا
میں اپنے گیتوں کی نغمگی سے
اُداس لمحوں کے غمکدے میں
مچلتے سپنوں کے بانکپن سے
سسکتی یادوں کو آنچ دوں گا
نئی سحر کا اُبھرتا سورج
دہکتی اُلفت کا رازداں ہے
کہ جس کی روشن جبین پہ، میری
بلکتی آہوں کے گرم بوسے مچل رہے ہیں
مری تمنّا کا نرم لہجہ
تمہارے دل میں اُتر چکا ہے
تمہاری یادیں چمکتے جگنو کا روپ بھر کر
لرزتے ہونٹوں کی ٹہنیوں سے چمٹ گئی ہیں

ناہید قاسمی

پرانی رات — نئی مشعل

روشن روشن آبادی سے دُور، بہت ہی دُور
ایک انوکھا مٹیالا سا محل تھا جس میں جو کچھ تھا وہ سویا ہوا تھا
سب انسان، پرندے، جگنو، مینا، شاخیں، پتّے، پھول
اُس کے اندر باہر صرف طلسم ہی جاگ رہے تھے، جادو ٹونے
سحر ——— بلائیں
جنگل پودے، آڑی ترچھی بیلیں جن کے پار سے کچھ بھی نظر
نہیں آتا تھا
اُسی محل میں آج سویرے ایک حسیں شہزادی جاگی
اور یہ دیکھ کے چونکی
اُس کے پاس تو وہ شہزادہ تھا ہی نہیں جو اُس کو ڈھونڈنے نکلا تھا
اس کے پاس اگر کچھ تھا تو سناٹے کا گونگا دیو
کتنی دیر وہ ہر اک سوئی سوئی چیز کو حیراں حیراں، سوچتی سوچتی، ڈھونڈتی
ڈھونڈتی آنکھوں سے تکتی ہی رہی
اس کے ہاتھوں کی حدت سے کسی کی آنکھ نہ کُھل پائی
اس کے لب کی پکار کسی بھی صدا کو ساتھ نہیں لائی
(کیا وہ رو دے، مر جائے! یا اُٹھ کر اپنی خبر لائے)
آخر اپنے عزم کا اسمِ اعظم لے کر اپنے شہزادے کو ڈھونڈنے باہر نکلی
اپنے ریشمی ریشمی ہاتھوں سے وہ اُلجھی اُلجھی بیلوں کے پردوں کو چاک
کیے جاتی تھی اور بڑھتی جاتی تھی
اپنے نازک نازک زخمی زخمی نقشِ پا کے سنگِ میل اُگاتی
روشنیوں کی سمت بڑھی
اور آج تلک بڑھتی آتی ہے
آہستہ آہستہ
دھیمے دھیمے
بے آواز!

ہمسفر

کیسی راہ ٹگی ہو پگلی
وہ تم سے آگے جاتا ہے
کانٹوں سے دامن کو بچاتا
ہنستا گاتا
آگے ہی آگے جاتا ہے
اور اُسے معلوم نہیں ہے
اُس کے بخشے کانٹوں میں سے
اُس کے نقوشِ پا کو چُنتی
سانجھ سانجھ کے دل میں رکھتی
بھیگی بھیگی آنکھوں والی
تم اس کے پیچھے آتی ہو
اور اُسے معلوم نہیں ہے

اختر کاظمی

آؤ خود کو جانیں!

ہم سب کیا ہیں ؟ ہم سب کیوں ہیں ؟
یہ اک گنجلدار بجھارت حل کرنے کی کوشش میں ہم جُتنے ہوئے ہیں
جسم ہمارے کسی اُجڑتے گھر کا بکھرا ہوا اثاثہ لگتے ہیں
اور ہماری زندگیوں کی ڈوری، گھڑیوں کی ٹِک ٹِک کے ساتھ بندھی ہے
جب بھی کسی چمکیلے خواب کی دہلیزوں کو پار کیا ہے
بھیانک تعبیر، خونی جبڑوں کو کھولے
ہمیں چبانے کو بے تاب نظر آتی ہیں
اور اگر کچھ بولتے ہیں ہم
تو پدرم سلطان بود کے نعرے لگاتی
خلقت کی یلغار ہمیں اپنے گھیرے میں لے لیتی ہے
اور اپنے بوسیدہ آدرشوں، نوکیلے وہموں کے پنجوں سے
ہونٹ ہمارے سی دیتی ہے
خلقت جس کے بوجھل فقرے کانوں میں سیسے کی صورت پڑتے ہیں
یوں لگتا ہے جیسے ہم صدیوں پہلے پیدا ہونے کے جرم میں
اس آزاد فضا میں قید ہیں —— جس میں
اک اک سانس کی قیمت لینے والے
گھڑیوں کی ٹِک ٹِک کو ساکت کر کے —— ہمیں
صدیوں کی ڈوری سے کس کر باندھ رہے ہیں
آؤ پرانے آدرشوں، نوکیلے وہموں، بوجھل فقروں کی یلغار کی دیواروں کو توڑیں
اور نئے آدرشوں میں سے
کیا اور کیوں کی گنجلدار بجھارت کا حل ڈھونڈیں
ورنہ کون ہمیں بتلائے گا ہم کیا ہیں اور ہم کیوں ہیں
آؤ خود کو جاننے اور پہچاننے کے بے انت سفر پر نکلیں

فرزانہ رضوی

مختصر نظمیں

ملاقات

عجیب کیف کے عالم میں کائنات ہے گم
خموشیاں -!
شبِ مہتاب -!!
رُوبرو - ہم تم -!!!

شناور

جیون کے اس رنگ بدلتے ساگر میں
پل دو پل کو تیر کے انساں
جانے کون سی راہ گیا
گیا ساگر کے اُس پار گیا

دورانِ گفتگو

وہ بھی تھا اک مقام جہاں پر پہنچ کے ہم
تھوڑی سی دیر کے لیے خاموش ہو گئے
اور ساری کائنات تبسم میں بھیگ کر
دونوں کی چشمِ شوق میں آ کر پگھل گئی

بازگشت

لیٹے لیٹے آج کی شب
ڈوبتے دیکھا چاند کو جب
ایک عجب اعجاز ہوا
چپ چپ آ کر بیٹھ گئی
میرے دل پر رکھ کر ہات
ایک پرانی ہجر کی رات

صبحِ ہجر

صُبح بستر سے جو اُٹھی تو عجب عالم تھا
نیم وا آنکھوں سے بہتا رہا قطرہ قطرہ
رات کو دیکھا ہوا خواب ترا

ہمراز

میرے دُکھ، ہر شب کی کہانی
آج تو اپنی بات بتا
تُو نے کس کے سوگ میں اوڑھی
کالی چُنر - اے رات! بتا

شفیع ضامن

دُوسرا جنم

"صاب! یہ مرغی لیں گے؟
لے لیں، آپ کو میں سستی دے دوں گا
بیس روپے ہیں
بیس نہیں تو آپ مجھے اٹھارہ دے دیں
دس تو بہت ہی کم ہیں — چلئے، پندرہ دے دیں
اچھا، خیر نہ لیں، مرغی کی بات ہی چھوڑیں
مجھ سے اپنے گھر کا کوئی کام کرا لیں
اور اس کی مزدوری دے دیں
آپ کے بچے ساتھ ہی ہیں یا
گاؤں گئے ہیں؟
آپ کے کتنے بچے ہیں
چاروں ہی لڑکے! ماشاءاللہ!!
پڑھتے ہوں گے!
میں بھی پڑھتا تھا، لیکن پھر چھوڑ دیا تھا

صاب! مرے ماں باپ نہیں ہیں
میں چھ سات برس کا تھا جب فوت ہوئے تھے
آپ ہی سوچیں، اب میں کیسے پڑھ سکتا ہوں
رشتہ دار تو کافی ہیں پر کون کسی کا!
اپنے چچا کے گھر رہتا ہوں
میری عمر بھی دس بارہ سال ہی ہوگی
میں بس مزدوری کرتا ہوں

صاب! چلیں ناں
آپ کے بچے ساتھ نہیں، تو آپ کا کمرہ میلا ہوگا
میں اُس کو پل بھر میں دھو کر چمکا دوں گا

اپنے موزے اور بنیانیں ہی دُھلوا لیں
یا اپنے جوتوں پر پالش ہی کروا لیں
دیکھیں ناں! کتنے میلے ہیں!

چلیے آپ کے پاؤں دبا دوں
آپ کی پیٹھ کو سہلا دُوں
اور آپ کے سر میں ہلکی ہلکی مالش کر دوں

مَیں بھوکا ہوں صاب!
خدارا، مجھ کو کوئی کام بتائیں
میں ہر خدمت کر سکتا ہوں
آپ اگر چاہیں تو مجھ کو رات بھی گھر پر ہی ٹھہرا لیں
اور اُس کی مزدوری دے دیں!"

گرمی میں سرما کا موسم تھا
شام کے بوجھل بوجھل سائے
چیڑ کے اونگھتے پیڑوں کی پُرہول خموشی

ہر منظر سہما سہما سا
ہر سُو اِک گمبھیر اُداسی، اِک سنّاٹا
اور وہ پتھریلی پگڈنڈی
اور وہ بھولا سا پیارا بچّہ
جلتی بجھتی آنکھوں سے یوں میری جانب دیکھ رہا تھا
جیسے میری آنکھوں کو پہچان گیا ہو

اور وہ میں
جس کی سوچوں پر
وحشی جذبے
اپنے لمبے لمبے ناخن گاڑ چکے تھے
میرے گلے میں سوکھے کانٹے ٹوٹ رہے تھے
میرے اندر کے بھونچال سے ساری دھرتی گھوم رہی تھی
میری ٹانگیں ڈول رہی تھیں
میری نس نس میں اِک آگ بھڑک اُٹھی تھی
جس کے شعلے
میری آنکھوں کے چولھوں میں ناچ رہے تھے
اور دسمبر کی سردی میں
میرا سارا جسم عرق میں بھیگ چکا تھا

کرب کی شدّت سے بوَلا کر
میچ لیا آنکھوں کو میں نے
لیکن اب محسوس ہوا کچھ ایسے مجھ کو
جیسے میری بنجر روح میں سینکڑوں آنکھیں اُگ آئی ہوں!
اب میں امکانات کے دہشت خیز مناظر دیکھ رہا تھا!!

مجھ کو مرے ہوئے اِک عرصہ بیت چلا ہے
میرے بعد مری بیوی بھی دُنیا سے منہ موڑ گئی ہے
اور ہمارے چاروں بچّے
اپنے سینوں سے اِک اِک مُرغی چمٹائے
تنہا تنہا
شہروں، قصبوں، چھاؤنیوں کی
عام گزرگاہوں سے ہٹ کر
گھوم رہے ہیں
اور انھیں جب مجھ سا کوئی "صاب" نظر آجاتا ہے
تو اُس کی راہ میں حائل ہو کر
پوچھ رہے ہیں
"صاب! یہ مرغی لیں گے؟"

شرجیل انظر

تماشہ کہانی سے آگے

وہ کسی بھی سہارے کی طاقت بنا ہی ہوا میں کھڑا تھا
تو سب چیخنے لگے
فریب نظر ہے ـــــ غلط ہے
یہ میرا (جو بیچ زمیں پر کھڑا ہوں) اور اس کا (جو وحشی ہوا میں
کھڑا ہے) نیا سلسلہ ہے

ایک بڑھیا نے کھڑکی سے پردے ہٹائے
تو خالی مکانوں سے نادیدہ قدموں کی آواز اُبھری
جواب تک ہوا میں کھڑا تھا، زمیں پر اُترنے لگا
موت آنکھوں سے بہنے لگی
جیسے جادو اُلٹنے لگا ہو
"تو ان کے پیچھے چلیں جو کہ پہلے سے بھٹکے ہوئے ہیں
کہ خوشبو، نئی روشنی، زندگی اور گل (خواہ کاغذ رنگے ہوں)
نہیں مل سکیں گے"
"فراری! سنو! کس طرف کو چلے ہو، گلی بھی تو نادیدہ قدموں کی
قیدی ہے"

بڑھیا نے کھڑکی سے پردے ہٹائے
تو ساری بلائیں ترے گھر کو گھیرے میں لینے کو جھپٹیں
جو اب تک اکیلا ہی وحشی ہواؤں سے لڑتا تھا کیسے ہواؤں کا
قیدی ہُوا

آسماں سے ہراساں صداؤں کی بارش ہے
صندوق ناخن کے ٹکڑوں سے پھولوں کی کترن سے تک بھرا ہے

چمکتی ہوئی خوابگاہوں میں لٹکے ہوئے عکس سارے لہو سے بھرے ہیں
جواں بستروں کی تہوں میں گلابوں کی سُلگن کسے دیکھتی ہے

وہ لڑکی مرے گھر کی چھت سے ترے گیت گاتے اُڑی ہے
کہ شاید تری آنکھ جاگے
تری آنکھ جاگے تو دُنیا کی محکوم نسلوں کا سویا ہوا خون جاگے

آخری آدمی

آشنائی کی اُونچی منازل پہ جلتے ہوئے قمقموں کی ہری روشنی
توڑ لانے کی خواہش
کہ زینہ بہ زینہ پُراسرار سوچوں کی اُلجھن
سنہری لبوں سے چھلکتے ہوئے لفظ روشن
حنا انگلیوں میں کنول اور سیہ آنکھ اپنے لیے خواب بُننے سے قاصر

رگوں میں سُلگتے ہوئے خون کی آنچ مدھم سے مدھم
اندھیرے کے بے چاپ قدموں کی لرزش
ہوا کے دریچوں پہ نادیدہ ہاتھوں کی دستک
سیہ آنکھ میں خوف کے تیر پیوست
پھیلے ہوئے زرد ہاتھوں کے کشکول ـــ لیکن
کسی آشنا لفظ کی بھیک ممکن نہیں ہے

حنا انگلیاں اب سنہری لبوں پر جمی ہیں
کہ تو آشنائی کی اُونچی منازل پہ جلتے ہوئے قمقموں کی ہری روشنی
اور میں موت کی سیڑھیوں سے پھسلتا ہوا آخری آدمی

حامد برگی

تنقید کا فن

بھاری بھرکم فلسفہ دانوں کے نام
اور کچھ 'ازموں' کی تحریکوں کی باتیں
ماورائی فلسفہ کی اصطلاحیں
کچھ رموزِ نفسیات
گونجتے لفظوں کے ڈھیر
اپنے دامن میں لیے
آؤ اب فن کار کے شہکار کو رکھ کر ذرا
اپنی اپنی عظمتوں کے گیت گائیں!

منہاج سعید

آہٹ

کوئی آیا ہے؟ ۔ مگر
نہ وہ آنکھوں کی چمک ہے
نہ وہ سانسوں کی مہک ہے
نہ وہ چہرے کی دمک
کعبۂ دل کے دریچے تو مقفل ہوئے مدت گزری
پھر یہ آہٹ ہے کسی کی کیسی!
یہ تو پھاگن کی ہوا ہے
یہ تو کلیوں کے چٹکنے کی صدا ہے
صحن میں ہنستی مچلتی یہ جو پُروائی ہے
اِک نئے موسمِ گُل بار کی انگڑائی ہے
جب بھی گُل مہکے
ہوا جب لہکے
گدگداتی ہوئی پھولوں کو، صبا جب گزرے
دلِ نادان یہ سمجھے
کہ کوئی آیا ہے؟

غلام حسین ساجد

میں جو خوشبو اور آواز سے آگے چلتا ہوں

سب کہتے ہیں، وہ خوشبو ہے
اور ہواؤں کے شانوں پر، اپنی شبنم میں بھیگی مہکار لئے
دیس بدیس کی سخت مسافت طے کرتا ہے
اپنے گھر سے ہم سب کے دروازوں تک کی اس دوری پر
(جو اک لمحہ کے دامن میں آ سکتی ہے)
کتنے زور سے ہنستا ہے
اور پھر اپنے سانس کے ٹھنڈے لمس سے ہلکی دستک دے کر کہتا ہے
میں آیا ہوں، خوشبو کا ہر روپ لئے
میں ہوں جو تم سب کی چڑھتی اور اترتی سانسوں میں
آہستہ آہستہ ایسے گھل جاؤں گا
جیسے بارش کے پانی میں، کچی مٹی کی ان دیکھی باس کی لہریں
لمحہ لمحہ کروٹ لیتی رہتی ہیں
یا پھر جیسے آتش دان میں جلتی آگ کے شعلوں میں
سب انجانے اور پہچانے رنگوں کے
حیرت سے کھلاتے چہرے اپنے عکس بدلتے ہیں
لیکن ایک ہی رہتے ہیں

سب کہتے ہیں، وہ آواز کا لہرا ہے
وہ ہر روپ کی صورت ہے
اور وہی حرفوں کے خالی کاسوں میں
قطرہ قطرہ اپنے لہجے کا ان چکھا رس ٹپکاتا رہتا ہے
پھر ان سب کو گویائی کے روپ میں ڈھلنے کے رستے پر
آگے بڑھنے دیتا ہے
اور کہتا ہے۔ تم سب ہو جو آئینے میں اپنا عکس بناتے ہو
تم سب ہو جو اپنے بوجھل لہجوں کے
اک انجانے بوجھ کی ہلکی مستی میں
لاکھوں باتیں کرتے ہو اور ہنستے ہو
لیکن کیا وہ سارے لہجے، سارے عکس تمہارے ہیں!
تم سوچو تو وہ شرمیلے عکس مری ہی خواہش کے پردردہ ہیں
تم دیکھو تو وہ گونجیلے لفظ میرے ہی لہجے کی پرچھائیں ہیں

سب کہتے ہیں، وہ تصویر کا پردہ ہے
جو نظاروں اور چہروں کے مبہم دھندلے خاکوں کو
ایک نئی پہچان کی دولت دیتا ہے
اور وہی ہے جس کے دم سے ہم سب اپنے ہونے کے مضبوط نشے میں
لہرا لہرا کر چلتے ہیں
اور ہر ساعت، اپنے اندر سے باہر کی سمت امڈتے رہتے ہیں
جیسے گرمی کے موسم میں سارے دریاؤں کا لمحہ لمحہ چڑھتا پانی
اپنی قوت کی موجود گواہی دینے کی انجانی خواہش میں
اچھل اچھل کر آگے بڑھنے کی کوشش میں اپنا پاٹ بڑھاتا ہے
یا پھر جیسے شام ڈھلے تو دن بھر کی بیکار مسافت سے گھبراتے سورج
رات کے بڑھتے سایوں کے جونیلے جمگٹ

اپنا زور جانے کی چاہت میں لرزاں
اپنی گہری تاریکی کے کالے ہاتھ بڑھاتے ہیں
اور سمٹتے جاتے ہیں

سب اس خوشبو کے شیدائی بنتے ہیں
اور اک اس کو خوش کرنے کی خاطر کہتے رہتے ہیں
یہ وہ باس ہے جس کے دم سے ہم ان زہر بھرے شہروں کی
بے چہرہ آبادی اور ہواؤں کے اس جمگھٹ میں بھی زندہ
چلتے پھرتے ہیں

ہم ہیں وہ جو اس کے لہجے کے درپن میں
اس کی خواہش کی سنگت سے اپنے عکس بناتے ہیں
اور اس کی پہچان سے اپنی ذات کا کاسہ بھرتے ہیں
وہ جس کی ہر شکل اُسی کے دم سے ہے
وہ جس کے سب روپ اُسی کے دم سے ہیں
ہم کو خبر ہے، وہ تصویر کا پردہ ہے
اور وہ ہم ہیں جو اس پردے کے سینے پر اک مبہم تصویر
کی صورت رہتے ہیں
اور اپنے مٹ جانے کے انجانے خوف میں گم سم
آہستہ آہستہ چلتے رہتے ہیں

سب جانے انجانے ہیں
اس کی ذات کے چنگل میں محبوس پڑے
ایک عجب حیرت کی چھوٹی دہشت میں
ایسی ہی بے معنی باتیں کرتے ہیں
اور ہر آن اسی کے نام کی لمبی مالا جپتے ہیں
وہ اپنے گھبرائے لبوں اور تھکے جسموں کے بوجھل پردے کی
اونچی اوٹ میں چھپ کر بیٹھے، اس کے پیکر کی ہیبت کو ہر
لمحہ تقویت دیتے رہتے ہیں

وہ سب اس کی خواہش کی دہلیز سے لپٹے
اک انجانے خوف سے لرزاں رہتے ہیں
لیکن میں ہوں، جو ان ساری باتوں سے انکاری ہوں
میں ہوں، وہ، جو اس کی خواہش کی دہلیز سے باہر ہے

میں کہتا ہوں، خوشبو کیا ہے
اک ان دیکھی باس کی دھیمی لہریں، جو
اپنے قدموں پر چلنے سے قاصر ہیں
اور ہواؤں کی مرہونِ منت ہیں
اور آواز کا لہرا کیا ہے
لہجے کی ان جانی پیٹھیں
جو ہونٹوں سے باہر آنے کی خواہش میں جلتی ہیں
لیکن خود آواز کی صورت میں ڈھلنے سے عاری ہیں
اور تصویر کا پردہ کیا ہے
سطحِ آب کی لمبی چادر
جس پر آنے جانے والوں اور پیڑوں کے
عکس ابھرتے رہتے ہیں
لیکن ڈوب نہیں سکتے

میں ہوں جو پہچان کے لمبے رستوں پر
خوشبو اور آواز سے آگے چلتا ہوں
اور نئی سوچوں کے اُجلے رنگوں سے
گزرے دنوں کے سارے عکس بدلتا ہوں

جمیل الرحمٰن

شراکت

ایک برس پہلے جب میں نے
جاتی رُت کے حساب میں، آتی رُت کے عذاب نہیں لکھے تھے
ہرے بھرے پیڑوں کے تلے
خوفِ طلسمِ راہگذر کے اسیر مسافر
جُھلساتی دوپہروں میں سستاتے تھے
سُکھ سپنوں سے بوجھل پتّے ان پر سایہ کرتے تھے
سب کے دامن اپنے نرم و خنک ہاتھوں سے بھرتے تھے

ایک برس پہلے جب یہیں کہیں میں رویا تھا
یہیں کہیں پیڑوں کے تلے
وہ جس کے نقش کتابی تھے
مجھ سے بچھڑا تھا
تب میری سماعت گنگ صداؤں میں گم تھی
اور اس کے گلابی ہونٹوں پر وہ نغمے تھے
جو ازل سے وقت کی بوڑھی پیشانی پر
گردِ تمنّا کی صورت جمتے آئے ہیں
اُس دم میری آنکھیں خالی تھیں

لیکن اب
جب حسنِ سماعت گونجتی آوازوں کے غبار میں چمک رہا ہے
سارے منظر
خوفِ طلسمِ راہگذر سے
خوفِ طلسمِ شب سے گریزاں
میری آنکھوں میں رقصاں ہیں
اُن چھتنار درختوں کے سائے میں
شام ڈھلے اک میلہ سا لگ جاتا ہے
کوئی اپنے لرزتے ہاتھ کو ڈھلتے سورج کی جانب لہراتا ہے
دُور دراز سے آنے والے تھکن سے چُور مسافر
بُجھتے دن کی راکھ سے اپنے خالی دامن بھرتے ہیں
ایک برس پہلے رونے والے کی باتیں کرتے ہیں

نادیدہ سکھ اپنی امانت سب کو سونپ رہے ہیں

صبحِ ابد کی سمت رواں کہربلے رستوں سے ہٹ کر
رُوحِ نشاط کی بے آواز صداؤں کا جنگل ہے
جس کے وجود میں شامل ہرے درختوں کے چہروں پر
دھوپ۔ تھکن اور بارش کا ہر نقش ہمارے زندہ لمحوں کی
گلرنگ صداقت کا شاہد ہے
شام ڈھلے جب اس کے گھنے پیڑوں کے تلے
میں لوحِ اُفق پر لکھے نوشتے پڑھ کر ڈوبتے سورج پر
روتا ہوں
تو ہر پیڑ رسان سے اپنے پتّے ہلا کر کہتا ہے
شاید تم آئینِ عشق سے ناواقف ہو
پیارے !
ناگفتہ لفظوں کی خوشبو سے جب سینے بھر جائیں تو ہوا کی
زد پر آجاتے ہیں
گردِ ملال میں لپٹے خوابوں کی پہچان اگر بجھ جائے تو
چشمِ ہجر میں سمٹے منظر ساری عمر رُلاتے ہیں
پگلے تم کیوں روتے ہو
جب کوئی لمحہ بس میں نہیں تو ہنس کر دکھ سہنا بھی ایک
عبادت ہے
اصل میں شامِ جدائی کسی نادیدہ سُکھ کی امانت ہے !

جمیل الرحمٰن

موجِ نظّارہ سے لرزاں آئینے

ہم (کہ ہمارے چہرے بدلتے رہتے ہیں)
بے شک خود کو گنوا کر اتنا جان گئے ہیں
خواب، ہوا اور خوشبو کی تثلیث ہمارے باطن کے
بے انت عمل کی مظہر ہے
اور ہمارے جذبے عکسِ تمنّا کی صورت صدیوں سے
وصل و ہجر کے گڈمڈ رنگوں کی سیماب صفت دیوار پہ
لرزاں ہیں

لیکن تم نے دیکھ لیا نا!
آدمی اپنے آپ کو کھو کر کتنی جلدی بوڑھا ہو جاتا ہے
اس کی اٹکتی سانسوں کی دہلیز پہ شام کے سائے پھیلیں
تو یہ سوچتا ہے
برف کی طرح پگھلتے لمحوں کی زنجیر سے اب کیا حاصل
خاک اُڑاتی گلیوں کی زنجیر تھی جس کے پاؤں میں
وہ سورج تو خالی شہر کے دروازوں پر دستک دے کر
لوٹ چلا ہے

دو مختصر نظمیں

مصوّرہ

سجی ہوئی ہیں تصویریں
اور ہر تصویر پہ اک لڑکی کا نام لکھا ہے
جانے وہ کیسی لڑکی ہے
جس کی حنائی پوروں میں بھی
ایسے وحشی رنگ چھپے ہیں
جن کا پرتو
بیتے دنوں پر چھپ کر بہنے والے
اشکوں جیسا ہے

بلاوے

شامِ کہنہ سے لے کر صبحِ عبادت تک
میرے شہر کی دیواروں سے
خوشبو کی لپٹیں اُٹھتی ہیں
سارے رستے اک انجانے لمس کی نرمی سے بھر جاتے ہیں
یادوں کی دہلیز پہ رنگ بکھر جاتے ہیں
بوجھل سانسیں خنک فضا میں انمٹ نقش بناتی ہیں
خالی گھر کی سُونی چھت سے تیری صدائیں آتی ہیں

مجھے چہرہ دکھا میرا

مسعود اشعر

اس نے کہا — تمہارے گھر میں تمہاری بیٹی بھی تو ہے، اور جوان بیٹی ہے۔

اور دور، برگد کے گھنے پیڑ کی موٹی موٹی شاخوں پر الٹی لٹکنے والی کالی کالی چمگادڑیں کانوں اور آنکھوں کے راستے میرے سینے میں اتر گئیں، اور وہ سارا خون جو میں نے جانے کہاں کہاں سے اس کے لئے اکٹھا کیا تھا میری آنکھوں میں اتر آیا۔

پھر میں وہاں سے بھاگا — جدھر منہ اٹھا ادھر بھاگتا ہی چلا گیا کہ اب میرے لئے یہی ایک راستہ تھا جس کی کوئی سمت نہیں تھی۔

میں کہاں کا رہنے والا ہوں؟ مجھے نہیں معلوم — اس وقت کہاں بیٹھا ہوں؟ نہیں جانتا — ریل گاڑی میں سفر کر رہا تھا، ٹی ٹی آیا دھکے دے کر نیچے اتار دیا۔ کوئی اور گاڑی آئے گی اس میں سوار ہو جاؤں گا — آگے چلا جاؤں گا یا پیچھے ہی روانہ ہو جاؤں گا — آگے جانے یا پیچھے ہٹنے سے مجھے کوئی غرض نہیں ہے — مقصد چلتے رہنا ہے، بھاگتے رہنا ہے — ریل میں زیادہ تیزی کے ساتھ دوڑا جاتا ہے اس لئے میں ریل کا سہارا لے رہا ہوں۔

میں بھاگ رہا ہوں، — دوڑ رہا ہوں — جہاں تک دوڑ سکتا ہوں دوڑتا چلا جاؤں گا کہ ابھی میرے پیروں میں جان باقی ہے۔

اپنی عزت بچانے کا میرے پاس ایک ہی طریقہ تھا — کہ اس کی توجہ دوسری طرف کر دی جائے — اور میں نے وہی کام شروع کر دیا — میں اپنی عزت بچانا چاہتا تھا — اپنی بیوی کی عزت بچانا چاہتا تھا — اسے ان خاردار ہاتھوں سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا، جو ہر وقت میری گردن پر جمے رہتے تھے جو سالہا سال میرے باپ کی گردن پر جمے رہے۔ میرے دادا کی گردن پر جمے رہے اور جو شادی کے بعد سے مجھے ہر وقت خوف زدہ رکھتے تھے۔

بوڑھے برگد کی اونچی اونچی شاخوں پر سینکڑوں سال پرانی چمگادڑیں الٹی لٹکا کرتی تھیں اور ملک کا کنواں گاؤں بھر کی پیاس بجھاتا تھا کہ سارا گاؤں اور اس جیسے اور کئی گاؤں ملک کا کنواں ہی تھے۔ میرا گھر گاؤں کے ایک کونے پر تھا جہاں سے شہر کو رستہ جاتا تھا — اور شہر سے آنے والے سارے راستے بھی میرے گھر کے قریب سے ہی گزرتے تھے — دن بھر کی اندھی چمگادڑیں شام پڑتے ہی جب آنکھیں کھولتیں تو صدیوں پرانے درخت کی شاخوں میں جان پڑ جاتی۔ اس کے چوڑے چوڑے گہرے سبز پتے کتھئی رنگ کی کھال اوڑھ لیتے اور چوں چوں سے سارا گاؤں بھر جاتا — اس وقت میری بھی آنکھ کھلتی اور میں بھی ملک کے لئے تازہ خون کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا۔

میں اپنے دادا کے متعلق کچھ نہیں جانتا، اپنے باپ کے متعلق بھی بس اتنا جانتا ہوں کہ وہ اس ڈیرے کے بہت سے کمیوں میں سے ایک کمی تھا — باپ کی طرح میری ماں بھی اسی گھر میں کام کرتی تھی، ہم سب نہ جانے کب سے اسی ڈیرے میں پلتے چلے آ رہے تھے — مگر نہ جانے میرے باپ کو کیا ہوا کہ اس نے مجھے بڑے گاؤں کے اسکول میں داخل کر دیا، اور مجھے بھی خدا جانے کیا ہوا کہ میں میٹرک تک پڑھ گیا، شاید یہی بات میرے لئے ساری مصیبتوں کا سبب بنی۔ مگر اس کے ساتھ میری عزت بھی ہو گئی، مجھے بتایا گیا کہ تم عزت دار ہو گئے ہو — میرا باپ اوپر کے چھوٹے موٹے کام کرتا تھا۔ میں ملک کی جاگیروں کا حساب کتاب رکھنے لگا۔ میں ایکدم کمی سے منشی بن گیا — میرا باپ بہت خوش تھا۔ میری ماں بہت خوش تھی — مجھ سے نہیں ملک سے کہ اس کی مہربانیوں سے میں نے عزت دیکھی، میرے باپ نے عزت دیکھی۔ میرے خاندان نے پہلی بار عزت دیکھی۔

شہر سے پیر سائیں آئے۔ انھوں نے جہاں ملک اور اس کے مزارعوں کو فصل میں برکت کے لئے نقش لکھ کر دیئے۔ وہاں ملک کی سخاوت اور خدا ترسی کی تعریف بھی کی کہ اس نے مجھ جیسے کمی کو اپنا منشی بنا لیا۔ انھوں نے میرے باپ کو یاد دلایا کہ تم اور تیرا بیٹا ملک صاحب کی عنایتوں کے طفیل ہی زندہ ہیں۔ تم دونوں کو

ان کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ تھانیدار صاحب آئے، انھوں نے یہی کہا۔ سکول کے ہیڈ ماسٹر آئے، انھوں نے بھی یہی یاد دلایا۔ سب لوگ ملک کی مہربانیاں یاد دلانے آئے تھے اور میری گردن نیچی اور نیچی ہوتی جاتی تھی۔ مجھے پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ عزتیں گردن نیچی بھی کر دیتی ہیں۔

"اوئے کھڑا کیا دیکھ رہا ہے، مخدوم صیب کے گھٹنے پکڑ......" میرے باپ نے مجھے میری حیثیت اور بھی اچھی طرح یاد دلا دی۔

یہ ریل گاڑیاں بھی خوب ہوتی ہیں۔ ہر وقت چلتی رہتی ہیں۔ کبھی اس طرف کبھی اس طرف۔ چوبیس گھنٹے میں شاید ایک منٹ بھی ایسا نہیں جاتا جب کوئی نہ کوئی گاڑی چل نہ رہی ہو۔ میں گاؤں سے میلوں پیدل بھاگ کر اسٹیشن پہنچا تو گاڑی بالکل تیار کھڑی تھی۔ پھر میں جس اسٹیشن پر بھی گیا وہاں مجھے گاڑی تیار ہی کھڑی ملی۔ میں نے یہ سمجھا کہ سب لوگ میرے ساتھ اس سازش میں برابر کے شریک ہیں۔ وہ سب چاہتے ہیں کہ میں بھاگتا رہوں۔ ریل گاڑی والے بھی ان کے ساتھ ہیں۔ میرے بھاگنے میں سب مدد کر رہے ہیں۔ مگر...... ملک کو تو میں نے قتل کر دیا تھا! ہاں مجھے خوب یاد ہے میں نے مار ڈالا تھا۔ جان سے مار ڈالا تھا!!

جب میں وہاں سے بھاگا تو میں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا کہ وہ شخص جو دوسروں کے خون پر جیتا تھا کہیں اپنا خون دیکھ کر بوکھلا نہ جائے۔ کہیں وہ دوبارہ اٹھ کھڑا نہ ہو۔ میں اس بیر کے قریب سے بھی نہیں گزرا تھا جس پر اس وقت ایک بھی چمگادڑ نہیں تھی۔ ساری چمگادڑیں کہیں دور شکار کے لئے جا چکی تھیں۔ میں اکیلا تھا اور خوش تھا کہ ساری دنیا میری مدد کر رہی ہے — مگر جب میں ملک کے چار مربع والے باغ کو پار کیا اور میلوں میں پھیلے اس کے کھیتوں کے قریب پہنچا تو کھلیانوں میں پڑی گندم کی ڈھیریوں پر لہراتے پیر سائیں کے نقش میرا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے۔ ان ننھے ننھے پرچموں کو دیکھ کر شک ہوا کیا سچ مچ ملک مر چکا ہے — کیا واقعی میں نے اسے مار ڈالا ہے؟ پھر میرے دل میں آیا کہ اپنا شک مٹانے کے لئے ان پرچموں کو بھی اکھاڑ کر پھینک دوں۔ پیر سائیں کو بھی قتل کر ڈالوں — مگر میرے دل کے اندر ایک چور بھی بیٹھا تھا۔ ہزاروں برس پرانا چور — اس نے کہا — اگر فصل واقعی تباہ ہو گئی تو گاؤں والوں کا کیا ہوگا؟ اس گاؤں میں تیری بیوی رہتی ہے۔ تیری بیٹی رہتی ہے۔ اور ملک کہتا ہے وہ خوبصورت ہے۔ اور تیرے گھر میں رہتی ہے۔ ملک یاد دلاتا ہے کہ وہ تیرے گھر میں رہتی ہے — مگر اب کیا وہ میرے گھر میں رہتی ہے؟!

میں پہلی بار ملک کے لئے جب شہر گیا تو سکول کے ایک دوست نے مجھ سے پوچھا کہ میں ایسا گھٹیا کام کیوں کرتا ہوں۔

"اپنی عزت بچانے کے لئے۔"

اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی — اس نے پھر پوچھا — میں نے پھر وہی جواب دیا۔

وہ خاموش ہو گیا۔ نہ جانے اس نے کیا سمجھا۔ اس کی خاموشی مجھے پریشان کر رہی تھی۔ وہ خاموشی سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ جیسے میں نے کوئی بہت ہی انوکھی بات کہہ دی ہو۔ ایسی بات جس کا یقین ہی نہیں کیا جا سکتا۔

"میری بیوی بھی ہے......" میں نے کہنا چاہا، مگر پھر سوچا کہ اب اسے سوال کرنا چاہیے۔ وہ سوال کرے گا تو میں بتاؤں گا — لیکن اس نے پھر کوئی سوال ہی نہیں کیا۔ مجھے تکتا رہا اور میں سارے جواب اپنے سینے میں ہی دبا کر رہ گیا۔

اور جب گھر پہنچا تو کسی سوال کے بغیر ہی بول پڑا۔

"دیکھ بھاگوں.... تو بہت خوبصورت ہے...... بہت ہی خوبصورت......"

وہ زور سے ہنسی اور سر جھکا لیا۔ کیوں؟ میں نے اس سے نہیں پوچھا۔ نئی دلہن سے اور بات بھی کیا کی جا سکتی ہے؟

انسان کو ڈرانے کے لئے کیا کیا چیزیں ہیں۔ چمگادڑیں بدصورت ہوتی ہیں اور یہ لڑکیاں خوبصورت — اور دونوں ہی ڈراتی ہیں۔ دونوں ہی خوف زدہ کرتی ہیں۔ میں نے جب پہلی بار اسے دیکھا تھا تو میں ڈر گیا تھا۔ اپنی زندگی میں مجھے اتنا ڈر کبھی نہیں لگا جتنا اس وقت لگا تھا۔ میں نے اسے دیکھا اور سر سے پیر تک کانپ اٹھا — یہ نہیں کہ میں نے اسے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ میں نے اسے پہلے بھی دیکھا تھا۔ کئی بار دیکھا تھا۔ بلکہ میں جب بھی اس کے گاؤں جاتا اسے دیکھتا — مگر اس وقت اسے اپنے گھر میں دیکھ کر میں لرز گیا۔ وہ اتنی خوبصورت تھی؟ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ میں ڈر گیا۔ سچ مچ ڈر گیا۔

پھر ساری دنیا کے خوف اور وسوسے ہر وقت مجھے ستانے لگے۔ میں ہر آنے جانے والے سے ڈرتا تھا۔ ہر آہٹ سے ڈرتا تھا۔ میں سوتے میں ڈرنے لگا تھا۔ مگر... میں سوتا ہی کب تھا! ہر وقت تو اسی فکر میں رہتا تھا — ایک بار میرے دل میں آئی کہ اسے لے کر یہاں سے بھاگ جاؤں۔ کسی دوسرے شہر چلا جاؤں کہ

وہاں میرا کوئی جاننے والا نہیں ہوگا۔ گاؤں میں تو سارے ہی جاننے والے ہیں۔

میری ماں کو بھی شاید اسی قسم کا خوف تھا، جبھی تو اس نے ایک دن مجھے اپنے پاس بلا کر بٹھایا، میرے سر پہ ہاتھ پھیرا اور ڈرتے ڈرتے کہا (وہ نہ جانے کس سے ڈر رہی تھی)

"بچوا ... اب تیری ذمہ داری زیادہ ہو گئی ہے۔ تیرا باپ زندہ ہوتا تو گھر میں دو بندے ہوتے۔ اب تو اکیلا ہے اور ... گھر میں دو عورتیں ہیں!"

کسی آدمی کی پہچان کیا ہے؟ یہی نا کہ لوگ اسے اپنی پسند کے کپڑے پہنا دیتے ہیں اور کہتے ہیں تم بہت اچھے لگ رہے ہو اور وہ کپڑے پہن لیتا ہے۔ وہ یقین کر لیتا ہے کہ وہ اچھا لگ رہا ہے اور اسے یہی کپڑے پہننا چاہئیں۔ کپڑے پہنانے والے اس میں اپنی سہولت سمجھتے ہیں اور کپڑے پہننے والا اپنی سہولت ——— اطمینان اور سکون کے لئے ضروری ہے کہ اسی طرح دونوں خوش رہیں۔

وہ سامنے جو آدمی جا رہا ہے۔ یہی آدمی میرے گاؤں میں رہتا ہے اور میری بیوی کے گاؤں میں بھی رہتا ہے۔ اسے میں نے شہر میں بھی دیکھا ہے، ہر شہر میں دیکھا ہے۔ ملک کے ساتھ یا ملک کے لئے جب بھی میں کسی شہر گیا اسے وہاں پایا ــ وہ بھی مجھے ضرور جانتا ہوگا ــ میں تو اسے دیکھ کر ڈر گیا تھا کہ اس نے مجھے پہچان ہی نہ لیا ہو۔ مگر وہ میری طرف اس طرح دیکھتا ہوا گزر گیا جیسے اسے وہاں بیٹھا کوئی نظر ہی نہ آیا ہو۔ اس نے کچھ دیکھا ہی نہ ہو۔ میں نے خوش ہو کر اپنے کپڑوں کو دیکھا کہ شاید وہ بدل گئے ہوں مگر افسوس ہوا کہ کپڑے تو اب بھی وہی تھے جو ملک نے مجھے دیئے تھے۔ پھر کیا بات ہے؟! ــ اس آدمی نے مجھے پریشان کر دیا۔

ایک دم میری آنکھ کھلی اور میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا ــ آس پاس دیکھا، میری بیوی روٹی پکا رہی تھی اور ماں نماز پڑھ رہی تھی ــ میری گھبراہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ میں کسی سے مشورہ بھی نہیں کر سکتا تھا، اپنا خوف کیسے دور کروں! ــ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا اور میں سیدھا ملک کے ڈیرے پہنچا اور اس کے گھٹنے پکڑ لئے کہ اپنی عزت بچانے کی ترکیب میری سمجھ میں آ گئی تھی۔

اب ملک کے لئے گاؤں گاؤں، شہر شہر جانا اور گھر گھر پھرنا میرا کام تھا کہ اپنے باپ دادا کی طرح ملک کو بھی نئے نئے دانے چکھنے کا شوق تھا۔

وہ شاید کوئی فلم تھی جو ملک شہر سے دیکھ کر آیا تھا۔ وہ سب کو اس کی کہانی سناتا۔ بڑے مزے لے لے کر سناتا اور کہتا بزرگوں کی باتوں میں بڑی حکمت ہوتی ہے پرانے لوگ، جو کہانیاں سناتے ہیں ان میں بڑا سبق ہوتا ہے۔ بڑی کام کی باتیں ہوتی ہیں۔

"افریقہ کے کسی قبیلہ کا ایک سردار تھا کئی سو سال پرانا ......"

"کئی سو سال ......؟"

"ہاں کئی سو برس اس کی عمر تھی، مگر وہ جوان تھا۔ قد کاٹھ کا پورا ــ اس کی جوانی کا راز تھا کنواری لڑکیوں کا تازہ خون ــ"

"......"

"ہر سال وہاں ایک میلہ لگتا اور پہلے سے منتخب کی ہوئی ایک کنواری لڑکی کا تازہ تازہ خون اسے پلایا جاتا۔ اور وہ ایک سال کے لئے اور جوان ہو جاتا۔"

یہ کہانی سنا کر ملک خوب ہنستا۔ اس کی باتوں پر ہنسنے والے لوگ تو وہاں ہر وقت ہی رہتے تھے۔ اس لئے میں نہ ہنستا تو کسی کو احساس تک نہ ہوتا۔ مجھے ہنسی کے بجائے غصہ آتا۔ پتہ نہیں کیوں ــ!

اس وقت تک میں نے ریل گاڑی میں سفر نہیں کیا تھا۔ وہاں ریل گاڑی تھی ہی نہیں۔ اپنے کام سے کہیں دور جانے کے لئے لاریاں تھیں اور ملک کے کام سے جانے کے لئے ملک کی موٹر جو اب میرے ہی قبضے میں رہتی تھی۔

ملک کے لئے گاؤں اور شہر برابر تھے کہ شہر کا سارا مال گاؤں آ جاتا تھا اور گاؤں کے سارے نوکر شہر پہنچ جاتے تھے۔ گاؤں میں اس کے ڈیرے بھی کوٹھیاں تھیں اور شہر میں اس کی کوٹھیاں بھی ڈیرے۔ میں نے تو ہر شہر میں اس کی ایک کوٹھی دیکھی۔ وہ کہتا تھا، دوسروں کے گھر ٹھہرنا عزت کی بات نہیں ہے اور ہوٹلوں میں سارے نوکر نہیں رہ سکتے، ہر جگہ اپنا گھر بناؤ اور دوسروں کو اپنے گھر بلا کر اپنا احسان مند کرو۔

ملک کے لئے اور ملک کے ساتھ میں نے کتنے گھر دیکھے، کیسے کیسے گھر دیکھے، کیسے کیسے لوگ دیکھے! وہ جو سامنے گاڑی کھڑی ہے، اس میں بیٹھے سب لوگ میرے جاننے والے نظر آ رہے ہیں، وہ سب جانے پہچانے ہیں۔ وہ کھڑکی کے ساتھ جو لڑکی بیٹھی ہے اسے تو میں خوب جانتا ہوں اور اس کے ساتھ جو عورت بیٹھی ہے اسے بھی۔

وہ بھی مجھے ضرور جانتی ہوں گی جبھی تو میں جب ڈبے کے اندر داخل ہونے لگا تھا تو انھوں نے دھکے دے کر مجھے باہر نکال دیا تھا اور لوگوں کو بھی جمع کر لیا تھا۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ ——میں نے تمہیں پہچان لیا ہے اور ان کو غصہ آگیا تھا —— اور وہ آدمی جو ابھی ابھی مجھے گھورتا ہوا گزرا ہے میں اسے بھی پہچانتا ہوں۔ خوب جانتا ہوں کہ وہ کون ہے اور ملک کے پاس کس کام سے آیا کرتا تھا۔

ملک نے مجھے آدمی کی پہچان خوب کرادی ہے میں ہر آدمی کو دور سے دیکھ کر پہچان جاتا ہوں۔ مگر..... جب ملک نے ایسی ہی بات مجھ سے کی تو میں بوکھلا گیا میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ میں کیا کہوں......

"جانتا ہے تو کون ہے......؟"

اور میں نہیں جان سکا کہ اب کیا کہوں! میرا سارا منہ ننھے ننھے دانتوں سے بھر گیا تھا اور زبان ہلاتے دقت ہو رہی تھی۔ میرا منہ کھلا تھا کہ اسے بند کرنے میں سخت تکلیف ہوتی تھی۔ میں نے سب کو جان لیا تھا مگر اپنے بارے میں سوچنے کی کبھی فرصت نہیں ملی تھی۔

پھر اس ٹیکسی ڈرائیور نے مجھے جھنجھوڑ دیا جو ملک کی گاڑی کسی اور کام میں مصروف ہونے کی وجہ سے اسے لے کر شہر جاتا۔ یا اس لئے ملک کے پاس رہتا کہ ملک کی گاڑی سب لوگ پہچانتے تھے۔

"یار تیرا ملک تو بہت ہی بخیل ہے...."

میں نے اس کے منہ کو دیکھا —— کیا کہہ رہا تھا وہ؟!

"ملک جب بھی کوئی اچھا مال لے کر شہر جاتا ہے اسے ایسا برقع میں لپیٹ کر رکھتا ہے کہ ایک جھلک بھی نہیں دیکھنے دیتا۔"

میں ہنسا کہ ملک کی بخیلی کو بھی کہاں گالی پڑی ہے۔ مگر ایسا معلوم ہوا کہ جیسے اس نے میرے سینے پر پوری طاقت سے گھونسہ مارا ہو میں جکرا گیا.....

اب میں شہر جانے کے بجائے گاؤں کی طرف دوڑ رہا تھا۔ میں موٹر سے بھی زیادہ تیز بھاگا جا رہا تھا۔ ملک کے ڈیرے کی طرف۔

ہانپتا کانپتا ملک کے ڈیرہ پر پہنچا۔ تھوڑی دیر باہر ٹھہرا۔ سانس درست کیا۔ پھر اندر داخل ہوا۔ مگر جب میں اس کمرے کی طرف جانے لگا جہاں صرف مجھ جیسے نوکر ہی جا سکتے تو ایک لمبی لاٹھی والے جوان نے میرا راستہ روک لیا۔ میں نے حیرت سے اس کی شکل دیکھی کہ میں اسے جانتا تھا۔

"کیوں؟"

"ملک صاحب کا حکم نہیں ہے۔"

"کیوں؟!"

"تم ملک صاحب کے حکم سے اس وقت شہر میں ہو۔"

"مگر میں تو شہر سے واپس آگیا ہوں۔"

"نہیں تم واپس نہیں آئے ہو۔"

"میں شہر سے واپس نہیں آیا ہوں......؟"

چمگادڑیں دو قسم کی ہوتی ہیں —— اور بھی کئی قسم کی ہوتی ہوں گی مگر میں دو قسم کی چمگادڑوں کو جانتا ہوں —— ایک تو وہ جو اتنی بڑی ہوتی ہیں کہ جہاز کی جہاز نظر آتی ہیں۔ وہ بہت اونچے اور بہت بڑے شکار کرتی ہیں۔ انھیں کسی نے شکار کرتے نہیں دیکھا —— دوسری وہ ہوتی ہیں جو شام کو ابابیلوں کے ساتھ اڑتی ہیں اور دور سے ابابیل ہی نظر آتی ہیں۔ یہ چمگادڑیں رات کو گھروں کے اندر گھس جاتی ہیں اور انھیں باہر نکالنے کے لئے سارے گھر میں اندھیرا کرنا پڑتا ہے —— کہتے ہیں یہ کان کو چمٹ جاتی ہیں اور جب تک سارا خون نہ پی لیں جان نہیں چھوڑتیں —— مگر میں تو بڑی چمگادڑ کی بات کر رہا تھا جسے شکار کرتے کسی نے نہیں دیکھا۔

میں گھر پہنچا تو وہ موجود نہیں تھی۔ میری ماں بھی نہیں تھی —— شاید وہ مر چکی تھی۔ اگر وہ مر نہ گئی ہوتی تو وہاں ضرور موجود ہوتی .... اور میری بیوی بھی گھر کے اندر ہی ہوتی۔ میں پھر بھاگا اور پھر ملک کے ڈیرے پر پہنچا اور پھر وہاں سے بھگا دیا گیا۔

پھر کسی نے مجھے سوتے میں چارپائی سے اٹھا کر دھڑام سے نیچے پھینک دیا۔

"جانتا ہے تو کون ہے۔"

ایک بار تو غصے نے میری گردن اونچی کر دی، اور نہ جانے میرے اندر کہاں سے اتنی طاقت آ گئی کہ میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑا ہو گیا مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے ملک بھی لڑکھڑا گیا ہے ـــ مگر دوسرے ہی لمحے مجھے معلوم ہوا کہ وہ تو میری نظروں کا دھوکا تھا، لڑکھڑایا ملک نہیں تھا میں لڑکھڑایا تھا، وہ تو اسی طرح سینہ پھلائے کھڑا تھا۔

"جی سائیں"

"سوچ سمجھ کر بات کرتے ہیں۔"

"نوکر سائیں۔"

میں نے ڈرتے ڈرتے اوپر آنکھیں اٹھائیں اور پھر حیران رہ گیا ـــ اب وہ مسکرا رہا تھا ـــ ملک ہنس رہا تھا۔ مجھے یقین نہیں آیا کہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔

میں نے پہلے صحیح دیکھا تھا یا اب ٹھیک دیکھ رہا ہوں؟! اس کا غصہ صحیح تھا یا پیار صحیح ہے؛

مگر جب ملک نے آگے بڑھ کر میرے کندھے پر ہاتھ رکھا تو مجھے دونوں باتوں کا یقین آ گیا۔

"دیکھ لالہ......"

ملک نے پہلی بار مجھے لالہ کہا تھا۔

"..... تو ہمارا پرانا نوکر ہے۔ تو اسی ڈیرے میں پیدا ہوا ہے ـــ تو ایسی باتیں کرتا ہے؟"

میرے پاس اس کا جواب تھا اور میں نے چاہا بھی کہ ملک کو وہ جواب دے بھی دوں مگر اس نے مجھے بولنے کا موقع ہی نہیں دیا۔

"... تجھے ہماری ضرورت ہے اور ہمیں تیری ـــ اور تو جانتا ہے کہ ہماری ضرورت تو پوری ہوتی ہی رہتی ہے ـــ اور پھر اگر کوئی اپنی خوشی سے......"

اس سے آگے میں نے اور کچھ نہیں سنا۔ میری آنکھیں نیچی تھیں اور چاروں طرف سے سیلاب نے مجھے گھیر رکھا تھا۔

اب میں اس ریل گاڑی سے بھی آگے نکل جاؤں گا، جو نہ جانے مجھے کہاں لئے جا رہی ہے۔ اس گاڑی میں وہ سب لوگ سوار ہیں جنھیں میں جانتا ہوں ـــ جو سب مجھے جانتے ہیں ـــ اب تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اصل چیز اپنی پہچان ختم کرنا ہے اور یہ کام اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک ہم دوسروں کو پہچاننا ختم نہیں کر دیتے ـــ میں دوسروں کو پہچانتا ہوں جس کا مطلب یہ ہے کہ دوسرے بھی مجھے پہچانتے ہیں۔ میری پہچان ابھی باقی ہے ـــ اس کا یہ بھی مطلب ہوا کہ میں ابھی اپنے گھر اور گاؤں سے زیادہ دور نہیں آیا۔ یہیں کہیں آس پاس گھوم رہا ہوں۔

سچ بولنا اور سچ سننا دونوں ہی بہت مشکل کام ہیں۔ پہلے میں سچ بولتے ڈرتا تھا۔ اب سچ سننے سے بھی ڈرنے لگا۔ تنہائی میں بھی کبھی سچی بات نہ سوچتا کہ کہیں میرے کان نہ سن لیں۔ ملک نے ایک سچ بول کر ساری سچائیوں سے نفرت کرا دی تھی۔

"اگر کوئی اپنی خوشی ..."

میں نے اس بے گناہ اور معصوم شکل کی طرف دیکھا، جو گھر واپس آ چکی تھی اور دنیا جہان سے بے فکر اپنے کام میں مصروف تھی۔

اس کے باپ کو اس بات کی اتنی پریشانی نہیں رہتی تھی کہ کل ـــ آنے والے کل وہ اور اس کے بچے کیا کھائیں گے جتنا وہ اس بات پر حیران ہوتا تھا کہ آج کا دن خیریت سے کیسے گزر گیا!!

"جس نے اتنی تکلیفیں دیکھی ہوں اس کے لئے تھوڑا سا آرام بھی بہت بڑی بات ہوتا ہے۔"

اب وہ ایسی باتیں کرنے لگی تھی اور میں بات کرنا بھی بھول چکا تھا۔

املتاس کے پھول لال ہوتے ہیں پیلے نہیں ہوتے ـــ اور پیپل اور برگد کی شاخوں پر اب چمگادڑیں اُگتی ہیں سبز پتے نہیں اُگتے۔ شکاری کے لئے شکار کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے جبتی دوپہر بھی ٹھنڈی کالی رات بن جاتی ہے۔

میرا شہر جانا بند ہو گیا۔ گھر سے باہر نکلنے کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ سارا کام بیٹھے بیٹھے ہونے لگا — اب میں تھا اور میری ننھی سی بچی۔

ایک دن میں نے اپنی آنکھوں کو اپنے سامنے رکھے دیکھا۔ وہ مجھے گھور رہی تھیں اور اپنی ننھی ننھی انگلیوں سے میری ناک پکڑنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ میں پھر ڈر گیا۔ اور اسی حالت میں اپنی بچی کو سینے سے لگا کر وہاں سے بھاگا۔ گاؤں سے بھاگا، شہر سے بھاگا۔ بھاگتا چلا گیا۔ بہت دور — اور جب بھاگتے بھاگتے تھک گیا تو سانس لینے کے لئے ٹھہر گیا — مگر سامنے دیکھا تو حیران رہ گیا — میں تو وہیں تھا۔ ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا تھا۔ وہی گاؤں، وہی گھر، وہی گھر کے سامنے گندہ نالہ، اور وہی صدیوں پرانا درخت — میں نے گھبرا کر اس ننھی سی جان کو اپنے سینے کے ساتھ زور سے بھینچا اور سو گیا۔

سفر میں ہر قسم کے اسٹیشن آتے ہیں۔ ہر طرح کے گاؤں اور شہر ملتے ہیں اور راستے میں موسم بھی بدلتے ہیں۔ سفر کی رفتار کے ساتھ موسم تبدیل ہونے کی رفتار بھی گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ سفر کی رفتار سست ہوگی تو موسم بھی دیر دیر سے تبدیل ہوں گے، سفر تیز ہوگا تو موسم بھی جلد جلد بدلتے رہیں گے۔

صدیوں کے بعد اچانک محسوس ہوا کہ ہم سب تیز دوڑنے لگے ہیں اور موسم بالکل ہی بدل رہا ہے۔ میں نے آنکھیں مل مل کر چاروں طرف دیکھا مگر صرف اتنا دیکھ سکا کہ میرے گھر اب ایک نہیں بلکہ دو عورتیں ہیں۔

ملک نے مجھے پھر حیران کر دیا۔ اس نے مجھے بار بار لالہ کہنا شروع کر دیا تھا — پہلے اس نے صرف ایک بار لالہ کہا تھا — اب تو وہ مجھے "سائیں میڈا" بھی کہتا اور میں خوف سے کانپ اٹھتا۔ مگر وہ صرف میرے ساتھ ہی ایسی باتیں کرتا، دوسرے کنبوں کے ساتھ بھی وہ ایسا ہی کرنے لگا تھا۔

سب لوگ مجھے مبارکباد دینے آئے میں انھیں مبارکباد دینے گیا۔ یہ سامنے جو لوگ اب مجھے دیکھے بغیر گزر رہے ہیں یہ سب مجھے مبارکباد دینے آئے تھے میں ان کے پاس نہیں گیا تھا۔

سامنے ریل کی پٹری پار کرنے والے آدمی کو دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ یہ پہچان کا معاملہ بھی عجیب ہے کبھی ہم سب کو پہچانتے ہیں اور کبھی کسی کو بھی نہیں پہچانتے۔ ان سب نے کہا — ہم نے اپنے آپ کو پہچان لیا ہے — میں نے ان کا یقین کر لیا — ان سب نے کہا — ہم نے اپنے دشمن کو بھی پہچان لیا ہے — میں نے اس کا بھی یقین کر لیا — انھوں نے کہا، اب دشمن بچ کر نہیں جائے گا — میں نے ان کے ہاتھ چوم لئے۔

اس اسٹیشن کو دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ گاڑیاں واپسی کا سفر بھی کرتی ہیں — جو گاڑی مجھے آگے لے جاتی ہے وہی واپس بھی لے آتی ہے۔ وجہ شاید یہ ہے کہ میں اسی گاڑی میں بیٹھا رہتا ہوں۔ اس سے اترتا نہیں، اسے تبدیل نہیں کرتا۔ اور اس چکر میں گاڑیوں کی پہچان ہی بھول گیا ہوں پتہ ہی نہیں چلتا کہ کون سی گاڑی آگے لے جائے گی اور کون سی پیچھے؟ بلکہ اب تو یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ کب کون سی گاڑی میں سوار ہوا تھا اور اب کس گاڑی میں بیٹھا ہوں؟! آگے جا رہا ہوں یا پیچھے —!!

اب میرے گھر میں دو عورتیں تھیں اور دونوں کبھی گھر سے باہر نہیں جاتیں۔

بڑی نے کہا۔ یہ میرا گھر ہے اور ملک ہمارا رب نہیں ہے

میں نے کہا یہ بات تو میں ایک زمانے سے کہنے کی کوشش کر رہا تھا۔

مگر تم نے کبھی نہیں۔

میں تو کہہ رہا تھا کوئی سنتا بھی۔

تم اپنے آپ سے کہہ رہے تھے۔ اپنے آپ کو سنا رہے تھے۔ کوئی اور کیسے سنتا۔

ان کی بات بھی شاید ٹھیک تھی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم لوگوں سے باتیں کر رہے ہیں مگر اصل میں اپنے آپ سے ہی باتیں کر رہے ہوتے ہیں اور جب سمجھتے ہیں کہ اپنے آپ سے باتیں کر رہے ہیں تو اس وقت سب لوگ ہماری باتیں سنتے ہیں۔

میں پھر اپنے آپ سے باتیں کرنے میں مصروف ہو گیا اور ایسا مصروف ہوا کہ سب کچھ بھول گیا۔ میں اب بھی ملک کا کام کرتا تھا مگر ایسا لگتا تھا کہ میں اسے بالکل بھول گیا ہوں۔ میری بیوی کو بھی جیسے وہ یاد نہیں رہا تھا بلکہ سارا گاؤں ہی ملک کو بھولے جا رہا تھا۔

پھر ایک عجیب بات ہوئی۔ ایک چمگادڑ نہ جانے کس طرح ہمارے گھر میں گھس آئی۔ اسے باہر نکالنے کے لئے سارے گھر میں اندھیرا کیا گیا مگر پھر بھی وہ باہر نہ نکلی۔ خدا جانے کس کونے میں چھپ کر بیٹھ گئی تھی کہ تلاش کرنے پر بھی نہ ملی۔

میری بیٹی ڈر سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس نے دوپٹے سے اپنا سر اور کان پوری طرح چھپائے ہوئے تھے پھر بھی وہ کانپ رہی تھی۔

"وہ تو کب کی نکل بھی گئی،" میں نے اسے تسلی دینے کے لئے کہا۔

"نہیں..... میں جانتی ہوں، وہ گھر کے اندر ہی ہے۔" اور وہ رونے لگی۔

اب وہ عورت بھی ڈر رہی تھی جس نے گھر سے باہر قدم نکالتے ہی تمام چیزوں سے ڈرنا چھوڑ دیا تھا۔

"صبح ہوگی تو آپ ہی بھاگ جائے گی یا ہم اسے مار دیں گے۔"

"صبح تو پتہ نہیں کب ہوگی۔ اس وقت تک میرا تو دم نکل جائے گا۔"

اور ہم ساری رات جاگتے رہے کہ رات ختم ہونے میں ہی آتی تھی۔

پھر اس رات..... یا اسی قسم کی کسی اور رات کو ___ مگر راتوں کی قسمیں تو نہیں ہوتیں۔ رات تو صرف رات ہوتی ہے۔ ایک ہی قسم اور ایک ہی رنگ کی ..... پھر وہی بھیانک خواب سارے گھر پر وارد ہوا.....

اندھیرے نے میرا دروازہ کھٹکھٹایا۔ رات نے ہلکی سی کنڈی ہلائی اور میں سمجھ گیا کہ کون ہے اور کیا چاہتا ہے۔ میں اٹھا اور اس کے ساتھ چلا گیا۔

باہر یہ دیکھ کر مجھے بالکل حیرت نہیں ہوئی کہ حدِ نظر سے بھی بہت آگے تک پھیلے ہوئے ملک کے کھیتوں پر پھر جوانی آ گئی ہے اور ہر کھیت پر پیر سائیں کے نقش ننھے ننھے پرچموں کی شکل میں لہراتے نظر آ رہے ہیں۔ میں بچپن سے جانتا تھا کہ یہ پرچم ملک کے ہیں، پیر سائیں کے ہیں کہ ملک، پیر سائیں اور مخدوم ایک ہی شخص کے نام ہیں۔

میں نے جھکی ہوئی آنکھیں اوپر اٹھا کر دیکھا اور پہچان لیں کہ ملک پھر اپنے قد سے بھی زیادہ اونچا کھڑا تھا۔

"تیرے گھر میں بیٹی بھی ہے ___ وہ جوان ہے اور خوبصورت بھی ہے ___ خوبصورت بھی ہے ___ خوبصورت ہے ___ خوبصورت ___ خوب خوب ___ خوب....."

"جی سائیں....."

"..... نوکر سائیں....."

"..... تابعدار سائیں....."

"..... حاضر سائیں..... حاضر سائیں..... حاضر..... حاضر....."

میرے منہ سے خود بخود یہ الفاظ اُبلنا شروع ہو گئے۔ جیسے کسی نے میرے اندر چابی بھر دی ہو ___ جیسے میرے باپ کے اندر کسی نے چابی بھر دی تھی ___ میرے دادا کے اندر چابی بھر دی تھی ___ مگر..... مجھے یہ احساس بھی تھا کہ کس نے یہ چابی بھری ہے۔ کوئی ہے، جو مجھے ایسا کہنے پر مجبور کر رہا ہے۔ اسی لئے میں آدھا اوپر آدھا نیچے تھا۔ کبھی پیروں پر اور کبھی سر کے بل ___

پھر بوڑھے برگد کی گھنی شاخوں پہ الٹی لٹکنے والی کالی کالی چمگادڑیں کانوں اور آنکھوں کے راستے میرے سینے میں اتر گئیں اور وہ سارا خون، جو میں نے نہ جانے کہاں کہاں سے اس کے لئے اکٹھا کیا تھا میری آنکھوں میں اتر آیا۔

اب میرے سامنے ملک نہیں تھا ___ اور مجھے اب صرف اپنے گھر کا ہی راستہ معلوم تھا۔ باقی سارے راستے بھول چکا تھا۔

میں سیدھا اپنے گھر پہنچا۔ بڑی عورت سے کوئی بات نہیں کی کہ اب اس سے بات کرنی فضول تھی۔ پھر اب یہ باپ بیٹی کا معاملہ تھا۔

میں نے اسے اپنے قریب بلایا، پیار کیا اور اپنی آنکھوں کا سارا خون اس کے حلق میں انڈیل دیا اور دونوں انگوٹھے اس کی گردن میں گاڑ دیئے۔

اب میں بھاگ رہا ہوں۔ پوری طاقت سے بھاگ رہا ہوں ___ جتنا تیز بھاگ سکتا ہوں، بھاگ رہا ہوں ___ ریل گاڑی کے ذریعے زیادہ تیز بھاگا جا سکتا ہے اس لئے ریل کا سہارا لے رہا ہوں۔ آگے بڑھنے یا پیچھے ہٹنے کا احساس ختم ہو چکا ہے۔ اب تو صرف ایک ہی مقصد ہے، بھاگتے رہنا، دوڑتے رہنا..... تاکہ سوچنے کی فرصت نہ ملے ___ مگر میں..... اب یہ کس سے پوچھوں کہ ___ میں نے ملک کو قتل کیا ہے ___ یا اپنی بیٹی کو ___ ؟!!

ایک شاخِ نہالِ غم

اکرام اللہ

تیس برس کتنے ہوتے ہیں؟ گنو تو بہت، سوچو تو گرمیوں کی ڈھلتی راتوں کے خاموش سناٹوں میں سروں پہ سے شاں سے گزر جانے والے پرندے کی بس ایک شاں۔ آج شام بہت اداس ہے۔ لیکن آج کی شام بھی تو بالکل عام شاموں جیسی ہے۔ سورج کی تیز گرم کرنیں دن بھر دھرتی اور اس کے باسیوں کو نہایت بے دردی سے جھلساتی رہی ہیں۔ اب وہ پچھم میں اتر گیا ہے تو زمین اور درختوں نے سکھ کا سانس لیا ہے اور اس سانس کا نم اور گرم بھبھوکا بالائی منزل کی کھڑکی میں کھڑے ہوئے کے چہرے سے کھیلتا، کمرے کی فضا میں پھیلتا جاتا ہے۔ تیزی سے رنگ بدلتے آسمان کے نیچے کالے کالے پرندے زور زور سے پر مارتے ہوئے اپنے آپ کو کہیں اڑائے لئے جاتے ہیں۔ میرے سامنے کھڑکی میں لوہے کی سلاخیں عمودی گڑی ہیں اور اس کے بعد جالی ہے۔ کھڑکی کے نیچے شہتوت کے پست قد مگر گھنے اور گتھے ہوئے درخت پر چڑیاں خوب زور سے شور مچا، مچا کر ابھی ابھی سو گئی ہیں۔ کبھی کوئی ہلکی سی چوں سنائی جاتی ہے۔ شاید کسی چڑیا نے کبھی تیری طرح اپنے ساتھی کی چھاتی پہ سر رکھ کر جھوٹ موٹ کہا ہوگا؛

سیئیں بار سجناں بھُل گئی موڑتے آکے

تو اب وہ سیٹی بجا رہا ہے کہ اس کی بھولی بھٹکی سجنی اس کی سیٹی کی روشنی میں موڑ کی بھول بھلیاں کاٹ کر آسکے۔ آج شام کیوں اتنی اداس ہے؟ سڑک پر پہلو بہ پہلو کھڑے چمکدار سبز رنگ والے، بلند و بالا درخت اب گاڑھی گاڑھی سیاہی کے تلے خوشی سے دبتے چلے جا رہے ہیں۔ ان کے پیچھے نیلاہٹ مائل ملگجا آسمان اندھیروں کے خلاف ازل سے ہاری ہوئی جنگ ابھی تک بہادری سے لڑے جا رہا ہے۔ ایک دن آئے گا کہ یہ سیاہیاں جو گاڑھا گاڑھا باہر گر رہی ہیں میری آنکھوں کے اندر گرنے لگیں گی۔ درخت اسی طرح سیاہیوں کے تلے دبتے چلے جائیں گے حتیٰ کہ فقط درختوں کے ہیولے باقی رہ جائیں گے اور پھر آہستہ آہستہ وہ ہیولے بھی گھل گھل کے اندھیروں میں مل کر اندھیرے بن جائیں گے۔ میرا آسمان اندھیروں کے خلاف جنگ ہار کر سرنگوں بیٹھ جائے گا۔ وہ نقش جو سب سے آخر میں میرے ذہن سے محو ہوگا۔ وہ سردیوں کی ایک شام میں اناروں کے بے برگ و بار، ٹنڈ منڈ ٹہنیاں پھیلائے کھڑے باغ کے ایک کنج میں تیری آنسو بھری مایوس آنکھیں اور وِدا کہنے کے لئے آخری بار اٹھتا ہوا ہاتھ ہوگا۔ انت میرے کتنا قریب آگیا ہے اور صرف تیس سال پرانی بات کتنی دور ہوگئی ہے۔ موت تو ایک لمبی نیند ہے ازل تک کے لئے اور اس کے مقابلے میں تیس سال کی مدت تو کوئی بات ہی نہیں، کوئی وقفہ ہی نہیں، وقت کے لامتناہی سمندر کے سامنے محض ایک قطرہ۔ اے وقت! تو ذرا تھم میں ان زور زور سے پر مارتے ہوئے کالے کالے پرندوں کی طرح ابھی اڑ کر جاتا ہوں اور تیس سال پہلے کے زمانے میں پہنچتا ہوں۔ وہاں سردی میں ٹھٹھری ٹہنیوں کی بجائے انار کے بوٹے ہری ہری پتیوں سے لدے ہوں گے اور ان میں جا بجا دہکتے ہوئے سرخ انگاروں جیسی کلیاں لگی ہوں گی۔ سردی کا موسم بیت چکا، اب تو گرمی کا موسم ہے نا۔ تیری آنکھوں میں آنسو نہیں مسکراہٹیں چھلک رہی ہوں گی۔ تیرے انار کی کلیوں جیسے نازک سرخ لب شدت جذبات سے تھرتھرا رہے ہوں گے۔ افسردہ و پژمردہ چہرہ خوشی سے تمتما رہا ہوگا۔ الوداع کہنے کے لئے اٹھنے والی لمبی باہیں میری گردن سے لپٹ رہی ہوں گی۔ سامنے کھڑکی میں لوہے کی سلاخیں عمودی گڑی ہیں اور اس کے بعد جالی ہے۔ خدا معلوم میں تجھے یاد بھی ہوں یا نہیں۔ اگر یاد بھی ہوں تو وہ جذبات بھی ہیں کہ نہیں۔ اگر وہ جذبات بھی ہیں تو ان کے اظہار کی جرأت بھی ہے کہ نہیں۔ اگر ان کے اظہار کی جرأت ہے تو کیا تو بھی ہے کہ نہیں۔ آج شام کتنی اداس ہے؟ تپتے بیابان میں تنہا کیکر پہ بولتی فاختہ کی آواز کی طرح سنسان اور پُرہول۔ نیچے سڑک پر بچوں کا غول شہتوت کے درخت پہ بسیرا کرنے والی چڑیوں کی طرح شور مچا رہا ہے اور آج بھی بچے وہی پرانا کھیل اسی جوش و خروش سے کھیل رہے ہیں جس طرح اس شام کھیل رہے تھے۔

لک چھپ جانا
مکئی دا دانہ
راجے دی بیٹی آئی جے

تو نے گھر کی دہلیز سے باہر قدم رکھ کر جھنجلائی ہوئی آواز میں پکارا تھا "نرملا، مدن جلدی گھر آؤ، بہت رات ہوگئی، ماتا جی بلاتی ہیں" اُدھر سے پھر بانگ بلند ہوئی۔ لک چھپ جانا اور سب بچے نرملا، مدن سمیت پھر پھر اندھیرے کونوں کھدروں میں غائب ہوگئے۔ تو تنگ آ کر انہیں پکڑ کرے جانے کے لئے نکلی اور اس طرح ایک راجہ کی بیٹی اپنے مجرموں کو تلاش کرتی کرتی بڑ کے بوڑھے چھتنار درخت کے نیچے اپنے بیتم کی ترسی ہوئی باہوں میں آ گری۔ ہم دونوں کے دل کیسے زور زور سے دھڑک رہے تھے؟ ہمارے بدن لرز رہے تھے کہ ہونٹوں سے کوئی بات نہ نکل سکتی تھی۔ تیرے سانسوں کی مہک میرے رگ و پے میں جذب ہو رہی تھی جیسے سوکھی ریت میں پانی۔ وہ کیا جذبہ تھا جس نے ملنے کے چند ثانیوں کے اندر ہمیں اُس طرح جھنجھوڑ کے رکھ دیا کہ ہم اپنے بدنوں کی ڈھیتی دیواروں کو سہارا دینے کے لئے بڑ کے تنے سے ٹیک لگانے پر مجبور ہوگئے۔ کوئی پرندہ پتوں میں پھڑ پھڑاتا ہوا اُٹھا۔ ہم اُس جانکاہ مگر میٹھے خواب سے چونک گئے۔ تو ہرنی کی طرح چوکڑیاں بھرتی ہوئی جا رہی تھی، واپس اپنے مجرموں کی تلاش میں۔ اور میں بھیگتی مسوں کے لڑکے سے ایک دم جوانِ رعنا بن گیا۔ پر اعتماد، شاید اپنے آپ پر قدرے مغرور بھی۔ ہم نے کتنی ہی راتیں، بوڑھے بڑ کے پروں کے نیچے اُس کے پاؤں میں بیٹھ کر گزار دیں۔ چاہے آکاش سے نیلی نیلی چاندنی برستی اور چاہے اندھی بھیانک رات ہوتی وہ ہمیں اپنے پروں میں سمیٹ کر دنیا کی آنکھوں سے اوجھل کر دیتا۔ وہ ہم پہ کتنا مہربان تھا جیسے ہم اُس کے دو لاڈلے بچے ہوں۔ وہ ہمیشہ چپ سادھے رکھنے والا بڑ جانے یاد ہے! ایک رات کی گہری خاموشی میں ہم سے بولا تھا، ہلکے ہلکے اپنی گہری گمبھیر آواز میں، ایک رکھ رکھاؤ کے ساتھ۔ ایک دھیرج کے ساتھ۔

"میرے بچو! دیکھے کب کسی کے لئے رکا ہے جو تمہارے لئے رکے گا۔ ایک ننھی ہری بیل کی طرح کی میٹھی کسک کہیں من سے لپٹی رہ جائے تو بہت ہے جو اُداسی کی ہوا کے سامنے کبھی کبھی اپنی نرم نازک پتیاں دل کی پتھر جیسی سخت دیواروں پر پھڑ پھڑا دیا کرے۔"

یہ کون بولا؟ کتنی مہان آواز تھی کہ لمحہ بھر کے لئے پوری کائنات جیسے تھم گئی ہو اور جب تک رہے گی اس کے ایک ایک ذرے کا ہر ہر دکھ بلور کے چمکتے ہوئے ٹکڑوں کی طرح بکھر کے ہمارے سامنے تھا۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ماضی، حال اور مستقبل تو ایک مکمل مربوط ناقابلِ تقسیم اکائی ہے۔ کیتنی سندر آواز تھی کہ ہمارے جسم اُس کی سندرتا کی ٹھنڈی حدت کے سامنے پور پور، ریشہ ریشہ، رواں رواں پگھل کے وقت کے اتھاہ امر ساگر میں مل گئے۔ ہم نے یہ تجربہ اپنے حواس اور احساس کی پوری شمولیت کے ساتھ کیا۔ ہم اتنے چھوٹے اور کم حیثیت کہ ریت کے ذرے سے بھی کمتر اور تجربہ جس سے ناگہانی دو چار ہوئے اتنا بڑا کہ بھگوان سے بات کرنے کے سمان، ہماری زبانیں گنگ، چہرے فق اور دل خوف و حیرانی سے بھرے ہوئے تھے۔ ذرا سنبھلے تو بڑ کے پاؤں پکڑ لئے "بابا! ہم سے اور باتیں کرو نا"

اُس کا گھنا وسیع چھتر اپنے مضبوط تنے پر رجا، ہوا کے جھکوروں کے ساتھ دھیرے دھیرے، ہمیشہ بے نیاز جذب و کیف و مستی کے عالم میں رقص کرتا رہا۔ ہماری منت و زاری کے باوجود اس نے ہونٹ نہ کھولے بلکہ پھر کبھی نہ کھولے۔ وہ تو مہاراج بکرماجیت تھا جو اپنی بجتی سے بچھڑنے کے دکھ میں اپنے شاہانہ جاہ و حشم اور اپنی غیر معمولی فہم و فراست اور اپنے بے اندازہ مال و منال سمیت بڑ کا روپ دھار کے کھڑا ہوگیا تھا۔ وہ تو بدھ تھا جو اپنے دکھ سہنے والے شریر اور مہا آتما کو سنبھالے اپنے ہی گیان کے پرسکون دھیان کے لئے بڑ بن گیا تھا۔

میرے سامنے کھڑکی میں لوہے کی سلاخیں عمودی گڑی ہیں اور اُس کے بعد جالی ہے۔ آج شام بہت اداس ہے مگر آج شام ننھی ہری بیل کی نرم پتیوں نے میرے دل کی پتھر جیسی سخت دیواروں سے پھڑ پھڑا کے جو دستک دی ہے وہ میں نے سن لی ہے۔ اب دفعتاً مجھ پر منکشف ہوا ہے کہ میں ان تیس سالوں میں کتنا دکھی رہا ہوں۔ شاید تجھ سے بچھڑ کے اتنا نہیں جتنا تجھے اپنی ملاقاتوں اور صدیوں پرانے بوڑھے اور مہربان بابا کو بھول کے دکھی رہا ہوں۔ میں کتنا مورکھ تھا کہ دکھ بڑھتا تھا تو دل کی سخت دیواروں کو اور سخت کر لیتا تھا جس سے دکھ اور بڑھتا تھا۔ یہ ایک لایعنی دوڑ تھی جو اس لمحے تک چلتی رہی ہے۔ کیا تیرے دل کے اردگرد بھی میٹھی کسک کی ننھی ہری بیل لپٹی تھی؟ اگر لپٹی تھی تو کیا اُس کی نرم پتیوں کی دستک تو نے کبھی اپنے دل کی دیواروں پر سنی ہے؟ جب تو دلہن بن کے گھر سے رخصت ہوئی تھی تو دور سے بڑ کے درخت نے اپنی مہان

اور سندر آواز میں تجھے کچھ کہا تھا؟ تو جانے سے پہلے اُس کے پاؤں چھو کے آئی تھی؟ تو نے اُس کے برسے تنے سے کان لگا کے ہمارے دلوں کی وہ دھڑکنیں سنی تھیں جو ہماری ملاقاتوں کے درمیان ایک ایک کرکے اُس میں جذب ہوتی رہی تھیں۔ تجھے وہ باتیں اُس نے دہرائیں جو پہروں ہم اُس کے نیچے بیٹھ کر کیا کرتے تھے؟ وہ دبی دبی ہنسی سنائی دی؟ ہمیشہ کے لئے بچھڑ جانے کے غم سے اٹھتی ہوئی سسکیوں اور آہوں کی بازگشت سنے تڑپایا؟ نہیں، کچھ بھی نہیں ہوا ہوگا۔ اول تو تم وہاں گئی نہیں ہوگی اور اگر گئی بھی ہوگی تو اس نے وہ خزانہ تم اکیلی کے سامنے دھرنے سے انکار کر دیا ہوگا۔ ٹھہرو! میں آرہا ہوں، ابھی۔ ان زور زور سے پر مارتے ہوئے کالے پرندوں کی طرح اُڑتا ہوا۔ پھر ہم دونوں مل کر بابا کے تنے سے کان لگائیں گے تو وہ ہماری ہر دھڑکن اور ہر آواز اُسی ترتیب سے دہرانے پر راضی ہو جائے گا۔ میرے سامنے کھڑکی میں لوہے کی سلاخیں عمودی گڑی ہیں اور اس کے بعد جالی ہے۔

تمہارا دولہا تمہاری طرح خوبصورت تھا؟ تمہیں پسند آیا؟ کاش میں اُسے دیکھ سکتا۔ تو اُسے پسند آئی؟ ضرور آئی ہوگی۔ ایسی دلہن تو اُس نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھی ہوگی۔ مگر کیا خبر تو نے شادی کی بھی یا نہیں؟ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ تمہاری شادی ہو بھی سکی یا نہیں؟ آخری دنوں میں تو ہماری محبت کے چرچے پورے شہر میں پھیلے ہوئے تھے۔ کیا کیا تہمتیں لگیں، کس کس طرح بات کا بتنگڑ اور پر کا کوا نہ بنایا گیا حالانکہ قصہ محض اتنا تھا کہ ہمیں ایک دوسرے سے مل کر جو تکمیل کا احساس ہوتا تھا وہ ہمیں بار بار ملنے پر مجبور کرتا تھا او بس ہماری بدقسمتی یہ ہوئی کہ ایک ہندو لڑکی اور مسلمان لڑکے کا خاص طور پر تقسیم کے دنوں میں، جب مذہبی فسادات زوروں پر تھے، ایک دوسرے سے پریم کرنا اچرج اور اچنبھا بات تھی۔ چار دانگ میں بدنامی ہوئی تیرے ماتا پتا ندامت کے سمندر میں غرق ہو گئے۔ تو اٹھتی ہوئی انگلیوں کے خوف سے گھر سے باہر نہ نکل سکتی تھی اور طعنوں کے ڈر سے گھر کے اندر نہ رہ سکتی تھی۔ اتنی بدنام لڑکی کو کہاں کوئی بر مل سکا ہوگا۔ اور اگر ملا ہوگا تو بھونڈا بدصورت ہوگا جس کے لئے تو دن رات نفرت کی آگ میں سلگتی رہتی ہوگی۔ اگر کسی سلیقے کے آدمی نے لاعلمی میں تجھ سے بیاہ رچا لیا ہوگا تو بعد میں جب لوگوں سے تیرے متعلق رنگا رنگ کہانیاں سنی ہوں گی تو گھر سے نکال دیا ہوگا اور تو ایک بچہ چھاتی سے چمٹائے کلکتہ کے قحبہ خانہ میں بیٹھی اپنی دھول اڑتی آنکھوں سے ہر راہ گیر کو فحش اشارے کرتے اپنی طرف بلا رہی ہوگی تاکہ اپنا اور بچے کا پیٹ پال سکے۔ آخر ایک دن تو نے کسی سینی ٹوریم میں دم توڑ دیا ہوگا اور وہاں کے عملے نے تیری لاوارث لاش میڈیکل کالج کے ڈائی سیکشن ہال میں لا کر رکھ دی ہوگی جہاں طلبا تیرے بدن کے اعضا کی وساطت سے علم الابدان حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہوں گے کیونکہ بدن تو سبھی ایک سے ہوتے ہیں نا۔ انہیں کیا خبر ہوگی کہ یہ بدن کبھی کتنا نازک اور خوبصورت تھا۔ اس کے خطوط میں کتنی دل آویزی تھی، کہ سینکڑوں میل آج بھی کوئی اس بدصورت، تھکے ہارے بدن کو اپنے دل کے کنول پر بٹھانے کے لئے تیار ہے۔ اس کے اندر کیسی معصوم اور پاکیزہ روح تھی جس نے ایک بار اپنے اندر بوڑھے دانا بابا کی جیسی سندر آواز میں دیا اپدیش سمویا تھا۔ اس کی بدولت ننھی ہری بیل کی طرح کی میٹھی کسک اس کے دل سے لپٹی رہتی تھی اور جب اداسی کی ہوا چلتی تو بیل کی نرم نازک پتیاں اس کے دل کی دیواروں پہ جنہیں زمانے نے پتھر کی طرح سخت کر دیا تھا، پھڑ پھڑاتیں تو یہ ان کی دستک بھی سن لیتی تھی۔ یہ بازار میں سرِعام بکنے والا بدن کبھی اتنا حساس تھا کہ دیکھنے والی نظر اگر میلی ہوتی تو یہ چھوئی موئی کی طرح مرجھا جاتا تھا۔ بڑے بڑے درختوں اور خاموش بنگلوں والی لمبی لارنس روڈ کے درمیان میں ایک کھوکھے کے ارد گرد بارونق دوکانوں کا جھرمٹ ابھر آیا تھا تو ایک گھر گھر کرتے تانگے میں اپنی ماتا جی کے ساتھ پیچھے بیٹھی اور چھوٹے بہن بھائیوں کو آگے بٹھائے اُدھر جا رہی تھی۔ میں اور ادھے پال سنگھ ایک ہی سائیکل پر سوار تانگے کے پاس سے گزرے تو تیرے ہونٹوں پر میرے لئے ایک خفیف سی مسکراہٹ (جیسی مونا لیزا کے ہونٹوں پر ہے) لمحہ بھر کے لئے طلوع ہوئی اور ٹوٹ کر بکھر گئی۔ ادھے کو اس وقت معلوم نہیں تھا کہ ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ تجھے دیکھ کر وہ ایسا مچلا کہ سائیکل تانگے سے آگے نکالنا اس کے لئے مشکل ہو گیا اور تیرے لئے اُس کی نظروں کی تاب لانا مشکل تھا۔ تو اپنے آپ میں سمٹ گئی اور گھبرا کے چہرہ موڑ کے سامنے دیکھنے لگی۔ تیری مصیبت کو جانچتے ہوئے میں نے ادھے کو سمجھا بجھا کے سائیکل آگے نکالنے پر مجبور کیا۔

ہم کھوکھے پر پہنچ کر رک گئے۔ پانی پینے کے لئے یا رونق دیکھنے کے لئے یا نادانستہ تیرا انتظار کرنے کے لئے۔ کھوکھے کے تازہ، ٹھنڈے یخ پانی کے گلاس ہم ہاتھوں میں پکڑے ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تبرک جیسے احترام کے ساتھ پی رہے تھے۔ یہ امیروں کی اس بستی کا عام ضرورت کی چیزیں خریدنے کا مرکز تھا۔ درختوں کی طرح سبھی دوکانوں کے اندر دوکاندار سامان بیچنے میں مصروف تھے۔ دوکانوں کے سامنے بڑا سا خالی احاطہ تیز دودھیا روشنی میں دمک رہا تھا۔ بچے رنگین تتلیوں کی طرح اُڑتے پھر رہے تھے۔ غرورِ حسن سے بھری عورتیں ناچتے موروں کی سی تمکنت اور شان لئے اِدھر سے اُدھر آ جا رہی تھیں۔ بھوک کے مارے

فقیر کھیوں کی طرح بھنبھناتے پھر رہے تھے۔ احاطے کے ایک کونے میں مینڈک کی طرح غلیظ، پھولا پھولا، زرد رنگ شخص اپنے ہی پسینے میں پانی میں ڈوبا، آلتی پالتی مارے مگن بیٹھا کڑکڑاتے گھی میں پوریاں تل رہا تھا۔ پوریوں کی مہک سارے احاطے میں پھیلی مچل مچل کے نتھنوں میں گھس کے اشتہا کو ابھار رہی تھی۔ ان سب سے بے نیاز بنچ ملک اپنی دھن میں گا رہے تھے:

دو نیناں متوارے تمہارے

ہم پر ظلم کریں

ہجر کی آگ میں جلتے ہوئے کسی دیوتا کی سوز و درد میں ڈوبی بلند پکار پورے ماحول کو اپنے قبضے میں لئے بار بار دو متوارے نیناں کے ظلم کی کتھا دہراتے ہوئے بے بس دلوں کو انجانے حزن کے سمندر کی اتھاہ خاموشیوں میں کھینچے لئے جارہی تھی۔ میں اور اودے حزن کے اس سمندر میں ڈوبے اپنے اپنے خیالوں میں گم تھے اور چپ تھے کہ اگر بات کی تو جاگتی آنکھوں، جو خواب دیکھ رہے ہیں ٹوٹ جائیں گے۔ تو شاید ان دو مختلف ذہنوں کے خوابوں میں موجود تھی مگر یقیناً الگ الگ انداز اور رنگ میں۔ ہم غالباً تیرے منتظر تھے کیونکہ جب سڑک کے کنارے تیرا تانگہ آکر رکا تو ہم دونوں میں کسی کو کوئی تعجب نہیں ہوا۔ تو نے قدم نیچے دھرا اور اودے نے ٹکٹکی باندھ دی۔ ہر دیکھنے والے کو تجھے دیکھ کر پتہ نہیں کیا کیا یاد آیا ہوگا کہ اک اک کی نظریں بہک گئیں۔ تو بہکتی بھٹکتی نگاہوں سے بچنے کے لئے سمٹتی سمٹاتی آنکھیں نیچی کئے احاطے میں سے تیز قدموں سے پوریوں کی دوکان کی طرف بڑھتی ہوئی اب، اس گھڑی میں بھی مجھے اسی طرح نظر آرہی ہے۔ ننھے ننھے مرن اور نرملا تیرے پیچھے پیچھے دو لیلوں کی طرح ممیاتے، کدکڑے لگاتے جارہے ہیں۔ اودے کے قدم تیرے پیچھے اٹھنے لگے تو میں نے اُسے بازو سے پکڑ لیا: "اودے سنو! مت جاؤ، یہ لڑکی میری دوست ہے!"

اُس کے قدم تو رک گئے مگر آنکھیں، جن میں ہزاروں سوال تیر آئے تھے، میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔

"یہ لڑکی؟ ..... اور تیری دوست، کیوں جھوٹ بول رہے ہو؟ مجھ پر رعب ڈال رہے ہو؟ یہ لڑکی تو ہے ہی نہیں، یہ تو دیوی ہے، یہ کسی کی بھی دوست کیسے ہو سکتی ہے؟ میں حسد میں جل رہا ہوں۔ رقابت کا جذبہ مجھے مارے ڈال رہا ہے۔ میں اسے تم سے چھین لوں گا۔ میں اسے زبردستی اغوا کر لوں گا۔ تو تو میرا جگری یار ہے۔ تجھے مل گئی تو مجھے کوئی گلہ نہیں۔ مجھے تجھ پر فخر ہے۔

تجھے در اصل اودے سے شادی کر لینی چاہئے تھی، وہ ہم دونوں کو بہت چاہتا تھا اس لئے تیرا معصوم گناہ معاف کر دینا اُس کے لئے ممکن ہوتا۔ مگر ایک بات ہے، تو اس کی دھرم پتنی بن کر شاید ایک اوسط درجے کی خوش زندگی تو گذار لیتی مگر وہ روحانی تجربہ جو ہم دونوں مل کر کرتے اُس کی معیت میں ان کا کوئی امکان نہ تھا۔ وہ حد درجہ پریکٹیکل آدمی تھا۔ لیکن قدرت کے ایسے انعام کسی کا حق تو نہیں ہوتے۔ یہ جب ملتے ہیں بنا مانگے ملتے ہیں کبھی اُس کے حضور صدیوں تک سیس نوائے کھڑے رہتے ہیں۔ وہ منہ پھیر کے ایک نظر بھی نہیں ڈالتی اور جو وہ دیالو ہو تو ہم جیسے اناڑیوں اور کچوں پر اُسے لاکر ڈھیر کر دے جو سوائے خوف سے تھرانے کے کچھ نہیں جانتے کہ کیا کریں۔ اگر ہم عمر بھر بھی اکٹھے رہتے تو ممکن ہے پھر کبھی ویسا لمحہ لوٹ کر نہ آتا۔ ہم بھی محض ایک عام سی زندگی گزارتے۔ تو آج بھی ماتا جی کی طرح آنکھوں پر چشمہ لگائے ہوئے ایک موٹی سی سفید رنگ کی ادھیڑ عمر عورت ہوتی جو دن بھر گھر کے کام کاج میں جتے رہنے کے بعد دیوار کا سہارا لئے کھڑکی میں کھڑی میرا اور سکول سے لوٹنے والے بچوں کا انتظار کرتی۔

شام کے ساتھ اداسی بھی ڈھل گئی ہے۔ چمکتا ہوا چاند آدھے آسمان میں اپنی ٹھوڑی تلے ہاتھ رکھے کھڑا مسکرا رہا ہے۔ ایک ننھی ہری بیل کی طرح کی ٹیس کسک جو میرے من سے لپٹی ہوئی تھی اُس کی نرم پتیاں میرے دل کی دیواروں پر بکھر رہی ہیں جو اب سخت نہیں رہی ہیں۔ ہم تو مٹی کے پتلے ہیں، فانی ہیں۔ لیکن ہر کے نیچے حاصل ہونے والا ایک اس لمحے کا گیان امر ہے۔ میرے سامنے کھڑکی میں لوہے کی سلاخیں عمر وہی گڑی ہیں اور اُس کے بعد جالی ہے لیکن اب مجھے ان سے باہر نکل کر زور زور سے پھڑپھڑاتے ہوئے پرندوں کی طرح اڑ کر جانے کی ضرورت نہیں۔ ہم کہیں بھی رہیں اور کیسے ہی حال میں ہوں، وہ ایک لمحہ جو تیرے اور میرے پریم کا حاصل ہے امر گیان کی صورت میں میرے پاس بھی ہے اور تیرے پاس بھی ہوگا۔

مٹی کے تیل کا چولھا

قیوم راہی

گھر اب زیادہ دور نہیں رہ گیا تھا۔ اور وہ وہاں پہنچنے کے لئے بیتاب سا ہو رہا تھا۔ اپنی طرف سے تو وہ قدم تیز تیز اٹھا رہا تھا لیکن راستے کی رکاوٹوں کا کیا کرتا جو اسے ہر موڑ اور ہر چوراہے پر تھوڑی دیر کے لئے روک دیتی تھیں۔ چند برس قبل ایک سڑک کراس کرتے ہوئے اس کا موٹر رکشا سے معمولی سا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ تب وہ کتنے ہی دنوں صاحبِ فراش رہا تھا۔ اسی دن سے وہ سڑک پار کرنے میں بڑی احتیاط سے کام لینے لگا تھا۔ اس وقت بھی اس سڑک پر ٹریفک کا بے پناہ رش تھا، جسے پار کر کے اسے ایک نئی تعمیر ہونے والی کالونی میں داخل ہونا تھا، کہ یہی راستہ اس کے گھر کے فاصلے کو سب سے زیادہ کم کر دیتا تھا۔

وہ تیز رو ٹریفک کے گزر جانے کے انتظار میں ایک گھنے درخت کے نیچے کھڑا تھا۔ تھکا تھکا سا، اور کسی حد تک افسردہ بھی ——— کچھ ہی دیر پہلے تو کم مائیگی کے احساس کا ایک اور بھونچال آیا تھا جس کے باعث اس کے اندر کچھ مزید ٹوٹ پھوٹ ہو گئی تھی۔

وہ اپنے ایک قریبی عزیز صدیقی صاحب کے بنگلے پر ان سے ایک رسمی ملاقات کے لئے گیا تھا۔ اس شہر میں ان کا حال ہی میں تبادلہ ہوا تھا لیکن وہاں اور تو بہت کچھ ہوا لیکن "ملاقات" نہ ہو سکی۔ صدیقی صاحب جو ایک اعلیٰ افسر تھے، سلام علیک اور ایک دو مختصر سی پُر تکلف باتوں کے بعد اپنے سجے سجائے ڈرائنگ روم میں بیٹھے زیادہ تر اپنے ہم مرتبہ دوستوں سے باتیں کرتے رہے یا ٹیلیفون پر بولتے ہوئے سننے لگتے رہے۔ ان پُر لطف باتوں میں وہ ایسے گم رہے کہ ان کو آدابِ محفل کا بھی ہوش نہ رہا، چنانچہ انھوں نے اپنے دوستوں سے اس کا تعارف تک نہ کرایا۔ اور یوں وہ سب سے الگ تھلگ چپ بیٹھا وہاں کی چیزوں کو تکتا رہا ——— اسی دوران اس پر انکشاف ہوا کہ ہنسی ٹھٹھول سے گونجتے ہوئے اس کمرے میں اس کا کوئی وجود نہیں ——— اور اگر کچھ دیر مزید یہاں بیٹھا رہا تو اس کے لئے سانس لینا تک دوبھر ہو جائے گا ——— چنانچہ وہ اندر ہی اندر کھولتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ صدیقی صاحب نے ایک خاص ادا سے دیکھا اور مسکراتے ہوئے اس کو خدا حافظ کہہ دیا۔ اور یوں وہ اس "حبس آلود" ماحول سے باہر نکل آیا۔

ٹریفک کا زور شور کم ہوا تو اس نے اطمینان سے سڑک پار کر لی۔ اسی وقت اسے سامنے اسکوٹر پر سوار اس کا ایک دیرینہ واقف کار حنیف نظر آ گیا۔ پہلے حنیف کے پاس سائیکل ہوا کرتی تھی۔ جب بھی سرِ راہ دونوں کا آمنا سامنا ہو جاتا حنیف سائیکل روک کر نیچے اتر جاتا اور اس کی خیر خیریت معلوم کرنے لگتا۔ اسی خیال سے اس وقت بھی وہ حنیف کے انتظار میں سڑک کے کنارے کھڑا ہو گیا۔ ویسے بھی اسے ایک طویل عرصے کے بعد حنیف سے ملنے کا موقع مل رہا تھا لیکن حنیف نے جب اسے دیکھا تو اسکوٹر کی رفتار تیز کر دی اور نگاہیں بچا کے آناً فاناً اس کے قریب سے گزر گیا ——— اور وہ کتنے ہی لمحے پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ حیران حیران سا کھڑا رہا۔ پھر اس نے دیکھا ایک تیز رفتار اسکوٹر اسے روندتا ہوا گزر گیا ہے اور وہ زمین پر پڑا سسک رہا ہے۔ دریدہ بدن ——— لہولہان ——— اس نے ایک دکھ بھرا سانس لیا اور دھیرے دھیرے کالونی کے درمیان سے گزرنے والی سڑک پر چل پڑا۔

کچھ عرصے سے وہ مسلسل اپنے بیشتر دوستوں، احباب اور واقف کاروں سے دور ہوتا جا رہا تھا ——— ویسے بھی اس کا میل ملاپ زیادہ تر یک طرفہ ہی تھا یعنی ساری گرم جوشی بس اسی کی طرف سے تھی ——— وہ جانتا تھا زمانہ اسی کی قدر اور عزت کرتا ہے جس کی کوئی سماجی حیثیت ہو ——— اور جب

وہ کسی کے کچھ کام ہی نہیں آسکتا تو پھر کوئی اسے کیوں اہمیت دے۔ اسی اذیت ناک احساس کے زیر اثر اس نے بھی رفتہ رفتہ خود کو سب سے الگ تھلگ سا کر لیا تھا۔ صدیقی صاحب تو سارے خاندان میں بڑے خوش اخلاق اور ملنسار کہلائے جاتے تھے اور طویل مدت کے بعد ان سے اس کی یہ پہلی ملاقات تھی۔ اسی لئے وہاں وہ خاصے خوشگوار موڈ میں گیا تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ اس جگہ سے بھی اسے گھائل ہو کر لوٹنا پڑے گا۔

"اسلام علیکم انکل"

وہ جیسے کوئی خواب دیکھتے دیکھتے جاگا ہو۔ اس نے دیکھا اس کے بیٹے کا ایک ہم جماعت نئی سائیکل پر سوار تیزی سے اس کے پاس سے گزر گیا تھا، اور اس کی بدحواسی کا یہ عالم تھا کہ وہ سلام کا جواب دینا تک بھول گیا تھا ——— لڑکا اس کی آنکھوں سے اوجھل ہوا تو اس نے ایک حسرت سے اِدھر اُدھر نئی تعمیر شدہ، رنگ برنگی عالی شان عمارتوں کو دیکھا، جن کے عقب میں سورج غروب ہو رہا تھا ——— تب اسے یہ شام بڑی بے رنگ معلوم ہوئی ——— اداس اور بجھی بجھی سی شام اس کی نگاہوں میں اس کے بیٹے کا معصوم چہرہ گھوم گیا جو اس سے سائیکل کی فرمائش کرتے کرتے جب سادھ چکا تھا اور جس نے اب اپنی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کو بھی صبر کے کھلونے سے بہلانا شروع کر دیا تھا ——— پھر اس کی بیٹی نے اس کی گردن میں اپنی ننھی ننھی باہوں کا گھیرا بناتے ہوئے کہا "ابو ——— میرے لئے سنہری بالوں والی گڑیا لا دیجئے۔" گڑیا جو اس کی بچی کے قد کی تھی اور جس کو خریدنے کے لئے پورے سو روپوں کی ضرورت تھی ——— پھر تھوڑی دیر بعد اس کی بیوی کا چہرہ اس کے سامنے آگیا۔ اُڑی اُڑی رنگت، سوچوں میں ڈوبی ہوئی آنکھیں ——— وہ کبھی کوئی فرمائش نہیں کرتی، ہر حال میں اس سے تعاون کرنا اپنا فرض سمجھتی ہے کتنی صابر و شاکر کتنی مجبور و بے بس اور مظلوم ہے وہ ——— بے چاری ——— اس کے اندر سے ایک آہ سی نکلی ——— لیکن وہ بھی تو کچھ کم مظلوم نہیں تھا۔ وہ جو دن رات تفکرات کی آنچ میں جھلستا رہتا تھا اور باوجود مسلسل ناکامیوں کے اپنی معاشی حالت کو بہتر بنانے کے لئے ہاتھ پیر مارتا رہتا تھا صدیقی صاحب سے ملنے کا ایک مدعا یہ بھی تو تھا کہ شاید وہی اپنے اثر و رسوخ سے اسے کوئی پارٹ ٹائم کام دلا سکیں۔ لیکن انھوں نے تو پہلے ہی دن اس کی ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔

جب وہ اپنے چھوٹے سے گھر کے چھوٹے سے آنگن میں داخل ہوا تھا تو اس کا بیٹا کمرے میں بیٹھا کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا بیوی پرانا سوئٹر اُدھیڑ رہی تھی اور بچی اون کا گولا بنانے میں مگن تھی۔ وہ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ اس کی بیوی اپنا کام ادھورا چھوڑ کر فوراً ہی اس کے پاس چلی آئی اور بولی "اچھا ہوا جو آپ اس وقت آگئے۔ سامنے والی کئی بار بلوا چکی ہے۔"

"کیوں؟"

"نیاز نذر کا سلسلہ ہے۔ ختم پڑھا جا رہا ہے۔"

"تب تو ضرور جانا چاہیئے تمہیں۔"

"اور ہاں، صدیقی ماموں سے کیا بات چیت ہوئی آپ کی؟"

"بات کیا ہوتی ——— مل آیا بس۔"

"اور ممانی .....؟"

"ممانی ———؟"

"ہاں۔"

"ان کو تو میں نے دیکھا ہی نہیں، پھر کیا بتاؤں تمہیں ان کے بارے میں۔"

اس کی بیوی نے اس کے بگڑتے ہوئے تیوروں کو بھانپ کر بات کو وہیں ختم کر دیا اور بچی کو لے کر پڑوسن کے گھر چلی گئی۔

اس نے لباس تبدیل کر کے اپنے ناتواں سے جسم کو بستر پر گرا دیا۔ کتنی خاموشی تھی گھر میں ——— روح میں خنجر کی طرح اتر جانے والی خاموشی ———

وہ جسے زندگی کی چہل پہل اور ہماہمی کہتے ہیں اس کے گھر میں ایک عرصے سے مفقود تھی۔ یہاں کا تو ہر فرد اپنے وجود کو کسی کونے کھدرے میں چھپائے، اپنے خیالوں کی کنڈلی میں دھونی رمائے بیٹھا رہتا تھا۔ وہ اس ماحول کا مدت سے عادی تھا لیکن اس وقت نہ جانے کیوں اسے یہ سائیں سائیں کرتا ہوا گھر بڑا سونا اور اجاڑ سا لگا۔ پھر اسے محسوس ہوا کہ دھیرے دھیرے اس کا اپنا وجود بھی اس پر اسرار ویرانی میں تحلیل ہوتا جا رہا ہے۔ اس نے آنکھیں بھینچ لیں۔ ایک دو بار کروٹیں بھی لیں لیکن وہ جو اندر ہی اندر ایک اضطراب کی رو سی دوڑی ہوئی تھی۔ اسے بدستور بے آرامی کی حالت میں مبتلا کئے ہوئے تھی۔ اور تو اس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا سوائے اس کے کہ چائے بنا کر ہی پی لی جائے۔ اس خیال کے آتے ہی اس کے نڈھال بدن میں ایک نئی طاقت عود کر آئی۔ وہ جلدی سے اٹھا اور باورچی خانے میں چلا گیا۔

باورچی خانے میں پہنچتے ہی اس کی پہلی نظر کونے میں رکھے ہوئے کیروسین آئل کے چولھے پر پڑی، سولہ بتیوں والے گول چولھے پر جو گرد سے اٹا ہوا ٹیڑھے میڑھے انداز میں رکھا ہوا تھا۔ ایک دم اس کی ساری پھرتی دم توڑ گئی۔ وہ سب کچھ بھول کر صرف چولھے کو ہی تکتا رہ گیا ——— چند لمحوں بعد جب وہ بوجھل سانسوں کے ساتھ پیڑھی پر بیٹھا تو اسے معلوم ہوا جیسے اس کے سینے میں کوئی شے پگھلنی شروع ہو گئی ہے۔

سات برس قبل اس کی بیوی بڑی چاہ کے ساتھ اس چولھے کو خرید کر لائی تھی۔ باہر سے تو وہ اس کو صاف ستھرا رکھتی ہی تھی، لیکن تھوڑے تھوڑے دنوں کے بعد اس کا سارا تیل نکال کر اندر سے بھی اس کی اچھی طرح صفائی کرنا اس کا معمول تھا جس کے باعث اس کی بتیاں زیادہ دنوں تک محفوظ رہتی تھیں۔ کچھ عرصے قبل جب اس کی گلی میں سوئی گیس کا پائپ پڑ گیا تو ہر گھر نے اس سے استفادہ کیا۔ تب اس نے بھی گیس کے کنکشن کے لئے درخواست دیدی کہ اس کا باورچی خانہ گلی کے بالکل نزدیک واقع تھا۔ یوں اس کام پر زیادہ خرچہ نہیں آتا تھا اور اب جب کہ سات دن قبل اس کے باورچی خانے میں بھی سوئی گیس کا چولھا جلنے لگا تھا، اس کی بیوی نے پرانے مٹی کے تیل کے چولھے کو کسی بیکار شے کی مانند ایک کونے میں ڈال دیا تھا۔

اس نے ایک بار سوئی گیس کے صاف ستھرے رنگین چولھے کی طرف دیکھا اور پھر اس کی نگاہیں مٹی کے گرد آلود چولھے پر جم گئیں ——— ایکا ایکی اسے احساس ہوا کہ وہ کسی گہرے صدمے سے دوچار ہو گیا ہے۔ افسوس کی ایک لہر اس کے سارے وجود میں سرایت کر گئی۔ اس نے یونہی کچھ دیر کے لئے ادھر ادھر دیکھا ——— سونا آنگن ——— حسرت و یاس کی تصویر بنے ہوئے در و دیوار مختصر سے طواف کے بعد نگاہیں پھر اپنے مرکز کی طرف لوٹ آئیں۔

اور اس بار اسے یہ داغدار چولھا بڑا ہی اکیلا، سوگوار اور دکھی معلوم ہوا ——— یہ میلا، بے رونق اور اداس چولھا ——— جو بے ڈھنگے پن سے ایک کسمپرسی کی حالت میں پڑا ہوا تھا۔ کوئی بھی تو اس کی طرف دھیان دینے کا روادار نہیں ——— کوئی بھی تو اس بھری دنیا میں اس کا غمگسار نہیں۔ کوئی بھی نہیں ——— اس کا جی چاہا وہ بڑھ کر پیار سے اس کو اپنی بانہوں میں بھینچ لے ——— اپنے سینے سے لگا لے۔ اس کے جذبات میں ایک کہرام سا مچ گیا۔

پھر یہ کہرام تیزی سے اس کی آنکھوں کی طرف بڑھا اور آنسوؤں میں ڈھل کر باہر نکلنا شروع ہو گیا۔

تلاش

انور سجاد

تیز سرد ہوا۔

روشنی، وہ روشنی جو مصنوعی روشنی کے نہ ہوتے ہوئے، انتہائی اندھیروں کے باوجود، سیاہ آسمانوں سے اتر کے اشیا کے بیرونی خطوط بناتی ہے۔

غلام گردشوں، راہداریوں، برآمدوں، محرابوں، بند دروازوں، کھڑکیوں کے روزنوں میں ٹرن ٹرناتی تیز سرد ہوا۔

گلیوں، بازاروں، سڑکوں کو رات سونگھ گئی ہے، سارا شہر رات کے ڈنک کی لذت سے مدہوش پڑا ہے۔

شہر کے سارے راستے کھدے پڑے ہیں جیسے شہر والوں نے شہر کی تلاش میں کھود ڈالے ہیں — اسی راستے پر گم ہوا تھا۔ وہ جھکا ہوا انقلاب سیاہ آسمانوں کی سرمئی روشنی میں اس کے وجود کے بیرونی خطوط لمحہ بھر کے لئے کپکپاتے ہیں۔

— یہیں تو کھویا تھا کہیں۔

وہ جیس کو اپنے گرد اور بھی لپیٹ لیتا ہے۔ تاریکی کی آواز بہت خوف زدہ کر دیتی ہے۔ اس سے فرار ممکن نہیں۔ یہ پلک جھپکتے میں وجود کے گرد محیط ہو جاتی ہے، سرد ٹرن ٹرناتی ہوا کی طرح۔ بہتے ہوئے لمحے ... کو آنکھوں کے فریم میں ساکت کر دیتی ہے۔ کی ہوئی محبتیں، نفرتیں، ہمبستریاں موت کی سنسنی روشنیوں میں سر اٹھائے وہ موت، جو کل آئی تھی، وہ موت جو ... تے ... ۔

— یہیں تو کھویا تھا کہیں۔

لیکن تاریکی کی یہ سرد ٹرن ٹرناتی آواز چیخ کو گلے میں دبا دیتی ہے، پرندوں کے حلق سے ابھرتی چیخ جیسے اس کے گرد محیط اپنا ہی ہوا کا سمندر اسے وہیں گھونٹ دیتا ہے۔ تب یہ دبی دبی گھٹی گھٹی چیخ چہرے کو زخ کر دیتی ہے۔ آنکھوں کے گرد حلقے اور گالوں میں گڑھے پڑ جاتے ہیں۔ فاقہ زدہ چہرہ، کہ دیکھنے والوں کو خوف آنے لگتا ہے۔ فاقہ زدہ خاموشی کی تاریکی اتنی ہی خوف زدہ کر دینے والی ہوتی ہے۔

— یہیں تو کھویا تھا کہیں۔

تاریکی کی یہ سرد ٹرن ٹرناتی آواز سیلاب کی طرح امڈتی ہے اور راستوں کو اکھاڑتی کھودتی ان میں شہروں کو دفن کرتی جھاگ کی پھنکار میں مسلسل جاری ہو جاتی ہے۔

— یہیں تو کھویا تھا کہیں۔

وہ ہاتھ میں پکڑی ٹارچ بجھا کے جیب میں رکھ لیتا ہے۔ ہاتھوں میں سردی کو رگڑتا ہے۔ جیب سے سگریٹ نکال کر منہ میں لگا لیتا ہے۔ اس کے قریب سے ایک سایہ گزرتا ہے۔ وہ پلٹ کر اس سے پوچھتا ہے

— ماچس ہوگی؟

— نہیں۔

سایہ رک جاتا ہے۔

سگریٹ اس کے منہ سے چھوٹ کر گر جاتا ہے۔ گرم بھاپ یکدم منہ سے نکل کر تاریک فضا میں تحلیل ہو جاتی ہے۔ وہ فوراً جیب سے ٹارچ نکال کر آواز کا چہرہ روشن کرتا ہے۔

——اوہ!

اسے دھچکا سا لگتا ہے۔ وہ ٹارچ فوراً بجھا کر جیب میں رکھ لیتا ہے۔ جھک کر زمین سے سگریٹ اٹھاتا ہے۔ سگریٹ کو دو انگلیوں کے درمیان دبا کے ہونٹوں پر لپ سٹک میں بھیگی مسکراہٹ سے منہ موڑ لیتا ہے۔

——تم اس وقت، اتنی سردی میں کیا ڈھونڈ رہے ہو؟ اتنے اندھیرے میں؟

——یہیں، یہیں کہیں، یہیں کہیں۔

وہ ڈرا ڈرا سا ہو جاتا ہے۔ وہ اس کے قریب ہو کر اس کے کان میں سرگوشی کرتی ہے۔

——میرے ساتھ آؤ۔

——کیوں؟

——شاید میرے ہاں مل جائے۔

——کیا؟

وہ کھلکھلا کر ہنس دیتی ہے۔ وہ گھبرا کے اپنے گردوپیش دیکھتا ہے۔ گشت کے سپاہی تو کیا دور دور تک کوئی نظر نہیں آتا۔ سارا شہر سرد رات کے ڈنک کی لذت سے مدہوش پڑا ہے۔

——تمہیں کیا چاہیے؟

——ماچس۔

——ماچس میں آگ اور روشنی بند ہوتے ہیں نا؟ آؤ میرے ساتھ۔

وہ جیب میں سگریٹ کو واپس رکھتا ساکت ہو جاتا ہے۔ تاریکی میں سرد، زن زناتی ہوا، چیخ کو اس کے گلے میں دبا کر اس کے چہرے کو مسخ کر دیتی ہے، جیسے پرندے کے حلق سے ابھرتی ہر چیخ، جیسے اس کے گرد محیط، اپنا ہی ہوا کا سمندر اسے وہیں گھونٹ دیتا ہے۔

——آؤ، تمہیں پتہ نہیں میں کیسی ہوں۔

——مجھے پتہ ہے۔ سب ایک جیسی ہوتی ہیں۔

——تم نے میرا چہرہ نہیں دیکھا۔ میرا جسم۔

——میں نے دیکھا ہے تمہارا چہرہ —— سب کی طرح بھوکے، فاقہ زدہ چہرے پر میک اپ کا ماسک۔

——آؤ نا۔ بہت اچھے لگے ہو مجھے۔ کھوئے کھوئے گم گم، گونگے گونگے سے۔

وہ اس کی طرف دیکھتا ہے۔ اس تاریک روشنی میں جو سیاہ آسمانوں سے اتر آتی ہے، اکھڑے ہوئے راستوں کے کنارے کھڑے دونوں کے بیرونی خطوط واضح ہو جاتے ہیں۔ سرد، تیز، زن زناتی ہوا، اکھڑے ہوئے راستوں کے پتھر مٹی کرچیاں بن کر اس کے مساموں میں سرایت کر جاتی ہے۔

——آؤ نا۔ ماچس جس میں آگ اور روشنی دونوں بند ہیں۔

——میں، میں تمہیں چھو کر دیکھ سکتا ہوں؟

——نہ، میں شرما جاؤں گی۔

وہ مسکراتی ہے۔ اس کے لپ سٹک میں ملفوف ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ زخم سے ابھرتے لہو کی طرح پھیل کر جم جاتی ہے جو اسے نظر نہیں آتی۔

——مجھے ماچس چاہیے۔

وہ اس کے ساتھ اس کے گھر آ جاتا ہے۔ دروازے کا کھڑاک سن کر کسی کمرے سے کمزور سی لرزتی، سرد رات کی ڈسی بوڑھی آواز آتی ہے۔

—— آ گئی ہو؟

—— ہاں، ہاں

وہ بجلی کا سوئچ آن کرتی ہے۔ بجلی کی رَو غیر معین ہے کبھی کم کبھی زیادہ۔ بلب، جگنو کی پشت، سرد ٹمٹماتا ہوا، وہ پلٹ کر فوراً دروازہ بند کرتی ہے لیکن تاریک،

سرد، تیز زن زناتی ہوا، کھدے ہوئے راستوں کی کرچیوں کو کمرے کے ایک ایک مسام میں جڑ دیتی ہے۔ وہ اپنا کھیس اتار پھینکتا ہے۔

وہ برقع اتار کے اس کی طرف دیکھ کے مسکراتی ہے، اس کے سرخ ہونٹوں پر مسکراہٹ ایک بار پھر زخم سے ابھرتے لہو کی طرح پھیل کر جم جاتی ہے۔ وہ جپ، تیزی سے

بڑھ کر اس کا میک اپ چکھتا ہے، اس کی آنکھوں کے گرد حلقے اور گالوں کے گڑھے اور بھی نمایاں ہو جاتے ہیں۔ لڑکی ذرا خوف زدہ ہو جاتی ہے۔ فاقہ زدہ خاموشی کی تاریکی تنی

سی خوف زدہ کر دینے والی ہوتی ہے۔ ہونٹ، چہرے خون آلود اور جسم کھلے زخم۔ ہاتھ لا تعداد ہاتھ جن میں سٹین گنیں، رائفلیں، ہینڈ گرنیڈ۔

—— موت۔

وہ چیختا ہے۔ اس کی چیخ کو سرسراتی ہواؤں میں جھومتے سندر بنوں، دھان کے لہراتے کھیتوں، مچھلیوں کے گیتوں سے گونجتی سونا ندیوں سے امڈتے طوفانوں، سائیکلون

اس کے حلق میں دبا دیتے ہیں، جیسے پرندے کے حلق میں ابھرتی چیخ کو اس کے گرد محیط، اپنا ہی ہوا کا سمندر اسے وہیں گھونٹ دیتا ہے۔

—— موت ہی تو نہیں آتی۔

وہ زیر لب کہتی ہے۔ وہ بستر میں گھس چکی ہے۔ لحاف کو اپنی گردن تک کھینچ لیتی ہے۔ اس کے دانت کٹکٹاتے ہیں۔

—— آ جاؤ سردی بہت زیادہ ہے —— باہر ٹھٹھر جاؤ گے۔

وہ پلکیں جھپکتا اپنے پیٹ کو تھامتا ہے جس میں گذرے ہوئے اور آنے والے کل کی محبتوں، نفرتوں کے فلسفے، تاریخ، جغرافیے، چیخ بن کر پیٹ میں اگی

جل کر ری میں پھنسے پھڑپھڑاتے ہیں۔

چیخ کا حلق میں دبایا جانا بہت بڑا عذاب ہے۔

اس عذاب سے نجات پانے کے لئے وہ پھر جیب سے سگریٹ نکال لیتا ہے۔ ادھر اُدھر دیکھتا ہے۔ وہ اسے مشورہ دیتی ہے۔

—— سگریٹ بعد میں۔

اگر اس چیخ کو جل کر ہی آزاد کر دیں، تو ریل گاڑیاں پٹڑیوں سے اتر جائیں گی، بسیں، کاریں، رکشے، انسان بے قابو ہو کر آپس میں ٹکرا جائیں گے، یہی، کنواری

انجانی چیخ، پرانی بوسیدہ کائنات میں معلق پتھرائے ہوئے ستاروں کو ایک دوسرے کے ساتھ متصادم کر دے گی جس سے نئی کائنات کے جنم کے امکانات روشن ہوں؛

—— کیوں نہیں۔

وہ خود سے کہہ کر یکدم دروازہ کھولتا ہے۔ سرد، تیز زن زناتی ہوا اس کے سینے پر وار کرتی ہے کھدے ہوئے راستوں کی کرچیاں اس کے ایک ایک مسام میں سرایت کر جاتی ہیں

—— میں جا رہا ہوں۔

—— رک جاؤ۔

لمحہ بھر خاموشی۔

بستر میں نیم برہنہ، نیم دراز لڑکی کی آنکھوں کے گرد حلقے گہرے ہو جاتے ہیں، گالوں کے گڑھے نمایاں ہو جاتے ہیں، ہونٹوں پر جمے لہو کی پپڑیاں اُدھڑ جاتی

ہیں۔ اس کا چہرہ مسخ سا دکھائی دینے لگتا ہے۔ فاقہ زدہ خاموشی اتنی ہی خوفزدہ کر دینے والی ہوتی ہے۔

وہ کچھ کہنے کی خواہش میں، کچھ کہے بغیر، اس گھر سے نکل آتا ہے۔ دور، تا حد نگاہ تمام راستے کھدے پڑے ہیں جیسے شہر والوں نے شہر کی تلاش میں کھود ڈالے

—— یہیں تو کھویا تھا کہیں۔

وہ ہونٹ میں لگائے سگریٹ کو انگلیوں میں پکڑ کے مسل دیتا ہے۔ جیب سے ٹارچ نکال کر جلاتا ہے اور تلاش میں پھر سے سرگرداں ہو جاتا ہے۔

اچھری

عزیز ملک

وہ ایک فربہ اندام گول مٹول سی بازارن تھی ـــــ سستا کھلونا جسے کوئی بھی خرید کر جی بہلا لے۔ پیسے کی افتاد کہیے یا طبیعت کی فطری نہاد کہ مسکرا کر بات کرنا اس کا سبھاؤ تھا۔ وہ سنبھل کر بات کرتی، لہجہ دھیما اور اطوار میں ٹھہراؤ تھا۔ اکثر تنہا چلتے ہیں اس کی کشادہ پیشانی پر گہری سلوٹیں نمودار ہو جاتیں لیکن بھاؤ تاؤ کے وقت اس کا ماتھا اس طرح سپاٹ نظر آتا جیسے کاغذ پر کھینچی ہوئی پنسل کی لکیریں کوئی ربڑ سے مٹا دے۔ بھاؤ نہ بنتا چپکے سے اپنی راہ لگتی۔ معاملہ ٹھہر جاتا تو بشنی کی انگلی پکڑ کر اس طرح ساتھ چلتی کہیں راہ گم نہ کر جائے۔ خوش فکرے جوان اسے دیکھ کر آوازے کستے۔ ایک کہتا "موٹی بازارن ہے تھوڑی" دوسرا چہکتا "ذرا سڑک پر لڑھکتا ہے۔ اگاڑی تکیہ دیکھنا جس کے سہارے تھکے ہارے مسافر کمر سیدھی کر لیتے ہیں۔" وہ سب کی پھبتیاں سنتی اور مستی کی دھڑی لگے نچلے ہونٹ کو لٹکا کر انگوٹھا دکھاتی گذر جاتی۔

میں جب شملہ پوسٹ ہوا تو پہلی بار ایک روز چھٹی کے وقت اسے ہیڈ کوارٹر کے صدر دروازے کے باہر میلی سی ساڑھی میں ملبوس دیکھا تھا۔ سردی کے دن تھے۔ اس نے ساڑھی پر سیاہ فر کا لمبا کوٹ پہن رکھا تھا۔ بائیں ہاتھ میں پرس۔ دائیں میں ایک کاپی تھی جس میں ادھار کی رقمیں درج تھیں۔ وہ غالباً حساب دوستاں در دل کی قائل نہ تھی۔ اس لئے وعدہ فردا کی تمام رقوم کھاتے میں درج کر لیتی اور ہر ماہ کی یکم کو تقاضہ کے لئے پہنچ جاتی۔ کچھ لوگ وعدے کے پکے قول کے سچے اس کی پائی پائی چکا دیتے۔ کچھ ادھار مار رکھتے، نظریں بچا کر نکل جاتے۔ کچھ لوگ اس کی فطرت کو جانتے تھے کہ بدمعاملہ اور بدزبان نہیں ہے۔ منہ در منہ کہ موسم میں اب نہیں تو اگلے مہینے حساب صاف کر دیں گے۔

اس کے تقاضے کی یہ نرالی کاروباری ادا مجھے بہت بھلی لگی۔

وہ غلط العام یا، روزمرہ کی طرح زبانوں پر چڑھ گئی تھی۔ حلقۂ یاراں میں اکثر اس کا ذکر چھڑ جایا کرتا۔ کردار جاندار ہو تو گفتار کا موضوع بن ہی جاتا ہے ـــــ میں غور سے اس کے بارے میں باتیں سنا کرتا۔ اس کے گھر بار نہیں تھا۔ ماں باپ تھے نہ بہن بھائی۔ شاید وہ گندے نالے کے کنارے گھاس کی طرح اگ آئی تھی۔ ایشری دیوی اس کا نام تھا جو کثرت استعمال سے اچھری بن گیا تھا۔ سنجولی راؤنڈ کے نشیب میں اس کی چھوٹی سی جھگی تھی۔ اکثر بشنی وہاں پہنچ جاتے یا وہ تماشبینوں کے ٹھکانوں پر چلی جاتی اور دست بدست دگرے گھائی جاتی اور شملہ کی نیلی شاموں میں کلالوں کی دکانوں سے ٹھرا پی کر بہک جانے والوں کے لئے گزک کا کام دیتی۔

وہ وشنو ہوٹل سے بھی بھوجن کر لیتی اور ہندو ہونے کے باوجود مسلم ہوٹل میں بیٹھ کر مہاں پرشاد کی سالم پلیٹ بھی چٹ کر جاتی۔ یہاں مسلمان یا ہندو کا دھرم نہیں انسان سارا دھندا اپنی پیٹ ہی کے لئے کرتا ہے۔

ان دنوں آزادی کی تحریک زوروں پر تھی۔ مہینے میں ایک آدھ بار کانگرس کے اجلاس ہوا کرتے۔ ستمبر کے دن سہ پہر کا وقت تھا۔ گرمی ڈھل چکی تھی پر زنانے دار سردی ابھی نہیں آئی تھی۔ گندم منڈی کے میدان میں جلسے کا جماؤ اور کھدر پوشوں کا خاصا مجمع تھا جسے کنٹرول کرنے کے لئے اسٹیج سے اعلانات ہو رہے۔ دیش بھگت لیڈر ابھی آئے نہیں تھے۔ ہر شخص کی نگاہ دائیں بائیں گھوم رہی تھی۔ اتنے میں سڑک کے رخ ڈھلوان پر ایک دیوار کے سہارے اچھری بھی آکر کھڑی ہو گئی۔ وہاں موج میلہ دیکھنے اور لابھ اٹھانے والے اور بھی بہت سے تماش بین کھڑے تھے۔ اچھری کا آنا

ایک تماشہ ہوگیا۔ دہکتے انگاروں پر جیسے کسی نے چپکے سے دانۂ سپند چھوڑ دیا۔ پنڈال میں ہر طرف طوفان ہاؤ ہو بپا ہوگیا۔ سیٹیاں، تالیاں، قہقہے اور نعرے گونجنے لگے۔ ایسا لگتا جیسے گنگا کی لہروں سے کوئی جل دیوی پریم کا سندیس لے کر ہر کے دوارے آ ٹھہری ہے اور سب بھکاری اپنی اپنی نگاہوں کا دامن پھیلا کر اس کی سندرتا کا دان مانگ رہے ہیں۔ وہ کچھ جھینپی لجائی شرمائی سی کھڑی گھورنے اور آوازے کسنے والوں کو خاموش تکتی یہ سوچ رہی تھی کہ بلندی پر سے پستی کا نظارہ کتنا سہانا ہوتا ہے۔ آس پاس جو لوگ کھڑے تھے وہ اس کے قریب تر ہوتے گئے۔ نئے آنے والوں میں سے بھی اکثر وبیشتر وہیں جمنے گئے۔ اتنے میں ایک منچلا کھانسا۔ دوسرے نے کہنی سے ٹہوکا دیا۔ تیسرے نے دیٹ یا کہہ کر چوٹی کھینچی۔ عورت ذات تو تھی بے چاری نے نوچا کھوچی سے گھبرا کر زنٹ سے بھاگ نکلنے کی کوشش کی تو کسی نے شاڑھی کے پلو پر پاؤں رکھ دیا۔ وہ منہ کے بل آ رہی کٹ ناپ سے انبر چھوٹ پڑے اور کوہ شوالک کی چوٹیاں نکھری دھوپ میں نمایاں ہوگئیں —— شاید بھوکی جنتا کو کام لوبھ کا ہیضہ ہوگیا تھا کہ دھرت ماتا بدقماسی میں لباس سے فارغ ہوگئی۔ ایک جتی ستی مہاپرش نے کہا اسے یہاں سے چلتا کرو۔ بدمعاش کسبی عورتوں کو یہاں آنے نہیں دینا چاہیے آکر شرارتیں کرتی ہیں۔

اس واقعہ سے چار پانچ ماہ بعد ایک شام میں اپنے دوست قریشی کے ساتھ ٹہلتے ٹہلاتے سنجولی کی طرف نکل گیا۔ قریشی کہنے لگا، آؤ ذرا رفیق دہجڑے کے ہوٹل تک چلتے ہیں۔ وہاں چائے پئیں گے اور مرزا معصوم بیگ بھی وہاں ضرور آتا ہے، مل گیا تو اس سے مجھے اپنا پارکر کا قلم واپس لینا ہے۔

رفیق دہجڑے نے بتایا کہ مرزا بھی ابھی جھگیوں کی طرف گیا ہے کیونکہ آج کل مس ایشری اس سے انگریزی پڑھ رہی ہے۔

ہوٹل سے روانہ ہوکر ہم جاکھو راونڈ کی سمت مڑ گئے۔ کچھ ہی نشیب میں اچھری کی جھگی تھی۔ قریشی کہنے لگا آؤ مرزا سے مل ہی لیں۔ جھگی کا دروازہ بند تھا۔ قریشی نے شگستہ کواڑ کے سوراخ سے جھانک کر مجھ سے کہا "آ پیارے کر لے نظارے" —— میں نے دیکھا ایک چوبی صندوق پر لالٹین رکھی تھی جس کی مدھم روشنی میں اچھری اور مرزا صاف دکھائی دے رہے تھے۔ مرزا اس کی کتاب زندگی کے اوراق کو تاش کے پتوں کی طرح پھینٹ رہا تھا اور وہ پورے انہماک سے انگریزی زبان کا سبق پڑھ رہی تھی۔ قریشی مصر ہوا کہ کنڈی کھڑکا کر مرزا کو بلاتے ہیں۔ مگر میں نے روکا کہ اس وقت گوروکل میں انگریزی کا سبق شروع ہے۔ کسی کی پڑھائی میں دخل دینا قرین مصلحت نہیں۔

کچھ دن اور نکل گئے۔ ایک روز سنا کہ مرزا معصوم بیگ کی زوردار تبلیغ سے متاثر ہوکر اچھری بائی نے اسلام قبول کر لیا۔ یہی نہیں بلکہ اب وہ سچ مچ کی دلہن بن گئی ہے۔ گردن میں چندن ہار لٹکایا، ماتھے پر جھومر لہرایا، ہتھیلی میں مہندی رچائی، انگلیوں میں چھلے ڈالے، کلائی میں چوڑیاں بجیں، کانوں میں بالیاں سجیں، شہنائی کی صدا گونجی اور وہ مرزا کی صاحبیاں بن گئی۔

اگلے برس پاکستان قائم ہوا تو وہ بھی مرزا کے ساتھ لاہور آ گئی لیکن وہ سے والٹن کیمپ میں چھوڑ کر بتائے بغیر کراچی بھاگ گیا۔ آغاز فروری کی ایک بھیگی بھیگی شام تھی میں اور قریشی پارک میں گھاس پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ وہ کہیں سے ادھر آ نکلی۔ قریشی کو مرزا کے دوست کی حیثیت سے اچھی طرح جانتی تھی کہنے لگی "قریشی کیسی رت بدل گئی، ناؤ کا کھیون ہار بیچ منجدھار چھوڑ کر روپوش ہوگیا۔ مرزا تمہارا دوست ہے نا کہیں ملے تو میرا سلام کہنا، کتنے پیار سے کہا کرتا تھا، اچھری اب تم گھر بسا لو، بھری برسات میں بادل گھر کے آتے ہیں تو بارش ضرور برستی ہے۔ بارش تو برسے گی۔ ہاں مگر چھتری لگا لیں تو انسان بھیگنے سے بچ جاتا ہے، میں کرموں کی ماری دیشیا تھی، آسرا پاکر اس کی چھتری کے سائے تلے آ گئی لیکن امڈتے جذبات کی ایک ہی برکھا رت مشکل سے گذری ہوگی کہ چھتری کے چیتھڑے اڑ گئے۔" یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں سرخ ہوگئیں۔ آنسوؤں کے قطرے پچھلے پہر کی شبنم کے مانند ٹپکے اور اس کے چہرے پر بہہ نکلے۔

قریشی نے پوچھا —— "اب تو یہاں کیا کرتی ہے؟"

"وہی جو شملہ میں کیا کرتی تھی" —— اس نے آنکھیں پونچھتے ہوئے جواب دیا۔

"واپس کیوں نہیں چلی جاتی" —— قریشی نے کہا۔

"جاکر کیا کروں، وہاں اپنی جاتی کو کیا منہ دکھاؤں گی" —— اس نے کہا اور ایک اندوہگیں مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور جاتے جاتے کہہ گئی —— "قریشی تم بھی مسلمان ہو، تم ہی بتاؤ، یا مرزا ملے تو اسی سے پوچھنا کہ مسلمان ہوکر بھی کوئی کسی بے کس کو دھوکا دے سکتا ہے؟"

پے انگ گیسٹ

محمد منشا یاد

وہ اس گھر اتنے عرصے سے پے انگ گیسٹ کے طور پر رہ رہا ہے کہ اب وہ اسی کو اپنا گھر سمجھنے لگا ہے۔
وہ بھی اسے اپنے گھر کا فرد ہی سمجھتے ہیں۔

اڑوس پڑوس میں اکثر نئے لوگ آ گئے ہیں۔ ویسے بھی کسی کو یہ معلوم کرنے کی فرصت نہیں کہ اس گھر میں وہ کس حیثیت سے رہتا ہے۔ عام لوگ اسے گھر کا مالک ہی سمجھتے ہیں۔ وہ خود بھی اکثر بھول جاتا ہے کہ وہ گھر کا مالک ہے یا پے انگ گیسٹ۔ ویسے بھی لینڈ لیڈی بیگم حمید اور اس کی بیٹیوں کو اس نے کبھی غیر نہیں سمجھا اور نہ ہی کبھی حساب کتاب کے جھنجھٹوں میں پڑا ہے۔ اسے معقول تنخواہ ملتی ہے اور وہ جو کچھ کماتا ہے ان کے حوالے کر دیتا ہے اس کے بدلے میں وہ اس کی ہر طرح سے خدمت کرتے، اس کے آرام و آسائش کا خیال کرتے اور اس کی بے حد عزت کرتے ہیں اور ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ وہ اسے اجنبیت کا احساس نہ ہونے دیں لیکن وہ کچھ عرصے سے خود کو ہوم سک محسوس کر رہا ہے اور اس گھر سے اس کا دل اچاٹ ہوتا جا رہا ہے۔

اس کے مصروف دن میں کوٹھی کا بہترین حصہ ہے۔ دفتر سے واپسی پر کار کا ہارن سنتے ہی ملازم بیگ تھامنے کے لئے حاضر ہوتا ہے۔ فرصت ہو تو بیگم حمید ڈرائنگ روم کے دروازے پر آ کر مسکراہٹ سے اس کا استقبال کرتی ہیں۔ بیگم حمید کی جوان بیٹیاں دوپٹے ٹھیک کرتی ہوئی باری باری آ کر اسے سلام کرتی ہیں اور سلام کرتے ہی یوں الٹے پاؤں جلدی جلدی لوٹ جاتی ہیں جیسے آدمی فقیر کے سامنے سکہ پھینک کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ بس ایسی ہی باتوں سے کبھی کبھی اس کا دل اداس ہو جاتا ہے اور اسے اپنا گھر یاد آنے لگتا ہے۔

بیگم حمید کی مسکراہٹ اور اس کی بیٹیوں کے سلام وصول کر کے وہ اپنے کمرے میں پہنچتا ہے تو میز پر کھانا چنا ہوتا ہے۔ شروع شروع میں جب وہ پرہیزی کھانا نہیں کھاتا تھا اسے کھانے کے لئے ڈائننگ روم میں بلا لیا جاتا تھا مگر اب کھانا اس کے کمرے میں بھیج دیا جاتا ہے حالانکہ اس کا جی چاہتا ہے وہ ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھائے۔ کھانے کے ساتھ گپ شپ ہوتی رہے اور وہ ماں بیٹیاں اس سے ایسی باتیں کریں جن سے دفتر کے کام کی بوریت اور تھکن دور ہو جائے۔ مگر وہ سب اس کا اس قدر احترام کرتی ہیں کہ اس کی موجودگی میں بلند آواز سے بات بھی نہیں کرتیں۔ اس کے گھر میں داخل ہونے کے بعد ریڈیو کی آواز دھیمی کر دی جاتی ہے۔ وہ ایک دوسری سے سرگوشیوں میں باتیں کرتی ہیں اور دروازے کھولنے اور بند کرنے میں بھی اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ زیادہ شور نہ ہو۔

وہ کھانا کھا کر اپنے کمرے میں لیٹتا ہے تو اسے لگتا ہے جیسے وہ سجے سجائے بیڈ روم میں نہیں ویران قبرستان میں لیٹا ہوا ہے۔ شام کو وہ کمرے کی قید سے رہائی پا کر ٹہلتا ہوا کلب چلا جاتا ہے اور تھوڑی دیر کے لئے بھول جاتا ہے کہ اداسی کی چلچلاتی دھوپ نے اس کا بدن جھلسا دیا ہے لیکن جونہی وہ رات کو کلب سے باہر آتا ہے جمائیاں لیتی ہوئی تاریکی اسے چاروں طرف سے گھیر لیتی ہے۔ کلب کے صدر دروازے کے سامنے اکڑوں بیٹھی ہوئی اکتاہٹ کی خارش زدہ کتیا اس پر زور زور سے بھونکنے لگتی ہے۔ وہ گھر میں قدم رکھتا ہے تو در و دیوار سے آدم بو آدم بو کی آوازیں آتی ہیں۔ ہنستے بستے گھر

میں چپ کی صفِ ماتم بچھ جاتی ہے۔ دوپٹے ٹھیک کئے جاتے ہیں۔ فرش پر سلاموں کے سکے کھنکتے ہیں اور ٹیلی ویژن کا گلا رندھ جاتا ہے۔

رات کے کھانے کے بعد اس کا جی چاہتا ہے وہ سب یا ان میں سے کوئی اس کے پاس آئے اور اس سے باتیں کرے لیکن وہ سب اپنے اپنے کمروں میں چھپ جاتی ہیں۔ وہ کوئی کتاب اٹھا کر پڑھنے لگتا ہے اکتا جاتا ہے تو دوسری کتاب اٹھا لیتا ہے۔ کبھی کبھی تھوڑی دیر کے لئے بیگم حمید اس کی خیریت معلوم کرنے آ جاتی ہیں لیکن ان کی باتیں اس کے لئے غیر دلچسپ اور بور ہوتی ہیں۔ وہ گھر کے اخراجات، مہنگائی، خریداری، شادیوں اور لڑکیوں کے رشتوں کی باتیں کرتی ہیں پھر خود بھی جماہیاں لیتی ہوئی اکتا کر چلی جاتی ہیں، البتہ جب کبھی اس کی طبیعت اچھی نہیں ہوتی بیگم حمید کئی کئی بار اس کی مزاج پرسی کرنے آتی ہیں۔ ان کی بیٹیاں بھی باری باری آتی ہیں۔ ٹیلی فون کر کے فوراً ڈاکٹر کو بلا لیا جاتا ہے یا ہسپتال سے ایمبولنس منگالی جاتی ہے۔ ملازم کو سخت تاکید کی جاتی ہے کہ وہ رات بھر اس کے پاس رہے۔ وقت پر دوا پلائے پاؤں دبائے اور ایمرجنسی کی صورت میں بیگم حمید کو جگا کر اطلاع دینے میں تامل نہ کرے۔

بیمار ہو کر اس کے دل میں عجیب سی خواہش جاگتی ہے اس کا جی چاہتا ہے بیگم حمید خود اس کا سر دبائیں، آصفہ، رفیعہ اور فریدہ اس کے پاس رہیں اس سے باتیں کریں اور اپنے ہاتھ سے اسے دوا پلائیں لیکن پھر سے یاد آجاتا ہے کہ وہ اس گھر میں پے انگ گیسٹ ہے، اور گھر والوں کو اس کی تیمارداری اور خدمت گذاری کے علاوہ بھی بہت سے کام ہیں ان کی اپنی مصروفیتیں اور دلچسپیاں ہیں۔ بیگم حمید کو خریداریوں اور گھر کے کام کی نگرانی سے فرصت نہیں ملتی۔ پھر آئے دن کوئی نہ کوئی ملازم بیمار ہو جاتا یا چھٹی پر چلا جاتا ہے۔ بڑی لڑکیوں کے رشتے آ رہے ہیں اور بیگم حمید مہمانوں کی خاطر تواضع اور جہیز وغیرہ کی الجھنوں میں لگی رہتی ہیں۔ آصفہ کو فلموں اور گانوں سے بے حد دلچسپی ہے۔ وہ نئے نئے ریکارڈ اور ٹیپ جمع کرتی اور سنتی رہتی ہے۔ اُسے پتہ چلا ہے کہ وہ خود بھی اچھا گا لیتی ہے۔ شاید ناچ بھی لیتی ہو کیونکہ اس کا جسم رقص کے لئے بے حد موزوں نظر آتا ہے۔ اس کا جی چاہتا ہے جب اس کا کومل بدن تھرکتا اور لمبی سیاہ زلفیں رخساروں پر بکھری ہوں اور وہ بند کمرے میں اکیلی ناچ رہی ہو وہ اسے چھپ کر دیکھے۔ کئی بار وہ اس ارادے سے آصفہ کے کمرے کی طرف بڑھا ہے مگر ہر مرتبہ گھر کے لوگوں اور ملازموں نے اسے یوں گھیر لیا ہے جیسے وہ اسے اغوا کرنے جا رہا ہو۔

منجھلی رفیعہ کو بناؤ سنگھار اور فیشن سے گہرا شغف ہے۔ وہ ہر وقت کریموں، پاؤڈروں، رنگوں، خوشبوؤں، لباسوں اور اپنی فیشن ایبل سہیلیوں میں گھری رہتی ہے اور اس کا جی چاہتا ہے ہر وقت دلہن سی نظر آنے والی رفیعہ اس کے ساتھ گھومنے پھرنے کے لئے جائے اور ہوٹلوں، پارکوں اور سیر گاہوں میں لوگ اسے حسد و رقابت کی نظروں سے دیکھ دیکھ کر جلیں مگر رفیعہ اس کے سامنے آتی ہے تو نظریں نیچی کئے رکھتی ہے اور اپنے خوبصورت بالوں اور کھلے گلے کی قمیص کا اوپر کا حصہ بار بار دوپٹے سے ڈھانپتی رہتی ہے۔

فریدہ سب سے چھوٹی مگر اپنی عمر سے دوگنی زیادہ جوان ہے۔ اسے دیکھ کر ندامت سے اس کی اپنی گردن جھک جاتی ہے۔ فریدہ کی شکل اس سے بے حد ملتی جلتی ہے اور وہ اس کے اور بیگم حمید کے لئے بدنامی کا نیون سائن معلوم ہوتی ہے۔ گھر میں آنے جانے والے یہ نیون سائن دیکھتے اور پکار اٹھتے ہیں "فریدہ کی شکل ہو بہو آپ پر گئی ہے۔"

فریدہ کو دیکھ کر اسے لگتا ہے جیسے وہ کئی برس چھوٹا ہو گیا ہو اور اس کی جنس تبدیل ہو گئی ہو۔ کئی بار غسل خانے کے آئینے میں اس نے اپنے جسم پر فریدہ کے جسم کے ٹکڑے چپکا کر دیکھے ہیں اور شرم سے پانی پانی ہوا ہے۔ شاید فریدہ بھی غسل خانے میں اپنے جسم کو اسی طرح دیکھتی اور پانی پانی ہوتی ہے کیونکہ وہ اس سے شرمائی شرمائی اور جھینپی جھینپی سی رہتی ہے۔ اس کا جی چاہتا ہے وہ اس سے بے تکلفی سے ملے، اس کے گلے میں باہیں ڈال کر کوئی ایسی فرمائش کرے جسے پورا کرنا اس کے لئے آسان نہ ہو لیکن فریدہ بھی اپنی بہنوں کی طرح اس سے دور دور رہتی اور اس کی بے حد عزت کرتی ہے۔

اُسے اس گھر میں جس میں وہ کئی برسوں سے پے اِنگ گیسٹ کے طور پر رہ رہا ہے ہر طرح کا آرام میسر ہے۔ ٹائم پیس کا الارم اسے

بروقت جگا دیتا ہے۔ غسل خانے میں اسے گرم پانی رکھا ہوا ملتا ہے۔ وہ غسل خانے سے باہر آتا ہے تو استری کئے ہوئے کپڑے اس کے منتظر ہوتے ہیں وہ گھنٹی بجاتا ہے تو ملازم ناشتہ لے کر حاضر ہو جاتا ہے۔ اسے کسی بھی چیز کے لئے کہنا نہیں پڑتا۔ ضرورت کی ہر چیز اسے خود بخود مل جاتی ہے لیکن اس کا دل خوشی سے خالی ہوتا جا رہا ہے۔ سب اس کا احترام کرتے۔ اس کے آرام کا خیال رکھتے اور اس کی ہر بات بے چون و چرا مان لیتے ہیں۔ اس کا جی چاہتا ہے کوئی اس سے لڑے جھگڑے۔ اسے گالیاں اور طعنے دے۔ دیر سے گھر آنے پر باز پرس کرے۔ وہ اس سے پوری نہ کی جا سکنے والی فرمائشیں کرے مگر پھر اسے یاد آ جاتا ہے کہ یہ اس کا اپنا گھر نہیں۔ وہ یہاں پے انگ گیسٹ ہے۔

رات کو سب اپنے اپنے کمروں میں محو خواب ہوتے ہیں۔ وہ اپنے کمرے میں خود کو تنہا اور اداس محسوس کرتا اور کہیں بھاگ جانا چاہتا ہے لیکن اس گھر میں اسے جو آرام میسر ہے وہ اس کے پاؤں کی زنجیر بن گیا ہے۔ اسے اپنے اردگرد نظر نہ آنے والے مسلح پہرے دار کھڑے محسوس ہوتے ہیں لیکن وہ زنجیر یا توڑ دینا اور مسلح پہرے داروں کا گھیرا توڑ کر فرار ہو جانا چاہتا ہے۔ اس خوبصورت اور پرتکلف ماحول میں اس کا دم گھٹ رہا ہے۔ وہ کھلی فضا میں سانس لینا چاہتا ہے۔

پھر ایک روز بیگم حمید کے ہاں بہت مہمان آتے ہیں۔ رات دیر تک دروازے کھلنے اور بند ہونے اور موٹروں کے انجن سٹارٹ ہونے کی آوازیں سنائی دیتی رہتی ہیں۔ وہ اٹھ کر صورت حال کا جائزہ لینا چاہتا ہے کہ دستک دیئے بغیر بیگم حمید اس کے کمرے میں گھس آتی ہیں۔ شاید وہ کسی سے لڑ کر آ رہی ہیں۔ وہ آتے ہی غصے میں لتھڑی ہوئی آواز سے اس پر حملہ کرتی ہیں۔ "شادی کی ڈیٹ بھی فکس ہو گئی مگر آپ کو کچھ فکر نہیں۔"

"شادی!۔۔۔ کس کی شادی؟" وہ گھبرا کر پوچھتا ہے۔

بیگم حمید کو اور غصہ آ جاتا ہے۔ وہ کہتی ہیں "حمید صاحب!۔۔۔ آپ تو اس گھر میں مہمان آئے لگتے ہیں۔"

"صرف مہمان نہیں" وہ تصحیح کرتا ہے "میں پے انگ گیسٹ ہوں۔"

سیاہ آنکھ میں تصویر

مستنصر حسین تارڑ

لارنزو کی لاش کئی روز تک مقدس پہاڑی کی چوٹی پر گڑی صلیب سے جھولتی رہی۔

انھوں نے مسیح کی طرح صلیب پر میخوں سے گاڑنے کی بجائے ایک رسہ لٹکا کر پھانسی دی تھی میخیں مہنگی ہوتی ہیں۔ ایک مرتبہ گاڑ دی جائیں تو آسانی سے اکھڑتی نہیں، ضائع ہو جاتی ہیں، رسہ سستا ہوتا ہے۔ پھانسی دینے کے لیے کوئی اور مجرم نہ بھی ملے تو اس کے ساتھ ڈول باندھ کر کنوئیں میں سے پانی نکالا جا سکتا ہے۔

اُس کی مردہ آنکھیں کھلی تھیں۔

گردن ایک ایسے زاویے پر ڈھلکی ہوئی تھی کہ دور سے لگتا جیسے وہ ہنستے ہنستے ایک دم ترچھا ہو کر ساکت ہو گیا ہو...... جیسے کسی ذہین ڈاکٹر نے چیتھڑوں سے بنے ہوئے گڈے کو رستے سے باندھ کر لٹکا دیا ہو...... اور وہ بے اختیار جھول رہا ہے۔

اُس کی مردہ آنکھیں کھلی تھیں۔

خانہ بدوشوں کے غاروں کے دہانے ششدر و حیرت زدہ کھلے تھے۔ جیسے بیل کے قتل پر پہاڑ کا منہ کھل گیا تھا، زبان باہر لٹک گئی تھی۔ سنگلاخ سینے میں سے آنسو رواں ہو گئے تھے۔

مقدس پہاڑی کے دامن میں البیسین کا مورش محلہ دھوپ میں سفید ہو رہا تھا۔ قدموں میں دریائے حدرہ کے پانی تھے۔ سامنے جبل سبیکہ پہ سرخ پتھر کا معجزہ، قصر الحمرا، گرمی میں پھنک رہا تھا...... مگر لارنزو ان سب سے لاتعلق مردہ آنکھیں کھولے جھولتا رہا۔

شارع چاپائیز کے پگھلے ہوئے کولتار پر ابھی تک شراب کے خالی ڈرم، ریت کی بوریاں اور گھریلو فرنیچر بکھرا پڑا تھا...... لیکن کہیں خون کے دھبے تھے سوکھے ہوئے جیسے کسی بڑھیا کے پپ سنگ زدہ ہونٹوں پر پپڑیاں ابھرتی ہیں۔ یہاں بیری کیڈ تھا۔ البیسین کے باسیوں نے کئی روز تک فرانکو کی فوج کا مقابلہ کیا۔ یہاں تک کہ وہ پورے غرناطہ سے کٹ کر استقامت کا ایک جزیرہ بن گئے۔ فاشسٹوں نے دریائے حدرہ میں سے سانس لینے والے پانی کے پائپ کاٹ دیے تھے، اور جب متعدد بچوں کے پیاسے مرجانے کے باوجود انھوں نے ہتھیار نہ ڈالے تو البیسین پر ہوائی جہازوں سے بم برسنے لگے...... بیری کیڈ ٹوٹا تو اس کے ساتھ ہی گھروں کی سفیدی کی ہوئی چمکتی دیواروں پر البیسینوں کے خون اور گوشت کے چھیچھڑے یوں برسے کہ ان پر گہرے، بلکہ اور شوخ سرخ رنگوں کی تصویریں ابھر آئیں جنھیں آنے والی نسلوں نے مٹانے کی کوشش کی...... ان پر قلعی کے کئی پوچے پھیرے مگر ان کے رنگ اور گہرے... مزید شوخ ہوتے چلے گئے۔ الحمرا کے برجوں تلے، غرناطہ کے میونسپل قبرستان میں روزانہ سینکڑوں افراد آزادی سے سانس لینے کی خواہش کی پاداش میں اپنے جسم میں داخل ہونے والے سیسے کے بوجھ سے سرنگوں ہوتے رہے۔ شہر سے چند میل کے فاصلے پر عرب عہد کے ایک پرفضا تالاب کے کنارے بھی فاشسٹوں نے آزاد خون کو منجمد کیا اور پھر اسے ایک اجتماعی قبر میں بل ڈوزروں سے دھکیل دیا۔ ان سینکڑوں لاشوں میں گارسیا لورکا کا مردہ جسم بھی تھا۔ بل ڈوزر کے سرد بلیڈ لورکا کے [illegible] تر جسم میں کھبتے پر بھی نہ جان سکے کہ یہ ایک شاعر کا بدن ہے کہ اس کے مرنے پر سوگواروں نے کہا تھا، گارسیا لورکا مر گیا اب غرناطہ بغیر دل کے ہے۔

لارنزو کی سیاہ مرجھا رہی ہوئی سوکھتی آنکھوں کے سامنے اُس کا محلہ البیسین سناٹے کے سمندر میں ڈوبے ہوئے ایک ویران جزیرے کی مانند [illegible]

جھول رہا تھا... قدیم موروثی حویلیاں سنسان پڑی تھیں اور اُن کے خاموش فواروں کے سوکھے ہوئے تالابوں میں بچوں کی لاشیں منہ کھولے دھوپ میں اکڑ رہی تھیں۔ مکانوں کے دروازے کھلے تھے اور مکینوں کے پھٹے ہوئے جسم چوکھٹوں پر اوندھے پڑے تھے۔ سوکھی ہوئی نالیوں کی پیاس کے لیے گاڑھا خون ناکافی تھا کہ مکانوں میں سے نکلتے ہی وہ سرخ چھیچھڑوں میں بدل چکا تھا۔ ہر سو خاموشی تھی۔ صرف مقدس پہاڑی پر کلیسا کا گھڑیال فتح کی خوشی میں جھول رہا تھا اور اُس کی گونج البسین کی فضاؤں میں بھوکے گدھ کی طرح تیر رہی تھی۔ لارنز کی لاش کئی روز تک مقدس پہاڑی کی چوٹی پر گڑی صلیب سے جھولتی رہی۔

لارنزو کو ہسپانوی خانہ جنگی سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اُسے نہ تو ڈی... سے کوئی خاص اُنس تھا اور نہ ہی وہ فرانکو کے بارے میں اچھے یا بُرے جذبات رکھتا تھا۔ اسے تو نیشنلسٹ اور ریپبلیکن کے الفاظ ادا کرنے میں بھی دشواری پیش آتی تھی..... وہ سیدھا سادا خانہ بدوش تھا۔ موسم گرما میں ملک کے طول و عرض میں منعقد ہونے والی گھوڑوں کی منڈیوں میں جاکر دہقانوں کو عمدہ نسل کے گھوڑے خریدنے میں مدد دیتا۔ مشوروں کی فیس وصول کرتا اور فرصت کے لمحات میں انہی دہقانوں کی جیبیں کاٹتا۔ سردیوں میں وہ اپنے مختصر غار میں بیٹھ کر بے تحاشا وینو پیتا اور شام کو اپنی بیوی اور بیٹی کو عصمت فروشی کے لیے بھیج کر خود مزید وینو پیتا اور بالآخر مدہوش ہو کر سو رہتا۔ کہنے کو تو اُس کے ہاں دس بچوں نے جنم لیا مگر وہ ہر بچے کی پیدائش پر اس کا ناک نقشہ دیکھ کر پہلے اطمینان کر لیتا کہ نومولود اُسی کا ہے۔ اگر خد و خال میں اُس کی سیاہ آنکھوں اور خنجر کی نوک ایسی ناک کا کوئی شائبہ نظر نہ آتا تو وہ اُسے بلا تکلف کسی اور خانہ بدوش کو تحفتہً دے دیتا.... لڑکے جیبیں کاٹنے کے لئے موزوں تھے اور لڑکیاں ظاہر ہے عصمت فروشی کے لئے...... یوں اُس کے پاس اس چھان پھٹک کے بعد صرف دو بیٹے آر تورو اور آندریس اور ایک بیٹی آدے لا بچی تھی۔ خانہ بدوشوں میں اُس کی شرافت کا چرچا تھا کہ وہ بچوں کو اغوا کرنے کا بے حد مخالف تھا اور جوانی کے ابتدائی ایام کے سوا اُس نے آج تک کسی کو قتل نہیں کیا تھا..... زندگی بے حد پُرسکون اور خوشگوار تھی مگر ایک روز جب وہ اپنے غار میں وینو کے نشے میں دُھت لیٹا گٹار پر فلیمنکو کی دُھن بے حد اوٹ پٹانگ طریقے سے بجا رہا تھا، اُسے محسوس ہوا کہ اس اداس دھن کے پس منظر میں کوئی ہولے ہولے پٹاخے چھوڑ رہا ہے۔ پہلے تو وہ اسے غبار آلود ذہن میں کلبلاتے خون کا کرشمہ سمجھا مگر جب آوازیں بلند ہوتی چلی گئیں تو وہ گٹار کی ٹیک لگا کر اٹھا اور لڑکھڑاتا ہوا باہر آ گیا۔ تیز دھوپ اس کی سرخ آنکھوں میں باندریلو کی برچھیوں کی طرح کھُب گئی۔ البسین کے چند مکانوں کی سفید دیواروں کو دھواں چاٹ رہا تھا۔ گولیوں کی آواز بھی اُدھر سے ہی تیرتی آ رہی تھی۔ وہ غصے میں بڑبڑاتا ہوا غار میں واپس آ گیا اور کچے فرش پر اوندھا لیٹ کر خنکی کو سونگھتا ہوا اونگھنے لگا۔ اس کے دونوں بیٹے جو نزدیکی قصبے لوشہ میں ہونے والے ایک گھوڑوں کے میلے میں گئے ہوئے تھے، شام کو لوٹے تو اُن کے چہرے اترے ہوئے تھے۔ "بابا! غرناطہ میں فرانکو کے فوجی داخل ہو گئے ہیں۔ البسین کے باسیوں نے شارع چاپیز پر بیری کیڈ کھڑا کر کے اُن کا مقابلہ شروع کر دیا ہے..... ہم بڑی مشکل سے..... یہاں تک پہنچے ہیں۔"

لارنزو نے سر میں پھٹنے درد کے گرم ریزوں کو ماتھے پر جپت لگا کر ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی اور بیزاری سے بولا "یہ ہسپانویوں کی آپس کی لڑائی ہے ہم خانہ بدوشوں کا اس سے کیا تعلق۔ جتنے زیادہ مریں اُتنا ہی بہتر ہے۔ لاشوں کی جیبیں کاٹنا نسبتاً آسان کام ہے۔"

تھوڑی دیر بعد آدے لا غار میں داخل ہوئی تو وہ بھی پھٹے ہوئے کپڑے کی طرح سفید اور سلوٹوں سے بھرپور تھی۔ "دیکھو بابا! انھوں نے میرے کپڑے بھی پھاڑ دیے۔ حالانکہ اگر وہ شرافت سے پیش آتے تو دو چار فوجیوں کے ساتھ ہمبستری کرنے سے میری چھاتیاں کون سی چھوٹی ہو جاتی تھیں؟"

لارنزو کو رہ رہ کر البسین کے باسیوں پر غصہ آ رہا تھا کہ یقینی شکست کا سامنا کرنے کے باوجود وہ اتنی ڈھٹائی سے بیری کیڈ کا دفاع کیوں کر رہے تھے۔ اور یوں وہ سارا دن غار کی تنہائی میں شراب سے لطف اندوز ہونے کی بجائے..... نیلے کڑوے سگریٹ پھونکتا رہتا کہ تمام اہل خانہ نے خانہ جنگی شروع ہونے کے بعد غار سے نکلنا چھوڑ دیا تھا۔

ایک روز وہ تنگ آ کر اپنے پُرشور غار میں سے باہر نکلا اور البسین کے گلی کوچوں میں بے مقصد گھومنے لگا۔ چند روز پیشتر کے چیختے چلاتے، پُرہجوم اور زندہ البسین کی بجائے اس کے سامنے ایک مردہ محلے کے سناٹے تھے، صرف کبھی کبھار کسی بچے کے رونے کی گھٹی گھٹی آواز آتی اور بند ہو جاتی جیسے کسی نے منہ پر ہاتھ کا پتھر رکھ دیا ہو۔ ویرانی کے علاوہ اسے جس چیز نے حیرت زدہ کیا وہ سوکھے ہوئے فوارے اور خشک نالیاں تھیں جو عربوں کے زمانے سے آج تک کبھی خشک

نہیں ہوئی تھیں۔

"پانی کیوں نہیں چل رہا؟" اُس نے سوچا اور کندھے اُچکا کر واپس غار کی جانب چل دیا۔

"پانی کیوں نہیں چل رہا؟" اُس نے بے دھیانی میں چھت کی طرف دیکھا جس کے ساتھ اُس کا شراب کا مشکیزہ لٹک رہا تھا۔

"اُنھوں نے بند کر دیا ہے۔" آرتورو نے آہستہ سے کہا۔

"تم لوگ کیا پیتے ہو؟" اُس نے مشکیزہ اتار کر ایک طویل گھونٹ بھرا۔

"کچھ بھی نہیں۔" اُن سب نے بے دلی سے جواب دیا۔ "پچھلے کئی روز سے پانی بند ہے۔ فوجیوں نے حدرہ سے پانی کھینچنے والے پائپ کاٹ دئیے ہیں۔" آندریس نے دانت کچکچاتے ہوئے کہا "البیسین کے رہنے والے پیاسے ہیں۔ وہ اپنے باغوں میں سے پودے اکھاڑ کر اُن کی جڑیں چوس رہے ہیں۔ بیری کیڈ پر لڑنے والے نیم بیہوشی کے عالم میں ہیں۔ عورتوں کی چھاتیاں سوکھ گئی ہیں۔ بچوں کی زبانیں اُن کے منہ سے باہر لٹک رہی ہیں، مردہ سانپوں کی طرح۔"

"بچوں کی زبانیں؟" لارنزو بوکھلا گیا۔ "لیکن یہ تو ظلم ہے۔ اُن کو تو پانی دینا چاہیئے۔ بچّے نیشنلسٹ یا ریپبلیکن نہیں ہوتے..... وہ تو صرف..."

"ہمارا دماغ کیوں چاٹتے ہو، فرانکو سے جا کر پوچھو۔" اُس کی بیوی چیخی "کم از کم جب تک تمہارے درجن بھر مشکیزے خالی نہیں ہوتے تم پیاسے نہیں مرو گے۔"

"لیکن یہ تو ظلم ہے..." لارنزو کمھلا سے پھولتی زبان بار بار لبوں پر پھیر کر بڑبڑاتا رہا۔

اُس شب لارنزو نے دو خالی مشکیزے کاندھے پر رکھے اور مقدس پہاڑی پر اُگے ہوئے تھوہر اور ناگ پھنی کے پودوں تلے پوشیدہ اُس قدیم غار میں اُترا جس کا علم پورے غرناطہ میں صرف اُسے ہی تھا۔ کہا جاتا ہے کہ مُوروں کے زمانے میں متعدد زیر زمین راستے البیسین کو دریا کے پار الحمرا کے سرخ ایوانوں سے ملاتے تھے۔ صدیوں کا بوجھ ان خفیہ راستوں پر بھی پڑا اور آہستہ آہستہ اُن کے خالی پیٹ مٹی سے بھر گئے۔ عالم نوخیزی میں جب لارنزو نے اپنے ایک رقیب کو جسم میں میخیں گاڑ کر اُسی کے دروازے پر مصلوب کیا تھا تو یہ محض اتفاق تھا کہ وہ کسی پناہ گاہ کی تلاش میں ایک ایسے راستے کو دریافت کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ یہ زمین دوز راستہ اگرچہ بے حد مندوش حالت میں تھا مگر لارنزو کا بچکیلا جسم اس میں سے ایک سیاہ ناگ کی طرح رینگتا بل کھاتا دریائے حدرہ تک پہنچ جاتا۔ وہ کئی ماہ تک اس سرنگ میں روپوش رہا۔ بعد میں یہ خفیہ پناہ گاہ اس کی محرم بن گئی۔ بیوی سے ڈانٹ پڑتی تو وہ چپ چاپ اس میں اُتر کر پہروں کروٹ بدلتا رہتا۔ جسموں کے استعمال کے لئے بھی اُس نے یہی جگہ مخصوص کر رکھی تھی۔ کبھی کبھار وہ تنہائی کا خواہش مند ہوتا تو شراب کا مشکیزہ کندھے پر ڈال کر اس میں غائب ہو جاتا۔ مگر اُس شب اُس کے کندھے پر صرف خالی مشکیزے تھے۔

رات گئے جب لارنزو اپنے غار میں واپس آیا تو اس کا نم آلود جسم مٹی سے یوں لتھڑا ہوا تھا جیسے وہ قبر میں سے نکل کر آیا ہو۔ اس نے مشکیزوں کو بمشکل کاندھے سے اتارا اور زمین پر لیٹ گیا۔ "آرتورو! ...... تم سب لوگ ایک ایک گھونٹ بھر لو..... ہم خانہ بدوش ہسپانویوں کی نسبت زیادہ سخت جان واقع ہوئے ہیں..... باقی پانی البیسین میں لے جاؤ اور پیاسے بچوں کے حلق تر کر دو کہ بچے نیشنلسٹ یا ری پبلیکن نہیں ہوتے۔"

اگلے کئی روز تک لارنزو کا یہی معمول رہا..... اور بالآخر فضائی حملے کی تاب نہ لاتے ہوئے بیری کیڈ ٹوٹ گیا۔ فرانکو کے فوجی البیسین میں داخل ہو گئے۔

غار سے نکلنے سے پیشتر اُس کے تینوں بچوں نے ایک مرتبہ پھر اُس کی منت کی..... "پاپا وہ سب کو قتل کر رہے ہیں..... ہم سیرا نوادا کی پہاڑیوں میں روپوش ہونے کے لئے جا رہے ہیں تم بھی ساتھ چلو..... پاپا۔"

لارنزو کی انگلی سے پھولی ہوئی زبان بمشکل حرکت میں آئی "تم بزدل ہو..... وہ ہمیں کچھ نہیں کہیں گے.... یہ ہسپانویوں کی آپس کی لڑائی ہے ہم خانہ بدوشوں کا اس سے کیا تعلق؟"

لارنزو کو ملٹری ٹربیونل کے سامنے پیش کیا گیا۔

"یہ شخص بہری بیڑے پر لڑنے والے کمیونسٹوں کو پانی پلائی کرتا رہا ہے۔"

لارنزو کی لاش کئی دن تک مقدس پہاڑی کی چوٹی پر گڑی صلیب سے جھولتی رہی۔

سیرا لوادا پہاڑیوں کی پتھریلی عافیت میں اتر کر ان تینوں نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ مقدس پہاڑی کے سفید جسم پر گڑی صلیب سے لٹکتا ہوا ایک پتلے کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔

ہسپانیہ ایک وسیع ملک ہے۔ صحرائی وسعتوں، برف پوش پہاڑوں اور گرد آلود میدانوں کا ملک۔ اُن تینوں نے اِن تینوں جغرافیائی حالتوں میں کئی ماہ تک روپوشی کا سفر کیا۔

ایک تپتی ہوئی جھلسا دینے والی دوپہر نے انھیں دریائے جدرہ کے کنارے آباد قدیم قصبے توریا میں دیکھا۔ دریا کا خنک پانی اُن کے جلتے ہوئے نیم سیاہ بدنوں میں جذب ہوا تو انھوں نے اپنے گرد نگاہ ڈالی..... پسینے سے نچڑتا ایک خاموش ہجوم مقامی بُل رِنگ کی جانب قدم گھسیٹ رہا تھا۔ وہ تینوں ان گرم جسموں کے الاؤ میں گم ہوگئے۔

کھنڈر نما بُل رِنگ کا نصف حصہ سائے میں سستا رہا تھا اور بقیہ نصف حصے کو دھوپ کے جلتے لب چوس رہے تھے۔ اکھاڑے کے درمیان میں ایک سیاہ بُل کا بھاری بھرکم دھبہ لرز رہا تھا..... اور اس کا کمر خمیدہ مالک ہاتھ فضا میں جھلاتے شور مچا رہا تھا "آیئے اور اس براد نیچو بُل کے ساتھ دو دو ہاتھ کیجئے۔ پانچ منٹ کے کھیل کے لئے صرف دس پیسیتے۔"

دیہاتی نوجوان بوسیدہ پتلونیں اُڑستے، غرور سے اپنے جنگلی گھاس بالوں پر ہاتھ پھیرتے اکھاڑے میں داخل ہوتے اور دس پیسیتے مالک کی رالیں ٹپکاتی ہتھیلی پر رکھ کر پانچ منٹ کے لئے بُل کے آگے پیچھے ہو ہو کر کے دوڑتے، اپنی بہادری جتا کر ہانپتے ہوئے واپس اپنی نشستوں پر آ بیٹھتے۔ بڑے لڑکے آرتورو نے سیاہ آنکھیں میچ کر بُل کو غور سے دیکھا "آندریس!" اُس نے بھائی کے کندھے پر ہاتھ کا گدہ بٹھاتے ہوئے کہا "فرانکو کیسا ہے؟"

آندریس کی آنکھوں سے سیاہ حیرت پھوٹی اور بہہ نکلی "مجھے کیا معلوم آرتورو، میں نے اُسے کبھی نہیں دیکھا۔"

"میں نے دیکھا تو نہیں لیکن جانتی ہوں۔" آدتے لانے گلے میں ہاتھ کی کپتی اتاری اور پسینے سے شرابور چھاتیوں کو پونچھا "وہ اُس موت کی طرح سیاہ ہے جس میں اُس نے ہمارے پاپا کے جسم کو ڈبو دیا ہے۔"

آرتورو کی نشست پر اُس کا بوجھ ختم ہوگیا، وہ اٹھا۔ پہچان کا لمحہ آن پہنچا تھا۔ ہم خانہ بدوشوں میں روایت ہے کہ اگر انتقام لینے کے لئے دشمن نہ مل سکے تو اُس کی خصلت کے کسی اور شخص کو موت کے گھاٹ اتار دو۔ اسی لمحے اُس کے شانوں کے ساتھ دو سر نمودار ہوئے۔ جو آندریس اور آدتے کے تھے..... "آرتورو تم نہیں جا سکتے..... سیاہ بُل بے حد طاقتور ہے۔" لیکن تین سروں کی اُس قطار میں سے ایک سر نے حرکت کی اور بُل رِنگ کے درمیان جا کھڑا ہوا۔

آرتورو نے دس پیسیتے ہتھیلی کی رال پر چپکائے اور سیاہ بُل کے سامنے گردن ٹیڑھی کر کے کھڑا ہوگیا..... بُل کی چمکتی آنکھوں میں ایک پتلا جھول رہا تھا..... لارنزو کی لاش کئی روز تک مقدس پہاڑی کی چوٹی پر گڑی صلیب سے جھولتی رہی۔

"بے تو رد" آرتو رو نے ریت پر تھوکا اور نفرت کا لعاب منہ سے پونچھ کر بُل کو شُشکارا۔ بُل کی سیاہ آنکھوں میں ایک پتلا جھول رہا تھا۔ "میں نے بستیوں کو ویران کیا ہے۔ بچوں کو پیاسا مارا ہے۔ نصف ہسپانیہ کو ہلاک کر ڈالا ہے۔ یہ خانہ بدوش گرہ کٹ کا بچہ میرے مقابلے پر..... ہم خانہ بدوشوں میں روایت ہے کہ اگر انتقام لینے کے لئے دشمن....."

آرتورو تپتی ریت پر پھیلا اپنے جسم میں اُترے ہوئے دو سینگوں کو تھامے بُل کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا..... اُس کی مردہ آنکھیں کھلی تھیں اور... بُل کی سیاہ آنکھوں میں ایک پتلا جھول رہا تھا۔

اُس شب آندریس اور آدرے لانے دریائے حدرہ کی ریت میں اپنے بھائی کا سرد جسم دفن کیا۔ "ہمیں قسم ہے خانہ بدوشوں کے تمام دیوی دیوتاؤں کی..... ہم جب تک سیاہ بُل کو ہلاک نہ کر دیں گے ایک دوسرے کو ناموں کی بجائے حرامی سؤر کہہ کر پکاریں گے۔"

ہسپانیہ ایک وسیع ملک ہے۔ صحرائی وسعتوں، برف پوش پہاڑوں اور گرد آلود میدانوں کا ملک۔ اُن دونوں نے ان تینوں جغرافیائی حالتوں میں کئی برس تک سفر کیا۔ اس سفر کی سمت کا تعین سیاہ بُل کے سموں کے نشان تھے۔ بُل کے مالک کا بوڑھا ذہن جانتا تھا کہ دو نیم سیاہ جسم بدلتی رتوں میں ان کا تعاقب کر رہے ہیں۔ گرم، سرد، نم آلود موسموں میں وہ اپنی روزی کے واحد وسیلے کی حفاظت کرتا، ایک لمحہ کے لئے بھی غافل نہ ہوتا..... آندریس اور آدرے لاکے لباسوں میں اُڑسے ہوئے خنجر کئی بار زنگ آلود ہوئے مگر انھیں ہسپانیہ کی دھرتی سے رگڑ کر پھر سے تیز کر لیا جاتا..... کون جانے کب؟.....

قشتالیہ کے وسیع ریگزاروں میں پہاڑی عقابوں نے نیچے دیکھا..... کانٹے دار جھاڑیوں اور بگولوں کے درمیان ایک بوڑھا ایک سیاہ دھبے پر ہاتھ رکھے یوں چل رہا ہے جیسے وہ کسی بُل کا بھاری اور کھردرا جثہ نہ ہو بلکہ صابن کی ایک گیلی ٹکیہ ہو جو ذرا سی غفلت سے اس کے ہاتھوں سے پھسل جائے گی..... اور کچھ فاصلے پر دو جسم جن کی چار سیاہ آنکھیں صرف ایک کالے دھبے پر جمی رہنے کے لئے کھلی تھیں۔

مُوروں کے ایک پہاڑی حصار کے کھنڈروں میں رہنے والے ایک اُلو نے آنکھیں گھمائیں اور ٹوٹتے ہوئے جھروکے میں سے اُس سڑک کو دیکھا جس پر زیتون کے باغ اُمڈے چلے آ رہے تھے..... اور سڑک پر..... ایک بوڑھا مگر اب بہت بوڑھا..... ایک سیاہ بُل مگر اب چمکیلے جسم کی بجائے ماند پڑتی ہوئی کھال، اور کچھ فاصلے پر..... چار آنکھیں..... منتظر!

وہ اپنے سفر کے دوران وادی غرناطہ میں سے بھی ایک مرتبہ گزرے۔ مقدس پہاڑی پر گڑی صلیب برسات کی بوچھاڑوں اور گرما کی حدتوں سے شکستہ ہو کر گرنے کو تھی..... جھولنے والا پتلا اب غائب تھا مگر..... آندریس اور آدرے لاکے لئے نہیں کہ وہ اُسے بُل کی آنکھوں میں جھولتا ہوا دیکھ رہے تھے۔

اُن دونوں نے اِن تینوں جغرافیائی حالتوں میں سات برس تک سفر کیا۔ ایک جانور، ایک انسان..... دو نیم سیاہ جسم۔

بالآخر بُل بوڑھا ہو گیا..... وہ جو پہلے اُس کے ظلم سے خائف تھے، اب زیرِ لب احتجاج کرنے لگے۔ اُس کی دہشت اور طاقت کو دھرتی نے دھیرے دھیرے ختم کر دیا..... بُل بوڑھا ہوا تو ناکارہ ہو گیا کہ اب اُس کے ساتھ کھیلنے پر کوئی بھی آمادہ نہ ہوتا..... ایسے بیکار جسم کا اور کیا مصرف ہو سکتا ہے سوائے اس کے کہ اُسے کسی بوچڑ خانے میں فروخت کر دیا جائے۔

کرخیبہ، بوڑھا بوچڑ خانے کے جس دروازے میں سے بیسیوں سے بھری جیبیں لے کر نکلا، اُسی دروازے میں کچھ دیر بعد آندریس اور آدرے لاکے جسم داخل ہوئے۔ انھوں نے اپنے خنجر آج صبح ہی تیز کئے تھے۔

بُل کو اس کے بڑھاپے نے بوچڑ خانے کے کچے فرش پر بے سدھ لٹا رکھا تھا۔ اُن دونوں نے اُس کی آنکھوں میں جھانکا..... اُن میں ظلم کی تصویر ابھی تک واضح اور متحرک تھی کہ اس کے رنگ کبھی ماند نہیں پڑتے۔

بوچڑخانے کا مالک اُن کے قریب آیا لیکن زیادہ قریب نہیں کہ خنجر آج ہی تیز کیے گئے تھے "تم کس نیت سے یہاں آئے ہو؟"

"یہ سیاہ بیل ہمارے پاپا کا قاتل ہے.... اس کے سینگ ہمارے بھائی کے جسم میں لٹو کی طرح گھومے تھے..... ہم صرف اسے اپنے ہاتھوں سے مارنے کی اجازت چاہتے ہیں۔"

بوچڑخانے کے مالک کو اُسی شام یہی کام خاصی تگ و دو کے بعد خود سرانجام دینا تھا۔ بھلا اُسے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔

"تمہیں اجازت ہے۔" اُس نے کہا اور چلا گیا۔

آدے لا گھٹنوں کے بل یوں بیٹھ گئی جیسے وہ کسی کلیسا میں عبادت کرنے والی ہو.... اُس نے اپنا خنجر سیاہ بیل کی پھولی ہوئی شہ رگ پر رکھا اور اس کی آنکھوں میں اپنے پاپا کی تصویر دیکھی.... شہ رگ میں سے بوڑھا بدبودار خون ایک آبشار کی طرح ابلا..... اور آدے لا کے سینے پر پھیل گیا۔ آدے لا نے گریبان میں ہاتھ ڈال کر اپنا لباس چاک کر ڈالا.... اُس کی چھاتیوں نے آگے بڑھ کر اپنے مسام کھولے اور ابلتے خون کو چوسا، پیاس بجھائی..... پھر اندلیس اسی طرح گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ اُس نے بیل کی ڈھلکی ہوئی گردن کو دونوں ہاتھوں میں پکڑا اور اُس کی آنکھوں میں جھانکا..... بیل کی مردہ آنکھوں میں اب بھی ایک پتلا دکھائی دے رہا تھا لیکن ساکت اور معدوم ہوتا ہوا..... خنجر کی نوک نے سیاہ آنکھ میں کھب کر اسے اپنے مسکن سے یوں ادھیڑا جیسے انار کے دانے کو ناخن سے اڑس کر نکالا جاتا ہے..... سات برسوں سے زندہ جھولتے ہوئے پتلے کی شبیہ اوجھل ہو گئی۔ دوسری آنکھ کو بھی خنجر نے جڑ سے اکھاڑ پھینکا..... پھر اُن دونوں نے آنکھوں کے خالی گڑھوں میں گذرے وقت کی، بیتے سفر کی تمام نفرت سمیٹ کر تھوکا..... آخری وار بیل کے پیٹ پر تھا۔ اُن دونوں نے جب اُس کا نیم سیاہ کلیجہ ہاتھوں میں لیا تو وہ ابھی تک تھرتھرا رہا تھا..... وہ بوچڑخانے سے باہر آگئے..... ویران گرد آلود گلی کے درمیان میں انھوں نے ایک الاؤ روشن کیا، اُس پر بیل کا سیاہ پڑتا ہوا کلیجہ بھونا اور پھر اسے حلق سے اتار کر اپنے وطن کی طرف ایک روشن دوپہر کی جانب لوٹ گئے۔

ایک ذلیل سائنس فکشن

اسد محمد خاں

میرے سب دن لنچمین؎ کے پاس ہیں۔

پہلے یوں نہیں تھا۔ کچھ ایسا یاد پڑتا ہے کہ جلاوطنی کے تیسرے برس میں انھوں نے خاردار تاروں سے ایک احاطہ کھینچ دیا تھا اور اس احاطے میں کھلے آسمان کے نیچے، مجھے چھوڑ دیا تھا مگر وہ کھلا آسمان بھی نہیں تھا کیونکہ پورے احاطے پر شفاف محدب شیشے کی چھت پڑی تھی میں سر اٹھا کر دیکھتا تھا تو محدب شیشے کے پار سورج بہت بڑا اور آسمان بہت قریب دکھائی دیتا تھا۔ پہلے پہل میں یہی سمجھا کہ وہ مجھے بصری دھوکے میں رکھنا چاہتے ہیں شاید اسی لئے اس احاطے میں چھوڑ دیا ہے۔

میں شاید ابھی تک اسی احاطے میں ہوں ــــ یا ممکن ہے انھوں نے مجھے کہیں اور منتقل کر دیا ہو ــــ کیونکہ معلوم کرنے کے لئے دیکھنا چاہوں تو سر اٹھا کر دیکھ سکتا ہوں ..... مگر آسمان آسمان سب ایک جیسے ہوتے ہیں۔ یا گرد و پیش دیکھ سکتا ہوں .... مگر وہاں چیزیں اتنی چھوٹی ہیں کہ پہچانی نہیں جاتیں اس لئے یہ کہنا مشکل ہے کہ پہلے میں کہاں تھا اور اب کہاں ہوں، یا یہ وہی جگہ ہے جہاں مجھے ہونا چاہئے، یا یہ کوئی اور جگہ ہے، یا یہ کوئی جگہ ہے بھی کہ نہیں۔

پہلے پہل میں یہی سمجھا تھا کہ یہ کوئی جگہ نہیں ہے اس لئے کہ خاردار تاروں کے باہر انھوں نے دوہرے مجوف شیشوں کی چہار دیواری بنا دی تھی سو ان شیشوں کے پار ہر چیز بہت چھوٹی نظر آتی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ اگر کوئی باہر سے مجھے دیکھتا تو میں بھی اُسے بہت چھوٹا نظر آتا۔ مگر لنچمین کے سوا باہر سے دیکھنے والا کوئی نہیں تھا اس لئے یہ لرزہ خیز اطمینان موجود تھا کہ مجھے باہر سے دیکھنے والا کوئی نہیں ہے۔

ایک دن ــــ کہ پتہ نہیں وہ رات تھی ــــ میں نے جب باہر کی طرف دیکھا تھا تو مجھے ہر چیز پہلے سے بھی کہیں زیادہ چھوٹی نظر آئی تھی اور میں نے گھبرا کر طے کیا تھا کہ چیزیں اتنی زیادہ چھوٹی نہیں ہوتیں اور جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں غیر منطقی ہے، اس لئے اس کا کوئی وجود نہیں ہے اس لئے میں جہاں ہوں وہ کوئی جگہ نہیں ہے۔ اس پر ان کی آواز بہت ہنستی تھی اور اس نے کہا تھا کہ یہ جگہ تو ہے، تم نہیں ہو۔

اس دن کے بعد سے ــــ کہ پتہ نہیں وہ رات تھی ــــ میں نے چہار دیواری کے پار کچھ دیکھنا چھوڑ دیا۔ اب صرف آسمان کی طرف یا اپنے اندر دیکھنے لگا۔ مگر اس صورت میں مشکل یہ تھی کہ چھت والے محدب شیشے کے پار اور میرے اندر مجھے ہر چیز ضرورت سے زیادہ بڑی نظر آتی تھی اور میں چونکہ چیزوں کو ان کے اصل تناسب میں دیکھنا چاہتا تھا اس لئے میں جھنجھلا گیا سو میں نے محدب شیشے کے پار اور اپنے اندر دیکھنا بھی چھوڑ دیا۔ وہ یہی چاہتے تھے۔ چنانچہ اس دن ــــ کہ پتہ نہیں وہ رات تھی ــــ انھوں نے خوش ہو کر شیشوں اور خاردار تاروں کے دوسری طرف سے کچھ بڑھائے اور آکسیجن کا ایک ٹیوب میری طرف اچھال دیا اور اس کے بدلے میں میرا ایک دن اٹھا لیا۔

پہلے پہل مجھے اپنے اس ایک دن کے چھن جانے پر کوئی خاص دکھ نہیں ہوا۔ یہ نہیں کہ مجھے اپنے دن عزیز نہیں تھے۔ مجھے اپنے سارے ہی دن عزیز تھے مگر سب سے زیادہ ضرورت مجھے آکسیجن کی تھی۔ جلاوطنی کے جس برس میں تک جتنی آکسیجن میں لا سکا تھا لے آیا تھا اب چھت کے محدب شیشے اور چہار دیواری کے مجوف شیشوں کے ہوتے نئی آکسیجن حاصل نہیں کر سکتا تھا اس لئے اُس دن ــــ کہ پتہ نہیں وہ رات تھی ــــ جب انھوں نے آکسیجن کا یہ ٹیوب میری طرف اچھالا اور اس کے بدلے میں میرا وہ دن اٹھا لیا تو میں اس اطمینان اور اس علم کی گھناؤنی دہشت سے کانپ اٹھا کہ مجھے آکسیجن ملتی رہے گی اور ہر بار ایک ٹیوب آکسیجن کے بدلے وہ مجھ سے میرا ایک دن لے لیا کریں گے یہاں تک کہ کسی دن ــــ یا ممکن ہے وہ رات ہی ہو ــــ میں بے دن اور بے آکسیجن ہو جاؤں گا۔

LYNCHMEN ؎

اب جبکہ مجھے آکسیجن کا ٹیوب مل گیا تھا اور میں احاطے کے وسط میں کھڑا محدب شیشے کے گرجتے ہوئے ارتکاز کو اپنے پیروں کی طرف بڑھتا دیکھ رہا تھا کیونکہ میں اب صرف جھلسی ہوئی زمین کی طرف ہی دیکھ سکتا تھا، تو مجھے بے دن ہو جانے کی دہشت نے آن پکڑا اور جب محدب شیشے کی لیزر شعاعوں نے میری آٹھوں انگلیوں اور دونوں انگوٹھوں کو چاٹنا شروع کر دیا اور جلتی ہوئی مٹی اور تپتے ہوئے گوشت کی بو میری طرف بڑھنے لگی، اُس وقت میرے لئے بے آکسیجن یا بے دن ہو جانا دونوں بے معنی ہو گئے اور میں نے پگھلتی ہوئی مٹی اور پگھلتی ہوئی آٹھ انگلیوں اور پگھلتے ہوئے دو انگوٹھوں کے اس لیزر دائرے میں قے کر دی۔

تب اچانک انھوں نے سیاہ سخت بالوں والے مہربان پنجے بڑھا کر چھت کا زاویہ بدل دیا، مرتکز کرنوں کی یکساں غیر شخصی گرج بند ہو گئی اور پگھلتی ہوئی مٹی اور پگھلتے ہوئے گوشت اور ہڈیوں نے پگھلنا موقوف کر دیا۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا کہ چلو ٹخنوں سے اوپر تو میں بچ رہا ہوں۔

اور اُس دن ——— کہ پتہ نہیں وہ رات تھی ——— انھوں نے اس اطمینان کے بدلے میں میرا ایک دن اور اٹھا لیا۔

یہ پریشانی کی بات تھی۔ مگر میں اس کا اظہار کرنا نہیں چاہتا تھا کہ کہیں وہ اسی بہانے مجھ سے میرا ایک اور دن نہ چھین لیں۔ پھر اچانک ہی یہ ہوا کہ محدب شیشے کے اذیت پہنچانے والے زاویے نے گرجتی ہوئی کرنوں کے سفیر میری پنڈلیوں پر اتار دیئے اور میں پنڈلیوں تک ختم ہو گیا۔ مجھے پنڈلیوں سے اوپر زندہ رکھنے کے جتن میں (یا ممکن ہے کوئی اور مصلحت ہو) انھوں نے اپنے سیاہ بالوں بھرے شفیق پنجے بھیج کر چھت کا زاویہ پھر سے درست کر دیا اور اس دفعہ مجھ سے کوئی اجرت نہیں مانگی، میرا ایک بھی دن نہیں اٹھایا۔ یہ بات مجھے اچھی لگی۔ سو میں نے شکر گزاری میں اپنا ایک اُن کے حوالے کر دیا۔

انھوں نے ایک کی جگہ دو دن اٹھا لیے۔

میں جھنجھلا گیا اور اس کے ساتھ ہی محدب شیشے کے مادر بخطا ارتکاز نے اپنی ایک مہیب گرج سے گردن سمیت میرا پورا سر اڑا دیا۔ اور اب کے تو انھوں نے حد ہی کر دی کہ سیاہ سخت بالوں والے مسیحا پنجے بھیجنے کی بجائے انھوں نے پنجے بڑھا کر ایک ساتھ میرے کئی دن اٹھا لئے۔ میں کیا کرتا، بس محدب شیشے کے نیچے پنڈلیوں اور شانوں تک کھڑا رہا اور جھنجھلایا کیا اور پگھلتا اور معدوم ہوتا گیا۔ محدب شیشے کی عذاب کرنیں بند ہونے میں ہی نہیں آئیں اس لئے کہ جو بالوں بھرے دلنواز پنجے چھت کے شیشے کا زاویہ درست کر سکتے تھے وہ اب تالیاں بجانے لگے تھے، اور کسی طرح رکنے ہی میں نہ آتے تھے۔ فنا کرنے والی کرنوں کے فنا کرنے والے ارتکاز نے پیروں سے شانوں تک میرا پورا دھڑ اور پہنچوں تک میرے دونوں بازو پگھلا دیئے تھے اور میں محض پنڈلیوں سے پیٹرو تک تھا یا میرے دونوں پنجے باقی تھے۔ ان کے علاوہ چھت کے شیشے تلے ایک ایک انچ پر لیزر شعاعیں تھیں اور دس لاکھ بادلوں کی گرج تھی، میں نے خاموشی سے خود کو ان کے حوالے کر دیا تو انھوں نے میرے سب دن اٹھا لئے اور معدوم کرنے والی شعاعوں نے جو کچھ بچا تھا معدوم کر دیا۔ بس میری دونوں ہتھیلیاں اور دونوں پنجے چھوڑ دئے۔

اور اب مجھے، کہ میرا ایک بھی دن میرے پاس نہیں، اور مجھے کہ میں صرف ہتھیلیاں اور پنجے ہوں، مجھے یاد آ رہا ہے کہ محدب اور مجوف شیشوں میں عذاب کے آخری دن ——— کہ پتہ نہیں وہ رات تھی ——— میں نے پہلی بار انھیں دیکھا تھا، اور ان کی تکمیل کا قائل ہوا تھا

وہ باہر کی کھلی فضا سے تالیاں بجاتے آئے تھے اور مجھ سے بغلگیر ہونے کو بڑھے تھے اور میں نے دہشت کی چیخیں اور پہچان کی کلکاریاں ماری تھیں اس لئے کہ وہ مرغزار کے پھیلاؤ میں شبنم آلود ہری ہری دوب پر لڑھکتے آ رہے تھے اور اپنے پیچھے پگھلی ہوئی دوب اور جھلسے ہوئے دنوں کے بدرنگ لیس دار مادے کی لکیر چھوڑتے جاتے تھے۔ میں نے اُن کے من موہنے گھناؤنے پن کو چھو کر دیکھا تھا اور مرغزار کی شبنم آلود ہری دوب پر ہری اُلٹیاں کی تھیں کیونکہ وہ ہر طرح مکمل تھے کہ اُن کی پہچان میں گھنے سیاہ سخت بالوں والے دو مہربان پنجے تھے اور سیاہ چھچھے بھور کی دو غلیظ گیندیں تھیں جن پر جاہت اور خوف کی نیلی وریدوں کا جال بچھا ہوا تھا۔

اور یاد آ رہا ہے کہ میرے سب دن اُن ہی کے پاس تھے۔

اور یاد آ رہا ہے کہ میں نے شبنم آلود ہری دوب کو پکارتے ہوئے سنا تھا اور میں دوسرے دنوں کی تلاش میں لیس دار مادے کی بدرنگ لکیر بنتا چل پڑا تھا ——— کہ پتہ نہیں ابھی تک اسی احاطے میں ہوں۔

فُل سٹاپ

ضیاء بٹ

اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ ایسی دلکش جھیلوں کے کنارے کھڑا ہے جن کے گرد و پیش نہایت حسین سبزہ بچھا ہے اور چاروں طرف سرو ہی سرو ہیں وہ ان میں بے اختیار اترتا اور ڈوبتا چلا گیا۔ یوں ڈوبتے اور ابھرتے وہ ان جھیلوں کے جزیروں میں پہنچ گیا۔ اچانک جھیلوں میں اٹھنے والی لہروں نے اس کی زندہ لاش کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اسے فوراً جزیروں سے اٹھا باہر پھینک دیا۔ اب وہ قافلے سے بچھڑے ہوئے مسافر کی طرح ایک ایسے ویرانے میں کھڑا تھا جہاں اسے کوئی راستہ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ البتہ نسرین اور جعفری کی باتیں صدائے جرس بن کر اس کے کانوں میں برابر گونج رہی تھیں۔

"فرزند علی، کیا پڑھائی جاری رکھنے کا ارادہ ہے؟" نسرین نے پوچھا۔

ابھی اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ جعفری بولا "یہ زیادتی ہے۔ غریب کو پورے نام سے پکارو۔ انہیں" فرزند علی فل سٹاپ" کہتے ہیں۔ پڑھائی کیا جاری رکھے گا یہ میرے خیال میں تو اس کی پڑھائی کو اب فل سٹاپ لگ گیا ہے۔ ویسے ہم جیسوں کو سکول چھوڑ دینا چاہیئے۔ اب تو موچی بھی فرسٹ آنا شروع ہو گئے ہیں۔"

"علم کسی کی وراثت نہیں۔ البتہ تم اپنی روایات پر قائم رہو۔ ہر جماعت میں دو دو سال لگاتے چلے جاؤ۔ کسی نہ کسی دن تو تعلیم مکمل کر ہی لو گے۔" نسرین نے طنزاً کہا۔

"میں صرف آپ کا ہم جماعت بننے کے شوق میں دو دو سال لگا رہا تھا۔ اب آپ کے نقش قدم پر چلنے کا ارادہ ہے اور اس وقت تک چلتا رہوں گا جب تک آپ کا دم نہیں ٹوٹ جاتا اور آپ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتیں۔" جعفری نے برجستہ کہا۔

"بکو مت۔"

"خفا کیوں ہوتی ہیں۔ اگر آپ کو کسی موچی کا ہی کلاس فیلو بننے کا شوق ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ ہم تو پھر بھی یہ کرتے ہی رہ گئے۔"

نسرین جا رہی تھی تو جعفری فرزند علی پر برس پڑا۔ "دفع ہو جاؤ۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

فرزند علی بجھا بجھا سا گھر پہنچا۔ اس نے اخبار کا وہ صفحہ اپنے سامنے پھیلا لیا جس پر اس کی اور نسرین کی تصویریں میٹرک کے امتحان میں ضلع بھر میں اول آنے پر ایک ساتھ چھپی تھیں۔ نسرین کی تصویر دیکھ کر اس نے دل میں کہا کہ وہ تو اپنی تصویر سے کہیں زیادہ خوبصورت ہے۔ مگر وہ خود اپنی تصویر جیسا جاذب نظر نہیں۔ نسرین کی آنکھوں کی پتلیوں میں دیکھا ہوا اپنا عکس اور جعفری کی باتیں اسے یاد آ رہی تھیں۔ اسے شدید احساس ہو رہا تھا کہ واقعی اس کا قد چھوٹا ہے۔

وقت رواں رہا۔ آخر ایک دن فرزند علی کے بوڑھے باپ نے وہی پرانا اخبار اپنے لڑکے کے ہاتھ سے کھینچتے ہوئے کہا "کب تک کاغذی پہلوان بنے رہو گے۔ چلو میرے ساتھ اپنا کام ہی سیکھ لو۔ ہاتھ میں ہنر ہونا اچھی بات ہے۔ اور پھر ایسا وقت آنے والا ہے جب ہم جیسوں کو اپنی اپنی قبر خود اپنے ہاتھوں سے کھودنا ہو گی اور مرنے سے پہلے ہی اس میں لیٹ جانا ہو گا۔"

باپ نے "آر" فرزند علی کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا کہ اسے پتھر پر تیز کرو۔ وہ آر تیز کر رہا تھا کہ نسرین اپنی سہیلی کے ساتھ کالج جانے کے لئے بازار میں سے گزری۔ سہیلی نے کہنی مارتے ہوئے نسرین کو فرزند علی کی طرف متوجہ کیا۔ نسرین کی سہیلی ہنس رہی تھی۔ پھر دونوں کی نگاہیں جعفری اور اس کے دوست کی نگاہوں سے ٹکرا گئیں جو پاس ہی گلی کے موڑ پر کھڑے تھے۔ پھر جب لڑکیاں آگے نکل گئیں تو جعفری کے دوست نے کہا "یار شاید کام بن گیا۔ آج دونوں نے پہلی بار لفٹ دی ہے۔"

فرزند علی یہ سب سن رہا تھا۔ اس کے ہاتھ نے "آر" کو زیادہ تیزی کے ساتھ پتھر پر رگڑنا شروع کر دیا۔

دوپہر کو جعفری نے عین اس وقت اپنا بوٹ صندوقچی پر رکھتے ہوئے فرزند علی کو پالش کرنے کے لئے کہا جب فرزند علی کا باپ مسجد میں ظہر کی نماز ادا کر رہا تھا اور نسرین اور اس کی سہیلی کالج سے واپس آ رہی تھیں۔ فرزند علی نے پالش کرنے سے انکار کر دیا۔

"جب پیشے بیٹھ ہی گئے ہو تو شرمانا کیسا!" جعفری نے طنزاً کہا۔ پھر نسرین پاس سے گزری تو کہنے لگا "ذرا سفارش کر دو۔ فل شاپ پالش نہیں کرتا!"

نسرین اور اس کی سہیلی کے قدم تیز ہو گئے۔ اس پر جعفری کے دوست نے کہا "چھوڑو سالے کو" اور پھر دونوں لڑکیوں کے ساتھ ساتھ ہو لئے اور انہیں تنگ کرنا شروع کر دیا۔ دکاندار یہ سب تماشا دیکھ رہے تھے اور بیٹھے مسکرا رہے تھے۔ فرزند علی برداشت نہ کر سکا۔ ہاتھ میں "[illegible]" لے اٹھا اور ان کے پاس پہنچ کر کہنے لگا "شرم کرو۔"

"تمہاری بہنیں لگتی ہیں؟" جعفری بولا۔

"میری جو بھی لگتی ہیں سو لگتی ہیں۔ تم اپنی بہنوں کا خیال کرو جو پڑھنے گئی ہوئی ہیں اور تم ایسے اوباش بالکل اسی طرح انہیں تنگ کر رہے ہوں گے۔"

جعفری نے زور کا ایک تھپڑ فرزند علی کے منہ پر مارا۔

دوسرے ہی لمحے "آر" جعفری کے دل کے پار تھی اور وہ زمین پر ڈھیر ہو گیا تھا۔ آناً فاناً سارا بازار بند ہو گیا۔

فرزند علی کا باپ ایک ایک کے پاس جا کر اس قرآنی آیت کا واسطہ دیتا رہا کہ "اے ایمان والو لوگوں کی دشمنی کا خیال تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف کی گواہی کے لئے کھڑے نہ ہو۔" لیکن مسجد کے مولوی تک نے جواب دیا کہ اس پر عمل صرف اس وقت ہو سکتا ہے جب معاشرے میں پورے اسلامی قوانین نافذ ہوں۔

سیشن نے سزائے موت کا، مگر بعد میں ہائی کورٹ نے چودہ سال قید بامشقت کا حکم سنا دیا۔

ملتان، ساہیوال اور قصور کی جیلوں کا چکر کاٹتے ہوئے جب وہ دوسری مرتبہ اپنے شہر کی جیل میں تبدیل ہوا تو اس کی سزا کے صرف تین ماہ باقی تھے۔ جیل کے ایک اہلکار نے اپنی عینک اتار کر اسے بڑے غور سے نیچے سے لے کر اوپر تک دیکھا اور گارڈ کو کہا کہ اسے بیرک نمبر ایک میں لے جاؤ۔ پھر دوسرے گارڈ کو حکم دیا کہ بھولا خنجر کو بلاؤ۔ اسے لایا گیا تو اہلکار بولا "بھولا جی دیکھو ایک نیا قیدی آیا ہے۔ اسے میں نے تمہاری ہی بیرک میں بھیجا ہے۔ اس کا نام فرزند علی عرف فل شاپ ہے۔ قتل کا جرم ہے۔ چودہ سال کی سزا میں سے صرف تین ماہ باقی ہیں۔ وہ چار جیلوں میں رہ چکا ہے۔ کہیں سے اس کی اچھی رپورٹ نہیں آئی چنانچہ پورے چودہ سال کے عرصہ میں اسے سزا میں کوئی رعایت نہیں ملی۔ معلوم ہوتا ہے جھگڑالو اور خودسر ہے۔ ذرا خیال رکھنا۔"

"آپ فکر نہ کریں۔ کہیں تو پہلے دن ہی اس کا دماغ درست کر دوں!"

"نہیں۔ ذرا اس کے چلن دیکھو —— ہاں مجھے آج تین سو روپوں کی ضرورت ہے۔"

بھولا خنجر نے تین سو روپے جیب سے نکال کر اہلکار کو دے دیئے اور خود واپس بیرک میں پہنچ کر اپنے چیلوں کو باداموں کا گلاس تیار کرنے کا حکم دیا۔ فرزند علی فل شاپ کو اپنے پاس بلایا اور گلاس پیش کرتے ہوئے بولا "بادشاہ، ہمارے ہوتے ہوئے تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہو گی بس ذرا ہم سے بنا کر رکھنا۔ میں نے سب سالوں کو حرام پر لگا رکھا ہے۔" کچھ قیدی نہایت خاموشی اور غور سے بھولا خنجر اور فرزند علی فل شاپ کو دیکھ رہے تھے۔

صبح فرزند علی گوبھی کی کیاریوں کی آبیاری میں مشغول تھا۔ اس نے پوچھا "بھولا خنجر کا کیا حدود اربعہ ہے؟"

بلیک کرتا ہے۔" ایک قیدی بولا۔

"قیدیوں کو چرس پر لگا رکھا ہے اور جیل میں جوا بھی کرواتا ہے۔" دوسرے قیدی نے کہا۔

"جیل کا عملہ اسے کچھ نہیں کہتا؟" فرزند علی فل ساپ نے پوچھا۔

"انھیں اپنا اپنا حصہ ملتا ہے۔" تیسرا قیدی بولا۔

"بڑا ظالم ہے۔ تین چار ہزار روپیہ ماہوار ناجائز کماتا ہے اور سب شراب اور آوارگی میں ضائع کر دیتا ہے۔ اپنی بیوی بچوں تک کا خیال نہیں رکھتا۔ بیوی کے ساتھ کئی دفعہ دفتر میں تکرار ہو چکی ہے۔ بے چاری کوئی شریف عورت معلوم ہوتی ہے۔" چوتھے قیدی نے کہا۔

"کوئی بات نہیں یہاں بھی برائیوں کو فل سٹاپ لگانا ہی پڑے گا۔ ذرا میں اپنے ساتھی پیدا کر لوں اور بھولا خنجر کی معرفت اپنے باپ سے مل لوں اسے ملے مجھے تین سال ہو گئے ہیں۔"

دوسرے ہی دن بھولا خنجر نے فرزند علی فل سٹاپ کو اطلاع دی۔ اس کے باپ کو مرے ہوئے دو سال ہو چکے ہیں۔ یہ خبر سنتے ہی اس کے اپنے ہر جذبہ کو فل سٹاپ لگ گیا۔ وہ اپنے حصے کا کام ختم کر کے نہایت خاموشی کے ساتھ بالکل الگ بیٹھا بھولا خنجر کی وارداتیں دیکھتا رہتا۔

ایک روز فرزند علی آنکھیں بند کئے اور گھٹنوں پر سر رکھے بالکل ایک بھیگے ہوئے پرانے بوٹ کی طرح ساکت تھا۔ اس کے ہاتھ جوتے کے تلے جیسے ہوئے تھے اور چہرہ ٹیٹی معلوم ہو رہا تھا۔ مونچھیں بوٹ کے تسموں کی طرح نیچے کی طرف لٹکی پڑ رہی تھیں۔ گارڈ نے آ کر کہا۔ "چلو فل سٹاپ آج تمہاری رہائی کا دن ہے۔ اب تم جہاں چاہو گے جا سکو گے۔"

حسرت بھری ہنسی فل سٹاپ کے چہرے پر نمودار ہوئی۔ اس کے دونوں ہونٹ ٹینی اور تلے کی طرح ایک دوسرے سے علیحدہ ہوئے۔

"چلو میرے ساتھ۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب سے ملاقات کے بعد تمہیں رہا کر دیا جائے گا۔ تمہارے کاغذات ان کی میز پر پڑے ہیں۔"

وہ خاموشی سے گارڈ کے ساتھ ہو لیا۔ جب دونوں گیٹ پر پہنچے تو دفتر میں ایک ہنگامہ برپا تھا۔ صاحب اور بیگم کا جھگڑا ہو رہا تھا۔ صاحب کہہ رہا تھا کہ جب میں نے تمہیں کئی دفعہ منع کیا ہے کہ جیل نہ آیا کرو تو تم میری بات کیوں نہیں مانتیں۔"

"تو گویا گھر سے تین دن غیر حاضر رہنے کا یہ جواب ہے؟ شرم نہیں آتی؟ اگر میرا نہیں تو اپنے بچوں کا ہی خیال کرو۔ یاد رکھو اگر تم آوارگی سے باز نہ آئے تو میں خودکشی کر لوں گی۔"

"خودکشی کرنے والے اجازت نہیں لیا کرتے۔" سپرنٹنڈنٹ نے جواب دیا۔

بیگم کرسی پر بیٹھی رو رہی تھی۔ فرزند علی کمرے میں داخل ہوا تو سپرنٹنڈنٹ کہہ رہا تھا۔ "کون سی آسائش ہے جو میں نے تمہیں مہیا نہیں کر رکھی ہے؟ پھر بھی تمہاری تسلی نہیں ہوتی۔ میں تمہارے اور بچوں کے علاوہ اس سوسائٹی کا ایک فرد بھی ہوں۔ میرے کچھ اور رکھ رکھاؤ بھی ہیں۔ رو کر دکھا رہی ہو۔ عورت کے آنسو فریب ہوتے ہیں۔ یہ ذات ہے ہی بے وفا۔ دیکھو اس فرزند علی فل سٹاپ کی طرف۔ اس نے ایک لڑکی کی عزت بچانے کی خاطر قتل کیا اور چودہ سال جیل میں گزارے اور وہ نہ جانے کہاں گلچھرے اڑا رہی ہو گی۔"

فل سٹاپ کا نام سنتے ہی بیگم نے آنسو صاف کئے اور بے اختیار فرزند علی کی طرف دیکھا۔ فرزند علی بیگم کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ ایسی جھیلوں کے کنارے کھڑا ہے جن کے سارے پیوٹے خشک ہو چکے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان جھیلوں میں پانی بھرنے لگا جن میں بیگم ڈوبتی چلی گئی اور آخر گل نسرین مرجھا کر کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔

بے قصور

عارفہ حسن احمد

ان کی ولدیت مشکوک تھی۔ ایک بڑے شہر کے کسی گمنام علاقے میں، انھوں نے اپنی ماں کی زیرِ نگرانی چھپتے چھپاتے زندگی گذاری۔ معاشرے میں اپنا مقام حاصل کرنے کے لئے انھیں عدالتوں کے دروازے کھٹکھٹانے پڑے۔ مقدموں کی اس بھرمار اور بچپن سے ہی جینے کی تگ و دو نے انھیں زندگی کے نشیب و فراز سے جلد روشناس کرا دیا۔ مقدمے جیت جانے پر وہ ایک ویران مگر معقول جائداد کے واحد مالک قرار دیئے گئے۔

ان کے عالمِ شباب میں مملکتِ خداداد پاکستان وجود میں آئی۔ ملازمت، صحافت، تجارت میں ہر طرف خلا تھا۔ پاکستان ایک چٹیل میدان کے موافق تھا، وہ جس طرف چاہتے سرپٹ دوڑ سکتے تھے۔ وقت کا فائدہ اٹھایا اور مقابلے کے امتحان میں بیٹھے۔ اس سال طلبا کم تھے اور اسامیاں زیادہ تھیں، چنانچہ وہ پلک جھپکتے میں سی، ایس، پی بن گئے۔

انگریز بڑے منجھے ہوئے سیاست داں تھے۔ دو صدیوں تک برصغیر پر ان کا بول بالا رہا۔ اُن کے دھیمے دھیمے کاروباری انداز پر تب تک کسی حکومت، ملک یا قوم کو شبہ نہ ہوا جب تک کہ وہ پوری طرح شکنجے میں کس نہ گئے۔ انھوں نے ہر خطے میں اپنے اہلکار بڑے پیار سے چنے اور پالے۔ انھی کی مدد سے دور دراز علاقوں پر حکومت کی۔ اس کارِ خیر کے لئے انھوں نے اس مخصوص طبقے کو بے تحاشا مراعات دیں اور یوں ملک میں بیوروکریسی کی بنیاد ڈالی۔ بیوروکریسی میں غیر مسلموں کی زیادہ حوصلہ افزائی کی گئی۔ وہ تو سو سال سے محکوم چلے آرہے تھے۔ اُن کی ہمدردیاں خریدنا نسبتاً آسان تھا۔ اس مخصوص طبقے کو جس کا رعب اور دبدبہ انگریز نے قائم کیا تھا، اکثر نوجوان للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ انگریز کی بنائی ہوئی یہ کرسی ان کے لئے ازحد اہمیت رکھتی تھی۔ ہماری کہانی کے ہیرو کو اپنی ابتدائی زندگی میں اچانک انقلاب آجانے اور اس کرسی کو اس طرح آسانی سے حاصل کرنے کا کبھی خیال بھی نہ آسکتا تھا

آزادی کے بعد ملک کے حالات دگرگوں سے رہے۔ دو چار ہی سال میں ملک اہم اور با اثر سیاسی شخصیتوں سے محروم ہوگیا۔ حکومت بیوروکریسی کے ہاتھ لگی جس نے انگریز کی کرسی سنبھالنے والوں کو "جینیئس" (GENIUS) کا نام دیا۔ پاکستان سائنس اور طب کی دوڑ میں تو پیچھے رہ گیا تھا۔ لیکن ڈنڈے بازی سے کام لینے والوں میں اول آنے کی جانب گامزن تھا۔ انھوں نے بھی اپنے خوابوں کی تکمیل کے لئے صاحب بہادری کے ہر اصول کو پورا کرنے کی ٹھانی۔ اِدھر اُدھر نظر دوڑائی اور ایک حسینۂ انجمن کو شمع خانہ بنانے کی سوچی۔ وہ بھی جیسے انتظار میں تھیں۔ بظاہر پھڑپھڑائیں اور مشرقی خاتون کی طرح اپنے آپ کو ایک بے بس پنچھی کی مانند اُن کی گود میں آن گرایا۔ ان کی والدہ کے لئے یہ صورتِ حال ایک صدمے سے کم نہ تھی۔ وہ اپنے اکلوتے صاحبزادے کی بولی لگوانے کی فکر میں تھیں۔ اپنی اہمیت بڑھانے کے لئے درجن بھر لڑکیوں کے والدین کو اپنی چوکھٹ پر سجدہ کروانے میں بھی کوئی مضائقہ نہ تھا، مگر جہاندیدہ خاتون تھیں۔ موقع کی نزاکت بھانپتے ہوئے اس کڑوی گولی کو نگل جانے ہی میں مصلحت سمجھی اور اجازت دے دی لیکن انھوں نے انتقام کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ اگر وہ ذہنی پسند کی بہو لاتیں تو جب بھی چپقلش تو چلتی لیکن اب تو چپقلش کے لئے ان کے پاس ایک خاصا معقول جواز موجود تھا۔ اس طرح یہ شادی ہر گذرتے لمحے کے ساتھ ہمارے ہیرو کے لئے مستقل دردِ سر بن گئی اور وہ اندرونی کشمکش کا بُری طرح شکار

ہو گئے۔ شاید اسی وجہ نے انھیں اِدھر اُدھر نظرِ التفات پھینکنے پر مجبور کیا۔ جوں جوں عمر گذرتی گئی وہ حسین عورتوں کے جھرمٹ میں زیادہ سے زیادہ دکھائی دینے لگے۔

اُن کی چال ڈھال، ان کا اٹھنا بیٹھنا، ان کا دیکھنا بھالنا ـــــ سب ان کے اندر لپکتے ہوئے کوندوں کے غماز تھے۔ وہ اقتدار کے خواہش مند تھے اور ترقی کی تمام سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے یکدم بالائی منزل کے جھروکوں سے جھانک کر نیچے پھیلی ہوئی مخلوق سے خراجِ تحسین حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس برق رفتاری کی وجہ سے وہ ملازمت کے اولین دور میں دو ایک دفعہ معطل بھی ہوئے مگر آدمی دل گردے والے تھے۔ آفتوں کا مقابلہ بچپن سے کرتے آ رہے تھے۔ دوڑ دھوپ کی اور بحال ہو گئے۔

ملک میں مارشل لگا۔ بظاہر خون کی ایک بوند نہ بہی مگر جمہوریت، صحافت اور شخصی آزادی کا بہتا خون کوئی نہ دیکھ سکا۔ فوج ملک کی سرحدوں کو زیادہ دیر تک خالی چھوڑ کر قوم کی ذہنی نشو و نما نہ کر سکتی تھی۔ اس لئے یہ کام سول حکام کے حوالے کر دیا گیا۔ ملک کے چند اہل حکام نے صدرِ مملکت کے گرد اپنا حلقہ تنگ کر دیا۔ یہ حکام ابھی تک ماضی میں رہ رہے تھے۔٭ ان کا طرزِ حکومت اور وضع کردہ پالیسیاں انتہائی ناقص اور صدیوں پرانے خطوط پر استوار تھیں۔ ملک سیاہ کاریوں کے اس دور میں داخل ہو چکا تھا جہاں بظاہر سکون اور زیرِ سطح تلاطم تھا۔ یہ حالات ان جیسے زرخیز اور اعلیٰ دماغ حاکم کے لئے مفید ثابت ہوئے۔ ایک اہم محکمے میں بیٹھ کر انھوں نے کروڑوں روپے کا زرِ مبادلہ اپنے کرم فرماؤں پر لٹوایا۔ خوشامدی حواری پیدا کئے۔ افواہ ہے کہ کچھ عرصہ سیاست کی جانب بھی راغب ہوئے (ملازمت چھوڑ کر یا دورانِ ملازمت ہی وزارت کی طرف چھلانگ لگا دینا اس دور میں اکثر افسرانِ بالا کا مشغلہ تھا) مگر بعض وجوہ کی بنا پر وہ ملازمت سے ہی چپکے رہے۔ شاید ملازمت کی ساکھ اس زمانۂ پر آشوب میں سیاسی زندگی سے زیادہ تھی۔ الغرض ناتجربہ کار لوگوں کو انڈسٹری کے لائسنس اور پرمٹ بانٹے گئے۔ قرضہ جات جاری ہوئے جن کا استعمال لندن کے پُر رونق شاپنگ ایریا میں نہایت خوش اسلوبی سے ہوا۔ اسی زمانے میں اُن کی ویران، ریگستانی زمینیں زیرِ آب آ کر سونا اگلنے لگیں۔ ملک کے ہر مشہور شہر میں ان کے بنگلے تعمیر ہو گئے۔ اور یہ سب کچھ ایک دم ہی ہو گیا۔

انھیں اریسٹوکریسی سے پیار تھا چنانچہ ایک اریسٹوکریٹ کی طرح انھیں اپنا ظاہری رکھ رکھاؤ تبدیل کرنا پڑا۔ آدابِ زندگی سیکھنے کے لئے انھیں شام کے وقت بار FIX کرنی پڑی۔ ایک عمدہ قسم کی لائبریری بنانی پڑی۔ کتابوں کی بھی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ چرمی جلدوں اور سنہری حروف میں لکھی ہوئی کتابیں STATUS کو کہیں سے کہیں لے جاتی ہیں۔ پڑھتے ہوئے کتابیں چاہے کتنی ہی احتیاط سے کیوں نہ برتی جائیں، تھوڑی بہت خراب ہو ہی جاتی ہیں اس لئے ایک اچھی لائبریری میں وہ بغیر پڑھے سجا دی جاتی ہیں۔ اس اصول کو وہ بخوبی سمجھتے تھے۔ حالات کی نزاکت اور نفاست کو پرکھ کر ان کی بیگم نے ان کا بھرپور ساتھ دیا۔ وہ ان کی ہمراہی میں ہر مرحلہ بہت خوبصورتی سے طے کرتی آ رہی تھیں۔ افسرانہ رکھ رکھاؤ میں تو وہ اپنے شوہر سے بھی آگے تھیں۔ انھوں نے اپنے گرد و پیش پر نگاہ ڈالی۔ اپنے زیرِ نگرانی عمدہ باورچیوں سے کھانا تیار کروا کر اپنے سلیقے اور گھر گرہستی کو سوسائٹی کے اونچے طبقے کی عکاسی کرنے والے رسالوں کے ذریعے مشتہر کرنے کی ٹھانی اور یوں اپنے شوہر کو ایک کامیاب زندگی گذارنے کے لئے ایک وفا شعار بیوی کی طرح کندھا دیا۔ ملک کے دو نہایت "اونچے پائے" کے رسالے خواتین کی سرپرستی میں ایک نہایت اہم قومی فریضہ انجام دے رہے تھے۔ یہ پاکستانی معاشرے کی بہترین عکاسی کر رہے تھے۔ ان رسالوں نے پاکستان کے ہر بڑے شہر میں اپنے اہلکار چھوڑے ہوئے تھے جو انھیں بیوروکریٹس کے ایک ایک لمحے کے پروگرام کی اطلاعات بہم پہنچاتے تھے۔ یہ تو ایک سینیئر افسر تھے اس لئے ان کے پروگراموں کو ان رسالوں میں بہت طویل اور بہت نمایاں جگہ ملتی تھی۔

٭ ROWLAND EGGER. THE IMPROVEMENT OF PUBLIC ADMINISTRATION IN PAKISTAN KARACHI THE INTER-SERVICES PRESS 1953. PAGE 5.

کوئی کسی اہم پوسٹ پر ذرا زیادہ عرصہ رہے تو کئی دوستوں اور دشمنوں کو تشویش لاحق ہو جاتی ہے۔ محفلوں میں چہ میگوئیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ وہ صاحب اپنے حسن سلوک سے حکومت کے مال کو اپنے حواریوں میں کتنی ہی خوش اسلوبی سے بانٹتے ہیں، دشمنوں کی تعداد بڑھتی ہی جاتی ہے۔ کئی حواری بھی دو رخی پالیسی اختیار کئے ہوتے ہیں مگر یہ جانتے ہوئے بھی انھیں سب کچھ دینا پڑتا ہے، اور پھر دیرگر بھی ان سے خائف رہنا پڑتا ہے۔ ترکیب یہی ہوتی ہے کہ کسی اور اہم اور اچھی جگہ کے لئے ہاتھ پاؤں چلائے جائیں۔ برا وقت آنے سے پہلے ہی وہ محکمہ، وہ پوسٹ، وہ شہر ہی چھوڑ دیا جائے۔ اگر ملک کے تمام اہم اور بڑے بڑے شہروں میں دھڑلے پن کی دھاک بیٹھ جائے تو کیا کہنے۔ ویسے بھی بڑے شہروں میں بڑے مواقع ملتے ہیں اور اس وقت تو ان کے سامنے ایسی بھی مثالیں موجود تھیں کہ لوگ ملازمتیں چھوڑ کر آئے اور راتوں رات بڑے صنعت کار بن گئے۔

ان حالات میں اس کہانی کے ہیرو نے ملک کے ایک بڑے شہر سے دوسرے بڑے اور سب سے اہم تجارتی مرکز کی طرف چھلانگ لگائی۔

اس دور میں بیوروکریسی اپنے عروج پر تھی۔ چیدہ چیدہ اونچی قسم کے صنعت کاروں کے سوا جنکی رسائی بادشاہ وقت تک تھی، باقی تمام تجارت پیشہ لوگ شدید احساس کمتری کا شکار تھے۔ ہر کام نکلوانے کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ افسران بالا کے بنگلوں اور دفتروں کے چکر لگائے جائیں۔ ذہانت سے زیادہ پرڈٹو کال کو اہمیت دی جاتی تھی۔ مردوں کے پاس وقت کم ہونے کی وجہ سے اکثر و بیشتر خواتین نے یہ جھنجھٹ سنبھال لئے تھے۔ محفلوں میں بیٹھ کر زیادہ سے زیادہ اونچے اونچے افسروں سے اپنی قربت کا ذکر کھلے الفاظ میں کرنا خاصا تاثر چھوڑتا تھا۔ کئی ایک موقع شناس خواتین نے تو یہ مشغلہ پیشہ ورانہ سطح پر اپنا لیا تھا اور اس کا استعمال بڑی خوبی سے کر رہی تھیں۔

مگر بیوروکریسی بھی طبقاتی کشمکش کا شکار تھی۔ ایک خاص طبقہ جو اپنے آپ کو سی۔ ایس۔ پی کہلواتا تھا، بادشاہ وقت کے گرد حلقہ ڈال کر خوفناک حد تک طاقتور ہو چکا تھا۔ یہ مخصوص گروپ بے چارے دیگر سرکاری ملازموں کی خوب اچھی طرح گوشمالی کر رہا تھا۔ اس گروپ کی تعداد و مراعات دیکھ کر نئی پود نے بجائے فنی تربیت حاصل کرنے کے ایڈمنسٹریشن کی طرف جانا شروع کر دیا۔ دنیا کے مہذب ملک فنی ماہرین دھڑا دھڑ نکال رہے تھے مگر پاکستان ایڈمنسٹریٹر پیدا کر رہا تھا۔ روس اور امریکہ چاند پر کمندیں ڈال رہے تھے اور پاکستان خلا کی ایڈمنسٹریشن کے لئے افرادی قوت تیار کر رہا تھا۔ ہر طرف دھاندلیاں تھیں۔ حکومت میں صاحب دل بھی تھے، اور صاحب قلم بھی لیکن صاحب گفتار کوئی نہ تھا۔

دوسری طرف زرخیز دماغ صنعت کاروں اور تاجروں نے بھی کوئی کمی نہ چھوڑ رکھی تھی۔ اونچی قسم کے افسروں کے احمق اور گاؤدی صاحبزادوں کو اچھی اچھی آفرز پیش کیں، اور بغیر مغز پچی کئے حکومت میں اپنے پاؤں پھیلائے۔ اس دور طوائف الملوکی میں آپ تبادلہ کے ایک اہم تجارتی مرکز میں آن کر گئے ____ ان کی خوش قسمتی نہیں تھی تو کیا تھا۔ انھیں ایک اہم شاہراہ پر ایک خوب بڑا سا پرانی وضع کا بنگلہ ملا۔ ان کی بیگم نے اسے ایک نیا DECOR دینا چاہا۔ حکومت کا مال بے دریغ خرچ ہوا۔ تمام گھر میں ایئرکنڈیشنرز نصب کئے گئے جو دراصل آفس کے استعمال کے لئے منگوائے گئے تھے۔ گھر میں اتنے ایئرکنڈیشنرز کے استعمال کا خرچہ ایک عام افسر کی تنخواہ سے دوگنا ہوتا ہے۔ لیکن وہ تو ایک بہت بڑے افسر تھے۔ حکومت کو ان کی خدمات کی اشد ضرورت تھی۔ حکومت میں ان کی موجودگی عوام کی فلاح و بہبود کے لئے ضروری تھی اور اسی لئے قوم کو انھیں ہر طریقے سے خوش رکھنا مقصود تھا۔ انھیں بھی اپنی اہمیت کا بخوبی احساس تھا۔ انھوں نے اپنی تنخواہ حکومت کی جانب سے صرف جیب خرچ سمجھی، باقی تمام اخراجات حکومت کے کھاتے میں ڈال دیئے اور زندگی ہنسی خوشی گذارنے لگے۔

پھر انھوں نے ایک شان بے نیازی سے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ محکمے کے فارن ٹرپس (FOREIGN TRIPS) کا جائزہ لیا اور محکمے کے ہر ٹرپ (TRIP) کے لئے اپنے آپ کو سب سے زیادہ موزوں پایا۔ ان کی زرخیزی دماغ اور قابلیت کو پرکھنے کے لئے اس سے اچھا موقع کونسا ہو سکتا تھا۔ محکمے کو لاکھوں کروڑوں روپے کی مشینری خریدنی پڑتی تھی۔ اس کی قیمت ایک فیصدی کے حساب سے بجائے محکمے

کے سینکڑوں [illegible] میں بٹنے گئے، ایک ان کے حصے میں آجائے تو وہ اس کا استعمال کرنا بہتر جانتے تھے۔ ان کی بیگم کتنی بھی شاپنگ کرنا چاہیں کرسکتی تھیں جن کو خوش رکھنا اب اُن کے لئے ضروری اور از حد ضروری تھا۔ اتنی اونچی پوسٹ پر جاکر بیگم سے بگڑیں، اسکینڈل بن جاتی تھیں اور ان کی مزید کامیابی کو خطرہ میں ڈال سکتی تھیں۔ اب وہ اپنی بیگم کی خواہش کی ہر چیز دنیا کے کونے کونے سے منگوا سکتے تھے۔ اور پھر یہ سب پیدا کرنے کے بعد بھی اُن کی دیہاتی زمینوں کو نہ چھوڑ کر نے کے لئے [illegible] تھا جس سے کہ وہ گاؤں میں نام پیدا کر سکتے تھے۔ آخر اپنی زمینیں وہ اپنے غریب کسان بھائیوں کی خوشحالی ہی کے لئے تو سیراب کرنا چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ بھی انھیں ڈھیر ساری مشکلات درپیش تھیں۔ بڑے بڑے شہروں میں چونکہ ملک سے باہر پڑھا ہوا لوگوں کا رجحان چل نکلا تھا، ان کی بیگم کو محفلوں میں وقت کا لحاظ کرتے ہوئے پیریڈ فرنیچر کی باتیں کرنی پڑیں۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے ڈیکوریٹر اور نوابی دور کی کرسیاں اُن کے گھر کی زینت بنیں[1]۔ FRENCH PROVINCIAL کا استعمال بخوبی ہوا۔ انھیں گھر کے لئے چاندی کے ظروف کی [illegible] کی ضرورت پڑی۔ بڑے بڑے جھاڑ فانوس (CHANDELLIER) اور نئی نئی قسم کے آلات برقی خریدنے پڑے۔ ان تمام اہم مسائل کے لئے انھیں [illegible] کی ضرورت تھی۔ یہ اپنی بیگم سے ویسے بھی خوش ہو گئے تھے۔ اُس بے چاری نے حالات سے سمجھوتہ کرلیا تھا۔ شوہر کی کھلم کھلا فلرٹیشن کو ماڈرن سوسائٹی کے "ایٹی کیٹس" سمجھ کر ان کی محبوباؤں کے ساتھ اچھے مراسم استوار کرلئے تھے۔ وہ اتنے نامی گرامی شوہر کا ساتھ چھوڑنا نہیں چاہتی تھیں۔

پھر بھی عورت تھیں، شوہر کا ہر شام مسند نوابی سجانا، بعض اوقات ہر جانب حوروں کا بٹھانا، شراب وکباب کے دور، شہر کے مشہور کلبوں میں کمپنیوں کے بڑے بڑے افسران کی بیگمات کو ان کا اچک اچک کر پیار کرنا، اپنے بے ہنگم ڈیل ڈول کے ساتھ ساری ساری رات ناچنا، بازار حسن کی ناچنے اور گانے والیوں سے محفلیں سجانا، رقص و عیش و نشاط جاری رہنا، پھر گھر میں [illegible] کے ساتھ ہر وقت کی چپقلش ——— اس رسہ کشی اور کشمکش کی زندگی نے اُن میں چند نامعلوم بیماریاں پیدا کردیں۔ ان کا مرض اپنے ملک کے ڈاکٹروں کے لئے جو اکثر باہر سے ہی تعلیم حاصل کرکے آئے ہوتے ہیں ناقابل تشخیص تھا اور ان کا علاج مشکل تھا۔ ویسے بھی امراء کی بیگمات کی ایڑیوں کا درد یا نبض کی رفتار باہر کے ڈاکٹروں کے علاج سے زیادہ یورپ کے فیشن ایبل شاپنگ سنٹر ٹھیک کرتے ہیں۔ لندن کی پکاڈلی، آکسفورڈ اور ہارلے سٹریٹ پر چل چل کر بھلا کس کے پاؤں کی دکھن ختم نہ ہوگی یا دوران خون میں باقاعدگی نہ آئے گی۔ ملک میں سوائے ڈانس فلور کے کہاں چلنا نصیب ہوتا ہے۔ بہرحال یہاں کے ڈاکٹروں کے علاج سے (انھیں بغیر دکھلائے) وہ تنگ ہار کر دیا تا، سوئٹزرلینڈ اور لندن کے ڈاکٹروں کے ساتھ قسمت آزمائی کرنے چل پڑیں۔ بیماری کا سر پیر پتہ چل رہا تھا۔ شاید کہ اُن کے شوہر کی کھلم کھلا دل لگی کی عادت نے ان میں شعوری یا لاشعوری یا کم از کم تحت الشعوری بیماریاں پیدا کردی تھیں۔ ایسی بیماریوں کا علاج عموماً ڈاکٹر مصروف رہنا بتاتے ہیں۔ اب اس STATUS پر پہنچ کر اپنے آپ کو مصروف رکھنے کے لئے چرخا جھونکنے سے تو رہیں، مسکین اور نادار داروں کی سرپرستی بھی کافی بوریت کا کام تھا۔ مصروف رہنے کا علاج انھوں نے ایک ہی سوچا کہ فیشن پرستی میں نئی نسل کی رہنمائی کی جائے اور اپنے آپ کو مصروف رکھا جائے۔ اس کے لئے ایک میگزین نکالنے کی ضرورت پیش آئی۔ میگزین نکالنے کی اجازت ایک عام آدمی کو ملنی مشکل ہوتی ہے مگر ایک اچھے پائے کی فیشن ایبل خاتون کو جو خوش پوشاک تھیں اور بہترین خانساموں کی نگرانی میں پکے ہوئے کھانوں کی مشاق تھیں اور اونچی سوسائٹی کی روح رواں تھیں، ایسی تکلیف کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ صحافت ویسے بھی ختم تھی۔ ادب میں جمود تھا اور بادشاہ وقت کو سیاست اور صحافت دونوں سے چڑ تھی۔ اس قسم کے رسالے صحافت کو تھوڑا بہت زندہ رکھنے کے لئے ضروری تھے۔ سیاسی اور ملکی صورت حال سے نوجوان نسل کی توجہ کو ہٹانا بھی ایک طرح کی خدمت ہی تھی کیونکہ کسی سماجی برائی کے خلاف ہمیشہ یہ نوجوان طبقہ ہی مصیبت کا باعث بنتا ہے۔ رسالہ بڑے زور شور سے نکلا۔ لیکن زیادہ نہ بک سکا۔ غریب عوام مہنگائی کی چکی میں پس رہے ہوتے ہیں۔ اُن میں ان لوازمات لباس کا بوجھ سہارنے کی سکت ہی کہاں تھی۔ امراء جو ضرورت کی ہر چیز باہر سے لے آتے تھے، رسالے بھی وہیں کے پسند کرتے ہیں۔ ویسے بھی ان کا یہ عروج کم ہی دوستوں کو بھایا۔ بظاہر خوش اخلاقی سے سراہا، گرداد دیتے رہے لیکن اندر ہی اندر جڑیں کاٹنے لگے۔ اندر سے ان کے حلقے کی ہر خاتون

[1] فرنیچر کا خاص ڈیزائن

ان کی خوش قسمتی پر رشک کرتی تھی۔ وہ ہر محفل میں ہاتھوں ہاتھ لی جاتی تھیں اب وہ صرف وزرا، اور سفارت خانوں کے دعوت نامے منظور کرنا چاہتی تھیں۔ شام کسی بہت اچھے کلب میں گذار لینے میں ہرج نہ تھا، ورنہ اکثر گھر پر ہی دربار عام و خاص منعقد ہوتا تھا۔ اسی دوران انہیں رنگ رنگ کے جواہرات اور بے حد قیمتی یا نیم قیمتی "سنگ پارے" جمع کرنے کا بڑا شوق پیدا ہو گیا۔ یہ شوق پورا کرنے کے لئے اس حسینۂ خوش لباس نے ہر پوشاک، اور ہر لباس کے رنگ کے ساتھ کا سیٹ بنوایا۔ خاص خاص قسم کے پتھر اُڑوائے اور اپنے حسن کو چار چاند لگائے۔ اکثر زیورات محفلوں میں اپنے آباؤ اجداد کے کہہ کر پہنے۔ آزادی کے بعد ملک میں کئی لٹی پٹی امیرزادیوں کو اپنی عیاشیاں جاری رکھنے کے لئے پرانے وقتوں کے زیورات بیچنے پڑے۔ یہ زیورات ملک کے نو دولتوں میں بڑی قدر و منزلت سے دیکھے جاتے تھے۔ اس لئے بڑی بڑی قیمتوں پر بکے۔ ایسے بنے بنائے سیٹوں پر بھی انھوں نے اپنی نظر عنایت قائم رکھی۔

ایک روز خبر ملی کہ وہ محب وطن ہو گئی ہیں۔ وہ اس طرح کہ ان کے پاس اللہ کا دیا سب کچھ تھا، ہر چیز کی فراوانی تھی۔ وہ اس دنیا میں کچھ کرنا چاہتی تھیں۔ انھوں نے پاکستان ہینڈی کرافٹ اور کلچر کو باہر کی دنیا میں روشناس کرانے کی سوچی۔ یہ حب الوطنی کا کام انہیں بڑا آسان لگا۔ ان کے شوہر ایک نیم سرکاری خود مختار ادارے کے سربراہ مقرر ہو گئے تھے۔ ماتحت ہزاروں کا عملہ کام کرتا تھا۔ بیگم صاحبہ کی قوم پرستی اور حب الوطنی کی داستانیں سینہ بہ سینہ پھیلائی گئیں۔ محکمے کا ہر فرد ان کے حکم کی بجا آوری کے لئے تیار ہو گیا۔ ان کے ایک ایک اشارے کے منتظر یہ لوگ دراصل ان کے دربار میں رسائی کے بھی خواہش مند تھے اس لئے ہر ایک نے ان کی سربراہی میں قوم کا نجات دہندہ ہونے کا شرف حاصل کرنا چاہا۔ وہ یہ حوصلہ افزائی دیکھ کر بہت محظوظ ہوئیں۔ ان کے کھوکھلے قہقہوں میں جان سی پڑ گئی۔ ابھی ان نفسیاتی الجھنوں کے باوجود ان میں زندگی کی امنگ اور رمق باقی تھی، اور پھر ان کی زندگی ایک اطلاقی ندی کی طرح رواں دواں ہو گئی۔ سوات، دیر، چترال، بلوچستان اور سندھ کے پسماندہ علاقے ان کی نظر عنایت کا مسکن بنے۔ وہ اپنے ناتواں کندھوں پر قوم کی اتنی بڑی ذمہ داری لے کر اٹھی تھیں۔ انہیں چاروں طرف سے واہ واہی۔ شوہر کے خود مختار ادارے نے اس کار خیر کے لئے پوری سہولتیں مہیا کیں۔ ایر کنڈیشنڈ کاریں اور دور دراز کے ریسٹ ہاؤسز ریزرو ہوتے۔ یہ وہ آرام دہ بنگلے تھے جو ہمارے ملک میں صرف وی آئی پی کے لئے ریزرو ہو سکتے تھے۔ سیاح اور سیاحت اس ملک میں ایک بے معنی سی چیز تھی۔ ایک عام آدمی وہاں جا کر نہیں رہ سکتا تھا۔ یہ وہ علاقے تھے جہاں عوام کو کبھی کبھی سڑک پر ایک لمبی سی چمکیلی کار رینگتی نظر آتی تھی کہ یہ مارشل لا کا دور تھا۔ ابھی انقلابی نعروں سے قوم روشناس نہ تھی۔ لاوا اندر ہی اندر پک رہا تھا، ابھی آتش فشاں پھٹا نہیں تھا۔

پھر انھوں نے بیرونی ملکوں میں حصہ لیا، قوم کا نام اونچا کیا اور اپنے خون پسینے کی کمائی غیر ملکی زر مبادلہ کی صورت باہر کے ملکوں میں رکھواتی رہیں۔ اخبارات میں ان کی حب الوطنی کے چرچے جلی سرخیوں کے ساتھ شائع ہوئے۔ نیشنل پریس ٹرسٹ نے ان کی سرپرستی کی۔ اپنے چرچوں اور کامیابی کے قصے پڑھ پڑھ کر وہ کچھ مطمئن سی نظر آنے لگیں۔ ان کی بیماری آدھی رہ گئی۔ ان کی انا کو تسکین کے سامان مہیا ہو گئے تھے۔

ادھر ان کے شوہر کی زندگی بھی بقول ایک پاکستانی ادیب کے عمر خیام کی رباعی، موپاساں کا افسانہ اور فیض کی غزل سے کم نہ تھی۔ وہ پوری طور پر بے فکر اور آزاد تھے۔ انھوں نے اپنا سفر بڑی خوش اسلوبی سے طے کیا تھا۔ بس آخری سیڑھی چڑھنے کے منتظر تھے۔ اس کے لئے صرف تھوڑے سے عرصے کی دیر تھی۔ سرکاری ملازم تھے، پچیس یا تیس سال پورے کرنے ان کے لئے ضروری تھے۔ وہ ملک کی سب سے عمدہ سروس میں تھے۔ وہ اعلیٰ دماغ تھے۔ وہ ایک اونچی شخصیت بن چکے تھے لیکن پھر — حالات اتنی جلدی پلٹا کھا گئے کہ انہیں کچھ سمجھ ہی میں نہ آیا۔ ملک میں ایک انقلابی نعرہ گونج اٹھا۔ انسانی لہو کے جذبات رس ٹوٹ گئے۔ ایک عوامی تحریک زور پکڑ گئی۔ بادشاہ وقت بے بس ہو گیا۔ اس کے اعلیٰ ذہن مشیر ڈھیلے پڑ گئے۔

یہ سال ان کے لئے بڑا منحوس ثابت ہوا۔ حکومت بدل گئی۔ دوسروں کے ساتھ ان کا بھی محاسبہ کیا گیا۔ ان کی بد اعمالیوں کی فہرست کافی لمبی پائی گئی۔ بے چاروں کی ٹانگ کھینچ لی گئی اور یوں وہ آخری سیڑھی چڑھنے سے پہلے ہی پھسل گئے۔ بلندی سے پستی کی جانب لڑھکے اور جب رکے تو گرد جھاڑ کر بڑی معصومیت سے بولے "یہ سب سیاسی رقابت کا معاملہ ہے ورنہ مجھ غریب کا قصور ہی کیا تھا!"

سول فشن

نسیم نیشو فوز

کہانی دنیا کے سات مشہور پہاڑوں کے فاتح فلک پیماؤں کی نہیں ایک پہاڑی پر رہنے والے خلوت نشیں شخص تحمین کی ہے جسے بلندیوں سے پیار تھا۔

بلندیاں جنہیں سدا تازہ ہوائیں اور قوس و قزح میں ڈھلے ہوئے بادل ہی چوم سکتے تھے تحمین بھی نظارت کے اس جشن و نشاط میں ہمہ وقت شریک رہنا چاہتا تھا۔ علامت کے طور پر تحمین نے سات پہاڑوں کا ایک نقشہ اپنے مثلث طرز کے مکان میں آویزاں کر رکھا تھا۔ قدرت کے سات جلال افروز اہرام جن کے قدموں تلے وادیاں عجب خنکی و وارفتگی کے ساتھ انسانی آبادیوں سے منہ چھپائے رہتی تھیں۔

تحمین کی آنکھیں مغربی افق کے سارے رنگ اپنی بصارت کے الاؤ میں سمیٹ لیتیں اور پھر وہ رنگ اس کے خوابوں کے سیال مرکز پر ابلنے لگتے، مچلنے لگتے اور ماضی کے بے نور گوشوں کو تابناک بناتے جاتے۔ تخیل کا ہر ہیولا تحمین کے خوابوں کا زائر بننے کا آرزومند رہتا۔

"رنگوں کے بہترین مرقعے انسان کے خواب میں پنہاں ہیں۔ ان رنگوں کا المیہ یہی ہے کہ وہ کینوس پر بکھیر دیئے جاتے ہیں۔ ان کی محفوظ ترین پناہ گاہ انسان کا خواب ہے۔ خواب انسانی تخیل کا خزانہ ہے۔ یہ کسی نفسیاتی کامپلکس کی عبث تعبیر نہیں روحِ انسان کی بلندیوں کا ہمالہ ہے۔ میرا فلسفۂ حیات تو یہ ہے کہ پہاڑ کی چوٹیاں فتح کر کے تم روح کی فرزانگی سر کر لو گے۔ اسی لئے میرے چہرے کا رخ ہمیشہ وادیٔ کشمیر کے جنوب مغربی نانگا پربت کی طرف رہتا ہے کہ میرا دل و دماغ ابر پوش فرازوں میں کھویا رہے۔"

تنہائی میں یہ الفاظ کہتے ہوئے تحمین کا چہرہ دھیرے دھیرے۔ چلتی ہوئی دھند کے اندر چند لمحوں کے لئے چھپ کر خود بھی دھند بن گیا۔ دھند کا نیم عمودی مرغولہ......

میرے مہمان بن کر اپنی ارضیت کے سارے تخیلات ان لامتناہی فضاؤں میں رخصت ہوتی ہوئی دھند کے سپرد کر دو تم وجدان کی طمانیت اور زندان کی ملکوتی کشادگی سے بھی نجات پا لوگے۔ یہاں رہبانیت اور تصوف تک دونوں ہی انسانی خودی سے جان چھڑانے میں کوشاں نظر آتے ہیں۔ یہاں تو ہر بلندی زمان و مکاں سے مزاحمت و مبارزت کرنے کے لئے مضطرب رہتی ہے لیکن یہ مزاحمت فتح کا تکبر بننا نہیں چاہتی کیونکہ یہاں دور عداوت نہیں، وقت مخاصمت نہیں، یہ سمجھ لو کہ ہر بلندی نفسی ایجاب ہے ہر عرش بلد برف کی شیفون نما چادر پہن کر اپنے ہم صفیر عرش بلد کو بشاشت سے دیکھتا ہے۔

"میں ہمالہ، پامیر، اینڈیس، ماؤنٹ ماکنلے، کلمنجارو، کوہ قاف اور الپس کے مطلعوں کی تقاردنیت [?] کو اپنی روح پر ثبت کر لینا چاہتا ہوں تاکہ انسان کو زمان و مکاں کے بے حد قابل فہم نصب العین سے روشناس کرا سکوں جب کہ بحر و بر کی فضائیں آلودگیوں کا شکار ہو رہی ہیں ہر نیا تحقیقی گزٹ اس بات کا شاہد ہے کہ فضاؤں کی آلودگی انسانی تنفس کو بری طرح متاثر کر رہی ہے۔ جدید تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ دنیا میں خالص پانی کی مقدار صرف ایک فی صد رہ گئی ہے وہ بھی جھیلوں اور ندیوں میں۔ باقی پانی سمندر کا نمکیاتی جزو ہو کر رہ گیا ہے۔ اب شاید درکار ہے اقدام جو زمانوں کے

خالص بہاؤ کا مرہونِ منت بھی نہ رہے۔ ہم نے اپنے وجود کو روح میں تحلیل کرنا نہیں سیکھا۔ اپنی علتِ غائی کو سمجھنے کے لیے پہنچنے کی بلندی پر ایک بنیادی خط کھینچو۔ غالباً تبت کا ہر دلائی لامہ اپنی فراستوں کا خط ایک مخصوص بنیاد پر کھینچتا ہوگا۔ تبت کا پوتالہ محض ایک رفعت انگیز محل کا نام نہیں انسان کی صدیوں کی حاصل کردہ فراست وکیاست کی علامت ہے۔ زمین کے رشتوں کی فرسودہ تلاش اب ختم کرو۔ تمہاری زمین کی یہ ھموریاں اپنے تجاوز تک پہنچ چکی ہیں۔ وہاں موت بھی اپنے زرد رو فسانے سناتے سناتے پتھرا چکی۔ ان افسانوں میں دیوں اور اوتاروں کی خاک شدہ معدومیت کا پندار تک ڈھے چکا۔ اب کون سے نئے کلائمکس کی تلاش میں اپنی زندگی کو یکسانیت کی طویل ترین کہانی بنانا چاہتے ہو؟

ایک مٹیالے بادل نے تحمین کی پیشانی کو چوما اور ہوتے ہوتے سنہری بادلوں سے جا ملا۔ ادھر شام کا سامنا کرنے کا خیال آتے ہی سورج کے ماتھے پر سرمئی بادلوں کا گہرا پسینہ آگیا۔ سنہری پن کا جال ٹوٹ گیا۔ پھیلتی ہوئی تاریکی نے سورج کا غرور ـــــ غروب کر دیا۔

تحمین تا حدِ نگاہ نظریں دوڑاتے دوڑاتے خود ایک سلھوتی نقطہ سا دکھائی دینے لگا۔ خواب کا مٹامٹا سا ہیولا نیند کے گہرے خزانے میں جھلملاتا ہوا۔ بہت نیچے گاؤں کی چھوٹی سی مسجد سے مغرب کی اذان سنائی دینے لگی۔

"تمہاری مسجد، مندر اور کلیسا کے مینارے اور ان کلسوں کی عمودیت کیا تمہیں بلندیوں میں تحلیل ہو جانے کا درس نہیں دیتی؟"

تب رات کی خنک ہوائیں چراگاہوں میں استراحت کرنے کے لئے گنبد آسا سی ہونے لگیں۔

مجھے یہ بھی بتاتے چلو کہ کوہ اولمپس کے یونانی دیوتاؤں کو معزول کر کے تم نے اپنی انسانی عظمت کو کون سی نئی معراج تک پہنچایا ہے۔ ان بارہ گریک دیوتاؤں کو اپنے اس "ماؤنٹ کا شاورش" پہ آنے کی دعوت دیتا ہوں۔ میں اُن کے طفیل دیومالائی داستانوں کا نیا باب کھولنا چاہتا ہوں۔ اے اولمپئین دیوتاؤ! دنیا کے سارے کوہستانی سلسلے تمہارے منتظر رہیں گے۔ کوہ پیماؤں کی شہید روحیں تم ہی کو سربلند کرنے کے لئے گلیشیرز اور آئس فالز میں معدوم ہو گئیں۔ خدارا ہماری زندگی کی اسراریت ہمیں لوٹا دو۔ ہم تحیرات میں محو ہو جانے کے لئے اک عجب بے چارگی سے دبا گئے ہیں۔

یہ کہہ کر تحمین نے اپنے دونوں ہاتھ فضا میں یوں بلند کر دیئے، جیسے کسی دعا کے بول اس کے ہاتھ چوم رہے ہوں۔

"معجزات کو راندۂ زمانہ کرنے والے ہم خود ہیں۔ اس کی وجہ؟ فہم و دانش اور ادراک کے رفیع الشان جہان نماؤں کو ہم ابھی تک فطرت کی رعنائیوں میں تحلیل نہ کر سکے۔"

تحمین کا عزیز ترین دوست اطرش ایک ڈھلوان کو بمشکل پھلانگتا ہوا اس کے قریب آرہا تھا۔ "فراریت کا یہ راستہ کب تک اختیار کئے رہو گے؟ تحمین دنیا کی یہ آبادیاں پہاڑیوں پر بسیرا نہیں کر سکتیں۔ واپس چلے آؤ تحمین! واپس۔"

اگر انسان اپنے لئے فلک بوس سکائی سکریپرز بنا سکتا ہے تو وہ فطرت کے ان کھلے اور شاداب سکائی سکریپرز پر کیوں بسیرا نہیں کر سکتا!!

"لیکن" اطرش کہتے کہتے رکا۔

"سنو! ہلمور براؤن ایک مصور تھا۔ لینڈ سکیپ مصور جو پہاڑوں کے دلفریب مناظر بناتے بناتے خود کوہ پیما بن بیٹھا۔ آئرش شاعر یٹس (YEATS) نے گالوے کے نارمن ٹاور میں رہنا پسند کیا اور وہیں رہ کر اپنی شاہکار نظم "SAILING TO BYZANTIUM" کمپوز کی۔ نارمن ٹاور میں بیٹھے بیٹھے بازنطینہ کے مقدس شہر جانے کا خواب!!! انسان کو ارضی بلندی ہی روح کی تقدیس کا سبق دے سکتی ہے۔

I HAVE SPREAD MY DREAMS UNDER YOUR FEET

TREAD SOFTLY BEARUSE YOU TREAD ON MY DREAMS.

"یہ خوابوں اور معجزوں کی دنیا نہیں رہی تحمین! تم کسی بھی بازنطینہ کو اپنے خوابوں کے آنچل میں نہیں سمو سکتے۔ آج کے خوابوں کے آئیڈیل ازم پر فرائیڈین تعبیروں کا پہرہ ہے۔"

"نہیں خواب اور معجزے کے درمیان انسانی زندگی کی حقیقی وسعت گاہ ہے۔ انسان کی پیدائش خواب ہے زندگی کی بڑی تعبیر کی رات

اور موت خود ایک معجزہ ہے ایک اور بڑی تعبیر کی طرف۔"

"تم تہذیب و تقدیر کی مرحوم اقدار کا موازنہ معجزوں سے نہ کرو تحسین! اس لفظ کی تقدیس کا کچھ تو خیال کرو۔"

"میں طورِ سینین پر جانے والے پیغمبر کے یدِ بیضا کا ذکر نہیں کر رہا ہوں اطرش!" یہ کہتے ہوئے تحسین نے اپنی دونوں ہتھیلیاں کھول دیں، ہتھیلیاں سلیٹ کی طرح صاف تھیں۔ وہاں تقدیر کی سب لکیریں غائب تھیں البتہ انگلیوں کی پوروں کی لکیریں مدھم مدھم ہو رہی تھیں۔ اطرش کا استعجاب دیکھنے کے قابل تھا۔

"حجروں کی پُر صمت عبادت کو منتہی کی کشادہ عبادت کی اس عینی شہادت کا فرق تم دیکھ سکتے ہو میں ان ہتھیلیوں کو اپنی آنکھوں پر رکھ کر تمہارے ہر خواب کی تعبیر بتا سکتا ہوں، جب تم اپنے خوابوں پر ایمان نہیں رکھتے تو زندگی کی بڑی بڑی قدروں اور صداقتوں پر کیسے ایمان رکھ سکتے ہو؟" پھر اطرش نے ایک اور عجیب نظارہ دیکھا، جگنوؤں کی ٹمٹماتی سی قطار تحسین کے سر پر ہالہ سا بناتی ہوئی جگمگانے لگی۔ ایک قوس نما سیمیں تاج۔

"بتاؤ کس خواب کی انسان کے پاس تعبیر نہیں۔ تعبیریں خود حسین خوابوں کی متلاشی ہیں۔"

"ہم ان پہاڑوں سے معدنی خزانے چرا کر ان پہاڑوں کی روح سلب کر لیتے ہیں۔ کاش میں ان معدنی خزانوں کی پاسبانی کر سکتا۔ مائیکل انجلو نے مرمر اور رخام چرائے میں خاموش رہا۔ ڈاکٹر لیکی نے فوسل ایپس (FOSSIL APES) اور 'MANDIBLES' کو کھنگالا میں نے احتجاج نہ کیا۔ مادام کیوری نے پچ بلینڈ DITCH BLEND کے تجربے کئے میں حرفِ شکایت زبان پر نہ لایا۔ انریکو فرمی نے یورینیم فیشن کیا میں کچھ بھی نہ بولا۔ میں سول فشن (SOUL FISSION) کا پروجیکٹ دنیا والوں کے پاس پیش کرتا ہوں جس سے انفس و آفاق کے ہر فلسفۂ اضافیت کی پہچان ہو سکتی ہے لیکن یہ سب کچھ پہاڑ کی بلندی پر ہی ممکن ہے۔"

وہ خودرو کاہی کی نیم سپید بالیوں کے درمیان چلتا چلتا جنگلی گلاب، نسترن اور سیوتی کے پھول چنتا رہا۔

"کیا ہماری خارج کی ہوئی زہر آلود سانسوں میں اتنی سکت باقی رہ گئی ہے کہ وہ بادل سے آنے والی شفاف بارش سے اپنی روح کی تطہیر کر سکیں؟ میں اسی زہر آلودگی کی متنفس علامت ہوں۔"

یہ کہتے کہتے تحسین نے ان پھولوں کو نیچے وادی کی طرف بکھیرنا شروع کر دیا۔ "دنیا کا سب سے بڑا معبر ان پھولوں کی وارفتہ بارش سے اپنے نیچے اترنے کا اعلان کر رہا ہے۔ آج سات سال بعد میں تمہاری سرزمین پر اترنے والا ہوں نطشے کا زرتشت بن کر نہیں، خلیل جبران کا المصطفٰے بن کر کسی ایورسٹ کا طلاری یا شرپا تن زنگ بن کر نہیں بلکہ جدید زمانے کا معجزاتی کردار بن کر میں اپنی خوابوں کی تعبیریں سنانے جا رہا ہوں جنھیں روح کے آفاق پر بیکرانی نصیب ہوتی ہے صرف ایک دن کے لئے۔"

تحسین پر عجیب سی مدہوشی چھا رہی تھی۔

"بخدا میں اگر ان بھٹکتے ہوئے جگنوؤں سے ان کی روشنی مانگ لوں تو وہ اپنی روشنی بھی مجھے دان دے دیں گے اور سنو انہی ڈونگروں اور پربتوں پر منطق الطیر کے پرندوں کی مجلسِ شوریٰ منعقد ہوئی تھی یہیں شاہ سلیمان کے ہدہد نے اپنی فہم و دانش کا تاج مجھے پہنایا تھا اور وہ میں ہی تھا جس نے ان پرندوں کو کوہِ قاف کا پتہ بتلایا تھا میرے قدموں کی اتنی چاپ سن کر خزاں رنگ زعفران لہلہانے لگتے تھے۔ ہواؤں کے زمستانی تنفس سے مسحور ہو کر قوسِ قزح میرا پیراہن بن جایا کرتی تھی۔ فلک کا ملائم کبودی پھیلاؤ میرے دہقانی مزاج کا کمبل ہے۔ میں ان بلندیوں پر رہتے ہوئے فطرت کی دلآویزیوں کو ہر لحظہ چومنا چاہتا ہوں۔ فطرت بقول ورڈزورتھ جو خدا کا تنفسِ عدیم [?] ہے۔ میں اس الوہی تنفس میں تحلیل ہو جانے کے بعد اپنی ہستی کو تقریباً گم کر چکا ہوں۔ الوہی تنفس میں تحلیل ہو جانے کے بعد معجزے اور کرشمے کی بلند بانگ آرزو کس لئے؟"

اطرش پر جیسے تحسین کے ساحرانہ کلمات غنودہ کیفیات طاری کر رہے تھے کہ اچانک پشتے کا ایک کمزور کنارہ ٹوٹ گیا اور یک بیک تحسین موت اور فنا کی قرمزی قوس بن کر بہت نیچے کھڈ میں جا گرا۔ اطرش دیوانوں کی طرح پھلانگتا ہوا تحسین تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تحسین کی جیب سے بلند پیما (HYPSOMETER) ٹوٹ چکا تھا بالکل تحسین کے شکستہ استخواں کی طرح۔

"میرا ایمان ہے دنیا کے سب پہاڑ ایک نہ ایک دن کوہِ طور کا مرتبہ حاصل کر لیں گے۔"

تحسین کے یہ آخری الفاظ وادیوں میں ایک تعزیتی گونج بن کر رہ گئے۔ تحسین کی ہتھیلیوں پر قسمت کی لکیریں دوبارہ پھیلنے لگیں۔ معتبر تعبیروں کے ابدی دہانے کی طرف رخصت ہو گیا۔

دستک

شاهد جیلانی

وہ کافی دیر سے کھڑا اپنا ہی دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ کھال کے موٹے پٹ کوٹتے کوٹتے اب تو اُس کے ہاتھ بھی دکھنے لگے تھے۔ اپنے آپ پر اپنا ہی دروازہ بند پاکر، اُسے یوں لگا جیسے وہ انجانے ہی انجانے میں زندگی کے لین دین میں بہت مقروض ہو چکا ہو۔ اور کچھ ایسا ڈرا ڈرا سا مقروض کہ اب اپنے آپ کو ہی اپنی دہلیز پر قرض خواہ سمجھ بیٹھا ہے۔ گہرائیوں سے اُٹھنے والا یہ احساس کسی سادہ لوح اعتراف کی طرح تھکی ہوئی مسکراہٹ کے روپ میں سطح پر ابھر رہا تھا کہ شعور کے اتھلے پانیوں سے ایک سرخ خونخوار شارک کی تیزی سے اس پر جھپٹی۔ زیرِ سطح ذرا سی دیر کے لئے تھوڑی سی ہلچل ہوئی اور پھر سطحِ آب روزانہ کی طرح آواز کے چند شفاف بلبلے چٹخے: "بھلا کہیں ایسا بھی ہوتا ہے ..... خود ہی مقروض اور خود ہی قرض خواہ؟ ..... نہیں میں شاید خواب دیکھ رہا ہوں ..... خواب ...."

اُس نے خود کو جھنجھوڑا۔ جھنجھوڑنے سے کڑیاں پھر سے جڑیں اور اُسے یاد آیا کہ وہ اپنے ہی دروازے پر دستک دے رہا ہے۔ اُس نے تھکی تھکی نگاہوں سے اپنے نام کی تختی ایک بار پھر پڑھی جس کے نیچے کا دروازہ ابھی تک کسی نوزائیدہ کی مٹھی کی طرح سختی سے بند تھا، البتہ کوئی اور دروازہ کہیں کھلا۔ اُس نے جھنجھلاتے ہوئے کہا "لیکن ..... وہ بات تو اب پرانی ہو چکی ہے۔ تب یہ صدی کبڑی نہیں ہوئی تھی ..... وہ سردیوں کی ..... رات" اُس نے جھرجھری لی "اُف! وہ رات بھی کیسی ..... ہولناک تھی ..... اور سردی کی شدت؟"

شاید ایسی ہی شدت سے وہ خوابوں کا دلدادہ تھا۔ وہ پہروں کہانیاں سنا کرتا ..... سردیوں کی لمبی راتوں میں جب اُس کی ماں چرخہ لے کر رات گئے تک سوت کاتا کرتی ..... اور ..... یہ پاس بیٹھا کہانیوں کے سوت سے خوابیں بُنا کرتا ..... لالٹین کی الف لیلوی لَو میں ..... چرخے کی اُلٹی طرف ..... تیز تکلے کی پہنچ سے ذرا ہٹ کر ..... ایک سرخ سے کمبل میں ..... کسی زخمی انگلی کی طرح لپٹا ہوا

لیکن رفتہ رفتہ یہ خواب پھیکے ہوتے چلے گئے۔ بدیسی سوت سے بنے ہوئے ایک ہی قسم کے کھردرے خواب۔ پریاں اور جن کچھ زیادہ ہی مانوس ہو چلے تھے، اُس کے پالتو بلے کی طرح ــــ وہ بھوکا پیاسا کب تک بیٹھا رہتا۔ آخر نئے خوابوں کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ کھوج لگاتے لگاتے اسے بالآخر ایک نیا داستان گو مل ہی گیا۔ خوابوں کے خام مال کا بہت بڑا بیوپاری ــــ اُس کے ہاں کا شوخ اور بھڑکیلا سوت اسے بہت ہی بھلا لگا۔ اس میں کچھ بُرا تھا تو یہی کہ یہ سوت بکاؤ تھا لیکن وہ بھی ایک ہی خرچیلا نکلا۔ اس نے سورج کی ٹکیا جیسے چمکتے کئی سکے بیوپاری کی جھولی میں جھونک کر۔ بہت سا ..... بہت سا ..... سوت خریدا۔ اور پھر اپنے ارد گرد اتنے بہت سے من چاہے خواب بنے کہ ..... گم ہو گیا ــــ وہ خود کو کھو کر بہت خوش تھا، مگر اسے تلاش کرنے والے بڑے کلک سے اُسے ڈھونڈتے پھرے۔ وہ چھپا تو بہت لیکن آخر پکڑا گیا ..... اپنے ہی دروازے پر ــــ جب وہ دیر سے گھر لوٹا تھا ..... اور اپنا دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا ..... کافی دیر سے ..... کافی دیر سے؟ پر کب سے؟ آخر کب سے؟" اُس نے بوکھلا کر خود سے پوچھا تو بوجھل دل کی پھنسی پھنسی، دھپ دھپ، ایک بار پھر اسے سنائی دینے لگی۔ لیکن ..... بے حس بند دروازہ ..... جیسے کسی شاہی عدالت کا ہو ــــ

اُس کا ہاتھ رک گیا ــــ شاید وہ تھک چکا تھا یا پھر اُس خیال کی وجہ سے رک گیا جس خیال نے کہ اُسے پریشان کر دیا تھا۔ کچھ اس لئے کہ

یہ خیال اسے پہلے کیوں نہ آیا..... اور بہت کچھ اس لئے کہ سرے سے ایسا خیال اسے آیا ہی کیوں..... یہی خیال کہ اُس کے پاس آواز بھی ہے اور وہ بول سکتا ہے۔ چیخ سکتا ہے ——— وہ سچ مچ حیرت سے چیخ پڑا "تو گیا یہ خواب نہیں ہے..... کیا میں جاگ رہا ہوں..... روزمرہ کے ماحول میں؟" لیکن شاید ایسا نہیں تھا۔ شاید وہ خواب ہی دیکھ رہا تھا کیونکہ دوسرے ہی لمحے اُسے آواز مل گئی اور اُس نے بانگ لگائی "دروازہ کھولو..... دروازہ کھولو..... یہ میں ہوں..... میں..... میں خود" ——— یہ اُس کی آواز تھی یا کوئی جواری جس نے شو (SHOW) کروانے کے لئے..... اس کی "میں" کو اور خود اس کو داؤ پر لگا دیا تھا ——— کھیل شروع ہو چکا تھا۔ دوسری جانب سے پہلا پتا کھلا تو اُسے لگا جیسے وہ اجنبی ہے۔ اُس نے عدم اعتمادی کے عالم میں، جھجک کر جیسے کوئی غریب شہر کسی اجنبی سے کسی اجنبی کا پتہ پوچھتا ہو، خود سے پوچھ ہی لیا۔ "کیا..... کیا..... یہ میں ہی ہوں؟" سوال کچھ ایسا ہی اذیت ناک تھا کہ اس کے ساتھ ہی اُس کی ہنسی چھوٹ گئی۔ وہ اُن مٹے قہقہے لگا رہا تھا جیسے طوفان آ گیا ہو۔ یہ تو اچھا ہی ہوا کہ وہ قہقہوں کے طوفان میں اڑا جا رہا تھا، ورنہ کون جانے وہ آنسوؤں کے سیلاب میں بہہ گیا ہوتا۔ بعض احساس ہوتے ہی سیلاب کی طرح ہیں۔ سونج کے دریا کے عام پاٹ سے ہمیشہ ہی باہر..... کبھی اِس کنارے سے..... اور..... کبھی اُس کنارے سے اور کبھی دونوں ہی سے ——— بہرحال وہ دیر تک بے خود سا ہو کر قہقہے لگاتا رہا۔ پھر رفتہ رفتہ جب سیلاب گھٹا..... پانی کچھ کچھ اترا اور دریا کے خدوخال واضح ہوئے تو کچھ دیر پہلے کی اذیت اُسے مذاق معلوم ہوئی ——— اس نے اپنے بچاؤ کے لئے پھبتی کا وار کیا "تو گویا اب میں کسی اور کی آواز لئے پھرتا ہوں؟ اور یہ چہرہ بھی میرا ہے..... یا یہ بھی کسی اور کا ہو گیا؟"

اُس نے ہنستے ہوئے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ لیکن جب احساس ہی بگڑ چکا ہو تو لمس سے کھیلنا لغزش ہوتی ہے۔ اس نے خود کو چھوا تو نظر بھک گئی اور سلامتی کے جس پل پر وہ چل رہا تھا، اس کے نیچے..... گہرائی میں..... دور کسی مقام پر..... حریف کھلاڑی کے ہاتھ کا دوسرا پتا بھی اس کی کھوکھلی ہنسی کی طرح ننگا ہو چکا تھا۔ اُس نے جھنجھلا کر خود سے کہا "یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ آخر یہ ماجرا کیا ہے؟ میں..... میں یقیناً میں ہوں..... میں خود ——— اور یہ آواز یہ چہرہ..... میرے اپنے ہیں۔ اب کیا میں اپنے ہی چہرے اور آواز کو نہیں پہچانوں گا؟" اور پھر اپنے ذہن میں اپنے ہی خدوخال ابھارنے کی کوشش میں اُس نے ذہن کو جھٹکا جس کے ساتھ ہی ستائیس سال پہلے کا تصویری آدمی اس کے روبرو کھڑا تھا۔ جو اپنے چوکھٹے سے نکل کر سیدھا یہیں چلا آیا تھا۔ صاف شفاف کپڑوں میں..... جن پر گرد کا شمہ تک نہ تھا۔ اس کے تصویری آدمی کا یہ چوکھٹا اس کے اپنے کمرہ میں دکھا رہتا تھا۔ خالی گلدانوں کے درمیان۔ چھتی پر۔ گھڑیال کے عین نیچے۔ وہ حیران تھا کہ یہ منجمد تصویری شخص بند چوکھٹے اور بند دروازے سے باہر کیسے آ گیا؟ اُس نے ایک بار پھر، شاید آخری بار قہقہوں کی بیساکھیاں سنبھالیں اور لڑکھڑایا "میں بھی تو گھڑیال کے عین نیچے ہوں۔ چھتی پر۔ خالی گلدانوں کے بیچ..... لیکن..... لیکن پھر بھی میں اندر نہیں جا سکتا۔ ہا ہا..... کیوں؟ آخر کیوں؟" ہارے جواری نے آخری داؤں لگا دیا تھا۔ دوسری جانب سے تیسرا پتا بھی شو ہو گیا۔ کھیل ختم ہو چکا تھا۔ بے دم قہقہے دم توڑ گئے۔ البتہ گنگوں چہرے والے تصویری آدمی کے زندہ قہقہے کہہ رہے تھے..... "اس لئے کہ تمہارا چوکھٹا کوئی نہیں..... اس لئے کہ تم اپنی تصویر نہیں ہو۔ اس......"

لیکن اُس نے اپنے آپ کو کسی بحری کپتان کی طرح ڈانٹ دیا۔ وہ ڈانٹتا نہیں تو کرتا بھی کیا۔ اسے سازش کی بو بھی آنے لگی تھی جیسے کسی بھلے چنگے بدن میں بغاوت کا ناسور یکلخت کھل جائے اور اُس ناسور کے منہ سے عجیب گلی سڑی سوچیں بہنے لگی ہوں "تم آوازوں کی نیاگرا ہو..... اور چہروں کا جنگل۔ تمہاری اَن گنت آوازیں ہیں اور بے شمار چہرے جن میں کوئی بھی تمہارا نہیں۔ تمہاری آواز کی سرگم اور چہرے کی دھنک بکھر چکی ہے..... تم ٹوٹ چکے ہو..... ریزہ ریزہ....." "بکواس بند کرو" اس نے چیخ کر کہا اور رستے ہوئے ناسور پر انگوٹھا رکھ دیا اور دونوں ہاتھوں سے دبا کر بند کر دیا۔ "میں خوب جانتا ہوں خواب اسی طرح کے ہوا کرتے ہیں۔ اُلٹ پلٹ لبے ہنگم۔ بے جوڑ۔ بھوڑے۔ بھگندر..... ناسور..... اور..... اور میں خوفزدہ بھی نہیں ہوں..... اور یہ سب کچھ میرا ہے..... میرا اپنا..... بس مجھے خواب کے جنگل سے نکل آنا چاہیئے..... بیدار ہو جانا چاہیئے۔"

ہانپتے ہوئے اُس نے خود کو سہارا دیا اور ہمت کر کے میز کی دوسری جانب دیکھا ـــ سامنے میز پر حریف کے تینوں پتے کھلے پڑے تھے ..... لیکن ... لیکن کس کے پتے ؟ ؟ ! اُس نے گھبرا کر سامنے کی کرسی پر بیٹھے شخص کو دیکھا اور بس دیکھتا ہی رہ گیا .... وہ زیادہ دیر نہ ٹھہر سکا، بھاگ نکلا

اُس نے خود کو جگانے کے لئے نہایت بے تابی اور سرعت سے اپنے دانت اپنے بازو میں گاڑ دیئے لیکن شاید اس جلد بازی میں ناسور کے منہ پر سے انگوٹھا کھسک چکا تھا۔ پیپ اور بساند بھری سوچیں بے تحاشا بہہ نکلیں۔ اُسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ ڈریکولا ہو، جو اپنے آپ پر ہی ٹوٹ پڑا ہے جو صدیوں سے خود کو نوچتا چلا آ رہا ہے، جو ابدی حقیقتوں سے روپوش، ازلی تاریکیوں کے تابوت میں موت کی طرح زندہ ہے۔ ایک ہولناک چمگادڑ جو موت کے پر لگائے، اندھیروں کی جنت میں قرنوں سے پھڑپھڑا رہا ہے اور زندگی کے بوٹے بوٹے بے بچے پھل چگتا چلا آ رہا ہے جس کے سیاہ پروں سے تاریک نغمے جھڑتے ہیں

"سب برابر ہیں ..... تاریکی میں اندھیروں میں .... ہم سب برابر ہیں .... سب برابر ہیں ..... تیرگی ہی جنت ہے، تریاق ہے .... اکسیر ہے .... ہر اونچ نیچ کے لئے .... زشت و خوب کے لئے .... نزد و دور کے لئے .... تیرگی ہی جنت ہے .... تیرگی .... جس کی سطح کوئی نہیں ..... کوئی ڈائمنشن نہیں .... انداز، پیمانہ کچھ نہیں .... درجہ تفاوت کچھ نہیں .... جس میں ہم سب ایک ہیں .... یکساں .... مساوی ـــ سائے ... ہم سائے ہیں .... سب سائے ہیں .... ازل کے سائے .... ابد کے سائے .... ٹھوس سائے .... جن کے ہیولے ہیں .... کہیں بھی کوئی .... کسی طرح کا چھید نہیں .... پس اے تیرگی کے مقدس مکینو! زیر زمیں اپنے اپنے تابوتوں میں ہوشیار رہو۔ بصارت زہر ہے اور آنکھیں بس کے پیالے .... خبردار رہو، اُن قدموں سے جن کی چاپ اندھیرے مقبروں کا تقدس فنا کرتی ہے ـــ اور اُن ہاتھوں سے، جو کرن کی کیل .... وقت کے ٹک ٹکاتے ہتھوڑے سے تیرگی کے سینے میں گاڑ دیتے ہیں ـــ"

تاریک نغمہ شاید ابھی جاری رہتا لیکن پسینے کے قطروں نے اسے وجود کا احساس دلایا تو اسے یوں لگا جیسے وہ تابوت میں پڑا ہے... مہیب قدموں کی آواز قریب تر آ رہی ہے .... اُس کے بے بس بدن پر وقت کے ہاتھوں نے کرن کی کیل رکھ دی ..... لحظے کا ہتھوڑا بلند ہوا..... ایک چوٹ اور اُس کا دل چھد جائے گا ..... اُس کی مردہ خاک بکھر جائے گی۔

"نہیں نہیں !" اُس نے کانپتے ہوئے کہا "میں ڈریکولا نہیں ہوں.... میں تو میں ہوں ... میں خود"

اُس نے جھٹکے سے دانت اپنے بازو سے نکالے اور خود سے التجا کی "دیکھو ! دیکھو ! میرے سب دانت برابر ہیں .... اور ان میں خون بھی نہیں لگا ہوا" لیکن اس کی التجا سے کچھ بھی نہ ہوا تو اُس نے پورے کرب سے چیخ کر کہا "میں ڈریکولا نہیں ہوں .... میں ڈریکولا نہیں ہوں .... خدا کے لئے میں ڈریکولا نہیں ہوں"

اپنی ہی چیخ اُس کے کانوں نے سنی تو اُسے خیال آیا کہ وہ آخر اتنا چیخ کیوں رہا ہے ؟ اور پھر جیسے دفعتہً اُسے یاد آ گیا کہ وہ تو کب سے کھڑا اپنا ہی دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے، اور کھال کے پٹ کوٹتے کوٹتے اب تو اُس کے ہاتھ دکھنے لگے ہیں۔

تذکرۂ اہلِ لاہور ـــــ (۲)

محمد خالد اختر

فخر الملت واللغت عاملِ نثر امولانا الف المحراث علیہ الرحمۃ

سلالۂ عظام، محققین کرام۔ سرگروہ شارعان و خلاقانِ زبان۔ آنحضرت بابرکت کے مقامات و خوارق لاتعداد و لاتحصیٰ ہیں۔ خامۂ خام بے چارے کو تکلیف کیوں دوں کہ ان کو بالتفصیل مرقوم کرے۔ اور بے سود ریزہ ریزہ ہو۔ ایسے لوگ کاہے کو پیدا ہوتے ہیں۔ خلاصہ احوال اس باکمال کا یہ ہے کہ مولد جناب موصوف کا قصبہ میرٹھ تھا جو ہندوستان میں ہے۔ والد بزرگوار نے وقتِ ولادت محمد ممتاز نام رکھا۔ آپ کو والد کا رکھا نام دل نشین نہ ہوا چنانچہ تحصیل علوم مکتب کے دوران ہی خود کوم۔م۔ انصاری لکھنے لگے اور بعد ازاں جیسا کہ ذکر آئے گا، اس سے بھی جی بھر گیا۔ اور عاملِ نثر الف المحراث ہو بیٹھے۔ فرماتے تھے ولدیت حسب نسب فضول باتیں ہیں۔ یہیچ النسب انصاری ہونے کے باوجود اس کا طغرا نام کے ساتھ کیوں باندھوں۔ جب کہ ہر دھنیا جلاہا قلعی ساز انصاری بنا پھرتا ہے۔ زاغ و شہباز میں کوئی تمیز نہیں۔ نام الف المحراث اس لئے پسند کیا ہے تاکہ عوام الناس کی سمجھ میں نہ آئے اور وہ ایک بار سٹپٹا جائیں۔ ۱۹۳۶ء میں جناب نے جامعۂ الٰہ آباد ہندوستان سے میٹرک کی سند لے کر علوم رسمی کی تکمیل کی اور سولہ سترہ کے سن میں طلڑی اکاؤنٹس کے شعبے میں بھرتی ہو گئے۔ ۱۹۵۹ء میں والئ ریاست ایوب خان نے نوکری اور روزی سے محروم کر دیا اور یہ گھر آ بیٹھے۔ شہر لاہور میں سکونت اختیار کی۔ اور وہیں کے ہو رہے۔ کسی نے کیا سچ کہا ہے کہ ایک بار جو اس شہرِ بے مہر میں آیا پھر اور دیار کو نہ بھاگ سکا اور یہیں سے اس کا جنازہ اٹھا۔

بعد ون بدباطن حاسد کے کل محققین کرام اس امر میں متفق ہیں کہ حضرت سے بڑا مجتہدِ زبانِ اردو میں اور کوئی نہیں ہوا۔ لغت اُردو کو یکسر بدل ڈالا۔ زبان کے ہزارہا مروجہ الفاظ کو منسوخ فرمایا اور ان کی بجائے ہندی، ہوشنگ، عربی، انگریزی، یونانی، لاطینی سے متبادل الفاظ وضع کئے۔ سبحان اللہ کیا شخص تھا کہ ایک ایک لمحہ اپنے اوقات کا زبان کی تنسیخ و ترویج میں صرف کیا۔ اور کسی حالت میں اس کارِ شاقہ سے غافل نہیں رہا۔ ایک اصول زبانِ اردو کی لغت سازی کا تفکر مسلسل سے یہ وضع فرمایا کہ صرف و نحو اردو و قواعد زبان کو مطابق زبان میکالے کے ہونا لازم ہے۔ ایک مضمون نثر لارڈ بینگٹن میکالے صاحب بہادر کا اپنی جماعت دہم کے نصاب انگریزی میں نظر جوہر قدر سے گذرا تھا۔ اس کی فصاحت و بلاغت و حماقتِ اظہار نے اس درجہ اثر کیا کہ اردو زبان بطریقہ تبدیلی لغتِ مروجہ انگریزی کے ہم پلہ بنانے کا خیال ذہن میں سما گیا۔ خامی اردو کی اصلاًان کے نزدیک اس کا انگریزی نہ ہونا تھی یہی اعتراض فارسی اور عربی زبانوں پر تھا۔ از بس کہ زبان میکالے سے شدید انسیت جوانی ہی میں غالب ہو گئی تھی، ایک دفعہ دلی میں دور سے وائسرائے لارڈ لن لتھگو کی سواری کو آتے دیکھا تو تعظیماً دونوں ہاتھ سر کے اوپر اٹھا کر کھڑے ہو گئے۔ وائسرائے کی سواری گذرنے کے بعد بھی دیر تک بایں وضع و ہیئت ایستادہ رہے۔ پوچھے جانے پر توجیہہ اس خارقِ عمل کی یہ فرمائی کہ وائسرائے ہم قوم لارڈ بینگٹن تھے اور ان کی مادری زبان انگلش تھی۔

غور کرو کہ جس شخص نے اپنی جوانی اور بڑھاپا اسی ایک دھن کی نذر کیا ہو اس کو کیا اعلیٰ مدارجِ باطنی حاصل ہوئے ہوں گے۔ البتہ جہاں تک مدارج ظاہری کا تعلق ہے بموجب خواستہ تقدیر اور مشیتِ کردگار تقدیر وہ ان کے نزدیک نہ پھٹکے۔ پچیس روپیہ ماہانہ پنشن سرکار سے ملتی تھی۔ حضرت نہایت عسرت و غربت سے تلخی ایام کاٹتے تھے مگر لب شکایت و شکوہ میں وا نہ ہوتے۔ خود اعتمادی جو ان میں تھی اس کا بیان نہیں۔ اٹھاون ساٹھ برس کے سن صغیر میں ہی

آثارِ پیری نمودار ہو چلے تھے۔ داڑھی مونچھ بگلا سفید ہو گئی۔ پھٹا پرانا پہنتے۔ روٹی مل گئی تو کھالی ورنہ پانی کے دو گھونٹ کر پڑ رہے۔ اخلاق و خاکساری بدرجۂ کمال اور گوشہ نشینی حد سے سوا۔ پچیس روپے ماہوار کی پنشن میں یہی وضع مناسب بھی تھی۔

جیسا کہ صوفیا اور اہل اللہ کا قاعدہ ہے مہینوں غسل نہیں فرماتے تھے۔ اسی طرح بال ترشوانے، ناخن کٹوانے سے بھی اجتناب تھا۔

حضرت کی تصنیفات میں سے چند لندن لائبریری میں اب تک موجود ہیں۔ آپ نے بتوجہ دلی و بصرف اوقات وخیرہ ایک کتاب "خاطرِ غبار" بایں کثرت ضخامت تصنیف کی کہ اصل ابوالکلام آزاد کی تصنیف "غبارِ خاطر" اس کا تیسرا حصہ تھی۔ "خاطرِ غبار" میں سطر بہ سطر غبارِ خاطر کی غلط عبارت کی تصحیح کا حق ادا کیا ہے۔ یہی سلوک اسد اللہ خاں غالب، عبدالحلیم شرر، مولانا محمد حسین آزاد، سر سید احمد خاں، شبلی اور نذیر احمد سے دیگر رسائل میں کیا ہے۔ دراصل آپ لکھنؤ اور دلی کے اہلِ زبان نثر نگاروں کی خرافات نگاری سے سخت نالاں تھے، فرماتے تھے کہ ان حضرات نے زبان میں بھاڑ جھونکا ہے۔ غلط اردو کو مستعمل کر کے ہم سب پر بڑا ستم توڑا ہے۔ جمعہ جمعہ مولانا احمد ندیم قاسمی قدس سرہ کے بالا خانے میں ضرور حاضری دیتے۔ وہی چکٹ جیکٹ جھیتھڑا سی پتلون، خستہ بوٹ، جزدان میں "خاطرِ غبار" کی ایک جلد۔ اکثر خود ہی طریقہ رشد و ہدایت سے مستفید کرتے۔ اگر چپ ہوتے تو شائقین صادق العقیدت و صافی نہاد کسی لفظ یا ترکیب کے غلط یا صحیح ہونے کا مسئلہ چھیڑ کر ان کو استفادہ پر مجبور کر دیتے۔ اس باکمال کی جودتِ ذہن دیکھو کہ نئے تراشے ترشائے الفاظ و تراکیب بیٹھے بیٹھے اس طرح زبانی ارشاد کرتے جاتے تھے جس طرح ٹکسال سے سکے ڈھلتے آتے ہوں۔ مولانا صلاح الدین محمود قدس سرہٗ کے ہاں ان کا اکثر آنا جانا تھا۔ وہ بھی حضرت کے تبحر اور ذہانتِ غیبی کے بڑے معتقد تھے اور فرماتے تھے کہ حضرت کے ذہنِ اقدس میں اردو میں انگریزی کا رنگ اور مزاج رچانے کا خبط نہ ہوتا تو ایک بڑے ماہرِ لسانیات ہونے کے سب اوصاف ان میں موجود تھے۔ مولانا صلاح الدین محمود ہی اس کے راوی ہیں کہ حضرت خود کو زبانِ اردو کا سیموئیل جانسن کہا کرتے جو اپنے باز ویل کی جستجو میں بھٹکتا پھرتا تھا۔

حضرت کا سن شریف جب تہتر تک پہونچا تو ایک دن سوتے میں سفرِ آخرت اختیار کیا۔ کسی قبرستان میں مدفون ہوئے۔ چند سرپھرے ان کی خلافت کا دم بھرتے ہیں مگر اصل خلیفہ نامزد نہیں کیا تھا۔ اردو زبان بھی حضرت کے اجتہاد کے باوجود اپنی پرانی فرسودہ ڈگر پر جادہ کناں ہے۔ بہرحال آپ نے اپنا کام جو کرنے کا تھا برملا اور دھوم دھام سے کیا۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

نمونۂ انتقاد حضرت عاجل نثر الف المحراش:

"اردو کو شحاذ السنہ ہے کیول اور کیول اس گت میں حیویت اخصابات دو سومت وغیرہ وغیرہ پا سکتی ہے جب قوس انم اعداد میں مطابق مراحل صحیح عربی، فارسی وغیرہ کرت الفاظ بریں مگر چوں کہ استشارہ ہجم فقط قائل متعصم نہیں بل محاظرات وتکسنی و ملگو یا تسخیر قمر وغیرہ وغیرہ ہے۔ مطابقاً ونتیجۃً فراہیدار دو کہتے ہیں۔ یہ اصل ہوتام ایضاً ہے یعنی آپ بھی ضد ملف اردو ہوں مگر پہلو بہ پہلو سوگندیدہ دشمن نادرست اردو ہوں وے جو آسان ترین بناتے ہیں وہ لاشے ہے!"

مخدومِ مخدوماں حضرت رشید ملک رحمۃ اللہ علیہ

وطن مولود و موضع قلعدار ضلع گجرات ہے۔ بسبب حسن اوقات اور کثرتِ اشغال کے مغتنمات روزگار سے تھے۔ مدت تک سرکارِ سلطانی میں عہدۂ کوتوالی پر مامور رہے اور اس زمانے میں اس عہدہ کو سپرنٹنڈنٹ پولیس کہتے تھے۔ بڑے سرتے یا نہ جھگڑے تنک مزاج کوتوال تھے۔ اور ولایت کا راز با سوا چند مزاج داں دیدہ وروں کے کسی پر آشکارا نہیں تھا۔ ان کے انفاسِ متبرکہ کی برکت سے بہت سے گم گشتگانِ راہ، دزدانِ ارجمند اور قاتل حضرات گوشۂ زنداں میں متمکن ہوئے یا تختۂ دار پر پہونچے۔ ان امورِ مرجوعہ کی سرانجامی میں بھی ہردم شغل جاری رہتا اور وظیفۂ موسیقی قائم و دائم۔ چنانچہ سارنگ نواز کوتوال مشہور تھے۔ البعاض نے ان کا اسم مبارک ناگ رس ملک رکھا تھا۔ چہرے پر جلال و جمال ایسا تھا کہ ان کے علاقے کے نامی گرامی رو ساحتی کہ کمشنر اور ڈپٹی کمشنر بھی نہایت معتقد تھے اور بے اختیار دوڑتے اور قدموں پر گرتے تھے۔ خلفاء نگار رنگ کے کفش برداری میں حاضر رہتے۔ معتقدین و مزاج شناسانِ حضرت پیر دستگیران سے مکالمت و مخاطبت میں لحاظ و احتیاط کا دامن نہیں چھوڑتے تھے۔ الغرض تنک تھے گو صورت بشر کی تھی۔ بکالے علم سے بھی شدبد تھی۔ اگرچہ ہر کس و ناکس

کو اس کے بتانے سے احتراز فرماتے۔ آپ کو اکثر علوم ظاہری و باطنی میں بڑا دخل تھا اور سُر تال اور لے سے ایسے واقف تھے کہ بڑے بڑے استادان کے سامنے نغمہ سرائی و بین نوازی کی ہمت نہ پاتے تھے۔ چنانچہ علم موسیقی میں ان کی تصنیفات سے کئی رسالے موجود ہیں۔ دراصل بچپن سے راگ راگنی کا شوق غالب تھا۔ ان کی طلب میں عالم جوانی میں فریضہ مراجعت جرمنی و فرانس بھی ادا کیا۔ اللہ تعالیٰ سب کو یہ سعادت نصیب کرے۔ آمین ثم آمین۔

اس یگانۂ روزگار کے پاس ایک مرسیڈیز گاڑی بھی تھی۔ اور اکثر اس کے انجن کو اوور ہال کرانے یا سودا کرنے کی فکر میں رہتے۔ وہ آخری دم تک رئیس رہے۔ معلوماتِ عامہ وسیع اور بے حد و حساب تھیں اور اس سے عملاً خاطر خواہ کام لیتے تھے۔ ذوق ادب و شعر کے کیا کہنے۔ نہایت درست، نہایت صائب۔ ملک روم میں رومیوں کے طور طریقے برتنے سے عار نہ تھی۔ بہت سے لوگ ان سے بیعت ہونے کے خواہاں تھے مگر یہ مصافحے یا علیک سلیک کی منزل سے آگے بڑھنے کی راہ نہ دیتے۔ اواخر میں زبدۂ سادات کرام، اسوۂ اولیائے عظام حضرت مولانا احمد شاہ ندیم قاسمی غفر اللہ کہ جن کا ذکر اس سے پہلے حصے میں ہو چکا ہے، کی خدمت میں پہنچ کر بیعت کی اور تا دمِ زیست ان کے سایۂ عاطفت سے علاحدہ نہ ہوئے۔ اوقاتِ دفتر میں مثل عکس آئینہ کے حضرت احمد شاہ کے سامنے بیعت میں حاضر رہتے اور اپنے نفیس پائپ کی راکھ جھاڑتے۔ دونوں پیر و مرشد و مرید بیٹھے ایک دوسرے کے جمال باکمال سے اپنی نگاہ کو گلچینِ نظارہ کرتے۔

عرصہ چند سال کا ہوتا ہے کہ اس یکتائے عہد نے اس عالمِ عنصری سے انقطاعِ تام کیا اور بزمِ جنت میں حور و قصور کا حقدار ہوا۔

جناب مولانا حبیب جالب علیہ الرحمۃ

مولد اس یکتائے روزگار و یگانۂ شہر و دیار کا قصبہ لدھیانہ ہندوستان ہے۔ شعرائے قدیم لاہور سے تھے اور بعد میں شعر کو برائے اظہارِ مضمون سوزِ انسانی و انقلابِ نظامِ عالم اکثر فرمانے لگے۔ یہ بزرگ گاڑھا موٹا پہنتے تھے۔ ہمیشہ سادہ وضع رکھی۔ ٹویڈ یا سوفینی یا مخمل کے پارچہ جات سے خیاطی شدہ جامے میں اپنے جسم مبارک کو کبھی ملفوف نہیں کیا۔ قد کاٹھ سے خوب تھے اور بازار میں جھولتے لڑھکتے ہزار مرد کے انبوہ میں الگ پہچانے جاتے۔ از بسکہ فلک عناد پر بلند تھا اور تنگ دستی میں گزر بسر مقدر تھی مشقِ سخن پروری کو اس مرتبہ کمال پر پہنچایا کہ قلم گویا زبان سے متکلم ہوتی تھی اور بیچ خوانی ان کی سن کر بلبل خجل کے مارے چمن سے بھاگی پھرتی تھی۔ شجاعتِ ذاتی اور جرات جبلی خمیر میں بایں افراط ودیعت تھی کہ کلمۂ حق کہنے سے کبھی عذر نہیں ہوا۔ بارگاہ سلطانان عہد کی چوکھٹ پر زنہار سجدہ ریز نہ ہوئے بلکہ اس کے پاس سے گزرنے کا اتفاق ہوتا تو منہ پھیر لیتے۔ ہجو میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے اور ان کی چند ہجویں زبان زدِ خلقت ہو گئیں۔ اپنا کلام ترنم سے پڑھتے تھے۔ اور فی الواقع حضرت کو لحنِ داؤدی عطا ہوا تھا جس سے بشر تو بشر، در و دیوار تک مست ہو جاتے تھے۔ مزید طائر بلند پرواز کی کیا مجال کہ ان کی نغمہ سرائی سننے اور پر مار سکے۔ آپ کو اپنی حق گوئی کی بنا پر قفس و زنداں کی مصیبتیں بھی جھیلنی پڑیں۔ سلطان معظم ایوب خاں کے عہد میں ایک بار لوہاری دروازے کے باہر آپ کہیں جاتے تھے کہ دھر لئے گئے۔ کوتوال شہر نے فردِ جرم یہ موزوں کی کہ حضرت کرتے نکلے، اور نیفے میں ایک دستی بم، دو طمنچے، دو رائفلیں اور ایک مشین گن لئے پھرتے تھے۔ جلد ہی حوالات سے رہا ہو گئے مگر ان کے لئے اندر باہر کا فرق ہی کیا تھا۔

سبحان اللہ کیا شیخ تھے بھولے بھالے، معصوم، حقیقت میں مادر زاد ولی تھے۔ صرف صادق القولی کے لئے ہزارہا نعمتِ دنیائے دوں پر لات ماری تھی اور گوشہ نشینی اختیار کی تھی۔ اگرچہ تعلقات ظاہری بہت سوں سے تھے لیکن ویسی ہی بے تعلقی بھی حاصل تھی۔ با ہمہ بے ہمہ سے بھی کچھ آگے قدم رکھا تھا۔

الغرض یہ کہ سالہا سال تک آپ کی ذاتِ فیض آیات سے یہ عالم منور رہا اور چونکہ ہر ایک کو اس دار الفنا سے دار البقا کو چلنا ہے، آپ نے بھی ہفتہ کے دن صفر کی بائیسویں تاریخ میں اس جہان سے انتقال کیا اور اپنی خانقاہ میں اپنے پیر کے پہلو میں دفن ہوئے۔ آپ کے ملفوظات بھی خوب خوب ہیں مگر راقم تک نہیں پہنچے۔

جناب حضرت مولوی علاؤالدین مظہر غفر اللہ لہٗ

یہ بوٹے سے قد کے بزرگ بھی یگانۂ روزگار تھے۔ آپ اس عہد کے اکثر اولیا کی مثل داڑھی مونچھ سے بے نیاز تھے۔ لاہور کے انار کلی بازار میں بہت مدت ایک مکتبہ کی ملازمت کی اور معاشِ قلیل پر قانع و شاکر رہے۔ کہیں اندرون سنت نگر ایک بالائی حجرے میں ڈیرہ تھا۔ ایک ٹوٹی پھوٹی سائیکل میسر تھی۔ اسی پر

مزین کرتے گوشۂ سکونت سے جائے روزگار آتے جاتے۔ بارہا پاپیادہ سائیکل کو گھسیٹتے لوگوں نے دیکھا۔ بچپنے میں اس دور کے بیشتر نونہالوں کی طرح بائسکوپ کی مس کجبن، مس سلوچنا، مس مادھوری وغیرہ پر باری باری عاشق ہوئے اور ان زنان فتنہ ساماں کی جو بھی فلم آتی اسے دیکھ دیکھ کر سیر نہ ہوتے چنانچہ راہ نوردی دشتِ عشقِ مجازی سے بالآخر وادیٔ عشقِ حقیقی کی راہ پائی۔ ہر چند کہ فنِ راگ و راگنی کے شوق میں بایں استغراق ڈوب گئے کہ دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہ رہی۔ دنیا سے فقط اتنا علاقہ رکھا کہ اس میں رہتے تھے۔ حضرت کے حجرۂ مبارک کے طاقچوں میں پرانے ارباب موسیقی کے گانوں راگوں کے بلا مبالغہ کوئی چار پانچ ہزار ریکارڈ اوپر تلے اس نظم و ترتیب سے ٹھنسے تھے کہ جس ریکارڈ سے سامعہ نوازی کرنا منظور ہوتا پل بھر میں اسے پیدا کر لیتے۔ پرانے وقتوں کا بھونپو والا ایک کہنہ گراموفون سرہانے میز پر دھرا رہتا تھا۔ اسی پر ریکارڈ بجاتے اور سامعین کے گوشِ شوق کو ممنون کرتے تھے۔ حجرے کے در و دیوار ان کی صغر سنی اور جوانی کی فلموں کے پوسٹروں سے پٹی تھیں۔ حضرت سجادہ نشین تان سین و بیجو باورا، مغفور نغمہ سرائی جناب کندن لال سہگل علیہ الرحمۃ جالندھری کے عاشق زار تھے۔ اصل وطن موصوف کا بھی جالندھر تھا۔ کندن لال ان کے محلہ دار اور پڑوس میں رہتے تھے لیکن ان کی بدبختی کہ اپنے پیر و مرشد کی زیارت نصیب نہ ہوئی۔ کس واسطے کہ جب آپ نے ہوش سنبھالا تو کندن لال کلکتے جا چکے تھے۔ چند سال بعد خود آپ کو بھی تلاشِ معاش عراق کھینچ کر لے گئی۔ فرمایا کرتے تھے کہ سہگل کو جسم کی آنکھ سے کبھی نہ دیکھا مگر دل کی آنکھ نے سہگل کے علاوہ کسی اور کو نہ دیکھا۔ عشقِ محبوب منزلِ منتہیٰ پر اس وقت پہنچا جب راہِ عراق میں ایک بندرگاہ پر قیام کے دوران کندن لال کے الحان داؤدی سے نغمے کے یہ بول بجتے سنے: ”سنو سنو، ہے کرشن کالا“ ۔ یہ بول سنتے ہی ایک کیفیت بہم پہنچی اور حالت ازخود رفتگی کی ہو گئی۔ محبوبِ حقیقی کے گائے ریکارڈ کو خریدنے میں توقف نہ کیا اور جب تک جئے اسے حرزِ جاں بنائے رکھا۔ حضرت کے حجرے کے ذخیرے میں اپنے اس معشوقِ معنوی کے گانوں اور نغموں کے کل ریکارڈ حتیٰ کہ اس کی فلموں کے پوسٹر تک موجود تھے۔ سبحان اللہ! کیا عشقِ کامل اس بزرگ کو اپنے شیخ سے تھا۔ صورت مہجوری میں کفِ افسوس ملتے تھے کہ کاش کندن لال پیاسے کی گذر کا منشا ان دنوں ہوتا جب وہ جالندھر میں تھا اور میں ایک بار ان آنکھوں سے اس کی موہنی صورت کو دیکھ لیتا۔ اس امر پر خوش بھی ہوتے کہ آپ کے ہوٹل کے سامنے ایک دفعہ کندن لال چند لمحے کے واسطے رکے تھے۔

آپ کے پاس سہگل کی ایک ٹوٹی ہوئی دھات کی چائے دانی تھی۔ اسے جان سے عزیز رکھتے اور ہمیشہ سرہانے رکھ کر سوتے۔ ہر صبح اٹھ کر اسے بوسہ دیتے تھے۔ یہ چائے دانی بانو قدسیہ نے کلکتے میں آپ کو تحفۃً دی تھی۔ ان کے ہاتھ کیوں کر لگی اور واقعی کندن لال کی تھی یا خود بانو قدسیہ کی راقم کو معلوم نہیں۔ آپ اپنے پیر کندن لال کا عرس سال بہ سال اپنے حجرے میں منعقد کرتے اور بھونپو والے گراموفون پر مجلسِ نغمہ رات بھر گرم رہتی۔ اس استادِ کامل کے شائقین و طالبین اس مجلس میں فراہم ہو کر وجد کرتے اور حال کھیلتے۔ آپ کے اوصاف لاتحصیٰ ہیں اور حیزۂ امکان سے زیادہ۔ اس نابغۂ روزگار کا عشاق میں سب سے بڑا رتبہ ہے اور اہلِ بصیرت جانتے ہیں کہ یہ مقام ہی اور ہے۔ از بسکہ عسرت و قلاشی کے مارے تھے اور کثیر الاولادی نے ناطقہ بند کر رکھا تھا۔ حرص دنیوی میں رزقِ حلال سے تجاوز نہیں کیا۔ بے پروایانہ زیست کرتے تھے اور جو رزاقِ انس و جاں کے خزانۂ تقدیر سے وظیفہ روز و شب مقرر تھا اسی پر قانع ہو کر اغراضِ دنیوی کو وسیلۂ تملق و خوشامد اخوانِ زماں نہیں کیا۔ توکل اور قناعت سے آپ کا خمیر تھا اور اسی لئے غالباً خودکشی کا خیال نہ کیا۔ گمنام جئے اور گمنام مرے۔ مرنے کی خبر کسی اخبار میں نہ چھپی۔ کسی تذکرہ نگار نے ان کا ذکر مشاہیرِ پاکستان کے ضمن میں کرنا مناسب نہ جانا۔ مولانا صلاح الدین محمود کہتے ہیں کہ جب حضرت کا وقتِ وداع آیا تو صحن کے پودوں کی شاخیں دو دن تک جھکی رہی تھیں۔

استاد عبد الکریم خاں اور استاد فیاض خاں سے لے کر سہگل، پنکج ملک، کے سی ڈے، کانن بالا جیسے باکمال مطرب اسپان سیاہ پر سوار پیشِ استقبال کو آئے اور بعد اعزاز و اکرام ان کی روح قدسی کو دار البقا کی طرف لے گئے۔

جناب مولانا اکرام اللہ غفر اللہ لہٗ

وطن اصلی اس شیخ کا قصبہ جالندھر ہے جہاں آپ کے والد ماجد بیش گاہِ سرکار میں عہدۂ طبابت پر مامور تھے۔ آپ نے سولہ سال کی عمر میں ملک ہندوستان کے انقسام پر اپنے والدین کی معیت میں اس اقلیم کو ہجرت کی اور اپنے جمال جہاں آرا سے قصبہ حضرت ملتان شریف کو منور کیا۔ اس قہر کی زندگی کا حول

میں تعلیم رسمی کے مدارج جوں توں طے کئے کہ آپ کی طبع میں آزاد مزاجی جبلت تھی اور دل کتب منقولہ میں نہیں لگتا تھا۔ علم ظاہری بھی مستحضر تھا اور علم باطنی کے تو کیا کہنے! باطنی میں درجۂ کمال بہ انتہائے کمال حاصل کر کے دم لیا۔ اگرچہ والد ماجد اس علم کے حق میں نہیں تھے اور آپ کے شوق کی طلب کو فرو کرنے کے لئے دقتاً فوقتاً آپ کی گوشمالی فرماتے تھے۔ علم باطنی حقیقت میں دین مبدائے فیاض ہے۔ کوئی گھر سے لے کر نہیں آتا۔ حضرت نے کچھ تو اسے اصل فطرت سے اور مزید تر گلی کوچوں بازاروں میں مشاہدۂ سیل حیات سے پایا۔ دیدۂ بینا نے راہیں معرفت کی سجھائیں۔ ویسے بھی اس شہر پر خاک کی آب و ہوا طالبانِ ولایت کے لئے بہت سازگار ہے۔ خاک کی تاثیر ایسی ہے کہ جتنے ولی، پیر، فقیر، رند اور صوفی اقلیم ملتان میں ہو گذرے ہیں ان کا حد و حساب نہیں اور کہیں اور اس کا عشر عشیر بھی نہیں ہوئے۔ راقم یہ بنظر حب الوطن یا اپنی بڑائی کو نہیں کہتا۔ حضرت نے چند سال ملتان میں پیشۂ وکالت میں سر مارا اور پھر ایک انشورنس کمپنی میں منتظم علاقہ ہو گئے۔ دفتر اور میز میسر تھے۔ وہاں بیٹھے بیٹھے مدرسہ کے طالبوں کی کاپیوں میں اردو میں اتنے اچھے اچھے قصے لکھے کہ گوش اہل روزگار نے کہن قصہ ہائے سابقین کو فراموش کیا۔ چنانچہ رسالہ بعنوان "جنگل" جس میں یہ قصے تمام فراہم ہیں، اب تک چمنستانِ ادب میں مشک بار ہے۔

ملتان سے حضرت کا ورود بسلسلۂ معاش لاہور میں ہوا۔ چونکہ السفر وسیلۃ الظفر کی حدیث مشہور ہے۔ گردشِ فلک نے اس کی موافقت پر رضا کی اور آپ دو ہزار روپیہ ماہیانہ کے مشاہرہ خطیر پر سٹیٹ لائف انشورنس میں عہدۂ مشیر قانون پر مامور ہو گئے۔ یہاں بھی لکھنے پڑھنے کا شوق جاری رہا گو احبابِ نگارنگ کی افراط سے عدیم الفرصتی تھی اکثر اس کے شاکی رہتے۔ حضرت ممدوح کی دوست پرستی کیا کہئے۔ وجیہہ، خوبصورت، جامہ زیب شخص تھے۔ باتوں میں لگاوٹ اور شگفتگی ایسی تھی کہ ان کے پاس سے اٹھ کر آنے کو دل نہ چاہے۔ چنانچہ دوست جان دیتے تھے، اور پیچھا نہیں چھوڑتے تھے۔ یہ بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑتے تھے۔ محفل احباب کے بغیر آپ کو چین نہ آتا تھا اور بیتاب ہو جاتے تھے۔

اگرچہ زی دنیا داروں کی تھی لیکن سیرت و سریرت درویشی و قلندری کی تھی۔ گلبرگ کی جس حویلی کے جس حجرے میں متمکن تھے، اس میں رسائل، سوٹ، کمانیاں ادھر ادھر کرسیوں یا بستروں پر بکھری رہتی تھیں۔ نوکر نہیں تھا اور رکھا بھی نہیں تاکہ طریقۂ آزادمنشی اور فقیری میں خلل نہ آئے اور کسی رفیق شفیق کی ہم ہی میں ما حضر تناول کرنے کا جواز قائم رہے۔ فرماتے تھے تنہائی میں جنون و وحشت کی کیفیت غالب ہونے لگتی ہے۔ اکل و شرب کا سامان ساتھ میں ہو اور صحبت یارانِ دلی میسر، تو یہ شخص بادشاہ رہتا تھا۔ گویا کہ ہفت اقلیم کی سلطنت مل گئی ہو۔ جملہ احباب میں بیٹھے رہنا اور مکالمت پسندیدہ میں دن رات بسر کرنا آپ کے نزدیک اس سے بڑا مولا کا کرم اور کوئی نہ ہو سکتا تھا۔ نیم شب کو حالت جذب طاری ہو جاتی لیکن حتی الامکان بس نہ کرتے۔ عالتِ جذب میں کئی خوارق عادات اور کرامات آپ سے ظہور میں آتیں۔ سبحان اللہ! اس عالم میں گفتگو کا ہر فقرہ کتاب معرفت ہوتا تھا۔ ایسی ایسی باتیں زبان مبارک سے جاری ہوتی تھیں کہ سننے والوں کو آپ پر پیار آنے لگتا تھا۔ کون و مکاں کے پردے اٹھ جاتے تھے۔ بسلسلۂ تلقین و ارشاد میں کوئی لیٹی نہ رکھتے اور کھری کھری بات منہ پر کہتے خواہ کوئی بھی ہو۔ اکثر ذکر و اذکار میں نماز صبح کا وقت ہو جاتا گو پڑھتے کسی نے نہ دیکھا۔ تب بتقاضائے بشریت استراحت کر لیتے۔ حجرہ مبارک میں دو بستر مستقل بچھے رہتے تھے۔ ایک اپنی ذات کے لئے اور دوسرا کسی بی بی سے منفرد و مسافر درویش کے لئے۔ ایسے درویش آپ کے ہاں آتے جاتے رہتے تھے۔ بالخصوص ملتان کے درویش صاحب مکاشفہ جو آپ سے بیعت تھے مہینے میں ایک آدھ بار اپنی صورت دکھا جاتے۔ ان کے نام دنیوی چودھری محمد رمضان اور اعجاز بخاری تھے۔ دونوں بڑے زبردست فقیر تھے۔ یہ فقیر بڑے طمطراق اور جاہ و جلال سے لاہور شہر میں نزول فرماتے اور بالعموم برگینزا کی سرائے میں اترتے۔ اسباب بہم رسانی وسیلہ معرفت سے لیس ہوتے تھے اور ایک حجرہ مخصوص میں اپنے بوریا بستر لگا دیتے تھے۔ دونوں رات حالت جذب میں رہتے۔ اور اور خوارق عادات اور کرامات کے مرتکب ہوتے جتنے دن لاہور میں ان کا قیام رہتا، اس شہر کے در و دیوار، بام و سقف زلزلے کی کیفیت سے لرزتے رہتے۔ ارباب محکمۂ موسمیات کے فہم میں نہ آتا تھا کہ یہ ماجرا کیا ہے اور بھونچال کیوں کر جاری ہے۔ خوشا حال ان لوگوں کا جو کوئی کار فضول پیٹ کی خاطر نہ کریں اور بسبب کثرت شرار ہائے مسائل دنیا: ما فیہا پر لات ماریں۔ جب تھرڈ کلاس کا ریل کا کرایہ جیبوں میں بچ رہتا تو دونو فقیر اچانک غائب ہو جاتے۔ مدعائے اصلی ان کے آنے کا اپنے پیران پیر کی سعادت دیدار کے سوا کچھ نہ ہوتا تھا۔

اس یکتائے روزگار کا پورا حال لکھنے کی اس مختصر تحریر میں گنجائش نہیں۔ اس کے لئے ایک دفتر درکار ہے۔ چند سال ہوتے ہیں، حضرت عزرائیل علیہ السلام آپ کی خدمت میں تشریف لائے اور بہلا پھسلا کر اپنے ہمراہ اس دنیائے تلخ کام سے لے گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون

حضرت علی مقصود حمیدی رضی اللہ عنہ

آپ بدایوں (یوپی) ہندوستان کے اولیائے کرام سے ہوئے ہیں۔ تقسیم ملک کے بعد کراچی میں متوطن ہوئے اور وہاں چند سال اپنے پرانے پیشہ دلالت کو وسیلہ معاش بنایا۔ پھر بسبب عمر رسیدگی اسے ترک کر کے لاہور میں آ بسے۔ نسبت باطنی بڑی قوی تھی۔ ان کے سامنے بڑے بڑے صاحب نسبت دم خم کھو بیٹھتے تھے۔ عالم پیری میں بھی چہرہ لال سرخ اور روشن تھا۔ نفیس لباس پہنتے اور سر پر رفیلٹ ٹوپی لگاتے۔ ہاتھ میں نوادرِ قدیم کی منقش چھڑی ضرور رکھتے۔ اوقات آپ کے نہایت خوب اور حرکات آپ کے نہایت محبوب تھے۔ آپ کو اکثر علوم خصوصاً تاریخ عالم، ادبیات اور موسیقی میں بڑا دخل تھا۔ علم مصوری بھی خوب جانتے تھے اور اپنے ہاتھ سے کئی مجرد فن کی تصویریں بنائی تھیں۔ فی الواقع پکاسو ان کا قلم بند وصدف دار تھا اور وان گاگ ان کی طرز کا چربہ نگار۔ از بسکہ مزاج بدھ مت کی طرف بڑا مائل تھا اور اس کے بانی مہاتما بدھ سے عقیدت خصوصی رکھتے تھے۔ کئی نوادرت اس نابغہ روزگار کے اپنے حجرے میں جا بجا سجائے تھے۔ ان کو بڑی محنت سے بصرف زر کثیر فراہم کیا تھا۔ گلبرگ کے محلے کی جس حویلی میں فروکش تھے، اس کے ماتھے پر بدھ کے جگر کا نشان مثل جھومر کے آویزاں کیا تھا۔ الغرض یہ شخص ہزار خوبی کا مجموعہ اور لاکھ ہنروں کا گلدستہ تھا اور گفتگو میں وسیع مطالعے اور مشاہدے کا پتہ ملتا تھا۔ آپ ایام شباب میں خوب کھائے کھیلے تھے اس لئے حسرت کی لکیریں چہرے پر نمایاں نہیں ہوئیں۔ اواخر عمر میں انشائے نثر اردو کی طرف توجہ فرمائی اور چند تحریریں طبعزاد طرح لطیف میں تصنیف کیں۔ بچاسی برس کی عمر میں بے رنج و ملال اس جہان سے رخصت ہوئے۔ اگر آواگون کا مسئلہ جس میں آپ کا ایمان تھا امر صدق ہے تو اب بھی یہ شاید کہیں کسی اور شکل میں ذی حیات ہیں اور چلتے پھرتے ہیں۔

جمیلہ ہاشمی صاحبہ

یہ ایک عورت تھیں باکمال، با تدبیر شہر لاہور میں قریب فورٹریس سٹیڈیم کے ایک قصر دل کشا میں تمام عمر بسر کر دی۔ ایک موٹر اپنی الگ تھی اور خوب تیزی سے اسے لئے پھرتی تھیں۔ اثنائے کلام میں کل سخنورانِ ہم عصر کی خبر لے ڈالتی تھیں اور بوسیلہ مکاشفہ و مشاہدہ ان کی کوئی بات ان سے ڈھکی چھپی نہ تھی۔ بہ سبب استعداد خداداد کے فن قصہ گوئی و داستان طرازی میں ید طولیٰ رکھتی تھیں۔ دیگر اس عہد کے قصہ گویوں کو اپنے سے کمتر جانتے ہوئے طریقہ سرپرستانہ اور مربیانہ ان سے برتتی تھیں۔ طبع ان کی خوئے نازک مزاجاں سے نازک تر اور مزاج ان کا کشور ہمالہ سے عالی تر۔ ان کمالات ظاہری پر خلق و حلم کا مرتبہ ایسا بلند تھا کہ اپنی یا دوسروں کی ستائش لبوں پر بھولے سے نہ آتی تھی۔ تقویٰ و ورع خیال کرو حسن اعتقاد دیکھو، ایک عرصہ سر شام حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر روزانہ حاضری دیا کرتیں اور تبرک قدسی سے کام و دہن آشنائے ذائقہ کرتیں۔ جب کسب فیض مکمل ہو گیا اور مسئلہ لاینحل سلجھا وہاں جانا ترک کر دیا۔ مکالمت میں درجۂ احتیاط در پیش نہ رکھتیں جس کا نتیجہ لامحالہ اس طرح پر ہوتا کہ ان کے عقیدت کیش ملنے والے آپس میں میل جول سے گوشہ گیر ہو کر ایک دوسرے کے درپے آزار ہو جاتے۔ ان اوصاف کے باوجود مقامات فقیری متعین نہ تھے۔ بہت سے قصے، داستانوں کی کتابیں آپ سے یادگار ہیں خصوصاً قصہ بنام "آتش رفتہ" اپنی صفت و روانی میں جواب نہیں رکھتا۔ اگر انصاف یاران سخن فہم کی طبیعت سے آمادۂ بغاوت نہیں ہوا تو ارشاد فرماویں کہ اس کیفیت کے ساتھ کوئی قصہ عہد آدم سے ایں دم تک کسی داستان سرا کے خامۂ طلسم سے ظہور میں آیا ہے؟ نثر ایسی کہ نثر ثریا اس پر نثار ہے اور روانی بیان ایسی کہ سندھ اور جہلم اپنی روانی پر خجل ہو کر اپنا رخ ہماؤ کا اختیار کریں۔ حق یہ ہے الفاظ لطیف و رنگین ان کے قلم سے اس فراوانی سے گرتے ہیں جیسے ابر سے باران رحمت۔ مزید براں بلبل اگر چمن میں کچھ بولتی ہے تو اس سخن سنج کی نثر کے زمزمے کی نقالی کرتی ہے۔ مابعد اس اعتراض بھی بردِ رشک و حسد کے کہ قصے ان کے بالعموم جمنا پار کی فضا کی مصوری کرتے ہیں اور معاشرت سلیمن اقلیم سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ آپ نے اسے درخورِ اعتنا گردانتے ہوئے ایک ہزار بارہ سو صفحات کی داستان رنگین ایسی تصنیف فرمائی جو کل عالم اسلامیہ پر محیط تھی اور فلسطین سے لے کر انڈونیشیا تک سب سلطنتوں پر حاوی۔ اس کے ہیرو ہیروئنیں

میں تعلیم رسمی کے مدارج جوں توں طے کیے کہ آپ کی طبع میں آزاد مزاجی جبلت تھی اور دل کتب منقولات میں نہیں لگتا تھا۔ علم ظاہری بھی مستحضر تھا اور علم باطنی کے تو کیا کہنے! باطنی میں درجہ کمال بہ انتہائے کمال حاصل کر کے دم لیا۔ اگرچہ والد ماجد اس علم کے حق میں نہیں تھے اور آپ کے شوق کی طلب کو زائل کرنے کے لئے وقتاً فوقتاً آپ کی گوشمالی فرماتے تھے۔ علم باطنی حقیقت میں وہبی مبدائے فیاض ہے، کوئی گھر سے لے کر نہیں آتا۔ حضرت نے کچھ تو اسے اہل نظرت سے اور زیادہ تر گلی کوچوں بازاروں میں مشاہدۂ سیل حیات سے پایا۔ دیدۂ بینا نے راہیں معرفت کی سجھائیں۔ ویسے بھی اس شہر پر خاک کی آب و ہوا طالبانِ ولایت کے لئے بہت سازگار ہے۔ خاک کی تاثیر ایسی ہے کہ جتنے ولی، پیر، فقیر، رند اور صوفی اقلیم ملتان میں ہو گذرے ہیں ان کا حد و حساب نہیں اور کہیں اور اس کا عشر عشیر بھی نہیں ہوئے۔ راقم یہ بنظر حب الوطن یا اپنی بڑائی کو نہیں کہتا۔ حضرت نے چند سال ملتان میں پیشۂ وکالت میں سر مارا اور پھر ایک انشورنس کمپنی میں منتظم علاقہ ہو گئے۔ دفتر اور میز میسر تھے۔ وہاں بیٹھے بیٹھے مدرسہ کے طالبوں کی کاپیوں میں اردو میں اتنے اچھے اچھے قصے لکھے کہ گوش اہل روزگار نے کہن قصہ ہائے سابقین کو فراموش کیا۔ چنانچہ رسالہ بعنوان "جنگل" جس میں یہ قصے تمام فراہم ہیں، اب تک چمنستانِ ادب میں مشک بار ہے۔

ملتان سے حضرت کا ورود بسلسلۂ معاش لاہور میں ہوا۔ چونکہ السفر وسیلۃ الظفر کی حدیث مشہور ہے۔ گردش فلک نے اس کی موافقت پر رضا دی اور آپ دو ہزار روپیہ ماہیانہ کے مشاہرہ خطیر پر سٹیٹ لائف انشورنس میں عہدۂ مشیر قانون پر مامور ہو گئے۔ یہاں بھی لکھنے پڑھنے کا شوق جاری رہا گو احبابِ نگارنگ کی افراط سے عدیم الفرصتی بھی اکثر اس کے شاکی رہتے۔ حضرت ممدوح کی دوست پرستی کیا کہئے۔ وجیہہ، خوبصورت، جامہ زیب شخص تھے۔ باتوں میں لگاوٹ اور شگفتگی ایسی تھی کہ ان کے پاس سے اٹھ کر آنے کو دل نہ چاہے۔ چنانچہ دوست جان دیتے تھے، اور پیچھا نہیں چھوڑتے تھے۔ یہ بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑتے تھے۔ محفل احباب کے بغیر آپ کو چین نہ آتا تھا اور بیتاب ہو جاتے تھے۔

اگرچہ زی دنیا داروں کی تھی لیکن سیرت و سریرت درویشی و قلندری کی تھی۔ گلبرگ کی جس حویلی کے جس حجرے میں متمکن تھے، اس میں رسائل، سوٹ کیس، کتابیں ادھر ادھر کرسیوں یا بستروں پر بکھری رہتی تھیں۔ نوکر نہیں تھا اور رکھا بھی نہیں تاکہ طریقۂ آزادمنشی اور فقیری میں خلل نہ آئے اور کسی رفیق شفیق کی ہمراہی میں ماحضر تناول کرنے کا جواز قائم رہے۔ فرماتے تھے تنہائی میں جنون و وحشت کی کیفیت غالب ہونے لگتی ہے۔ اکل و شرب کا سامان ساتھ میں ہو اور صحبت یارانِ ذی میسر، تو یہ شخص بادشاہ رہتا تھا۔ گویا کہ ہفت اقلیم کی سلطنت مل گئی ہو۔ حلقۂ احباب میں بیٹھے رہنا اور مکالمت پسندیدہ میں دن رات بسر کرنا آپ کے نزدیک اس سے بڑا مولا کا کرم اور کوئی نہ ہو سکتا تھا۔ نیم شب کو حالتِ جذب طاری ہو جاتی لیکن حتی الامکان بس نہ کرتے۔ حالتِ جذب میں کئی خوارق عادات اور کرامات آپ سے ظہور میں آتیں۔ سبحان اللہ! اس عالم میں گفتگو کا ہر فقرہ کتاب معرفت ہوتا تھا۔ ایسی ایسی باتیں زبان مبارک سے جاری ہوتی تھیں کہ سننے والوں کو آپ پر پیار آنے لگتا تھا۔ کون و مکاں کے پردے اٹھ جاتے تھے۔ بسلسلہ تلقین و ارشاد میں لگی لپٹی نہ رکھتے اور کھری کھری بات منہ پر کہتے خواہ کوئی بھی ہو۔ اکثر ذکر و اذکار میں نماز صبح کا وقت ہو جاتا گو پڑھتے کسی نے نہ دیکھا۔ تب بتقاضائے بشریت استراحت کر لیتے۔ حجرہ مبارک میں دو بستر مستقل بچھے رہتے تھے۔ ایک اپنی ذات کے لئے اور دوسرا کسی بی بی سے تنفر و مسافر درویش کے لئے۔ ایسے درویش آپ کے ہاں اکثر آتے جاتے رہتے تھے۔ بالخصوص ملتان کے درویش صاحب مکاشفہ جو آپ سے بیعت تھے مہینے میں ایک آدھ بار اپنی صورت دکھا جاتے۔ ان کے نام دنیوی چودھری محمد رمضان اور اعجاز بخاری تھے۔ دونوں بڑے زبردست فقیر تھے۔ یہ فقیر بڑے طمطراق اور جاہ و جلال سے لاہور شہر میں نزول فرماتے اور بالعموم بر گینزا کی سرائے میں اترتے۔ احباب، ہم رسائی و سیلہ معرفت سے لیس ہوتے تھے اور ایک حجرہ مخصوص میں اپنے بوریا بستر لگا دیتے تھے۔ دونوں رات حالتِ جذب میں رہتے۔ اور اور خوارق عادات اور کرامات کے مرتکب ہوتے۔ جتنے دن لاہور میں ان کا قیام رہتا، اس شہر کے در و دیوار، بام و سقف زلزلے کی کیفیت سے لرزتے رہتے۔ ارباب محکمۂ موسمیات کے فہم میں نہ آتا تھا کہ یہ ماجرا کیا ہے اور بھونچال کیوں کر جاری ہے۔ خوشا حال ان لوگوں کا جو کوئی کارِ فضول پیٹ کی خاطر نہ کریں اور بسبب کثرت شرارۂ مسائل دنیا، مافیہا پر لات ماریں۔ جب تھرڈ کلاس کا ریل کا کرایہ جیبوں میں بچ رہتا تو دونو فقیر اچانک غائب ہو جاتے۔ مدعائے اصلی ان کے آنے کا اپنے پیران پیر کی سعادت دیدار کے سوا کچھ نہ ہوتا تھا۔

اس یکتائے روزگار کا پورا حال لکھنے کی اس مختصر تحریر میں گنجائش نہیں۔ اس کے لئے ایک دفتر درکار ہے۔ چند سال ہوتے ہیں۔ حضرت عزرائیل علیہ السلام آپ کی خدمت میں تشریف لائے اور بہلا پھسلا کر اپنے ہمراہ اس دنیائے تلخ کام سے لے گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

حضرت علی مقصود حمیدی رضی اللہ عنہ

آپ بدایوں (یوپی) ہندوستان کے اولیائے کرام سے ہوئے ہیں۔ تقسیم ملک کے بعد کراچی میں متوطن ہوئے اور وہاں چند سال اپنے پرانے پیشۂ وکالت کو وسیلۂ معاش بنایا۔ پھر بسبب عمر رسیدگی اسے ترک کر کے لاہور میں آ بسے۔ نسبت باطنی بڑی قوی تھی۔ ان کے سامنے بڑے بڑے صاحبِ نسبت دم خم کھو بیٹھتے تھے۔ عالم پیری میں بھی چہرہ لال سرخ اور روشن تھا۔ نفیس لباس پہنتے اور سر پر فیلٹ ٹوپی لگاتے۔ ہاتھ میں نوادرِ قدیم کی منقش چھڑی ضرور رکھتے۔ اوقات آپ کے نہایت خوب اور حرکات آپ کے نہایت محبوب تھے۔ آپ کو اکثر علوم خصوصاً تاریخ عالم، ادبیات اور موسیقی میں بڑا دخل تھا۔ علم مصوری بھی خوب جانتے تھے اور اپنے ہاتھ سے کئی مجرد فن کی تصویریں بنائی تھیں۔ فی الواقع یکتا سو ان کا قلم بند و صدف دار تھا اور فان گاگ ان کی طرز کا چربہ نگار۔ از بسکہ مزاج بدھ مت کی طرف زیادہ مائل تھا اور اس کے بانی مہاتما بدھ سے عقیدت خصوصی رکھتے تھے۔ کئی نوادرات اس نابغۂ روزگار کے اپنے حجرے میں جابجا سجائے تھے۔ ان کو بڑی محنت سے بصرف زر کثیر فراہم کیا تھا۔ گلبرگ کے محلے کی جس حویلی میں فروکش تھے، اس کے ماتھے پر بدھ کے جگر کا نشان مثل جھومر کے آویزاں کیا تھا۔ الغرض یہ شخص ہزار خوبی کا مجموعہ اور لاکھ ہنروں کا گلدستہ تھا اور گفتگو میں وسیع مطالعے اور مشاہدے کا پتہ ملتا تھا۔ آپ ایام شباب میں خوب کھائے کھیلے تھے اس لئے حسرت کی لکیریں چہرے پر نمایاں نہیں ہوئیں۔ اواخر عمر میں انشائے نثر اردو کی طرف توجہ فرمائی اور چند تحریریں طبعزاد طرح لطیف میں تصنیف کیں۔ پچاسی برس کی عمر میں بے رنج و ملال اس جہان سے رخصت ہوئے۔ اگر آواگون کا مسئلہ جس میں آپ کا ایمان تھا امر صدق ہے تو اب بھی یہ شاید کہیں کسی اور شکل میں ذی حیات ہیں اور چلتے پھرتے ہیں۔

جمیلہ ہاشمی صاحبہ

یہ ایک عورت تھیں باکمال، ہاندیر شہر لاہور میں قریب فورٹریس سٹیڈیم کے ایک قصر دل کشا میں تمام عمر بسر کر دی۔ ایک موٹر اپنی الگ تھی اور خوب تھیسے سے اسے لئے پھرتی تھیں۔ اثنائے کلام میں کل سخنورانِ ہم عصر کی خبر رکھتی تھیں اور بوسیلۂ مکاشفہ و مشاہدہ ان کی کوئی بات ان سے ڈھکی چھپی نہ تھی۔ بہ سبب استعداد خداداد کے فن قصہ گوئی و داستان طرازی میں ید طولیٰ رکھتی تھیں۔ دیگر اس عہد کے قصہ گویوں کو اپنے سے کمتر پاتے ہوئے طریقہ سرپرستانہ اور مربیانہ ان سے برتتی تھیں۔ طبع ان کی خوئے نازک مزاجاں سے نازک تر اور مزاج ان کا کشور ہمالہ سے عالی تر۔ ان کمالات ظاہری پر خلق و حلم کا مرتبہ ایسا بلند تھا کہ اپنی یا دوسروں کی ستائش لبوں پر بھولے سے نہ آتی تھی۔ تقویٰ و ورع خیال کرو حسن اعتقاد دیکھو، ایک عرصہ سرِ شام حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر روزانہ حاضری دیا کرتیں اور تبرک قدسی سے کام و دہن آشنائے ذائقہ کرتیں۔ جب کسب فیض مکمل ہو گیا اور مسئلہ لاینحل سلجھا وہاں جانا ترک کر دیا۔ مکالمت میں درجۂ احتیاط درپیش نہ رکھتیں جس کا نتیجہ لامحالہ اس طرح پر ہوتا کہ ان کے عقیدت کیش ملنے والے آپس میں میل جول سے گوشہ گیر ہو کر ایک دوسرے کے درپے آزار ہو جاتے۔ ان اوصاف کے باوجود مقامات فقیری متعین نہ تھے۔ بہت سے قصے، داستانوں کی کتابیں آپ سے یادگار ہیں خصوصاً قصہ بنام "آتش رفتہ" اپنی صفت و روانی میں جواب نہیں رکھتا۔ اگر انصاف یاران سخن فہم کی طبیعت سے آمادۂ بغاوت نہیں ہوا تو ارشاد فرماویں کہ اس کیفیت کے ساتھ کوئی قصہ عہد آدم سے ایں دم تک کسی داستان سرا کے خامۂ طلسم سے ظہور میں آیا ہے؟ نثر ایسی کہ نثر ثریا اس پر نثار ہے اور روانی بیان ایسی کہ سندھ و جہلم اپنی روانی پر خجل ہو کر اُلٹا رخ بہاؤ کا اختیار کریں۔ حق یہ ہے الفاظ لطیف و رنگین ان کے قلم سے اس فراوانی سے گرتے ہیں جیسے ابر سے باران رحمت۔ مزید براں اب اگر چمن میں بھول نکلتے تو اس سخن سنج کی نثر کے زمزمے کی نقالی کرتی ہے۔ مابعد اس اعتراض جنہی بر رشک و حسد کے کہ قصے ان کے بالعموم جمنا پار کی فضا کی مصوری کرتے ہیں اور معاشرت مسلمین اقلیم سے کوئی تعلق نہیں رکھتے، آپ نے اسے درخور اعتنا گردانتے ہوئے ایک ہزار بارہ سو صفحات کی داستان رنگین ایسی تصنیف فرمائی جو کل عالم اسلامیہ پر محیط تھی اور فلسطین سے لے کر انڈونیشیا تک سب سلطنتوں پر حاوی۔ اس کے ہیرو ہیروئنیں

اور ولین وغیرہ مختلف ممالک کے باشندے تھے ۔ ۔ ۔ داستان بھی تخیل معجز نگار کا کارنامہ ہے۔ راقم کی نظر سے نہیں گذری۔ یہ نیک بی بی طبقاتی تفریق کی قائل تھیں اور روشن خیالات کے لوگوں کو بہ نظر تشکیک دیکھتی تھیں۔ اٹھاسی برس کی عمر میں جہانِ فانی کو وداع کر کے سمہ سٹہ بہاولپور میں ایک روضہ میں مدفون ہوئیں ان کا روضہ قصہ خواں پیرنی کا روضہ کہلاتا ہے اور عرس کے موقعے پر ہزارہا زائر عورتیں وہاں منتیں مانتی ہیں اور دل کی مراد پا کر خوش و خرم گھر لوٹتی ہیں۔

الحمد للہ کہ یہ رسالہ اب تمام ہوا اور جگر سوزی اور شب بیداری کی مزید ضرورت نہ رہی۔ بعد تکمیل کار خواب خرگوش کی راحت و لذت نصیب ہوگی۔ جن زبدۃ العصر بزرگوں کا ذکر اس تذکرۂ مختصر میں بسبب تساہل و بے خبری نہیں ہو سکا۔ امید ہے کہ ان کے لواحقین اس کسر پر زود نشتر مبرے گوش گیر نہ ہوں گے۔ بزرگانِ ممدوح کی خدمت میں اگر کوئی شوخی یا گستاخی نافہمی و کم عقلی کی بنا پر راقم سے سرزد ہوئی ہو تو ان کی ارواح مطہرہ سے استدعا ہے کہ دل میل نہ خاطر کریں، اس عمر میں جس میں میں ہوں، یعنی اٹھاون ساٹھ کا سن، تمیز تو ہوتی نہیں۔

خدا کرے کہ یہ تصنیف مقبول مدیر "فنون" ہو تا کہ اشاعت پذیر ہو کر مشتہر ہو:

مہد شکر کہ ایں نگار خانہ — بگرفت طراز جاودانہ
فن نامہ پاک راو راست ایں — ناقوس ہزار بیگ راست ایں

"شوقِ آوارگی" ۔ اردو سفرنامے میں ایک نیا موڑ

عارف عبدالمتین

میں نے آج سے کچھ عرصہ قبل عطاء الحق قاسمی کے فن سفرنامہ نگاری پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ عطاء الحق قاسمی کا سفرنامہ محض شوقِ جہاں گردی کا مظہر نہیں کیونکہ اس میں ہمیں اجنبی دیاروں اور ان کے باسیوں سے وہ غیر مربوط ربط دکھائی نہیں دیتا، جو ایک جہاں گرد کے ہاں عام طور سے ملتا ہے بلکہ اس کے برعکس اس کا سفرنامہ ایک ایسے آفاقی انسان کے ذوقِ تجسس کا آئینہ دار ہے جو ابنِ آدم کو اس کے مختلف رنگوں اور مختلف طبعی اور معاشرتی پس منظروں میں دیکھنے اور اسے پیار کرنے کا آرزومند ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عطاء الحق قاسمی اجنبی کرداروں کے ساتھ گھل مل کر ان کے دکھ سکھ میں یوں شریک ہو جاتا ہے کہ دیوارِ بیگانگی یکلخت گر جاتی ہے اور ایک ایسا احساس جنم لیتا ہے جو ہمیں وحدتِ انسانی کے شعور سے بہرہ ور کرتا ہے اور یوں ہمارے جذباتی اور فکری افق کو وسیع تر کرنے میں مدد دیتا ہے ــــ توسیعِ افق کا یہ عمل ایک ایسی جمالیاتی کیفیت کا حامل ہے جو عطاء الحق قاسمی کے رواں دواں شگفتہ اور شاداب جمالیاتی اسلوب کی ارفع دین ہے ــــ مگر واضح رہے کہ عطاء الحق قاسمی کا یہ بین الاقوامی رویہ اس کے شدید قومی علائق کو کسی مرحلے پر بھی نہیں دھندلاتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اس کو اس کی جہاں گردی کے دوران میں ہمہ وقت اپنے وطن اور ہم وطنوں کے پیار کی غیر مرئی مگر مضبوط ڈور سے بندھا ہوا محسوس کرتے ہیں اور یوں ہمیں عطاء الحق قاسمی کے سفرنامہ کے حوالے سے خارجی سفر میں داخلی سفر کے اہم عنصر کا ادراک ہوتا ہے۔

جب میں نے عطاء الحق قاسمی کے سفرنامے کے بارے میں یہ عرض کیا تھا کہ وہ محض شوقِ جہاں گردی کا مظہر نہیں تو اس بیان کے پردے میں، میں اس کے اس شوقِ بادیہ پیمائی کی تردید نہیں کر رہا تھا، جسے وہ دنیا بھر کے سیارہ صفت لوگوں کی طرح ایک عمومی وصف کے طور پر رکھتا ہے۔ بلکہ میں تو اس سے قطع نظر اس کی اس خصوصی صفت کی طرف بلیغ اشارہ کر رہا تھا، جو اسے ان تمام لوگوں سے ممیز و ممتاز کرتی ہے، جن کے پاؤں میں زنجیر نہیں، چکر ہوتا ہے۔ اور وہ اس چکر کے طفیل پورے کرۂ ارض کی گردش کا شرف تو حاصل کر لیتے ہیں مگر اس پر بسنے والے مختلف رنگ و نسل اور زبان کے لوگوں اور ان کے مختلف جغرافیائی اور تہذیبی پس منظروں سے گذر جاتے ہیں گویا وہ شاہدانِ محض ہوں اور ان کے سفرنامے ایسے البم ہوں جن میں ان کی چشمِ باریک بین نے ایک اعلیٰ درجہ کے کیمرہ کی مدد سے، بہت سے افراد اور مناظر کے عکس محفوظ کر لئے ہوں یا اپنی تن آسانی کے لئے محض گائیڈ بک ہی سے اخذ کر لئے ہوں، اور ایسا کرتے ہوئے اپنی معروضی حیثیت کو سختی سے برقرار رکھا ہو کہ ان کا موضوعی رویہ کہیں ان کے سفرنامے کی ثقاہت اور سندیت کو منفی طور پر متاثر کرنے کا باعث نہ بن جائے۔ عطاء الحق قاسمی کی یہ امتیازی خوبی اس کی وہ ذاتی وابستگی (PERSONL INVOLVEMENT) ہے، جو اسے اجنبی دیاروں کے باسیوں اور ان کے ثقافتی گردوپیش سے جذباتی طور پر منسلک کر دیتی ہے اور وہ اپنے سفرنامہ میں اس حساس ناظر کی طرح اپنے مشاہدات پیش کرتا ہے، جو مناظر سے باہر رہ کر ان کی پیش کش کا فریضہ سرانجام نہیں دیا کرتا بلکہ خود ان کا جزو بن کر ان کے رگ و پے میں رچ بس کر ان کی فنی صورت پذیری میں مصروف رہتا ہے۔ یہ طریقِ کار اسے ایسی زندہ و متحرک موضوعیت سے ہمکنار کرتا ہے جس کے باعث وہ ہمارے ان تمام روایتی سفرنامہ نگاروں سے الگ ہو جاتا ہے جن کے ہاں ہمیں ایسی مردہ و جامد معروضیت دکھائی دیتی ہے جو ان کے سفرناموں کو انسانی جذباتی علائق کی حرارت سے محروم کر کے فن کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہونے سے روک دیتی ہے، جب کہ عطاء الحق قاسمی کا سفرنامہ اسی حرارت کے فیضان سے فن کے ارفع مقام تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں روایتی سفرنامہ نگاروں کو ان کے

مداحوں سمیت، یہ شکایت پیدا ہو سکتی ہے کہ عطاء الحق قاسمی کا سفرنامہ مروجہ ثقاہت اور سندیت سے معرا ہے، اور یہ بات سفرنامہ نگاری کے آداب کے خلاف ہے۔ میری عاجزانہ رائے میں ان کی یہ شکایت ان کی فکری سطحیت کا شاخسانہ ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ وہ غیر مرئی صداقتیں جو جذباتی رابطوں کی کوکھ سے جنم لیتی ہیں اور احساسات کے افق سے سورج بن کر طلوع ہوتی ہیں، اعتبار کے حوالے سے، کیمروں اور گائیڈ بکوں سے ابھرنے والی مرئی حقیقتوں پر کہیں زیادہ فائق ہوتی ہیں۔

دوسرے لفظوں میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ عطاء الحق قاسمی کا یہ سفرنامہ اپنے صنفی تقاضوں کی تکمیل کے لئے خارج کو نظر انداز نہیں کرتا مگر اسے فن کے منصب جلیل پر فائز کرنے کے لیے داخل سے ہم آہنگ کرتا ہے گویا وہ اپنے شانوں پر دوہری سیاحت کی ذمہ داریوں کا بار ڈال لیتا ہے، ایک بیرونی سیاحت ہے، جو ملک ملک، ملت ملت اور فرد فرد کے ظاہر سے تعلق رکھتی ہے اور دوسری اندرونی سیاحت ہے جس کا تانا دیس دیس، قوم قوم اور شخص شخص کے باطن سے استوار ہے۔ مقام مسرت ہے کہ عطاء الحق قاسمی اکثر و بیشتر مقامات پر اپنے ان دوگونہ فرائض سے بطریق احسن عہدہ برآ ہوتا ہے۔

اس سلسلہ میں عطاء الحق قاسمی کی کامیابی کا راز اس کی شخصیت کے اس نمایاں وصف میں موجود ہے کہ وہ اپنی انتہائی پرخلوص اور فعال بے تکلفی سے دلوں کے درمیانی فاصلے جنھیں عام لوگ صدیوں میں طے کر پاتے ہیں لمحوں میں طے کر لینے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ جنھیں عطاء الحق قاسمی سے ذاتی تعلقات استوار کرنے کا موقع نہیں ملا، اس کے سفرناموں کے ان حصوں کو جن میں عطاء الحق قاسمی اجنبی دیاروں میں اجنبی کرداروں، بالخصوص خوبصورت نسائی کرداروں سے یارانِ غار کی طرح محو اختلاط نظر آتا ہے، اس کی افسانہ طرازی پر محمول کرتے ہیں، حالانکہ حقیقت اس کے برعکس یہ ہے کہ جو لوگ عطاء الحق قاسمی کی من موہنی شخصیت سے براہ راست تعارف کا حظ اٹھا چکے ہیں وہ نہ صرف ان واقعات کی صحت پر پورا پورا یقین رکھتے ہیں بلکہ محسوس کرتے ہیں کہ سفرنامے کے احوال کی رعنائی اور سفرنامہ نگار کے بیان کی دلکشی میں کھوئے ہوئے ناظرین کی از خود رفتگی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر عطاء الحق قاسمی نے واردات کے لذیذ تر اجزا پر چپکے سے پردہ ڈال دیا ہے اور یوں وہ ان کے ساتھ یک گونہ بے انصافی کا مرتکب ہوا ہے۔ اس کے سفرنامہ "شوق آوارگی" سے عطاء الحق قاسمی کی شخصیت کے اس انداز دلربائی کی ایک دل آویز مثال پیش کرتا ہوں، جو ایک سفید فام نسائی مخاطب کو تعارف کے اولین مرحلہ پر ایسی جذباتی حالت سے دوچار کر دیتا ہے، جس کی موجودگی میں بیگانگی کے بسیط صحرا پل بھر میں حقیر "ذرے" کی سمت آتے ہیں اور یگانگت کی بے بساط رائی عظیم پہاڑ کا روپ دھار لیتی ہے۔

عطاء الحق قاسمی جہاز کا مسافر ہے، میریلین اور زولا اس کی ہم سفر ہیں، وہ انھیں وقت کٹی کے لئے ایک بے ضرر سا لطیفہ سناتا ہے، جسے سن کر دونوں کے چہروں پر مسکراہٹ کھیل جاتی ہے اور پھر کیا ہوتا ہے، اسے عطاء الحق قاسمی ہی کی زبانی سنئے:

"زولا نے میریلین کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر میری طرف جھکتے ہوئے فرانسیسی لہجے اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہا" میں تمہارا مطلب سمجھ گئی ہوں وقت گذاری کا مسئلہ واقعی اہم ہے، تو لو پھر شروع ہو جاؤ ـــــ تمہارا نام کیا ہے؟"

"پیرزادہ محمد عطاء الحق قاسمی"

"ڈیٹ اے منٹ، ویٹ اے منٹ! یہ سارے کا سارا نام تمہارا اپنا ہی ہے؟"

"یہ تو نام کا ایک حصہ ہے، ابھی تو قاسمی کے بعد امرتسری، ثم لاہوری اور عفی عنہ وغیرہ جیسے اہم حصے چھوڑ گیا ہوں!"

"یہ کس می (Kiss me) قاسمی، کیا ہے؟"

"کس می کا مطلب نہیں سمجھتیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہم فرانسیسیوں سے زیادہ اس کا مطلب کون جانتا ہوگا؟" زولا نے ہنستے ہوئے کہا" میں تو صرف یہ جاننا چاہتی ہوں کہ تم نے اسے نام کا حصہ کیوں بنایا؟"

وہ یوں کہ لڑکیوں میں بہت پاپولر ہوں، جدھر سے گزر جاؤں کِس می کِس می کی آوازیں آتی ہیں۔ اب تو یہ نام کا حصہ بن گیا ہے۔"

"تو مسٹر کِس می......!"

"یہ مسٹر کیا ہوا؟ صرف کِس می کہو۔ میں تکلفات کا قائل نہیں۔"

"نہ بابا" زولا نے شریر مسکراہٹ سے کہا "میں یہ رسک نہیں لے سکتی۔"

"تو چلو پھر قاسمی کہہ لیا کرو کیونکہ اصل لفظ قاسمی ہی ہے۔"

عطاء الحق قاسمی کے سفرنامہ کی ایک اور قابلِ ذکر اور اہم خوبی یہ ہے کہ اس میں وسیع تر انسانی ہمدردی کا بھرپور اظہار ملتا ہے۔ یہ ہمدردی جہاں ایک طرف جغرافیہ، رنگ، نسل اور زبان کی حدود پھلانگ جاتی ہے وہاں وہ اچھے اور برے کے ظاہری امتیاز سے بھی بنیادی طور پر ماورا رہتی ہے۔ کیونکہ وہ اس حکیمانہ نکتہ سے بخوبی آشنا ہے کہ کسی کردار کی برائی کوئی مطلق شے نہیں ہے۔ بلکہ ایک اضافی چیز ہے اور اس مادی ماحول اور نظام سے مشروط ہے جس میں وہ زندگی گذارنے پر مجبور کر دیا گیا ہے۔ لہذا عطاء الحق قاسمی کو اگر نفرت ہو سکتی ہے تو اس برے ماحول اور نظام سے ہو سکتی ہے۔ نہ کہ اس مظلوم کردار سے جو اس کا نخچیر بن کر برا کہلانے کا پابند ہے۔

عطاء الحق قاسمی کا یہ وصف، جو اس کے معاشرتی شعور کی کلیۃً آئینہ داری کرتا ہے "شوقِ آوارگی" میں اس مقام پر قارئین کی نگاہوں کے سامنے ابھر آتا ہے، جہاں وہ ایک ہوٹل میں ہپیوں کے ایک مخلوط گروہ سے دوچار ہوتا ہے اور ان کے ذوقِ حشیش اور دیگر عمومی سرگرمیوں کے سلسلے میں اس گروہ کی نسائی رکن ماریا کے استفسارات پر اپنا جچا تلا ردعمل یوں ظاہر کرتا ہے۔ ماریا پوچھتی ہے:

"کیا تمہیں یہ سب کچھ پسند نہیں ہے؟" اس کا اشارہ ارد گرد کے ماحول کی طرف تھا۔

"مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟" میں نے بدبودار دھوئیں سے بھرے ہوئے اس کمرے میں نتھنے کھول کر سانس لیتے ہوئے کہا۔

"تمہارے جواب سے لگتا ہے تم اس سے خوش نہیں ہو۔" ماریا برہم ہو گئی۔

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں" میں نے کہا "دراصل میں کسی چیز سے خوش نہیں ہوں، کسی پر ناراض نہیں ہوں کیونکہ جانتا ہوں کہ فرد کو کسی اچھے یا برے فعل کی طرف دھکیلنے والی طاقت وہ خود نہیں۔"

"کیا مطلب؟" ماریا نے حیرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ سارا مسئلہ CONDITIONINING کا ہے۔ اس کے تحت افراد جو راستہ اختیار کرتے ہیں اس کا کریڈٹ یا ڈس کریڈٹ ان کی بجائے اس ماحول کو جاتا ہے جس میں وہ بڑھتے پلتے اور جوان ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے اثرات سے نکلنا بھی چاہیں تو نکل نہیں سکتے۔" میں نے جواب دیا۔

اگر بات یہیں ختم ہو جاتی تو یقیناً ہم آپ عطاء الحق قاسمی کے معاشرتی شعور پر ناپختگی کا اعتراض وارد کرنے میں حق بجانب ہوتے بلکہ اس کو اس سماجی جرم کا مرتکب قرار دینے سے نہ چوکتے کہ وہ افراد کو ماحول کے مقابلے میں بالکل بے دست و پا اور منفعل وجودوں کے طور پر پیش کر کے عمرانی انقلابات کا راستہ روکنے کی ناپسندیدہ اور رجعت پسندانہ کوشش میں مصروف ہے، اور ان کی اس فعال حیثیت کو تسلیم کرنے سے منکر ہے، جس کے طفیل سوسائٹی ہر دور کے تواتر سے ارتقاء کی منازل طے کرتی رہی ہے مگر عطاء الحق قاسمی نے بات کو آگے بڑھایا ہے اور اسے اپنے منطقی عروج پر پہنچاتے ہوئے بتایا ہے کس طرح بالآخر ظالم معاشرہ مظلوم افراد ہی کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچتا ہے چنانچہ جب ماریا عطاء الحق قاسمی کے مذکورہ بالا الفاظ کو سن کر پوچھتی ہے کہ کیا یہ بات بطور کلیہ کہہ رہے ہو؟ تو عطاء الحق قاسمی جواباً کہتا ہے:

"ہاں، مگر ہر دور میں اس کلیے سے خود کو مستثنیٰ قرار دینے والے کچھ لوگ پیدا ہو جاتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو انسان کی پیدائش سے

اب تک دنیا میں ایک ہی نظام نافذ ہوتا!؟

یہ الفاظ عطاء الحق قاسمی کی مکمل سماجی آگہی کے اعلان نامہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور انسانی تاریخ مختلف معاشروں کے عروج و زوال کے حوالے سے اس اعلان نامہ کی تصدیق کرتی ہے۔

غیر ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک سے جو لوگ ترقی یافتہ ممالک کی سیاحت کے لئے جاتے ہیں، ان کی تقریر، تحریر اور طرزِ عمل سے خفی یا جلی انداز کی مرعوبیت ضرور جھلکتی ہے اور ہم محسوس کرتے ہیں کہ ایک مخصوص نوع کا احساس کمتری ان پر ہمہ وقت سایہ کناں رہتا ہے، عطاء الحق قاسمی کے ہاں آپ کو ایسی مرعوبیت کے کسی روپ کا ادراک نہیں ہوتا اور ہم احساس کمتری کی کسی پرچھائیں کو اس کے اعصابی نظام پر محیط نہیں پاتے۔ بلکہ اس کے برعکس ہمیں وہ ایک نہایت کمیاب اور دلنواز قسم کی خود اعتمادی کے جلو میں سفر کو منزل بہ منزل طے کرتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ خود اعتمادی ہمیشہ اس شخصیت کا طرۂ امتیاز بنتی ہے، جو بیک وقت اپنی پسماندہ قوم اور اس کے افراد کے ان تمام گراں قدر محاسن سے کماحقہ آشنا ہوتے ہیں جن پر پسماندگی نے پردہ ڈال رکھا ہوتا ہے اور ترقی یافتہ اقوام اور افراد کے ان معائب سے بھی کلیتہً آگاہ ہوتے ہیں جنھیں ان کے فروغ کی چکاچوند نے عام لوگوں کی نگاہوں سے چھپا رکھا ہوتا ہے۔

آیئے اب "شوق آوارگی" کے اس حصے سے بہرہ ور ہوں، جس میں عطاء الحق قاسمی امریکہ کے تہذیبی آشوب کا مطالعہ اس سائنس داں کی طرح کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے جو EMPERICAL KNOWLEDGE کی اہمیت کے علاوہ EXPERIMENTATION تجزیہ و تالیف اور استقرائی و استخراجی طریق کار کی وقعت سے بھی آشنا ہے اور ان سب کو بروئے کار لاکر جن نتائج تک رسائی حاصل کرتا ہے انھیں ایک فن کار کی قدرت ابلاغ کے وسیلے سے دوسرے تک نہایت موثر انداز میں پہنچا بھی دیتا ہے۔ اپنے معروضے کی وضاحت کے لئے "شوق آوارگی" کے ایک کردار جیک اور عطاء الحق قاسمی کے مابین چند مکالمے پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں:

"چلو چھوڑو ان باتوں کو!" جیک کو غالباً مجھ سے اتفاق نہیں تھا سو اس نے بیزاری سے کہا "یہ کہو تمہیں امریکہ کیسا لگا؟"

"جیسا اسے ہونا چاہیئے"، میں نے جماہی لیتے ہوئے جواب دیا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ وہاں دولت کی ریل پیل ہے اور لوگ بہت سکھی نظر آتے ہیں، مگر ان کے کچھ مسائل بھی ہیں" میں نے کہا۔

"وہ مسائل کیا ہیں؟" جیک نے گفتگو میں دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

میری آنکھوں میں نیند تیر رہی تھی اور میں سونا چاہتا تھا، سو میں نے سبق سنانے کے انداز میں وہ مسائل گنوانے شروع کر دیئے۔ "مثلاً یہ کہ انھیں سونے کے لئے نیند کی گولیاں استعمال کرنا پڑتی ہیں، ایرکنڈیشنڈ کار، ایرکنڈیشنڈ مکان اور زندگی کی دیگر سہولتوں سے بہرہ ور لوگ ڈیپارٹمنٹل سٹورز سے ہر سال کروڑوں ڈالر کی اشیا چرا لے جاتے ہیں۔ تمام تر جنسی آزادی کے باوجود کوئی لڑکی رات کو پیدل سڑک پر نکلنے کی جرات نہیں کرتی۔ علاوہ ازیں جنسی تسکین کی تلاش میں وہ لواطت سے لے کر اپنے عضو کو بیدے سے چھیلنے تک کے مراحل طے کر جاتے ہیں۔ دولت کی ریل پیل کے باوجود کچھ لوگوں کو رات بھوکے رہ کر بھی بسر کرنا پڑتی ہے۔ کرپشن نچلی سطح پر قدرے کم مگر اوپر کی سطح پر بے انتہا موجود ہے۔ جرائم اپنی انتہا کو پہنچ چکے ہیں۔ پریس کے اجارہ دار مالکان کو اپنے مفاد کے مطابق پالیسیاں بنانے کی مکمل آزادی ہے، کالوں کی بستیاں اب بھی الگ ہیں اور اگر ان میں سے کوئی سفید فام لوگوں کی کسی بستی میں رہائش اختیار کرے تو وہاں جائداد کی قیمتیں گر جاتی ہیں۔ اخلاقی معیار و ضابطے ہیں، ازدواجی زندگی میں انتشار ہے۔ بچے سڑکوں پر جوان ہوتے ہیں اور بوڑھے اولڈ پیپلز ہوم میں سسکتے ہوئے دم توڑتے ہیں۔"

امریکی معاشرت کے ناسوروں کی اس عکاسی نے آپ کے ذہن میں سعادت حسن منٹو کی اس حقیقت نگاری کی یاد ضرور تازہ کر دی ہوگی جس کی زہرناکی

مروجہ نظام اور اس کی اخلاقیات کے محافظوں کے لئے ہمیشہ ناقابلِ برداشت رہی ہے!

بہرکیف یہ ایک طے شدہ امر ہے کہ اجنبی دیاروں کے سلسلے میں عطاء الحق قاسمی کی معاشرتی تنقید کے پیچھے نفرت کارفرما نہیں بلکہ اس کے پس پردہ اس کی وہ محبت سرگرم عمل ہوتی ہے، جو اسے ان دیاروں کے باسیوں کے ساتھ ایک عالمگیر اخوت کے علمبردار کی حیثیت سے ہے!

عطاء الحق قاسمی کا یہ بین الاقوامی اندازِ نظر اس کے قومی طرزِ فکر سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں وہ دیگر ممالک کے باشندوں سے پیار کرتا ہے، وہاں وہ اپنے وطن اور اپنے ہم وطنوں کے لئے شیفتگی کی حد تک چاہت رکھتا ہے اور یہ اسی چاہت کا نتیجہ ہے کہ وہ دیارِ غیر میں رضاکارانہ طور پر اپنے وطن کے سفیر کا منصب اختیار کر لیتا ہے، ہر مرحلے پر اس کے مفادات کا تحفظ کرتا ہے اور اس کے امیج کے تقدس کی نگہداری کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ "شوقِ آوارگی" میں سے ایک اقتباس کو اس کی وطن پرستی اور سفارتی کارکردگی کی احسن مثال کے طور پر پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

"چھوڑو بھی، بتاؤ کہاں کے رہنے والے ہو؟"

"تمہارا حافظہ بہت کمزور ہے، تعارف کے وقت بتایا تھا کہ میں پاکستانی ہوں۔"

"میرا مطلب ہے مشرقی یا مغربی پاکستان؟"

"مغربی پاکستان۔"

اب کے میں نے اس کے چہرے پر بیزاری کے آثار دیکھے۔

"تمہاری فوج کے ہاتھ بے گناہوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں، کیا تم مغربی پاکستانی ہونے کی حیثیت سے خود کو گلٹی محسوس نہیں کرتے؟" میریلین کی آنکھوں میں غصہ تھا۔

"مجھے ایک بات بتاؤ۔" میں نے پوچھا "کیا تم ویت نام کی جنگ کے بارے میں ہنوئی کی کسی نیوز ایجنسی کی خبروں پر لفظ بہ لفظ اعتبار کر سکتی ہو؟"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ اس میں جانبداری کی جھلک کہیں نہ کہیں ضرور مضمر ہو گی۔"

"انڈیا اور پاکستان کے تعلقات کے بارے میں کچھ جانتی ہو؟"

"ہاں دونوں ایک دوسرے کو ناک آؤٹ کرنے کی کوشش میں رہتے ہیں، مگر تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"اس لئے کہ تمہارے اخبارات میں اس معاملے کے بارے میں جتنی خبریں شائع ہوتی ہیں، وہ سب کی سب ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا نے جاری کی ہیں، اور اس کا باقاعدہ حوالہ دیا جاتا رہا ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ بنگالیوں کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوئی؟"

"نہیں، انڈیا میں تربیت یافتہ مکتی باہنی کے سپاہیوں سے نبرد آزمائی کے دوران بے گناہ لوگ زیادتیوں کے شکار ہوئے۔ میرا دل ان کے لئے روتا ہے مگر میں ان محب وطن افراد کو بھی نہیں بھول سکتا جنہیں مکتی باہنی نے اپنے مظالم کا نشانہ بنایا۔ ظالم کوئی بھی ہو، وہ ظالم ہے اور مظلوم کوئی بھی ہو، وہ مظلوم ہے۔ اس میں تفریق نہیں کرنا چاہئے۔ مجھے افسوس ہے کہ تمہارے پریس نے اس ضمن میں کھلی جانبداری کا مظاہرہ کیا۔"

میریلین کے چہرے پر ندامت کے آثار نمایاں ہوئے اور اس نے کہا "ہمارا پریس واقعی صرف وہی تصویر پیش کرتا ہے، جو وہ عوام کو دکھانا چاہتا ہے۔ اب تم سے بات ہوئی تو مسئلے کا دوسرا پہلو بھی سامنے آیا، ورنہ میں ہمیشہ یہی سمجھتی کہ تم لوگ بہت ظالم ہو!"

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ عطاء الحق قاسمی نے پل بھر کی مدلل اور عادلانہ گفتگو سے معاندانہ پروپیگنڈے کے اثرات کو کس طرح زائل کیا اور کیسی شدید

مخالفانہ صورت حال کو کیسے اپنے وطن کے حق میں منقلب کر کے اس دیس پیار کا ثبوت فراہم کیا جسے ہم بہترین سفارتی منصب کا آئینہ دار قرار دے سکتے ہیں۔

سفر کے دوران میں اپنی دھرتی اور اس کے باسیوں سے عطاء الحق قاسمی کے ہمہ وقتی تعلق اور وابستگی کے کئی اور دلآویز روپ بھی ہیں، جن میں سے ایک تلازماتی نوعیت کا ہے جس کے حوالے سے ہم دیکھتے ہیں کہ اس کا ذہن اجنبی دیار کی کسی صورت واقعہ کو اپنے دیس کی مخالف یا موافق صورت واقعہ سے مقابلہ یا موازنہ کے فنی حربے سے باہم مربوط کر دیتا ہے اور یوں سینکڑوں یا ہزاروں میل کے درمیانی فاصلے احساسی سطح پر سمٹ کر ایک نقطہ پر مرکوز ہو جاتے ہیں۔ دراصل یہی ارتکاز عطاء الحق قاسمی کے خارجی سفر میں داخلی حصہ کو ظہور میں لانے کا ذمہ دار ہے۔ اب ایک مثال ملاحظہ فرمائیے، ایمسٹرڈیم کے سٹیشن کے باہر کھڑا عطاء الحق قاسمی کہتا ہے:

"میرے ساتھ سیاح لڑکے لڑکیوں کا ایک پورا جتھا تھا........ ان میں سے ایک تیس بتیس سالہ خاتون بھی تھی، جس نے سامان کی گٹ کی جگہ اپنا چار ماہ کا "بے بی گلیکسو" قسم کا ایک خوبصورت سا بچہ کمر کے ساتھ ایک ٹوکری میں لٹکایا ہوا تھا اور اپنا سامان ایک ٹرالی نما چیز میں لادے لئے جا رہی تھی۔ میں نے اسے دیکھ کر سوچا یہ لوگ بھی عجیب ہیں، زندگی کے ہر مرحلے پر، رجگڑے ہوئے حالات میں بھی زندگی کا رسیلا رس پینا چاہتے ہیں جب کہ ہم لوگ جوانی کی سرحدوں میں قدم رکھنے سے پہلے ہی بوڑھے ہو جاتے ہیں، ہمارے ہاں کی عورتیں تو اس معاملے میں مردوں سے دو چار ہاتھ آگے ہیں۔ ادھر شادی ہوئی اور ادھر ہم نے دیکھا کہ اچھی خاصی لڑکیوں نے بھی خود کو بڑھی بوڑھیوں میں شمار کرنا شروع کر دیا چنانچہ ان کے شروع کے چند ماہ تو دولہے کے ساتھ گزرتے ہیں اور پھر بقیہ تمام عمر چولھے کے ساتھ بسر ہوتی ہے۔"

یہ مقابلہ کی ایک مثال تھی۔ اب ایک مثال موازنہ کی ملاحظہ فرمائیے۔ عطاء الحق قاسمی ایک اور موقع پر کہتا ہے:

"چنانچہ نیو یارک کے ٹائم سکائر پر میری ملاقات اگر مسٹر نارمن نامی شخص سے ہوئی تو پہلی ملاقات میں وہ مجھے نارمن ہی لگا مگر تیسری یا چوتھی ملاقات میں یہ عقدہ کھلا کہ ٹائم سکائر کا یہ نارمن دراصل بھاٹی گیٹ کا عبدالرحمٰن ہے، کیونکہ انسانی برادری کا ایک فرد ہونے کے ناتے اس میں محبت، نفرت، مسرت اور غم کے جذبات بھاٹی گیٹ کے عبدالرحمٰن سے کسی طرح بھی مختلف نہیں تھے۔"

اور یہی وہ مقام ہے جہاں عطاء الحق قاسمی کے سفرنامہ میں عظمت کا وہ عنصر داخل ہوتا ہے، جو وحدت انسانی کے حوالے سے نیو یارک اور اسلام آباد کے درمیانی فاصلے ہی کو نہیں مٹاتا بلکہ مشرق و مغرب اور شمال و جنوب کی تمام دوریوں کو بے معنی کر کے رکھ دیتا ہے۔

اور یوں عطاء الحق قاسمی کا سفرنامہ اس درخشاں بین الاقوامیت سے ہمکنار ہو جاتا ہے جو راست فکر قومیت کی کوکھ سے جنم لیتی ہے اور عطاء الحق قاسمی کے قارئین کو فکری ارتفاع بخش کر انھیں زندگی کے بارے میں ایک آفاقی نقطۂ نظر اپنانے پر آمادہ کرتی ہے۔

اب آخر میں ایک بات عطاء الحق قاسمی کے اسلوب کے بارے میں عرض کرنے کا آرزومند ہوں۔ عطاء الحق قاسمی کا اسلوب اس کے اپنے سیمابی مزاج اور سفرنامے کے سیلانی تقاضوں کے عین مطابق انتہائی متحرک و رقصاں ہے۔ اسلوب میں تحرک و رقص کی یہ بے محابہ کیفیت، جمال آفریں ہوتے ہوئے بھی اپنی تیز رفتاری کی وجہ سے عام قاری کی سانس اکھاڑ دینے کے لئے کافی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ عطاء الحق قاسمی کا سفرنامہ پڑھتے ہوئے کبھی غالب کی طرح محسوس کرتا ہے کہ:

رَو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

اور کبھی میر درد کی زبان میں پکار اٹھتا ہے:

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

عطاء الحق قاسمی کے جذبوں سے لبریز اسلوب کو آپ اس کے سفرنامے کے رگ و پے میں سرایت کیا ہوا محسوس کریں گے، یہاں میں صرف دو ایسی چھوٹی چھوٹی سی مثالیں پیش کرنے پر اکتفا کروں گا جن کے حوالے سے میں واضح کرنا چاہتا ہوں کہ عطاء الحق قاسمی داخلی جذبات و احساسات کی ترسیل کے موقع پر بھی ایسے الفاظ کا انتخاب کرتا ہے جو خارجی حرکت و روانی کے تاثر کو نہ صرف برقرار رکھیں بلکہ اس میں اضافہ کا موجب بنیں، پہلی مثال ملاحظہ کیجیے:

"اچھا اب میں چلتی ہوں!" اس نے بھنوؤں کو چھوتی ہوئی پلکیں اٹھا کر میری طرف تکتے ہوئے کہا اور اپنا سامان اٹھانے کے لئے جھکی، اس بار مجھے یکدم احساس ہوا کہ گذرتے لمحے مجھ سے میری کوئی قیمتی چیز چھیننے والے ہیں اور یوں کچھ دیر بعد حسین زوآ کی رفاقت کے باوجود میں تنہا رہ جاؤں گا۔ اس کے ساتھ ہی شگفتہ بیانیاں میرا ساتھ چھوڑ گئیں اور پھر جہاز کے سبھی مسافروں کی تھکن میرے جسم میں اتر گئی!"

دوسری مثال ملاحظہ فرمایئے:

"تو پھر برس میں تمہارا انتظار کروں گی!" اس نے انداز محبوبیت سے میرے بہت قریب آ کر کہا "مگر وعدہ کرو کہ جلد آؤ گے!"

"وعدہ!" ایک قدم میں نے اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "مگر میرے وطن پہنچنے پر تم بھی اپنے وعدوں کا پاس کرنا!"

اس کے جواب میں زوآ کی ہنسی میرے کانوں کے بالکل پاس سنائی دی اور پھر اس نے اپنے ہاتھ میرے شانوں پر رکھ کر میرے ہونٹوں کو مقفل کر دیا۔

مجھے یوں لگا میرے جسم میں خوشبوؤں کے قافلے اتر رہے ہیں!

عطاء الحق قاسمی کے اسلوب کا دوسرا اہم عنصر شگفتہ اور لطیف مزاح ہے، جس کی بہت سی دلآویز مثالیں مہیا کی جا سکتی ہیں، مگر یہاں صرف اس واقعہ کا حوالہ ہی کافی ہوگا۔ جسے میں اس سے قبل پیش کر چکا ہوں اور جس میں عطاء الحق قاسمی نے "قاسمی" کے لفظ سے "کس می" کی آرزومندانہ گنجائش نکالی تھی۔

ان معروضات کے بعد اس دعوے کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ عطاء الحق قاسمی کا سفرنامہ، ان جدید سفرناموں میں سے ایک ہے، جن کے طفیل اردو سفرنامہ نگاری ایک بالکل نئے موڑ سے آشنا ہوئی ہے اور جس کا زندہ ثبوت "شوقِ آوارگی" ہے!

دس منٹ عطاء الحق قاسمی کے ساتھ

امجد اسلام امجد

برادرِ کلاں مرزا اسداللہ خاں غالب "عفی عنہ" نے ایک جگہ لکھا ہے:

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں

میں نے اور میرے چند دوستوں نے فیصلہ کیا ہے کہ اس مصرعے کو:

ہم طرفدار ہیں غالب کے سخن فہم نہیں

پڑھا جائے۔ بلاشبہ اس سے ہماری سخن فہمی خطرے میں پڑ جائے گی لیکن برادرِ کلاں سے غیر مشروط محبت کے اظہار کی خاطر یہ چھوٹی سی قربانی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ ہمارا یہی کمال کیا کم ہے کہ ایسے COMMITMENT SHY زمانے میں ہم بہانگ دہل اپنی طرفداری کا اعلان کر رہے ہیں۔ اگر یہ نالائقی ہے تو ٹھیک ہے کہ محبت میں اگر لیاقت شامل ہو جائے تو آدمی زیادہ سے زیادہ پاپولیشن پلاننگ والوں کو خوش کر سکتا ہے۔

ادب کے استاد جو کچھ بھی کہیں، میرے نزدیک ہر تنقید بنیادی طور پر تاثراتی ہوتی ہے۔ اگر نقاد کی پسند ناپسند کا پتہ اس کی تحریر سے نہ چلے تو اس سے بہتر ہے کہ آدمی حضرت نسیم حجازی، نقاش فطرت ایم اسلم یا کسی غیر معروف خاتون کا لکھا ہوا رومانی، جذباتی، معاشرتی اور نفسیاتی ناول پڑھ لے۔ پچھلے کچھ مضمونوں سے میں شدت سے اس بات کا خطرہ محسوس کر رہا ہوں کہ کہیں میں بیچ بیچ کا سکہ بند نقاد تسلیم نہ ہو جاؤں۔ آپ نے محسوس کیا ہو گا کہ میں پچھلے دو منٹ سے مسلسل گول مول اور غیر متعلق باتیں کر رہا ہوں، تمہیدیں باندھ رہا ہوں، اور عطاء الحق قاسمی کو SUSPENSE میں مبتلا کر رہا ہوں کہ پتہ نہیں مجھے تھیلے میں سے کون سی بلی نکالنی ہے اور واضح رہے کہ ایک کامیاب تنقیدی مضمون کے یہی تین بنیادی اصول ہیں۔ ویسے آپ کو آپس کی ایک بات بتاؤں، جب عطا کالم لکھنے کے موڈ میں نہیں ہوتا تو وہ بھی اسی اصول پر عمل کیا کرتا ہے۔

عطاء الحق قاسمی کے حالاتِ زندگی جہاں تک میرے علم میں ہیں، اگر اس کے والد محترم کے علم میں بھی ہوتے تو وہ آج یہاں اس طرح بیٹھا اپنی شام نہ سنوار رہا ہوتا کسی تبلیغی جماعت کے ساتھ دورے پر ہوتا ——— ان موٹی موٹی آنکھوں میں کجلے کی دھار کھینچ کر اور اپنے پیٹ میں چھپی ہوئی داڑھی باہر نکال کر جمعیت علمائے اسلام کی طرف سے صوبائی اسمبلی کا ضمنی انتخاب لڑ رہا ہوتا اور اگر یہ بھی نہیں تو کم از کم رویتِ ہلال کمیٹی کا ممبر ضرور ہوتا۔ لیکن افسوس کہ امرتسر کے اس نونہال کو اردو کا ایک اہم ادیب اور کالم نگار بننا تھا ——— چنانچہ خداوند کریم نے کسی انتہائی معتبر فرشتے کے ذریعے مولانا بہاء الحق قاسمی کی نظروں سے نور چشمی کی مصروفیات اوجھل رکھیں۔ بلاشبہ وہ ہر بات پر قادر ہے۔

عطا بہت اچھا انسان ہے۔ یہ بیان میں روایتاً اور رسماً نہیں "ٹھوک بجا" کر دے رہا ہوں۔ گیارہ برس سے میری اس کی یاری ہے اور اس عرصے میں میں نے اس کی شخصیت کے تمام ارتقائی اور غیر ارتقائی مراحل دیکھے ہیں لیکن اس کی طبیعت کی صفائی، وضعداری، شگفتگی اور مشکلات سے ہار نہ ماننے والے عزم میں کبھی لغزش محسوس نہیں کی۔ ایم اے کرنے کے بعد بیکاری کے خاصے طویل عرصے میں بھی اس کے چہرے کی مسکراہٹ میں نے دھندلی پڑتی نہیں دیکھی پھر ایک دن اچانک اس نے بیٹھے بیٹھے اعلان کیا کہ وہ باہر جا رہا ہے۔ میں سمجھا شاید کمرے سے باہر جانے کو کہہ رہا ہے مگر وہ سچ مچ چلا گیا۔ یہ تو بہت بعد

میں پتہ چلا کہ اُس نے یہ سفر، سفرنامہ لکھنے کے لئے کیا تھا۔ بہرحال وہ ٹھڈے ٹھیڈے کھاتا، دیارِ فرنگ میں سوتا جاگتا (سوتا کم اور جاگتا زیادہ) اس گذرگاہ تک پہنچ گیا جو کب سے اُس کے قدموں کا انتظار کر رہی تھی اور آج وہ یہاں آپ کے سامنے بیٹھا ہے۔

عطا بہت حساس اور جذباتی ہے۔ اُس کی یہ جذباتیت اس لئے نہیں کہ وہ شاعر ہے کیونکہ میں نے بہت سے غیر شاعروں کو بہت جذباتی دیکھا ہے۔ یہ جذباتیت اس وجہ سے ہے کہ وہ ایک انسان ہے اور انسان اور آدمی میں شاید یہی فرق ہے جسے سمجھ کر "بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا" لکھا گیا تھا۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو نہایت سنجیدگی سے مسئلہ کشمیر کی طرح DISCUSS کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ دوسرے بھی اسی طرح کریں: ؎

حالانکہ اس سے فرق تو پڑتا نہیں کوئی!

وہ بہت کم کسی کو دشمن بناتا ہے۔ بے پناہ فقرے باز ہے۔ دشمن پر زبردست ہاتھ مارتا ہے لیکن کینہ دشمن نہیں ہے، اور خواتین و حضرات! اس عہد میں کینہ ہوتے ہوئے بغیر دشمنی کرنا بہت کم لوگوں کو آتا ہے۔ ہر مخلص آدمی کی طرح وہ بھی اپنے دوستوں رفیقوں کی بھلائی میں بے غرض حصہ لیتا ہے اور بعض اوقات ایسے ڈنک کھاتا ہے کہ کوئی اور ہو تو حملہ آور کا سر کچل کر رکھ دے، مگر وہ خاموشی سے ایک طرف ہو جاتا ہے اور اکثر مجھ سے پوچھا کرتا ہے "یار لوگ اتنے زہریلے کیوں ہو گئے ہیں۔؟"

عطا نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا اور اوائل عمر میں حضرت عبدالرشید تبسم ایڈیٹر، پبلشر، مصنف اور خاکہ نگار کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور دیر تک کئے رکھا جس کے نشانات آج بھی اُس کے گھٹنوں پر نظر آتے ہیں۔ تبسم صاحب نے "ماڈرن ماڈرن کے شعراء" کے تذکرے میں عطا کا ذکر بڑی محبت اور شفقت سے کیا ہے اور عطا کئی برسوں سے اس کوشش میں ہے کہ کسی طرح اس کتاب کے سارے نسخے غائب کر دے، مگر عطا! یہ نہ بھولو تبسم صاحب اس کا دوسرا ایڈیشن بھی چھپوا سکتے ہیں۔ عطا شروع شروع میں تیس روزہ "چاند" میں "بونگا ماڈل ٹاؤنی" کے نام سے شاعری کیا کرتا تھا۔ اب اُس نے یہ نام چھوڑ دیا ہے اور شیکسپیر کہہ چکا ہے کہ "نام میں کیا رکھا ہے!"

ایم اے او کالج میں عطا کو پروفیسر طفیل دارا کا شاگرد بننے کا فخر حاصل ہوا۔ آج کل وہ انہی کے شعبے میں بطور استاد اردو کام کر رہا ہے۔ شاگردی سے استادی تک کی اس منزل میں دارا صاحب قدم قدم پر اُس کے ساتھ رہے ہیں اور عبدالرشید تبسم کے بعد دارا صاحب اُس کی زندگی کی دوسری اہم شخصیت ہیں۔!

عطا نے کہیں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر ایک آیت نکالی ہے جس کا مفہوم کچھ اس طرح کا ہے کہ "عورتوں سے محبت کرو" شاعر آدمی ہے اس لئے اس نے اس جزو میں کل کی تلاش کا عمل شروع کر رکھا ہے اور جب میں کچھ کہتا ہوں تو برادرِ کلاں کا یہ شعر پڑھ کر مجھے خاموش کرا دیتا ہے۔

قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل
کھیل بچوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

سو یہ دیدۂ بینا امریکہ میں اُس کے بے حد کام آیا، میری سمجھ میں آج تک یہ راز نہیں آیا کہ اتنا شرمیلا آدمی خواتین سے کیا باتیں کرتا ہو گا۔ ویسے میرا اندازہ ہے وہ خواتین سے باتیں بہت کم کرتا ہے۔

بچوں کے بارے میں عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ اگر انہیں بازار سے سودا لانے کے لئے بھیجا جائے تو چاہے دو گھنٹے راستے میں کھڑے تماشا دیکھتے رہیں، گھر کی سیڑھیاں دوڑتے ہوئے اور پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ چڑھتے ہیں تاکہ سند رہے کہ بڑی محنت اور تگ و دو کے بعد آئے ہیں۔ عطا اس ٹرک (TRICK) سے نہ صرف اچھی طرح واقف ہے بلکہ اسے بروئے کار لانے میں بھی ید طولیٰ رکھتا ہے ـــــ خیالی آدمی ہے۔ خیریں اُس تک پہنچتے لگا کر پہنچ جاتی ہیں اور وہ انہیں پر لگا کر "روزن دیوار" "یا شاید" میں "بٹھا دیتا ہے ـــــ (اہل زبان نہ ہونے کا یہ بڑا نقصان ہے کہ آدمی پریا میں مہ کے چکر میں چکرا تا رہتا ہے)

عطا ایک اچھے مسلمان کی طرح آنکھیں بند کر کے ہر کسی پر بھروسا کر لیتا ہے۔ اُس کے اجتماعی لاشعور میں کشتیاں جلانے کا شوق ہے۔ یہ اور بات

ہے کہ ہر مرتبہ اسے تیر کر واپس آنا پڑتا ہے۔

FIRST SIGHT LOVE شوق سے مجھے یاد آیا کہ یوں تو عطا کو بے شمار شوق ہیں لیکن وہ جرات رندانہ رکھنے کے باوجود "شوق فضول" کا قائل نہیں چنانچہ

کے بجائے FIRST SIGHT LOVE MAKING پر اعتقاد رکھتا ہے اور احباب کو بھی اس کی تلقین کرتا رہتا ہے۔ البتہ آج کل اس نے ایک نیا شوق اختیار

کر رکھا ہے اور وہ ہے حادثے کرنے کا شوق۔ عطا اپنے ہر فارم کئے ہوئے ہر حادثے کا ذکر ایسے خوفناک طریقے سے کرتا ہے جیسے سچ مچ اسے دوسری زندگی

YOU ONLY LIVE TWICE ملی ہو۔ اس کی اس روز روز کی SUSPENSE سے تنگ آ کر ایک دن میں نے اسے آئن فلیمنگ اور جیمز بانڈ کی مشترکہ پیش کش

دکھائی اور بتایا کہ انگریزی لفظ TWICE کا مطلب صرف "دوبار" ہی ہوتا ہے اور جیمز بانڈ کو بھی یہ رعایت صرف اس لئے ملی ہے کہ وہ جیمز بانڈ ہے۔ وہ میری

بات سن کر ہنسا اور پھر کہنے لگا "یار یہ سنسر والے بڑی زیادتی کرتے ہیں۔ ایک ہی اچھا سین تھا وہ بھی کاٹا ہوا ہے۔"

اگلے دن وہ پھر لنگڑاتا ہوا میرے دفتر آیا اور بتایا کہ کیسے ایک کمبخت رکشے والا، ایک بدبخت ہونڈے والا اور ایک بدکردار ڈبل ڈیکر اومنی

بس والا مل کر جی پی او کے چوک میں خواہ مخواہ اس کے سکوٹر میں آ گھسے تھے۔ جب کہ نہیں پتہ ہونا چاہیئے تھا کہ اس کے سکوٹر کی بریکیں خراب ہیں جو اس نے

گزشتہ دو مہینوں سے ٹھیک نہیں کروائیں۔

ایک پرانا لطیفہ سنئے:

"اگر ایک بچہ سیڑھیوں سے گر پڑے تو اسے کیا کہیں گے؟"

"اتفاق"

"اگر دوبارہ انہی سیڑھیوں سے گرے، پھر کیا کہیں گے؟"

"حادثہ"

"اچھا اگر پھر سے انہی سیڑھیوں سے ——— تب؟"

"تب تو اسے عادت ہی کہا جا سکتا ہے"

تو پیارے عطا! دیگر اچھی عادتوں کی طرح اسے بھی ترک کرنے کی کوشش کرو کہ ابھی "قوم" کو تمہاری ضرورت ہے۔ یہ سچ ہے کہ محبت کی طرح تقدیر

بھی اندھی ہوتی ہے۔ مگر اتنی بھی نہیں ہوتی جتنا تم اسے سمجھ رہے ہو۔

"نوائے وقت" میں اس کا کالم "روزن دیوار سے" اتنا معروف اور مقبول ہے کہ اس کے سلسلے میں میں اس کے علاوہ کچھ نہیں کہنا چاہتا کہ

جب بھی اردو کالم نگاری کی تاریخ مرتب ہو گی عطا کا نام جلی حروف میں لکھا جائے گا۔

"شوق آوارگی" اس کا سفرنامہ ہے جو "فنون" میں قسط وار چھپ رہا ہے۔ مجھے یقین کامل ہے کہ اس کی یہ کتاب اردو سفرناموں میں ایک ایسا

اضافہ ہو گی جس کی گونج مدتوں سنائی دے گی۔ نمائشی اور معلوماتی سفرناموں کے ریگستان میں شفیق الرحمٰن، محمد خالد اختر، ابن انشاء، اشفاق احمد، محمد کاظم

مستنصر حسین تارڑ اور اب عطاء الحق قاسمی وہ پھول ہیں کہ بقول میر سوز ——— ارے رے رے رے! ارے رے رے رے بس ارے رے!

عطا کی تحریر اس کی گفتار کی نسبت بہت زیادہ شگفتہ ہے۔ اگرچہ وہ بڑا مجلسی، پُر مذاق، زندہ دل اور بجلے باز آدمی ہے مگر اس کے اصل

جوہر تحریر ہی میں کھلتے ہیں۔ اپنے زمانہ طالب علمی میں اس نے ایک تقریب کا حال بیان کرتے ہوئے لکھا تھا

"جلسہ گاہ میں بڑی رونق تھی۔ منتظمین بھاگ دوڑ میں مصروف تھے۔ صاحب صدر صوفی تبسم کا بے چینی سے انتظار ہو رہا تھا۔ اتنے میں ایک طرف سے

شور اٹھا "صوفی صاحب آ گئے۔ صوفی صاحب آ گئے"

صوفی صاحب اسٹیج پر تشریف لائے تو ان کے احترام کا یہ عالم تھا کہ کوئی ان کی طرف پشت نہیں کرتا تھا۔"

راوی کہتا ہے کہ صوفی صاحب اس کی یہ تحریر پڑھ کر چند لمحے سر اپنا کھجاتے رہے اور ناک اپنی مسلتے رہے اور پھر منہ پھیر کر گویا ہوئے "بڑا حرامی اے۔"

عطا لوگوں سے بہت جلد متاثر ہو جاتا ہے اور OUT OF THE WAY جا کر اپنے ممدوح کی تعریف کرتا ہے مگر اُس کے اندر کا سنسر اسے بہت جلد اعتدال پر لے آتا ہے۔ البتہ دوستوں کے سلسلے میں وہ اس سنسر کی ایک نہیں سنتا اور میرے نزدیک یہ بات خطرناک تو ہے، بُری نہیں ہے۔ اخبار سے تعلق کا عطا کو سب سے زیادہ فائدہ اُس کے سکوٹر کے حوالے سے ہوتا ہے۔ کیسی ہی زبردست ٹریفک ریڈ کیوں نہ ہو، پولیس والے اخبار کا نام سن کر اسے ایسے جانے دیتے ہیں جیسے ٹائم پوچھنے کے لئے روکا تھا۔ اور تو اور اُس کا چوری شدہ سکوٹر تک اُسے واپس مل گیا جو شاید پاکستانی سکوٹر چوری کی تاریخ میں اس نوعیت کا پہلا اور آخری واقعہ ہے۔

ویسے اس کا لبیرینا، آج تک اپنی اس حرکت پر شرمندہ ہے کیونکہ اُس کے بعد سے عطا نے مسلسل حادثے کر کر کے اُسے اتنا بدشکل کر دیا ہے کہ اب کوئی "فففی سی سی" بھی اسے منہ نہیں لگاتی۔

عطا نے ایک جگہ میری کتاب پر رائے دیتے ہوئے لکھا تھا کہ وہ میرا زبردست مداح ہے اور یہ مداحی ہم دونوں کو لے ڈوبے گی۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔

(حلقہ ارباب ذوق گجرات میں "عطاءالحق قاسمی کے ساتھ شام" کی تقریب میں پڑھا گیا)

عطاء الحق قاسمی — ایک تاثر

احمد ندیم قاسمی

عطاء الحق قاسمی کی اس خوبی یا خامی نے مجھے ہمیشہ بے حد متاثر کیا ہے کہ جب اسے کسی ایسے شخص کی طرف سے کوئی صدمہ پہنچتا ہے جسے وہ اپنے نہایت عزیز دوستوں میں شمار کرتا ہو، تو وہ کچھ یوں ٹوٹ کر اداس ہو جاتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے اب وہ اپنے آپ کو مشکل ہی سے سمیٹ پائے گا۔ اس اداسی کی شدت بالکل اس بچے کی اداسی کی سی ہوتی ہے جس کا عزیز ترین کھلونا ٹوٹ گیا ہو۔ اس حد تک اداس ہو جانے اور اتنی سچائی سے اداس ہو جانے کے لئے محبت کرنی پڑتی ہے۔ اپنی ذات کو کسی دوسری ذات میں دریافت کرنا پڑتا ہے۔ حقیقت پسند اور صداقت شعار بننا پڑتا ہے۔ مصلحتوں سے بے نیاز ہونا پڑتا ہے۔ ایسا شخص اگر کسی دوست کی طرف سے اپنے خلوص کی پامالی برداشت نہیں کر سکتا تو دراصل وہ سچائی کی بے حرمتی برداشت نہیں کر سکتا۔ اور جو سچائی کو باوقار دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ جھوٹ بولنے پر قادر ہی نہیں ہوتا — اور جو جھوٹ بولنے پر قادر نہیں ہوتا، وہ اگر سفرنامہ لکھنے پر آئے تو سفرنامہ نگاری کے اعلیٰ معیار قائم کرتا ہے۔

میں نے دیکھا ہے کہ عطاء الحق قاسمی کے سفرناموں میں، جو زندگی، توانائی، چہل پہل، شگفتگی اور چلبلاہٹ ہوتی ہے، وہی اس کی شخصیت کی خصوصیات بھی ہیں۔ اس کی شخصیت کا خاکہ لکھنے کے لئے اسے قریب سے جاننا کچھ ایسا ضروری نہیں ہے۔ اس کے سفرنامے پڑھ لیجئے۔ ان میں سے سفر کرنے والے کی جو شخصیت ابھرے گی وہی سچا اور کھرا عطاء الحق قاسمی ہو گا۔ اسی لئے تو میں نے عرض کیا تھا کہ عطا جھوٹ بولنے پر قدرت ہی نہیں رکھتا۔ میں مانتا ہوں کہ بعض معاشرتی اور اخلاقی پابندیوں کے جبر کے تحت ہم لکھنے والے بعض باتوں کو چھپا جاتے ہیں اور بعض کو استعاروں میں بیان کرتے ہیں اور تجرید تک پر اتر آتے ہیں۔ عطا بھی اس جبر کا شکار یقیناً ہوتا ہے مگر ایسی صورت میں اس کے الفاظ کے کنارے ان بادلوں کے کناروں کی طرح چمکنے لگتے ہیں جنہوں نے سورج کو چھپا رکھا ہوتا ہے۔ عطا کے سفرناموں کے بین السطور سچ چھپائے نہیں چھپتا۔ ایک بار غالب کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے ایک محترم ادیب نے غالب کے مزاج کی ایک ایسی خصوصیت کا ذکر کیا تھا جس کے بارے میں غالب کے سوانح نگاروں نے کبھی کوئی بات نہیں کی تھی۔ میں نے پوچھا آپ کو اس خصوصیت کا علم کیسے ہوا؟ کہنے لگے "یہ راز مجھے خود غالب کی شاعری نے بتایا ہے۔ بات یہ ہے کہ بڑا شاعر اپنے آپ سے کبھی جھوٹ نہیں بول سکتا۔ بولنے کی کوشش کرتا ہے تو پکڑا جاتا ہے۔ میں نے بھی غالب کو اس کی شاعری سے پکڑا ہے۔" بعینہٖ عطاء الحق قاسمی اگر اپنے معاشرت کے جبر کے تحت پڑھنے والے سے کچھ چھپانے کی کوشش کرتا بھی ہے تو پکڑا جاتا ہے۔ وہ تو شکر کیجئے کہ ہمارے بیشتر حکام نفاستِ ذوق سے محروم ہوتے ہیں ورنہ سفرنامہ نگاری کے دوران میں عطا ہمیں ایک سے زیادہ مرتبہ کٹہرے میں کھڑا نظر آتا۔

یہ جھوٹ سچ کی بحث میں نے اس لئے چھیڑی ہے کہ گذشتہ کچھ عرصہ سے ہمارے ادبی حلقوں میں ہمارے جدید سفرنامہ نگاروں کے خلاف ایک محاذ سا بن رہا ہے۔ یہ سفرنامے اتنے مقبول ہوتے ہیں اور اتنے شوق سے پڑھے جاتے ہیں کہ معترضین کے ہاں بعض دوسری اصناف ادب کے پس منظر میں چلے جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر صنف ادب کا ایک اپنا منفرد کردار ہوتا ہے۔ جب تک وہ اس کردار کو خوبصورتی سے نبھاتی ہے، کسی دوسری صنف ادب سے اسے کوئی خطرہ پیدا نہیں ہو سکتا، البتہ اگر وہ کسی اور صنف ادب سے دبتی نظر آتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس صنف کو تخلیق کرنے والے کمزور پڑ گئے ہیں۔ ہر صنف ادب دوسری اصناف ادب کے اشتراک و تعاون سے آگے بڑھتی ہے چنانچہ لڑائی اصناف ادب

میں نہیں ہوتی۔ ادیبوں میں ہوتی ہے اور وہ بھی ایسے ادیبوں میں، جو ٹھہرے ہوتے ہیں اور خود اعتمادی سے محروم ہوتے ہیں۔ بعض ایسے ادیبوں نے اس طرح کی زبانی و تحریری افواہیں گرم کرنا شروع کر رکھا ہے کہ یہ جدید سفرنامہ نگار جھوٹ بہت بولتے ہیں۔ یعنی وہ زیب داستان کے لئے بہت کچھ بڑھا دیتے ہیں اور اپنے سفری اور جذباتی اور جنسی کارنامے بیان کرتے ہوئے مبالغہ آرائی کے شکار ہو جاتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس طرح کا اعتراض خود معترضین کے ہاں خود اعتمادی کی قلت کا اظہار ہوتا ہے ــــ اور اس جلن کا بھی کہ ان اہل قلم کو ایسے مواقع کیوں میسر آئے اور وہ زندگی کی اتنی بہت سی پرتوں اور ان کی لذتوں سے کیوں شاد کام ہوئے۔

عطاء الحق قاسمی کے سفرناموں کا مطالعہ کرتے ہوئے مجھے کئی مقامات پر یہ سوچ کر رکنا پڑا کہ اگر عطا کی جگہ کوئی اور ہوتا تو ان واقعات کو گول کر جاتا جنھیں عطا اتنی سچائی سے بیان کر رہا ہے۔ مگر عطا تو اپنی کمزوریوں کا اعتراف بھی بہت دھڑلے سے کرتا ہے اور یہ آسان کام نہیں ہے۔ اپنی کمزوری کے اعتراف کے لئے بے پناہ حوصلے اور خود اعتمادی کی ضرورت ہوتی ہے۔ عطا کے سفرنامے اسی لئے تو اتنے دلآویز ہیں کہ وہ بنتا کہیں نہیں ہے۔ وہ اتراتا کہیں نہیں ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک آئینہ ضرور ہے مگر وہ پڑھنے والے کو اس آئینے میں محض اپنا چہرہ نہیں دکھاتا، زندگی کی رنگا رنگیاں اور بوقلمونیاں دکھاتا ہے۔ اس کی اپنی ذات ان سفرناموں میں صرف اس حد تک دخل رکھتی ہے کہ وہی تو سفر کر رہا ہے اور وہی تو وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے جو ہمیں دکھا رہا ہے۔ اس سے زیادہ عطا آپ کو اپنے سفرناموں میں کہیں نہیں ملے گا۔ وہ آپ پر کہیں بھی مسلط نہیں ہوتا۔ بس زیادہ سے زیادہ یہ کرتا ہے کہ آپ کا ہاتھ محبت کی گرمی سے تپتے ہوئے ہاتھ میں لے کر آپ کو اپنا شریک سفر بنا لیتا ہے۔

عطاء الحق قاسمی کے سفرناموں میں کئی ایسے مقامات بھی آتے ہیں۔ جہاں سے اگر اس کے معترضین کو گزرنے کی سعادت نصیب ہوتی تو خوب کھل کھیلتے اور محض اپنی انا کی تسکین کے لئے ایسی ایسی جزئیات و تفاصیل بیان کرنے میں لگ جاتے کہ سفرنامہ ختم ہو جاتا اور نچلے درجے کے جذبات کی گتھیاں شروع ہو جاتیں۔ مگر عطا ایک آسودہ خاطر نوجوان ہے۔ ابھی چند روز پہلے میں اس کا ایک سفرنامہ پڑھ رہا تھا جس میں اس نے ایک لڑکی کے ساتھ اپنے قرب کا ذکر کرتے ہوئے بس اتنی سی بات کہنے پر اکتفا کی تھی کہ پھر ہم دونوں خاصی دیر تک صرف ناک کے رستے سانس لیتے رہے۔ یہ ایسا مقام ہے جہاں عطا کی جگہ کوئی دوسرے صاحب ہوتے تو نہ جانے ان کے کون کون سے کمپلکس اپنی ساری گرہیں کھول کر کودنے لگتے۔ اور سفرنامے کے بہانے جنس کے مسئلے پر ایک تھیسس مرتب ہونے لگتا۔

میری نظر میں جدید سفرنامہ نگاری میں اولیت کا سہرا محمد خالد اختر کے سر بندھتا ہے۔ جس نے بہت عرصہ پہلے سندھ کے تھرپارکر کے بارے میں ایک سفرنامہ "ڈیپلو سے نوکوٹ تک" کے عنوان سے لکھا تھا اور بعد میں سوات اور کاغان سے متعلق ایسے سچے اور دل نشیں سفرنامے لکھے کہ اردو کی اس نئی صنف ادب کا حلق تر ہوتا معلوم ہوا۔ پھر اختر ریاض الدین اور کرنل محمد خان کی سفرنامہ نگاری نے میری اس رجائیت کو سہارا دیا کہ جس طرح اردو میں مختصر افسانہ نگاری کا فن اس وقت رائج ہوا جب یورپ میں یہ فن نقطۂ کمال کو چھو رہا تھا مگر اردو افسانہ نگاری یورپی اساتذہ کے شہکاروں سے بھی کہیں آگے نکل گئی۔ بعینہ ہمارے ہاں سفرنامہ نگاری بھی افسانہ نگاری کے نقش قدم پر چل کر ان ترقی یافتہ معیاروں کی طرف بڑھ رہی ہے جو یورپی سفرنامہ نگاروں نے قائم کر رکھے ہیں۔ عطاء الحق قاسمی، مستنصر حسین تارڑ اور محمد کاظم کے سفرناموں نے اس صورت حال کو مزید امید افزا بنایا ہے۔ تارڑ کے سفرنامے تو مجموعوں کی صورت میں چھپ چکے ہیں اور بعض چھپ رہے ہیں۔ مگر ساتھ ہی جب عطا اور کاظم کے سفرنامے بھی کتابی صورت میں اشاعت پذیر ہو گئے تو اردو میں سفرنامے کی صنف کی آسودگی اور ہمہ رنگی مسلمہ حیثیت اختیار کر جائے گی۔

اس صنف ادب میں عطا کا انفرادی کنٹری بیوشن یہ ہے کہ وہ سفرنامے یوں لکھتا ہے جیسے اپنے قریبی دوستوں سے گفتگو کر رہا ہے، کوئی تکلف نہیں، کوئی پردہ نہیں، کوئی ہچکچاہٹ نہیں۔ وہ جس طرح عام بات چیت میں پھلجھڑیاں چھوڑتا ہے، اسی طرح اس کے سفرناموں میں بھی مہتابیاں چھوٹتی ہیں اور انار ٹوٹتے ہیں۔ اس کے سفرنامے کے کسی بھی حصے میں اکتاہٹ پیدا کرنے کی گنجائش ہی نہیں ہوتی کیونکہ نہ وہ ملکوں کے جغرافیے بیان کرتا

ہے اور نہ وہاں کے قابلِ دید مقامات کی کھڑکیوں اور دریچوں کے اعداد و شمار بتاتا ہے۔ اس کا واسطہ تو ان ملکوں کے انسانوں سے، ان کے معیاروں سے، ان کی ننھی منی خوشیوں اور ذرا ذرا سے دکھوں سے ہے۔ عطا ان ملکوں کے انسانوں کی نفسیات کا سیاح ہے اور پھر قدرت نے اسے ایسا "کاسموپولیٹن" قسم کا مزاج بخشا ہے کہ میں اپنے ہی ایک شعر میں ایک آدھ تبدیلی کے بعد عطا کے بارے میں کہوں گا:

وہ اعتماد ہے اس کو سرشتِ انساں پر
کسی بھی شہر میں جائے غریب شہر نہیں

یہ جو کرۂ ارض کے ہر انسان کے ساتھ اس کو اپنائیت کا جذبہ ہے، یہ اس کے سفرناموں کی نہایت لطیف اور بے مثال خصوصیت ہے۔ ساتھ ہی زبان و بیان کی باریکیوں اور نفاستوں پر اسے حیرت انگیز عبور حاصل ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کے ہاں جو سلاست کی بلاغت ہے، وہ اسی کا حصہ ہے۔

عطاء الحق قاسمی کے نام اور میرے نام میں "قاسمی" کا لفظ مشترک ہے چنانچہ لوگ ہمیں ایک ہی خاندان کے افراد سمجھتے ہیں۔ میں ان کی تردید نہیں کرنا چاہتا۔ واقعی ہم ایک ہی خاندان کے افراد ہیں مگر یہ وضاحت ضروری ہے کہ یہ پاکستان سے محبت کرنے والوں اور انسان کا احترام کرنے والوں کا خاندان ہے، یہ حق کا پرچار کرنے والوں اور منافقت کے پردے چاک کرنے والوں کا خاندان ہے اور اس خاندان میں خون کے رشتوں کی بجائے روحوں اور ضمیروں کے رشتے قائم ہیں اور اس دور میں متعدد نوجوان اہلِ قلم ایسے ہیں جو اسی خاندان کے افراد ہیں۔ میں خوش ہوں کہ وہ عطا اس خاندان کا نمایاں فرد ہے جو اپنی تحریر اور اپنے مزاج، دونوں میں خلوص و محبت کا، حق و صداقت کا، بے خوفی و بیباکی کا، شگفتگی و رعنائی کا پیتلا ہے اور جس کے لئے اردو سفرنامہ نگاری کا مستقبل اپنے بازو مشرق و مغرب کی وسعتوں پھیلائے کھڑا ہے۔

شوقِ آوارگی — (۸)

بابے دی ھائیم (میونخ)

عطاء الحق قاسمی

میونخ ریلوے اسٹیشن پر اترتے ہی میں نے حسب معمول ٹوٹی ہوئی مُٹھ والے اٹیچی کیس کو بائیں کاندھے پر رکھا کہ گناہوں کی رپورٹنگ کرنے والے فرشتے سے حساب چکانے کا یہی ایک طریقہ تھا۔ بیگ گلے میں لٹکایا اور دائیں ہاتھ سے دوسرا اٹیچی اٹھانے ہی کو تھا کہ مُٹھ میرے ہاتھ میں رہ گئی اور اٹیچی زمین پر جا گرا۔ ثابت ہوا کہ دوسری اٹیچی کی مٹھ بھی ٹوٹ گئی ہے۔ یک نہ شد دو شد۔ یہ اٹیچی میں نے دائیں کاندھے پر رکھا، جہاں نیکیاں نوٹ کرنے کے لئے ایک فرشتہ مامور ہے اور چونکہ عرصہ دراز سے کوئی نیکی سرزد ہونے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ لہٰذا اس سرپلس (SURPLUS) فرشتے کو بھی زحمت دینے میں کوئی حرج نہ تھا۔ اب میرے دونوں کاندھوں پر ایک ایک اٹیچی کیس تھا اور بیگ گلے میں، جو دائیں بائیں اٹیچی کیس ہونے کی وجہ سے اپنے پورے وزن سمیت گردن کے پیچھے پشت کی جانب لڑھک گیا تھا اور اس کی ڈوری میرے حلق کے گرد پیوست ہو گئی تھی۔ یوں میں مجبور تھا کہ گردن اکڑا کر اور سینہ تان کر چلوں لیکن اس "تمکنت" کا پردہ میری آنکھیں چاک کر رہی تھیں، جو ڈوری سے گلا گھونٹے جانے کے سبب باہر کو نکل رہی تھیں۔ بہر حال میں چند قدم چلنے کے بعد سانس لینے کے لئے رکتا اور پھر یہ صلیبیں اٹھائے چل پڑتا، حتیٰ کہ پلیٹ فارم سے نکل کر ٹرام کی پٹڑی کراس کر کے افتاں و خیزاں سٹیشن کے قریب ایک ہوٹل کے لاؤنج میں داخل ہو گیا۔ اس کا نام FELD HUTTER تھا اور آثار بتاتے تھے کہ خاصا ٹھیک ٹھاک ہوٹل ہے اور اس کی تصدیق بھی ہوئی کیونکہ ایک دن کا کرایہ پچیس مارک تھا۔ تاہم مجھے یہ "وارا" کھاتا تھا کیونکہ میرا اصول سفر یہ ہے کہ میں دوران سفر کچھ دن بچت کرتا ہوں اور پھر ایک دن ساری کسریں نکال دیتا ہوں۔ باوردی پورٹر نے میرا سامان اٹھایا (کس طرح اٹھایا؟ اب یہ اس کا مسئلہ تھا) اور پانچویں فلور پر آ گیا۔ پھر اس نے کمرے کا دروازہ کھولا اور سامان ایک کونے میں رکھ کر پسینہ پونچھنے کے لئے رومال جیب سے نکالنے لگا۔ میں نے جھٹ سے جیب میں ہاتھ ڈالا اور پیشتر اس کے کہ اس مزدور کا پسینہ خشک ہو، کچھ رقم اس کی ہتھیلی پر رکھ دی۔ اس نے سر کی جنبش سے شکریہ ادا کیا اور ہولے سے دروازہ بند کر کے باہر نکل گیا۔

میرا کمرہ سڑک کی جانب واقع تھا۔ میں نے کھڑکی کھول دی اور اس کے ساتھ ہی اگست کی نم آلود ہواؤں نے مجھے خوش آمدید کہا۔ آسمان پر کالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں اور لگتا تھا کہ بارش ہونے کو ہے۔ میں نے کھڑکی کے قریب پہنچ کر پانچویں فلور سے نیچے سڑک پر نگاہ ڈالی تو تیز ٹریفک رواں دواں تھا۔ فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے انسان اتنے ہی چھوٹے دکھائی دے رہے تھے جتنے بلندیوں پر کھڑے لوگوں کو دکھائی دیتے ہیں۔ میں چند لمحے پوری محویت کے ساتھ یہ منظر دیکھتا رہا اور پھر کپڑے تبدیل کر کے بڑے سلیقے سے سجے ہوئے اس کمرے کے آرام دہ بستر پر دراز ہو گیا۔ میرا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا تاہم چند لمحوں میں اپنے ہی ہاتھوں سے "اپنی مٹھی چاپی" کرنے کے نتیجے میں، میں نے خاصا ریلیف محسوس کیا۔ میرے لئے یہ امر اطمینان بخش تھا کہ میں اس اجنبی شہر میں بالکل اجنبی نہیں ہوں بلکہ پرویز اور مسعود جو ماڈل ٹاؤن میں میرے ہمسائے تھے، گذشتہ کئی برس سے یہاں مقیم ہیں۔ میں اسٹیشن سے اتر کر ان کی طرف اس لئے نہیں گیا تھا کہ جانتا تھا وہ پہلے ہی سے گوناگوں مشکلات خصوصاً رہائشی مسئلے سے دوچار ہیں اور میں نہیں چاہتا تھا کہ میری وجہ سے ان کی مشکلات میں مزید اضافہ ہو۔

پرویز اور مسعود اگرچہ آپس میں گہرے دوست تھے لیکن ان کے طبائع میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ پرویز انتہائی مخلص، سخت جان

اور دوستوں کی خاطر جان قربان کرنے والا شخص تھا۔ وہ سب کے دکھ درد میں شریک ہوتا تھا اور اپنا درد کسی کو نہیں بتاتا تھا۔ وہ اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کی ماں بچپن ہی میں فوت ہوگئی تھی اور اس کے فوراً بعد اس کے لکھ پتی باپ نے دوسری شادی کرلی اور پھر وہ جوان بیوی کے نازنخرے اٹھانے میں مشغول ہوگیا اور پرویز کو یکسر فراموش کردیا۔ دوسری بیوی سے جب اولاد ہوئی تو سوتیلی ماں نے باپ اور بیٹے کے درمیان دیوار مزید اونچی کردیں تاکہ تمام جائداد کی مالک تنہا اس کی اولاد بن سکے۔ اس کی یہ سکیم اس حد تک کامیاب ہوئی کہ ایک دن پرویز کو گھر سے نکال دیا گیا۔ اس وقت اس کا ایف اے کا داخلہ جانے والا تھا تاہم اس نے ہمت نہ ہاری اور کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی بجائے کوکا کولا کے ایک ایجنسی ہولڈر کے ہاں ملازمت کرلی اور اب وہ ریڑھے پر بیٹھ کر بوتلوں کے کریٹ دوکانداروں میں تقسیم کرنے کے لئے نکلتا تھا۔ وہ ریڑھا خود چلاتا تھا۔ کبھی کبھار اس کا گذر اپنے باپ کی عظیم الشان کوٹھی کے سامنے سے بھی ہوتا۔ یہ صورت حال اس کے باپ کے لئے بظاہر خاصی تکلیف دہ تھی لیکن انسان ایک بار عورت کے سحر میں آجائے تو وہ ناقابل یقین حد تک بے غیرت ہوجاتا ہے۔ اس دوران در در کی ٹھوکریں کھاتے ہوئے اس کے خیالات میں بڑی بنیادی تبدیلی آگئی تھی۔ وہ اپنے ساتھ گذرنے والے اس المیے کا ذمہ دار دولت کو سمجھنے لگا تھا اور اس کے باعث رفتہ رفتہ وہ ٹریڈ یونین سرگرمیوں میں بھی حصہ لینے لگا۔ مگر کچھ عرصہ بعد وہ اپنے ساتھیوں کی بے عملیوں سے دل برداشتہ ہوگیا اور اس نے ان سے کنارہ کشی کرلی تاہم اس علیحدگی کے باوجود اس کے خیالات میں کوئی تبدیلی نہ آئی تھی۔

مسعود کا معاملہ بھی پرویز سے قدرے ملتا جلتا تھا۔ وہ ایک امیر باپ کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا۔ ابھی وہ سات آٹھ برس کا تھا کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ بڑے بھائیوں نے شادیاں کرلیں بچے پیدا کئے اور اپنے اپنے کاروبار میں مست ہوگئے۔ کچھ عرصہ بعد ماں بھی فوت ہوگئی جو اس کی واحد غم خوار تھی۔ اب وہ بہن بھائیوں کے ہوتے ہوئے بھی بے سہارا رہ گیا۔ اسے اپنی تعلیم بالکل آغاز ہی میں چھوڑنا پڑی اور وہ کاروبار کی طرف متوجہ ہوگیا۔ اس نے کئی کام شروع کئے لیکن کم عمری، ناتجربہ کاری اور رہنمائی کے فقدان کے باعث ہر بار نقصان اٹھایا۔ اب وہ COMPLEXES کا مجموعہ بن گیا تھا۔ وہ خود کو خاندان کے دیگر افراد کے مقابلے میں کمتر محسوس کرتا تھا اور اس احساس کو دبانے کے لئے اپنی برتری ظاہر کرنے میں لگا رہتا تھا۔ اس کا ایک کمپلکس تعلیم بھی تھا چنانچہ وہ کچھ بھی نہ جاننے کے باوجود ہر چیز کے جاننے کا دعویٰ کرتا تھا جس سے متعدد بار طرفین کے لئے مضحکہ خیز صورت حال پیدا ہوجاتی۔ پرویز اور مسعود کے خاندانی حالات اور پس منظر میں مشابہت کے باوجود ان کا ردعمل دونوں پر جدا جدا تھا ـــــ مسعود اپنے خاندان کے دیگر افراد کے سٹیٹس تک پہنچنے کے لئے پیسے کے جنون میں مبتلا ہوگیا تھا اور اب وہ ہمہ وقت اسے جمع کرنے کی فکر میں رہتا تھا جبکہ پرویز کو اس صورت حال نے انتہائی دردمند بنا دیا تھا۔ پھر ایک روز نجانے کیا ہوا کہ ان دونوں نے سامان باندھا اور اجنبی عزیزوں سے دور مغربی جرمنی پہنچ گئے۔ اب یہاں پرویز ایک روسی کھانوں کے ریستوران "ڈاشر" میں باورچی کے عہدے پر تعینات تھا اور مسعود سامان سے بھرے ہوئے ٹرک "ان لوڈ" (UNLOAD) کرتا تھا۔

میں نے سرہانے پڑے ٹیلیفون کو مزید قریب کیا اور پرویز کو اپنی آمد کی اطلاع دینے کے لئے ڈاشر کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف کوئی جرمن تھا اور اپنی قومی روایت کے عین مطابق انگریزی جاننے سے صاف انکاری تھا۔ بہرحال اس نے "پرویز" کا لفظ سن کر میرا مدعا جان لیا اور چند لمحوں بعد مجھے پرویز کی محبت بھری آواز سنائی دی۔

"آپ کب آئے؟" وہ اگرچہ مجھ سے خاصا بے تکلف تھا مگر عمر میں چھوٹا ہونے اور اپنی طبعی شرافت کی وجہ سے ہمیشہ "آپ" کہہ کر مخاطب ہوتا تھا۔

"کوئی ایک گھنٹے پہلے پہنچا ہوں۔ تم سناؤ کیسے حال ہیں؟"

"بالکل ٹھیک ہوں۔" اس نے افسردہ لہجے میں رسمی جواب دیا۔

"مسعود کی کھوکھ رخارش کا کیا حال ہے؟" میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"ابھی تک ویسی کی ویسی ہی ہے۔ وہ اس کے لئے کبھی نیم کے پتے گھوٹ کر پیتا ہے اور کبھی کچھ اور کرتا ہے مگر ڈاکٹر کے پاس نہیں جاتا۔ وہ پہلے سے زیادہ کنجوس ہوگیا ہے۔

"کیا وہ اب بھی تم سب کو خارش میں مبتلا دیکھنے کے لئے بہانے بہانے اپنا ہاتھ تمہارے بازو اور گردن پر پھیرتا ہے؟" میں نے اس کی دیرینہ عادت کے بارے میں تازہ ترین صورت حال جاننے کے لئے پوچھا۔

"ہاں! وہ ابھی تک باز نہیں آیا۔ کئی دفعہ اشاروں، کنایوں میں اسے سمجھا چکے ہیں، صاف کہتے ہوئے لحاظ آتا ہے، مگر وہ سمجھتا ہی نہیں ہے۔" پرویز نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ویسے آپ کہاں سے بول رہے ہیں؟"

"میں سٹیشن کے قریب FELD HUTTER میں مقیم ہوں اور اس وقت اپنے کمرے ہی سے بول رہا ہوں۔"

"آپ ہوٹل میں کیوں ٹھہرے ہیں؟" اس نے پرخلوص لہجے میں شکایت کی۔ "مجھے آپ کی اس حرکت سے دکھ ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ مجھے اپنا نہیں سمجھتے۔"

"ارے نہیں یار۔ میں تمہیں بیگانہ کیسے سمجھ سکتا ہوں، میں نہیں چاہتا تھا کہ تم لوگوں کی مشکلات میں مزید اضافہ کروں۔"

"خیر ملاقات ہونے پر آپ سے نبٹ لوں گا۔ یہ بتائیں مل کب رہے ہیں؟"

"میں تو فارغ بیٹھا ہوں، جب کہو آ جاؤں گا۔"

"آپ کو یہاں پہنچنے میں دشواری ہوگی، میں مسعود کو پیغام بھیجتا ہوں کہ وہ آپ کو آکر لے جائے، میں اس وقت بہت بری طرح پھنسا ہوا ہوں ورنہ خود آتا۔"

"تم کتنے بجے فارغ ہو جاؤ گے؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے ابھی تین چار گھنٹے لگیں گے۔"

"ٹھیک ہے تم مسعود کو بھیج دو۔ مجھے کچھ کام بھی کرنے ہیں، اس کے بعد ہم تمہارے پاس پہنچ جائیں گے۔"

میں نے فون بند کر دیا۔ بستر سے اٹھ کر اٹیچی کیس میں سے گندے کپڑے نکالے اور دھونے کے لئے غسل خانے میں چلا گیا۔ سگھڑ بیویوں کی طرح یہ کام انجام دے کر میں ایک بار پھر کھڑکی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ کالی گھٹا نے بارش کی شکل اختیار کر لی تھی اور سڑک پر لوگ چھتریاں لئے تیز تیز قدم چلتے اپنی منزل مقصود تک پہنچنے کی کوشش میں تھے۔ دور تک پھیلی ہوئی بلند و بالا جدید عمارتیں دھل کر اور نکھر گئی تھیں۔ اتنے میں بغیر "ناک" (KNOCK) کئے کسی نے دروازہ کھولا اور میرے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ یہ مسعود تھا۔ اس نے برساتی پہنی ہوئی تھی اور ہاتھ میں بند چھتری تھی جس میں سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ وہ ہاتھ کے بڑھے ہوئے ناخنوں سے گردن کھجلا رہا تھا۔ پھر اس نے چھتری ایک کونے میں رکھی اور مجھ سے لپٹ گیا۔

"مارے گئے ——— کھرک!" میں نے سوچا۔ مجھے اگرچہ ایک عرصہ بعد اسے مل کر بہت خوشی ہوئی تھی۔ مگر یہ کھرک (خارش) کا خوف میرے ذہن سے زائل نہیں ہوا تھا۔ دراصل میں نے ماڈل ٹاؤن میں اسے اپنے ملازم سے جانوروں کے ساتھ بہت بے دردانہ طور پر جسم کھجاتے کئی بار دیکھا تھا۔

اب وہ کرسی گھسیٹ کر میرے سامنے بیٹھ گیا تھا اور ماضی کی یادیں دہرا رہا تھا۔ پھر اس نے میرے قیام امریکہ کے بارے میں پوچھنا شروع کر دیا۔ "وہاں تمہارا وقت کیسا گذرا؟"

"بہت اچھا!" میں نے جواب دیا۔

"پھر واپس کیوں آگئے ——— یہاں ہم لوگ تو امریکہ جانے کے لئے ترستے ہیں۔"

"اگر ہو سکے تو ضرور جاؤ۔ تمہاری تمام خواہشیں وہاں پوری ہو جائیں گی۔"

"لیکن تم کیوں چلے آئے؟"

"میں اس دنیا کے ایک ایک کونے کو بوسہ دینا چاہتا ہوں لیکن میری سجدہ گاہ میرا وطن ہے۔ ان دو برسوں میں میری جبیں سجدوں کے لئے ترس گئی ہے۔"

"تم نے یہ بات کہہ کر دل خوش کر دیا ہے۔ اس پر تمہارا بوسہ لینے کو جی چاہتا ہے۔" یہ کہہ کر وہ اٹھا اور میری طرف بڑھا۔

کھڑکی" اس خیال سے میرے رونگٹے ایک بار پھر کھڑے ہو گئے۔ "بس تم سمجھو کہ میں نے تمہارا بوسہ وصول کر لیا۔" میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے واپس کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا اور وہ ہنستے ہوئے خلافِ توقع واپس کرسی پر بیٹھ گیا۔

"اب کیا پروگرام ہے؟" مسعود نے کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے پوچھا۔

بارش تھم گئی تھی اور اب قدرے حبس محسوس ہو رہا تھا۔

"مجھے دو کام کرنے ہیں، ایک تو اٹیچی کیس مرمت کرانے ہیں اور دوسرے پرسوں کے لئے استنبول کا ٹکٹ خریدنا ہے۔ اس کے بعد پرویز کی طرف چلیں گے۔"

"ویسے پرویز کا سناؤ، یہاں آ کر اس میں کوئی نئی تبدیلی تو نہیں آئی؟"

"بس ایک ہی تبدیلی آئی ہے اور وہ یہ کہ بے حساب پینے لگ گیا ہے۔ بیئر پیئے کہ بن پیئے وہ افسردہ افسردہ سا نظر آتا ہے اور پینے کے بعد وہ اتنا کھلنڈرا بن جاتا ہے کہ ایک مختلف انسان نظر آتا ہے ——— رہا معاملہ اٹیچی مرمت کرانے کا تو یہ خیال دل سے نکال دو کیوں کہ اتنے پیسوں میں تم نئے اٹیچی خرید سکتے ہو۔ اور ٹکٹ ابھی جا کر بنوا لیتے ہیں۔"

"چلو۔" میں نے کہا اور پھر ہم اٹھ کر سڑک پر آ گئے۔

ٹکٹ بنوانے کے بعد ہم اسٹیشن کے تہہ خانے میں واقع ایک ہال نما ریستوراں میں چلے گئے۔ اس تہہ خانے میں کئی ریستوراں ہیں اور یہاں سے "ایس بان" (زیرِ زمین ٹرین) بھی چلتی ہے۔ یہاں سیلف سروس تھی۔ میں نے اور مسعود نے لائن میں لگ کر روسٹڈ چکن ٹرے میں رکھے۔ کاؤنٹر کلرک کو اپنے اور میرے چکن کی ادائیگی کرتے ہوئے مسعود نے پوچھا کہ "تمہارے پاس کچھ ٹوٹے ہوئے پیسے ہیں؟ مجھے مارک بھنوانا پڑے گا۔" اور میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر چینج ہتھیلی پر پھیلا دیا جو تقریباً میری مرغی کی قیمت کے برابر تھا۔ یہاں اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ امریکہ کی طرح یورپ میں بھی چکن غریبوں کی غذا ہے جبکہ بقول اشفاق احمد ہمارے ہاں امیر آدمی مرغی اس وقت کھاتا ہے جب وہ بیمار پڑتا ہے اور غریب آدمی مرغی اس وقت کھاتا ہے جب مرغی بیمار پڑتی ہے اور غالباً یہ غرباء و مساکین ہی کا ریستوراں تھا کیونکہ یہاں ہر کسی کے ایک ہاتھ میں مرغی اور دوسرے میں بیئر کا گلاس تھا۔ یہاں بے پناہ رش تھا اور بیٹھنے کا کوئی انتظام نہیں تھا چنانچہ لوگ شانے سے شانہ ملائے کھڑے تھے اور خورد و نوش میں مشغول تھے۔ یہاں شائستگی مفقود تھی۔ لوگ مرغی کو اس طرح "چک" مارتے تھے جس طرح انگریزی فلموں میں سفاک بادشاہوں کو دکھایا جاتا ہے۔ ایک ادھیڑ عمر جرمن مجھ سے کچھ فاصلے پر کھڑا متواتر مجھے گھورنے میں مشغول تھا۔ پہلے میں سمجھا کہ مجھے محض شبہ ہوا ہے لیکن جب میں نے شعوری طور پر نوٹ کیا تو پتہ چلا کہ وہ بغیر پلک جھپکائے مجھے دیکھے چلا جا رہا ہے۔ میں نے مسعود کو ٹھوکا دیا اور صورتِ حال سے مطلع کیا تو اس نے کہا "برداشت کرو، اس کی طرف توجہ دیئے بغیر جلدی سے کھانا ختم کرو اور یہاں سے نکل چلو۔"

"مگر معاملہ کیا ہے؟"

"معاملے کو چھوڑو، اگر تم نے اسے مسکرا کر دیکھ لیا تو وہ ادھر چلا آئے گا اور پھر جان نہیں چھوڑے گا۔"

"مگر کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"بس اپنا اپنا شوق ہے۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "یہاں پاکستانی نوجوانوں کو جب شروع شروع میں نوکری نہیں ملتی تو ان میں سے بعض ایسے بزرگوں ہی کی خدمت کر کے اپنا اور ان کا پیٹ بھرتے ہیں اور یہ بزرگ جرمنی کے دوسرے شہروں کی نسبت میونخ میں زیادہ کثیر تعداد میں پائے جاتے ہیں۔"

کاغذ کے نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے باہر نکلے تو میں نے مسعود سے پوچھا "تو پھر کیا خیال ہے، اٹیچی کیس نئے خرید لئے جائیں؟"

"میری مانو تو کسی نہ کسی طرح کام چلا لو میں تمہیں مضبوط ڈوری کی مٹھ بنا دوں گا جو پاکستان تک نہیں ٹوٹے گی۔"

"مشکل ہے" میں نے اس کی تجویز رد کرتے ہوئے کہا "مجھے کسی دکان پر لے چلو۔"

"یہاں ایک ڈیپارٹمنٹل سٹور ہے جہاں سب کچھ مل جاتا ہے، وہیں چلتے ہیں۔"

"کتنی دور ہے؟" میں تھکا ہوا تھا اور مزید تھکن کا شکار نہیں ہونا چاہتا تھا۔

"بس قریب ہی ہے۔" اس نے کہا۔

"تمہیں پتہ بھی ہے وہ کہاں واقع ہے؟" میں نے پوچھا کیونکہ مسعود نے ساری عمر لاہور میں بسر کی تھی اور وہ ابھی تک لاہور کے راستوں سے بھی بے خبر تھا۔

"کیوں نہیں کیوں نہیں۔" اس نے بڑے وثوق سے گردن ہلائی جس پر مجھے شبہ ہوا کہ وہ رستہ نہیں جانتا کیونکہ جس چیز کے بارے میں وہ نہ جانتا ہو وہ اتنے زور سے گردن ہلانے کا عادی تھا کہ بسا اوقات منکا ٹوٹنے کا خطرہ پیدا ہو جاتا تھا۔

"یار کیسی باتیں کرتے ہو۔ تم مجھے بالکل ہی چغد سمجھتے ہو۔" اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور سڑک پار کر کے دوسری سمت آ گیا اور پھر ہم نے چلنا شروع کر دیا۔ چلتے چلتے میری ٹانگیں جواب دے گئیں تو اسے کہا کہ اگر دوکان دور ہے تو ٹیکسی، بس یا ٹرام پر بیٹھ جاتے ہیں اور اگر تمہیں رستے کا علم نہیں ہے تو کسی سے پوچھنے میں کوئی حرج نہیں۔ اس پر وہ باول نخواستہ ایک جرمن نوجوان کی طرف بڑھا اور بتے "پلیز" کہ کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ راہگیر چند ثانیے منتظر رہا کہ وہ آگے سے کچھ کہے مگر جب اسے خاموش پایا تو حیران نظروں سے دیکھتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

"کیا تمہیں جرمن نہیں آتی؟" میں نے مسعود سے پوچھا۔

"مجھے تو آتی ہے۔ اسے نہیں آتی۔" مسعود نے سنجیدگی سے کہا اور اس پر میری ہنسی چھوٹ گئی۔

چلتے چلتے مسعود اچانک دائیں جانب پر واقع ایک دکان میں داخل ہو گیا۔ اس پر میں بھی اس کے پیچھے چل پڑا۔ میں سمجھا کہ شاید یہاں سے اچھی کیس دستیاب ہیں مگر یہ سیکس شاپ تھی۔ کاؤنٹر پر ایک لڑکی کھڑی تھی، یہاں ننگی تصویریں، بلیو فلمیں، عورتوں اور مردوں کے مصنوعی اعضاء، قوت باہ کی گولیاں، ٹیکے اور خدا جانے کیا کچھ تھا۔ ایک طرف چھوٹے چھوٹے کیبن بنے ہوئے تھے جن میں بلیو فلمیں دکھانے کی مشینیں نصب تھیں۔ ان میں سکہ ڈالا جاتا ہے جس پر فلم شروع ہو جاتی ہے مگر یہ اسی طرح دکھی جاتی ہے جس طرح ہم سب بچپن میں بارہ من کی دھوبن اور تاج محل دیکھا کرتے تھے۔ یہاں ایک "جدت" انھوں نے یہ بھی پیدا کی ہے کہ دو منٹ کے بعد فلم عین اس مقام پر آ کر رک جاتی ہے جسے نازک مقام ہی کہا جا سکتا ہے۔ اگلا سین دیکھنے کے لئے ایک سکہ اور ڈالنا پڑتا ہے، تھوڑی دیر بعد یہ پھر کسی نازک مقام پر رک جاتی ہے اور ایک سکہ مزید ڈالنا پڑتا ہے۔ یوں پوری فلم دیکھنے کے لئے کئی مارک "ختم" ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس میں کچھ ایسا سسپنس قائم کیا گیا ہوتا ہے کہ شائقین جیبیں خالی کر کے ہی دکان سے باہر نکلتے ہیں۔ یہ تماشا میں نے ایک بار امریکہ میں دیکھا تھا بعد میں مجھے یہ سب کچھ مضحکہ خیز معلوم ہوا اس لئے مسعود کو کیبن میں داخل ہوتے دیکھا تو مجھے ہنسی آ گئی۔ وہ ایک آنکھ روزن سے لگائے پورے خضوع و خشوع سے فلم دیکھنے میں مشغول تھا۔ تھوڑی دیر بعد "ٹک" کی آواز آئی اور ٹائم ختم ہو گیا۔ اس نے جلدی سے ایک سکہ اور نکالا اور ایک بار پھر فلم کا بقیہ حصہ دیکھنے میں محو ہو گیا۔ کچھ دیر بعد ٹک کی آواز آئی اور مسعود نے اضطراب کے عالم میں جیب میں ہاتھ ڈال دیا۔ اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور دونوں ہاتھوں سے اس نے مشین کو جپھا ڈالا ہوا تھا۔ اس نے ایک سکہ مزید ڈالا اور آنکھ سوراخ کے ساتھ چپکا دی۔ چند لمحے گذرنے پر فلم پھر رک گئی تھی۔ اس بار اس نے سخت ایمرجنسی کے عالم میں مجھے آواز دی "یار کچھ ٹوٹے ہوئے پیسے دیں۔ ذرا جلدی کریں۔" "یار کچھ ٹوٹے ہوئے پیسے دو۔ ذرا جلدی کرو۔" میں نے جیب سے ریزگی نکال کر اسے دے دیا۔ اور کاؤنٹر پر کھڑی لڑکی کو دیکھنے لگا جو ایک گاہک کو قوت باہ کے ٹیکے فروخت کرتے ہوئے ان کی افادیت پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈال رہی تھی۔ "ان کے استعمال سے آپ اپنے اندر ایک بالکل نئی زندگی محسوس کریں گے۔ یہ ٹیکے بہترین دماغوں کے تیار کردہ ہیں۔ طویل عمر میں مسرت کے لمحات بھی طویل ہونے چاہئیں اور ان کی مدد سے آپ مسرت کے لمحوں کو جتنا چاہیں طویل کر سکتے ہیں۔ اس کے سائڈ ایفیکٹس بھی نہیں ہیں!"

اتنے میں مسعود نے ایک بار پھر کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا "یار کچھ ٹوٹے ہوئے پیسے دیں"۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور حالت غیر تھی۔ اس پر میں نے خارش کی پروا کئے بغیر اسے گردن سے پکڑا اور دوکان سے باہر لے آیا۔ اس نے پہلے تو بُرا سا منہ بنایا اور پھر کچھ دیر بعد نارمل ہونے پر ہنسنے لگا۔

رستے میں ایک بوڑھا شخص فٹ پاتھ پر گٹار لئے بیٹھا تھا۔ اس نے اپنا ہیٹ زمین پر پھیلایا ہوا تھا اور جرمن میں کچھ گانے کی کوشش کر رہا

تھا جو یقیناً بڑے جا سخیار رہے۔ خدا تیرا اللہ ہی بولا اوے گا۔ قسم ہی کی چیز تھی۔ میں نے کچھ سکّے اس کے ہیٹ میں اچھالے اور آگے بڑھ گیا۔ کچھ آگے چل کر ایک اور بوڑھا جو حبشی دکھائی دیتا تھا جو چیختا جاتا تھا اور مٹھیاں بھینچ بھینچ کر پرجوش تقریر بھی کرنے میں مشغول تھا۔ اس کا لہجہ کرخت تھا۔ اتار چڑھاؤ خطیبانہ تھا۔ چہرہ کھنچا ہوا تھا اور زورِ بیان سے منہ لال ہو رہا تھا۔ وہ یقیناً دلّی کے لال قلعے پر ایک بار پھر جھنڈا گاڑنے جیسی باتیں کر رہا تھا۔ لوگ ایک نظر اس کی طرف دیکھتے تھے اور پھر زیادہ توجہ دیے بغیر آگے چل پڑتے تھے۔ کیونکہ اب وہ ایک عرصہ تک اس نوع کی تقریریں نہیں سننا چاہتے تھے۔ میونخ میں دو دن کے قیام میں میں نے اس قسم کے کم و بیش پانچ چھ پاگل دیکھے۔

ہم اب تک دو تین میل چل چکے تھے لیکن وہ ڈیپارٹمنٹل سٹور کہیں نظر نہیں آیا تھا جہاں مسعود مجھے لے جانا چاہتا تھا۔ یہاں سڑکوں کے دونوں طرف چھوٹی چھوٹی دکانیں تھیں جہاں سے روزمرہ کی چیزیں دستیاب تھیں۔ طویل سفر اور "صلیبیں" اٹھا کر چلنے کی وجہ سے میرا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ اوپر سے اس "واک" نے میرے لئے "مرے کو مارے شاہ مدار" والی صورت حال پیدا کر دی تھی۔ اس پر میں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا اور زمین پر بیٹھنا (چوکڑی) مار کر بیٹھنے کو تھا کہ مسعود نے ہنستے ہوئے مجھے اس حرکت سے باز رہنے کو کہا اور برابر والی دکان کے کاؤنٹر پر کھڑی لڑکی سے راستہ پوچھنے کے لئے اس کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ دور سے میں نے دیکھا تو لڑکی کے پنکھڑی ایسے ہونٹ اور مسعود کی کمانی دار گردن حرکت میں تھے۔ وہ گردن کو کبھی آگے پیچھے ہلاتا اور کبھی بڑی بیدردی سے بائیں یا دائیں طرف ڈھلکا دیتا۔ تھوڑی دیر بعد وہ دکان سے باہر نکلا "ٹھیک ہے سمجھ گیا ہوں" اس نے کہا اور مجھے ایک بار پھر پیچھے لگا لیا۔

دفتروں میں چھٹی ہو گئی تھی۔ دن بھر کے تھکا دینے والے کام کے باوجود ہر طرف تر و تازہ اور خوش و خرم چہرے دکھائی دیتے تھے۔ یہ قوم سب کچھ "کر بھی ویسی کی ویسی ہی ہے"۔ "عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی۔" غالباً ہمارا اقبال ٹھیک کہتا ہے۔ ان کا گوئٹے بھی ٹھیک کہتا ہے۔ بس سارا جھگڑا گفتار اور کردار کے غازی ہونے کا ہے۔

"مسعود میں تھک گیا ہوں۔"

غالباً اس بار میری تمام تھکن مسعود میں سرایت کر گئی ہے۔ وہ کہتا ہے "چلو ٹرام میں بیٹھ جاتے ہیں۔"

ٹرام اس قدر خوبصورت ہے کہ اسے پاؤں کی دھول سے آلودہ کرتے ہوئے جھجک محسوس ہوتی ہے۔ یہاں ایک خستہ حال پاکستانی چہرہ دکھائی دیتا ہے۔

"قیصر سٹریٹ اتر جاؤ وہاں کئی ڈیپارٹمنٹل سٹور ہیں۔" وہ مسعود کو بتاتا ہے۔

"کمال ہے یار، ہم لوگ تو اس کے قریب ہی رہتے ہیں۔ ڈاکٹر ریستوران بھی تو وہیں ہے۔" مسعود میرے کان میں کہتا ہے۔

"تم اتنے عرصے میں کبھی اس طرف نہیں گئے؟" میں پوچھتا ہوں۔

"کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔ پاکستان سے چلتے وقت ضرورت کے تمام کپڑے اور دیگر چیزیں ساتھ لے آیا تھا۔ سارا دن ... کرتا ہوں اور شام کو واپس 'بابے دی ہائم' آ کر سو جاتا ہوں۔ ویسے یہ ڈیرہ اور دوسرے پاکستانی رات کو بیئر پینے کے لئے کسی بار میں چلے جاتے ہیں یا میکسی ہاؤس کا رخ کرتے ہیں لیکن میں نے کبھی ادھر کا رخ بھی نہیں کیا۔"

"یہ بابے دی ہائم اور میکسی ہاؤس کیا ہے؟"

"ہائم (HEIM) یہاں اس بڑی بلڈنگ کو کہتے ہیں جہاں بہت سے لوگ رہتے ہوں۔ پاکستانیوں نے ان ہائمز کے اپنے نام رکھے ہوئے ہیں مثلاً چاچے دی ہائم، زنانے دی ہائم وغیرہ۔ جہاں ہم رہتے ہیں اس کا نام بابے دی ہائم ہے۔ میکسی ہاؤس چکلے کو کہتے ہیں، جو شہر میں مختلف جگہوں پر ہے یہ کئی منزلہ عمارت ہوتی ہے جو سیڑھیوں کے ذریعے طے کرنا پڑتی ہے۔ ہر منزل پر جہاں سیڑھیاں ختم ہوتی ہیں وہاں کمروں کے باہر سیڑھیوں کی ریلنگ کے ساتھ طوائفیں بیٹھی ہوتی ہیں ــــ چالیس مارک ... بہت زیادہ ہیں۔"

"تم جب سے آئے ہو میونخ ہی میں رہے ہو یا کسی دوسرے شہر میں بھی قسمت آزمائی کی ہے؟"

"بون بھی گیا ہوں۔ مگر وہاں نوکری نہیں ملی مجھے یوں بھی میونخ زیادہ اچھا لگا ہے۔ یہ جو اتنی خوبصورت ٹرامیں اور بسیں تم یہاں دیکھ رہے ہو، بون میں نظر نہیں آئیں گی۔ وہاں چلنے والی ٹرام اور کراچی کی ٹرام میں کوئی فرق نہیں۔ بسیں بھی انتہائی خستہ ہیں۔ کنڈکٹروں نے ٹکٹ کی گڈیاں ہاتھ میں پکڑی ہوتی ہیں۔"

یہ ٹرام مین تھیمر سٹریٹ کی بجائے اس کے گردونواح میں جا رہی تھی اور وہ علاقہ قریب آنے کو تھا۔ پیشتر اس کے کہ مسعود بغیر ٹکٹ اتر جاتا، کنڈکٹر اس کے پاس پہنچ چکا تھا۔ مسعود نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور پھر میری طرف دیکھ کر کہا "یار ذرا ٹکٹ لے لو، پیسے......"

پانے دری بام کی دیواریں ایک عرصے سے سفیدی نہ ہونے کے باعث سیاہ پڑ چکی تھیں اور عمارت اتنی خستہ حال تھی کہ اس کی چھتیں اور دیواریں کسی بھی وقت گر سکتی تھیں۔ سیڑھیاں چڑھتے جگہ جگہ بلغم کے نشان دکھائی دیئے۔ پرویز پہلی ہی منزل میں مقیم تھا۔ ہال نما کمرے میں داخل ہوتے ہی مجھے قطار اندر قطار چارپائیاں بچھی دکھائی دیں۔ ان میں سے بیشتر کی پائنتی پر بستر لپیٹے ہوئے رکھے تھے۔ کچھ چارپائیاں ایسی بھی تھیں جن پر لوگ لیٹے ہوئے تھے۔ کمرے کے ایک کونے میں تیل والا چولہا پڑا تھا جس پر مٹی کی ہنڈیا چڑھی تھی اور ایک پاکستانی نوجوان اس میں ڈوئی ہلا رہا تھا۔ ایک دوسرا شخص پاؤں کے بل بیٹھا ہوا ایک کُنالی میں آٹا گوندھ رہا تھا۔ آٹا گوندھنے کی مسلسل حرکت اور چولہے کی تپش سے پسینوں پسینہ ہو رہا تھا۔ اس نے ایک لمحہ توقف کر کے ماتھے پر سے پسینہ پونچھا اور پھر اسی انہماک سے دوبارہ آٹا گوندھنے میں مشغول ہو گیا۔ چارپائی پر بیٹھا ایک نوجوان سوئی دھاگا ہاتھ میں لئے قمیص میں بٹن ٹانک رہا تھا۔ کمرے کے درمیان میں پڑی ایک چارپائی پر بیمار سا ایک مکین رضائی لپیٹے پڑا تھا۔ اسے تیز بخار تھا اور وہ وقفے وقفے بعد کراہ رہا تھا ــ "پانی" اس نے نحیف سی آواز میں کہا اور اس کے سرہانے بیٹھے ایک نوجوان نے صراحی میں سے پانی انڈیل کر اسے دیا۔ یہ سب لوگ پنجاب کے مختلف علاقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے چہروں پر غربت و افلاس اور محنت و مشقت کی لکیریں اتنی گہری تھیں کہ باقی تمام نقوش ان میں چھپ گئے تھے اور یوں ان سب کی شکلیں ایک جیسی ہو گئی تھیں۔

جب ہم کمرے میں داخل ہوئے تو ہمارے پاؤں کی چاپ سن کر قمیص میں بٹن ٹانکنے والے زرد رو نوجوان نے سر اٹھا کر ہماری طرف دیکھا اور پھر مسعود کے ساتھ ایک خوش پوش اور مختلف شکل اجنبی کو دیکھ کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"یہ میرے اور پرویز کے دوست ہیں عطا صاحب! ان سے ملو۔" مسعود نے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

وہ نوجوان بجلی کی سی تیزی کے ساتھ آگے بڑھا اور مرعوبیت کے عالم میں اپنے دونوں ہاتھ مصافحے کے لئے میری طرف بڑھا دیئے۔ اسی اثنا میں آٹا گوندھنے والے نے کُنالی پرے سرکائی اور ہاتھ دھو کر مجھ سے ہاتھ ملانے کے لئے بڑھا۔ میں چارپائی پر بیٹھنے ہی کو تھا کہ زرد رو نوجوان نے "نہ نہ" کرتے ہوئے مجھے رکنے کا اشارہ کیا اور پھر لپٹا ہوا بستر کھول کر مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ یہ بستر گھٹے کی بنی ہوئی دری اور کڑھے ہوئے غلاف والے سرہانے پر مشتمل تھا۔ اتنے میں سامنے والے کمرے سے سسکیوں کی آواز سنائی دی اور پھر یہ بلند ہوتی چلی گئی۔

"یہ کون رو رہا ہے؟" میں نے مسعود سے پوچھا۔

"جہلم کے ایک شخص کا والد فوت ہو گیا ہے۔ اسے پرسوں تار کے ذریعے اطلاع ملی تھی۔ اس وقت سے یہ مسلسل روئے جا رہا ہے" مسعود نے میرے برابر میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

دوسرے لوگ سامنے والی چارپائی کے کنارے پر بیٹھ گئے تھے۔

"اس کمرے میں کتنے لوگ رہتے ہیں؟" میں نے رونے والے کی طرف سے اپنا دھیان ہٹانے کے لئے کمرے میں بچھی کم و بیش پچیس چارپائیوں پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

جتنی چارپائیاں آپ کو نظر آ رہی ہیں۔ اس سے دوگنے لوگ یہاں مقیم ہیں۔ رات کو کام کرنے والے دن کو یہاں آ کر سو جاتے ہیں اور دن کی شفٹ والے رات کو یہاں آرام کرتے ہیں۔ بوقتِ ضرورت ایک چارپائی پر دو افراد بھی سو جاتے ہیں۔"

مسعود، پرویز کو بلانے چلا گیا تھا۔ اتنی دیر میں کئی اور نوجوان ایک نو وارد کو دیکھ کر سامنے والے کمرے سے آئے اور میرے گرد گھیرا ڈال کر بیٹھ گئے۔

"وطن کا کیا حال ہے جی؟ بڑی بری بری خبریں سننے میں آ رہی ہیں۔" ایک نے پوچھا۔

"اس بارے میں میری معلومات بھی آپ جتنی ہی ہیں۔"

"آپ پاکستان سے نہیں آ رہے؟"

"نہیں ــــ میں پاکستان جا رہا ہوں۔"

"آپ کہاں سے آ رہے ہیں؟"

میں نے انھیں مختصراً اپنے بارے میں بتایا تو وہ چارپائیاں کھسکا کر میرے اور قریب آ گئے۔ "آپ ہمیں امریکہ کا ویزا نہیں دلوا سکتے۔" ان کے لہجے میں لجاجت تھی۔

"وہاں پہنچنا بہت مشکل ہے۔ پہلے وہاں سے کسی دوست سے SPONSER کروانا پڑتا ہے، پھر ویزے کا مرحلہ آتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ ملک سات سمندر پار ہے۔ کرایہ بھی بہت زیادہ ہے۔" وہاں پہنچنا اور وہاں رہنا ان بے آسرا اور غریب لوگوں کے بس میں نہیں تھا۔ چنانچہ میں نے دل پر جبر کر کے برہنہ صورتِ حال سے انھیں آگاہ کر دیا۔ میں انھیں کسی نئی خود فریبی میں بہتا نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

ان کے چہروں پر لمحہ بھر کے لئے امید کی جو روشنی نمودار ہوئی تھی، وہ آناً فاناً غائب ہو گئی۔

اتنے میں دروازے میں ایک سرخ و سفید چہرے والا موٹا تازہ شخص نمودار ہوا وہ اگرچہ قمیص پتلون میں ملبوس تھا لیکن چہرے مہرے سے گنوار اور کھردرا سا شخص لگتا تھا۔ اس نے ایک نظر میری طرف دیکھا اور پھر کوئی توجہ دیئے بغیر بوٹوں سمیت چارپائی پر چت لیٹ گیا۔

"اوئے فقیریئے، ادھر آ کے میری ٹانگیں دبا۔" اس نے لیٹے لیٹے رعب دار آواز میں حکم دیا۔ اس پر قمیص میں بٹن ٹانکنے والا زرد رو نوجوان پلک جھپکنے میں اٹھا اور چارپائی کی پائنتی کے کنارے پر بیٹھ کر اس کی ٹانگیں دابنے لگا۔

"یہ کون شخص ہے؟" میں نے اس کے رویے پر حیران و پریشان ہو کر سامنے بیٹھے نوجوان سے پوچھا۔

انھوں نے جواب میں ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کی ہدایت کی۔ ان کے چہرے پیلے پڑ گئے تھے۔ پھر ان میں سے ایک اونچی آواز میں بولا۔ "یہ ہمارے چودھری صاحب ہیں۔ ہمارے بڑے مہربان ہیں۔ ہم انہی کی وجہ سے یہاں ہیں ورنہ کب کے نکالے گئے ہوتے۔"

"نواز کے بچے، تم بھی ادھر آؤ، یہ جوتے اتار کے چارپائی کے نیچے رکھ دو۔" اور اب کے آٹا گوندھنے والا برق رفتاری سے اس کی طرف بڑھا اور تسمے کھولنے لگا۔ "تمہاری ماں کو...... ہاتھوں میں جان نہیں ہے کیا؟ کوڑھوں کی طرح دبا رہے ہو!" اس نے فقیریئے کو موٹی سی گالی دی۔

یہ سب کچھ دیکھ کر میرے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا تھا۔ پیشتر اس سے کہ میں زبان کھولتا، سامنے بیٹھے ہوئے خوف زدہ نوجوان نے ایک بار پھر ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کی درخواست کی۔

"تم لوگوں کے پاس یہ کون بیٹھا ہوا ہے؟" اس نے پلٹا کھا کر اوندھے ہوتے ہوئے اپنا چہرہ میری طرف کرتے ہوئے کہا۔

"یہ پرویز صاحب کے مہمان ہیں جی۔"

"اچھا اچھا!" وہ چارپائی پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کا لہجہ ایک دم تبدیل ہو گیا تھا۔ "پرویز تو اپنا یار ہے۔ کیا حال ہے جناب۔ آپ پرویز ہی کے نہیں میرے بھی مہمان ہیں۔ چل اوئے نواز جلدی سے ان کے لئے چائے بنا کے لا۔"

"میں چائے نہیں پیوں گا۔" میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ میرے دل میں اس کریہہ شخص کے لئے نفرت کا لاوا اُبل رہا تھا۔

"او وہ میرا پرویز بادشاہ آگیا۔" اچانک اس نے اپنے بازو ہوا میں پھیلائے اور چارپائی سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ پرویز دروازے میں داخل ہو رہا تھا چوڑی چکلی چھاتی، گٹھا ہوا بدن اور سانولے چہرے پر خود اعتمادی کا غازہ۔ اس کے ساتھ مسعود بھی تھا۔ پرویز ادھر اُدھر دیکھے بغیر سیدھا میری طرف آیا اور میرے سینے سے چپک گیا۔ اس کے معانقے میں گہری محبت اور خلوص کی گرمی تھی۔ اس نے کافی دیر تک مجھے لپٹائے رکھا اور پھر میرے برابر چارپائی پر بیٹھ گیا۔

"جب سے آپ کا فون آیا، میرا کام میں جی نہیں لگ رہا تھا۔ آپ اتنی دیر کیا کرتے رہے؟"

"کچھ کام کرنے تھے، ان میں دیر لگ گئی۔"

پرویز کے آنے سے کمرے میں بیٹھے ہوئے نوجوانوں کے چہروں سے خوف زائل ہوگیا تھا اور اب وہ چہک رہے تھے۔ ان کا آقا بھی اب ان سے مصنوعی ملائمت کے ساتھ گفتگو کر رہا تھا۔

"چلو اٹھو کہیں سیر کو چلتے ہیں۔" پرویز نے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ میں اور مسعود اس کے ساتھ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ کراہنے والے شخص نے ایک بار پھر پانی مانگا۔ اس بار پرویز نے کونے میں پڑی صراحی سے پانی انڈیل کر اسے دیا۔ پرویز نے اس موٹے شخص کو مخاطب کیا "تم سے پھر ملاقات ہوگی۔"

اور پھر ہم باہر دی بام سے نکل کر میونخ "فرائی ہائٹ" ابسوں کا آخری سٹاپ اسے انگلش گارڈن کی طرف نکل گئے۔ ہمارے ساتھ پاکستان کے ایک مضافاتی ہفت روزے کا ایک ایڈیٹر بھی تھا جو سیڑھیوں میں مل گیا تھا اور پرویز اسے بھی ساتھ لے آیا تھا۔ اس کا نام تنویر تھا اور یہ بھی دیگر لوگوں کے ساتھ یہاں دھکے کھا رہا تھا۔

"یہ موٹا سا شخص کون تھا؟" میرے دل میں اس شخص کے لئے شدید نفرت پیدا ہوگئی تھی اور میں اس کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔

"کیا بات ہے اس حرامزادے نے آپ کو تو کچھ نہیں کہا؟" پرویز چلتے چلتے ایک دم رک گیا۔ اس کے چہرے پر غصے کے آثار نمایاں تھے۔

"نہیں لیکن اس کا رویہ ان غریب لوگوں کے ساتھ انتہائی حاکمانہ اور جابرانہ تھا۔"

"یہ شخص یہاں ایک طویل عرصے سے مقیم ہے۔ اسے امیگریشن ویزا مل چکا ہے۔ اس نے کچھ غنڈے پالے ہوئے ہیں جن کے بل بوتے پر اس نے ان مظلوم لوگوں کو اپنا غلام بنایا ہوا ہے۔ ان سے باقاعدہ ٹیکس وصول کرتا ہے، خدمت لیتا ہے جو حکم عدولی کرے اسے مار مار کر لہو لہان کر دیتا ہے۔ یہ سب لوگ اس لئے ظلم سہہ جاتے ہیں کہ یہ پولیس کو ان کے غیر قانونی قیام کے بارے میں مطلع کرنے کی دھمکیاں دیتا رہتا ہے اور یوں اس کا سارا کاروبار بلیک میلنگ کے ذریعے چل رہا ہے۔"

"لیکن میں نے محسوس کیا ہے کہ یہ تم سے خاصا دبتا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟"

"وجہ یہ ڈولے ہیں" پرویز نے بازو کی مچھلیاں دکھاتے ہوئے کہا۔ "جب میں پہلے روز یہاں آیا تو اس نے مجھے بھی تابع فرمان بنانے کی کوشش کی۔ میں نے مار مار کر اس کا بھرکس نکال دیا۔ اگلے روز یہ غنڈوں کو ساتھ لے آیا۔ یہ ڈیڑھ ڈیڑھ پسلی کے غنڈے تھے۔ مگر ان پلے ہوئے مجبور و مظلوم لوگوں کی کمزوری نے انہیں شیر بنا رکھا تھا۔ میں نے ان کی بھی خبر لی۔ پھر اس نے مجھے دھمکی دی کہ میں تمہیں دو دن میں جرمنی سے نکلوا دوں گا۔ میں نے اسے کہا کہ میں تو یہاں سے زندہ جاؤں گا لیکن تمہاری لاش وطن واپس جائے گی۔ اس پر اس کا دماغ درست ہوگیا۔ یہ اندر سے بڑی خار کھاتا ہے مگر فی الحال مصلحتاً خاموش ہے۔ اب یہ میرے سامنے ان بے نوا اور بے آسرا لوگوں کو بھی کچھ نہیں کہتا مگر بعد میں ساری کسریں نکال لیتا ہے۔ میرا دل ان کے لئے روتا ہے لیکن میں اکیلا ان کا دفاع نہیں کر سکتا۔ اپنی رہائی کے لئے انہیں بھی کچھ کرنا ہوگا۔"

"اچھا خیر چھوڑو۔" میں آزردہ ہوگیا تھا اور گفتگو کا رخ موڑنا چاہتا تھا "تمہیں جرمن زبان میں ابھی تک کچھ شد بد حاصل ہوئی ہے یا نہیں؟"

"شد بد ہوگیا، ابھی خاصی روانی سے بول لیتا ہوں۔ بلکہ میں تو پڑھنا بھی سیکھ گیا ہوں۔ یہاں کا سب سے مشہور اخبار "سود دیچے زائی ٹونگ"

SUD DEUTCHE ZIETUNG ہے اور میں باقاعدگی سے اس کا مطالعہ کرتا ہوں۔"

"میونخ سے کتنے اخبار نکلتے ہیں؟"

"بہت سے ہیں تاہم ان میں سے ابینت سافی تونگ، ٹی ذیٹ اور دی ویلٹ وغیرہ زیادہ مشہور ہیں۔ ان میں بعض اشتہار ہم ایشیائیوں کے لئے بڑے مزے کے ہوتے ہیں، مثلاً ایک اشتہار جو عام طور پر دیکھنے میں آتا ہے، وہ یہ ہے

INDIANER MODLE FUR-SIE

یعنی "آپ کے لئے خوبصورت ہندوستانی نوجوان ماڈل دوشیزہ۔" اس کے ساتھ ٹیلیفون نمبر بھی دیا ہوتا ہے۔ پاکستانی اس نمبر پر ٹیلیفون کر کے ان ہندوستانی دوشیزاؤں کو تنگ کرتے ہیں اور وہ جواب میں انہیں اردو کی بجائے جرمن میں گالیاں دیتی ہیں۔"

"یہ ہندوستانی لڑکیاں صرف ماڈلنگ ہی کا کام کرتی ہیں؟" میں نے پوچھا

"یہ ماڈلنگ تو محض آڑ ہے ورنہ ان کا اصل کام جسم فروشی ہے۔ ماڈلنگ کی آڑ انہیں اس لئے لینا پڑتی ہے کہ ایک تو طوائف کا لائسنس حاصل کرنے کے لئے یہاں خاصے دشوار گزار مراحل سے گزرنا پڑتا ہے اور دوسرے غیر ملکی لڑکیوں کو اس کے لئے یہاں "ورک پرمٹ" نہیں ملتا۔"

"میونخ میں پاکستانی لڑکیاں بھی تو ہوں گی؟"

"ایک نہیں کئی ہیں لیکن وہ اونچے گھرانوں سے تعلق رکھتی ہیں اور یہاں تعلیم کے لئے آئی ہیں۔ ان میں سے ماڈل ٹاؤن کی یاسمین نزہت سے میری ملاقات بھی ہوئی تھی۔ آپ شاید اسے نہیں جانتے۔ وہ ایک جرمن لڑکے کے ساتھ بانہوں میں بانہیں ڈالے شٹرن برگ جھیل کے قریب پھر رہی تھی۔ اس نے مجھے دیکھ کر نظریں چرانے کی کوشش کی لیکن اتفاق سے وہ جرمن میرا دوست تھا اور پھر ہم تینوں ایک قریبی بار میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد وہ بھی ہمارے ساتھ ناؤ نوش میں مشغول ہو گئی۔"

تھوڑی دیر میں ہم نوئے انگلش گارڈن میں گھنے درختوں کے درمیان پہنچ گئے تھے۔ جہاں بے شمار لڑکے لڑکیاں سبز گھاس پر بیچ جنوں کی جوڑی کی طرح لیٹے ہوئے تھے۔ پارک کے بیچوں بیچ ایک جھیل تھی جس پر بطخیں تیر رہی تھیں۔ جھیل کا پانی خاصا گدلا تھا۔ نوجوان جوڑے یہاں بوٹنگ کر رہے تھے اور ان کشتیوں کی اندرونی صورت حال بھی کچھ اس طرح کی تھی کہ اندر لیٹے ہوئے جوڑوں نے چپو چلانے بند کر دیئے تھے اور کشتی کو موجوں کے سہارے چھوڑ دیا تھا۔ کچھ جرمن نوجوان یہاں بکھرے بالوں اور لمبی داڑھیوں کے ساتھ اکیلے بھی گھوم رہے تھے۔ پرویز نے ان کی طرف اشارہ کیا اور کہا "یہ سب چرسی ہیں اور انگلش گارڈن میں کسی محفوظ گوشے میں بیٹھ کر اپنا یہ شوق پورا کرتے ہیں۔ یہاں درختوں کی شاخوں میں سبزوں کے حساب سے چرس بھی چھپا کر رکھی جاتی ہے۔ چرس کے تاجر یہاں آتے ہیں اور ان درختوں کے نیچے سودے طے پاتے ہیں۔ پولیس یہاں آکر چھاپے مارتی رہتی ہے۔ کئی پولیس والے یہاں سادہ لباس میں بھی پھرتے رہتے ہیں۔"

پرویز اپنے ساتھ پوری بوتل لایا تھا۔ اس نے اسے منہ لگایا اور پھر تنویر کی طرف بڑھا دی

تنویر کہہ رہا تھا "ہم لوگ پاکستان میں درآمد ہونے والی یورپی فلموں میں جو کچھ دیکھتے تھے اور پھر حاصل کرنے کی تمنا کرتے تھے، یہاں آکر ان سے کچھ بھی نہیں ملا۔ نہ بکارڈ، نہ ٹیلیویژن، نہ ریفریجریٹر، نہ ایرکنڈیشنڈ گھر، نہ سوئمنگ پول اور نہ خوبصورت لڑکیاں۔ ہم لوگ یہاں سارا دن کوئی نچلے درجے کا کام کرتے ہیں، بابے دی ہائم میں رہتے ہیں۔ مقامی لوگوں سے ہمارا کوئی ربط ضبط نہیں، وہ ہمیں حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان عوامل کے نتیجے میں فرسٹریشن کا شکار ہو کر ہم اپنی خون پسینے کی کمائی سے شراب پیتے ہیں، عورت کی تلاش میں سیکسی ہاؤس کی طرف نکل جاتے ہیں اور چالیس مارک خرچ کر کے آجاتے ہیں۔ ایک بار ہمارا ایک ساتھی اپنی خوبصورت جرمن گرل فرینڈ کو ہائم میں لے آیا تھا۔ یہاں ایک انار تھا اور سو بیمار تھے، سو گڑبڑ ہوئی اور [illegible] تک نوبت پہنچی۔ اس کے بعد کوئی لڑکی اس طرف کا رخ بھی نہیں کرتی۔ ہم لوگ تمام محرومیوں کے باوجود یہاں رہ رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ بیشتر کے پاس

دیسی ہو کر اپنا رنگ نہیں ہے۔ دوسرے ہم لوگ بڑی ڈینگیں مار کر یہاں آئے تھے کہ وہاں جا کر یہ کریں گے وہ کریں گے اور تیسرے ہم یہاں تمام تر تنگی و عسرت کے باوجود ایک نعمت سے ہم کنار ہیں اور وہ آزادی کی نعمت ہے ہم متوسط طبقے کے لوگ جن گھروں سے تعلق رکھتے ہیں وہاں بے شمار ناروا پابندیاں روا رکھی جاتی ہیں جب کہ ہم یہاں آزاد ہیں۔ ہماری سرگرمیوں پر کوئی انگلی دھرنے والا نہیں۔ اپنی مرضی سے گھر سے نکلتے ہیں اور اپنی مرضی سے واپس آتے ہیں ـــ البتہ یہ جو دوسرے لوگ آپ کو یہاں نظر آتے ہیں، ان کا معاملہ مختلف ہے۔ یہ انتہائی پس ماندہ علاقوں سے یہاں آئے ہیں۔ ان میں سے کوئی اپنی بیوی کے زیور فروخت کر کے یہاں آیا ہے، کسی نے اپنی گٹیا رہن رکھی ہے، کوئی اپنے چند کلے زمین بیچ کر آیا ہے اور کسی نے اپنے عزیز و اقارب سے ادھار لیا ہے۔ انھیں اپنے بوڑھے والدین کو پالنا ہے، اپنی بہنوں کی شادیاں کرنی ہیں، اپنے بچوں کے لئے دو وقت کی روٹی مہیا کرنی ہے۔ سو ان کا مسئلہ صرف زندہ رہنا ہے اور وہ کچھ نہ کچھ رقم ہر مہینے گھر بھیج دیتے ہیں اور کچھ رقم واپسی پر بھی اپنے ساتھ لے جاتے ہیں، جس سے وہ کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کر لیتے ہیں ـــ ان کا مسئلہ بھوک ہے اور یہ انفرادی آزادی وغیرہ ہم لوگوں کے مسئلے ہیں۔!"

پرویز نے ایک بار پھر بوتل کو ڈاٹ لگائی اور مجھ سے پوچھا "یہ تنویر کیا کہہ رہا تھا؟ خیر جو بھی کہہ رہا تھا، ٹھیک ہی کہہ رہا ہوگا۔ آئیں بوٹنگ کرتے ہیں!"

جب چپو چلاتے چلاتے پرویز کے بازو شل ہو گئے تو اس نے کشتی کنارے پر لگا دی۔ شروع میں وہ کچھ افسردہ سا نظر آ رہا تھا لیکن اب نشہ بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس کے لہجے میں شگفتگی آتی جا رہی تھی۔ تنویر پہلے سے زیادہ DEPRESSED ہو گیا تھا۔ مسعود نہ خوش تھا نہ افسردہ، وہ صرف لڑکیوں کو گھورنے میں مشغول تھا۔ کبھی ایک کو دیکھتا اور کبھی دوسری کو اور پھر کھجلانے میں مشغول ہو جاتا۔ انگلش گارڈن پر شام محیط ہوتی جا رہی تھی اور یہاں کی رونقیں ماند پڑنا شروع ہو گئی تھیں۔ ہم یہاں سے نکلے اور شوابنگ کے بارونق علاقے میں آ گئے۔ مسعود اور تنویر واپس ہائم چلے گئے تھے۔ تنویر نے بقعۂ نور بنے ہوئے شوابنگ میں سے گزرتے ہوئے زور سے پاؤں زمین پر پٹکا اور کہا "یہ ہے وہ یورپ جس کے ہم خواب دیکھا کرتے تھے، ہم یہاں رہ کر بھی خواب ہی دیکھتے ہیں!"

یہاں زندگی کی تمام رونقیں اپنی تمام حشر سامانیوں کے ساتھ جلوہ گر تھیں۔ یہ سارا علاقہ رنگا رنگ روشنیوں اور نیون سائنوں سے مرکز نگاہ بنا ہوا تھا۔ مقامی لوگوں کے علاوہ غیر ملکیوں کی ایک بڑی تعداد بھی یہاں گھوم رہی تھی۔ یہاں بڑے بڑے سٹور بھی تھے اور نائٹ کلب بھی۔ بار بھی تھے اور سنیک بار بھی۔ یہاں ہر طرح کے لوگ جمع تھے۔ ایک کثیر تعداد عریانیت کے وہ مظاہر دیکھنے کے لئے آئی تھی جو یہاں پر موجود نائٹ کلبوں کا خاصہ ہیں۔ کچھ لوگ اپنی گرل فرینڈز کے ساتھ محض ڈرنک اور ڈانس کے لئے یہاں آئے تھے۔ کچھ فاسٹ فوڈز کے موڈ میں تھے اور کچھ ایسے بھی تھے جو کسی سنیک بار کے باہر کھڑے گرم کتوں (HOT DOG) ہی سے کام و دہن کی تواضع میں مشغول تھے۔ ایک جگہ ہپیوں کے غول بھی دکھائی دیئے۔ وہ ان سارے ہنگاموں سے بے نیاز اپنی گندگی میں مست تھے۔ ایک کونے میں ایک خوبصورت گل فروش لڑکی پھول بیچ رہی تھی۔ پرویز اب پوری طرح فارم میں تھا، وہ انتہائی خوش دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے لڑکی سے ایک گلدستہ خریدا اور پھر یہی گلدستہ عاشقانہ انداز میں اسے پیش کرتے ہوئے کہا: "یہ میری طرف سے تمہارے لئے ہے!" لڑکی کے چہرے پر ایک دلنواز مسکراہٹ ابھری۔ یہ دیکھ کر پرویز نے مجھے کہنی ماری اور کہا "حسن کی گرانی! (اب کیا کروں؟)"

ایک جرمن لڑکی فٹ پاتھ پر چوکڑی مارے گیان دھیان میں مصروف تھی۔ پرویز اس کے ساتھ گھٹنے سے گھٹنا جوڑ کر یوگا کے انداز میں براجمان ہو گیا۔

لڑکی نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور اس کے چہرے پر شرارت دیکھ کر جرمن میں اسے کہا "یہاں سے اٹھ جاؤ۔"

"مجھے جرمن نہیں آتی!" پرویز نے بھولا بنتے ہوئے کہا۔

وہ تھوڑی دیر چپ رہی لیکن کچھ دیر بعد اس نے پھر جرمن میں کہا "یہاں سے اٹھ جاؤ۔"

"مجھے جرمن نہیں آتی۔"

"میں کہتی ہوں یہاں سے فوراً اٹھ جاؤ۔" اس نے اس بار قدرے درشت لہجے میں کہا۔

"مجھے جرمن نہیں آتی" پرویز نے دونوں ہاتھوں کو بے چارگی سے پھیلاتے ہوئے کہا
وہ تھوڑی دیر خاموشی سے اس کے شرارت بھرے چہرے کو تکتی رہی اور پھر اس نے انگلی کھڑی کرتے ہوئے انگریزی میں چیخ کر کہا "میں کہتی ہوں یہاں سے دفع ہو جاؤ۔"

"پرویز کپڑے جھاڑ کر کھڑا ہو گیا اور ہنستے ہوئے جرمن میں کہنے لگا "میری زندگی کا واحد مقصد تم جرمنوں سے یہ اعتراف کرانا ہے کہ تم انگریزی جانتے ہو۔"

"میرا نام باربرا ہے" ایک کھلے بالوں والی انگور زادی نے اچانک سامنے سے آکر شستہ انگریزی میں مجھ سے اپنا تعارف کرایا "اور مجھے ایک کوکا کولا پینی ہے۔"

"تم چاہو تو کھانا بھی کھا سکتی ہو" پرویز نے اس من وسلویٰ کو اسرائیلی نظروں سے دیکھتے ہو کہا۔

"کھانا میں کسی اور سے کھا چکی ہوں! اب میری ضرورت صرف کوکا کولا ہے۔"

ہم سامنے والے سینک بار میں قطار کے لئے بنی ہوئی ریلنگ میں کھڑے ہو گئے اور پھر ایک ایک بوتل ہاتھ میں لئے دوبارہ باہر آن کھڑے ہوئے۔

"میں انڈیا جا رہی ہوں، وہاں مہارشیوں اور جوگیوں سے ملاقات کروں گی۔ مجھے یقین ہے تم بھی انڈین ہو۔ اگر میرا خیال درست ہے تو اپنا پتہ لکھاؤ میں وہاں تم سے ملاقات کروں گی۔ تم تو وہاں بڑے محل میں رہتے ہو گے!"

میں نے جیب سے کاغذ کا پرزہ نکالا اور اس پر کرشن چندر کا ایڈریس لکھ کر اس دوشیزہ کے حوالے کرتے ہوئے کہا "یہ میرا ایڈریس ہے، سارا انڈیا میرے نام سے واقف ہے۔ میں وہاں کا مشہور افسانہ نگار ہوں۔ تمہیں وہاں ریسیو کرتے ہوئے مجھے دلی مسرت ہو گی۔"

کرشن چندر کی طرف سے مجھے شکریے کا خط اگر پہلے موصول نہیں ہوا تو اب موصول ہو جانا چاہیے۔

"چٹاخ" ایک کونے سے دفناک طمانچے کی آواز گونجی۔ ایک جرمن نوجوان اپنی محبوبہ کی پٹائی کر رہا تھا۔ "چٹاخ"! ایک اور طمانچہ۔ پھر کچھ گالی گلوچ اور دوشیزہ کا اپنے محبوب کے بال نوچنا وغیرہ ——!

"یہ منظر میرے لئے نیا نہیں ہے، شاید آپ کے لئے نیا ہو" پرویز نے مجھے بتایا۔

"میرے لئے بھی نیا نہیں ہے —— امریکہ میں بھی میں نے مردوں کو اسی طرح عورتوں کی پٹائی کرتے دیکھا ہے!"

"مجھے پھر سے پیاس لگنے لگی ہے" پرویز نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ غالباً اس کا نشہ کم ہو رہا تھا

وہ بائیں جانب کے ایک بار میں گھس گیا اور قریباً ایک گھنٹہ بعد واپس آیا، وہ اب بُری طرح نشے میں تھا اور اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے ایک بوتل اس کے ہاتھ میں بھی تھی۔

"آئیں مارین پالٹس چلتے ہیں!"

"وہاں کیا ہے؟"

"وہاں ایک میکسی بار ڈس ہے!"

"لعنت بھیجو" میں پہلی بار پرویز کے بارے میں متشوش ہوا "پرویز خود کو سنبھالو تم یہاں اپنی زندگی برباد کرنے نہیں آئے! تم شب و روز محنت کے باوجود وہیں کھڑے ہو جہاں تمہارے بدخواہ تمہیں دیکھنا چاہتے ہیں۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟" اس نے فلک شگاف قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "اگر آپ نہیں جانا چاہتے تو نہ سہی، چلیں کھانا کھاتے ہیں!"

ہم ایک ہوٹل سے کھانا کھا کر نکلے تو رات گہری ہو چکی تھی۔ محبوب سے طمانچے کھانے اور جواباً اس کے بال نوچنے والی لڑکی اب اس کے کاندھوں پر سر رکھے سڑک کے کنارے کنارے جا رہی تھی، اس کے چہرے پر محبت کی سرخوشی اور طمانیت تھی۔ پرویز کھانے کے بعد بھی برابر پینے میں مشغول تھا مگر کے

قریب پہنچ کر اس نے ایک جگہ اکڑوں بیٹھ کر قے کی اور پھر وہیں زمین پر لیٹ گیا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے بمشکل اسے اٹھایا اور سہارا دے کر سیڑھیاں طے کراتے ہوئے اس ہال نما کمرے میں لے گیا جہاں قطار اندر قطار بچھی ہوئی چارپائیوں پر زندہ لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ ایک کونے سے سسکیوں کی آواز آرہی تھی۔ رونے والے نے اپنے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپایا ہوا تھا۔ اس نیم تاریک کمرے میں کسی کا چہرہ بھی روشن نہیں تھا۔ میں نے پرویز کو اس کی چارپائی پر لٹایا اور باہر وی ہائم سے نکل کر FELD HUTTER میں چلا آیا۔

صبح ٹیلیفون کی گھنٹی بجی "گوٹن ماگ" (صبح بخیر) دوسری طرف ہوٹل کا کوئی ملازم تھا "داخ ٹراخ چاخ ڈزن ڈزن" وہ جرمن میں کچھ کہہ رہا تھا۔ اس نے تو خدا جانے کیا کہا تھا لیکن مجھے یہی محسوس ہوا جیسے "داخ ٹراخ چاخ ڈزن ڈزن" کہہ رہا ہو — یہ لوگ امن کے دنوں میں بھی توپیں داغنے سے باز نہیں آتے۔

"آئی ڈونٹ نو جرمن" میں نے "اتحادیوں کی طرف سے اس "جارجیت" کا انگریزی میں جواب دیا۔

تھوڑی دیر تک محاذ پر خاموشی رہی اور پھر کسی دوسرے شخص نے ٹیلیفون اٹھایا "سر آپ ناشتے میں کیا پسند کریں گے؟"

"دو انڈے، سلائس، چائے اور دودھ کا ایک گلاس"

"سر آپ کو ہمارا بیکن (سور کا گوشت) بھی بہت پسند آئے گا۔"

مجھے یہ بیکن تو کیا پسند آنا تھا، اسے غالباً میرا جواب بھی پسند نہیں آیا کیونکہ اس نے ریسور رکھ دیا تھا۔

ویٹر کمرے میں ناشتہ رکھ کر جا ہی رہا تھا کہ ایک بار پھر ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔

"پیارے کیا حال ہے؟" یہ مسعود تھا اور اس وقت خاصی بے تکلفی کے موڈ میں تھا۔

"ارے تم صبح صبح کہاں سے ٹپک پڑے؟"

تھوڑی دیر تک ادھر سے کوئی جواب نہ آیا بس سسکاریاں سی سنائی دیتی رہیں، غالباً وہ کھجلانے میں مصروف ہو گیا تھا۔

"مجھے پرویز نے تمہیں فون کرنے کے لئے کہا ہے۔ وہ تیار ہو رہا ہے۔ تم بھی فوراً تیار ہو جاؤ۔ ہم ٹیگرن سی (TEGERNSEE) جا رہے ہیں اور وہاں سے کل لوٹیں گے، تم چاہو تو ہوٹل چھوڑ دو کیونکہ کل تمہیں استنبول کے لئے روانہ ہونا ہے۔" بالآخر اس کی آواز سنائی دی۔

"یہ ٹیگرن سی کیا چیز ہے اور بیٹھے بٹھائے یہ پروگرام کیسے بن گیا؟"

"ٹیگرن سی یہاں سے قریباً پچاس کلومیٹر دور ایک انتہائی خوبصورت صحت افزا مقام ہے۔ میونخ کا طبقۂ امرا یہ سیزن وہیں گذارتا ہے۔ وہاں پرویز کے ایک دوست ہانس کی سووینیئرز کی دکان ہے، ہم اسی کے ہاں ٹھہریں گے۔ اتفاق سے پرویز کا باس بھی آج ادھر ہی جا رہا ہے۔ ہم بڑے آرام سے اس کی کار میں چلے جائیں گے۔ پرویز نے اس سے بات کر لی ہے۔"

"کیا اس کے لئے مجھے بلیے وی ہائم آنا پڑے گا؟"

"نہیں تم یہیں ٹھہرو، ہم تمہارے پاس آرہے ہیں۔"

ٹیلیفون بند کر کے میں نے جلدی سے ناشتہ کیا اور پھر ہوٹل کے قریب واقع جنرل پوسٹ آفس چلا گیا جہاں میں نے اباجی کو خیریت کا خط لکھا اور استنبول میں اپنے دوست منور کو اپنی آمد کی تاریخ سے مطلع کرنے کے لئے تار دیا۔

واپسی پر میں نے اپنا سامان پیک کیا اور بلوں کی ادائیگی کے بعد لاؤنج میں بیٹھ کر ان کا انتظار کرنے لگا۔ انھوں نے آنے میں کافی دیر لگا دی تھی۔

"آؤف ویدر زین" (AUF WIEDER SEIN) کاؤنٹر کلرک نے کاروباری مسکراہٹ کے ساتھ مجھے "خدا حافظ" کہا اور میں پرویز و مسعود کے

ساتھ باہر نکل آیا۔

کار میں پرویز کا باس ایک بازو کھڑکی پر جمائے سگریٹ کے کش لگانے میں مصروف تھا۔ اس کی عمر چالیس بیالیس کے قریب تھی اور جسم پھولا پھولا سا تھا
بھوری رنگت [illegible] پر بھوری مونچھیں، بالکل بھالو [illegible] تھا۔

"گوٹن مارگن" میں نے اس کے قریب پہنچ کر دس بجے سے پہلے کا جرمن سلام کیا۔

اس نے مسکرا کر میرا استقبال کیا اور پھر اپنے برابر والی سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا "نیمن زی پلیز بیٹھئے" (تشریف رکھیے)۔

پرویز اور مسعود پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد کار شہر کی حدود سے نکل کر ہائی وے پر آگئی۔

"مجھے تمہارے دوست نے بتایا ہے کہ تم صحافی ہو، تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔" بھالو نے اپنے "مترجم" پرویز کی وساطت سے خیر سگالی کے یہ جذبات
مجھ تک پہنچائے۔

"کیا اسے واقعی انگریزی نہیں آتی یا یہ بھی پوز کر رہا ہے؟" میں نے پرویز سے پوچھا اور پھر تصدیق کے بعد کہا "میری طرف سے جو کچھ کہنا چاہو کہہ دو۔"

سو پرویز نے جی میں جو آیا اس نے کہہ دیا۔

"جب پرویز نے مجھے بتایا کہ تم صحافی ہو تو میں ڈر گیا۔ ہم جرمن لوگ صحافیوں سے بہت ڈرتے ہیں۔" اس نے خوش طبعی کا مظاہرہ کرتے ہوئے
گپ شپ کا آغاز کیا۔

"صحافیوں سے ڈرنے کی کیا بات ہے؟" میں نے بھی اسی ٹون میں پوچھا۔

"دراصل ہم لوگ اخبارات میں شائع ہونے والی خبروں پر بہت جلد ایمان لے آتے ہیں اور اسی لئے اپنے معاملے میں بھی ڈرتے رہتے ہیں کہ
کہیں کل کلاں ہمارے بارے میں بھی کوئی اسکینڈل اخبار میں شائع ہو جائے اور لوگ اس پر ایمان لے آئیں۔ اس سلسلے میں ایک جرمن لطیفہ بہت اچھا
ہے، سنو گے؟"

"سناؤ۔" مجھے یہ شخص خاصا دلچسپ لگا تھا۔

"ایک شیر جنگل میں سو رہا تھا کہ ایک بندر ادھر آنکلا اور اس نے جنگل کے بادشاہ کو سوتے دیکھ کر بے ادبی کرنے کی کوشش کی۔ اس پر شیر کی
آنکھ کھل گئی اور وہ اس کے پیچھے بھاگا۔ بندر بھاگتا ہوا ایک پارک میں گھس گیا جہاں لوگ بنچوں پر بیٹھے اخبار پڑھنے میں مشغول تھے۔ بندر نے بھی ایک اخبار
پکڑا اور ان کے درمیان بیٹھ گیا۔ اتنے میں شیر ہانپتا ہوا وہاں پہنچا اور بندر کی پشت کی جانب کھڑے ہو کر پوچھا "تم نے یہاں کوئی بندر تو نہیں دیکھا؟"
بندر نے اخبار چہرے کے سامنے رکھتے ہوئے پوچھا۔
"تم اس بندر کے بارے میں تو نہیں پوچھ رہے، جس نے شیر کے ساتھ بے ادبی کی ہے؟"
اس پر جنگل کے بادشاہ کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور اس نے گھبراہٹ کے عالم میں کہا "بیڑہ غرق کیا یہ خبر اخبار میں شائع ہو گئی ہے؟"

اس پر ہم سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

"تمہارا دوست بہت اچھا شخص ہے۔ انتہائی محنتی اور دیانت دار ہے۔" بھالو نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ اس کا اشارہ پرویز کی طرف تھا۔

"یہ تو مجھ سے پوچھو۔" مسعود نے مجھے مخاطب کر کے ہنستے ہوئے پنجابی میں کہا۔ "یہ محنتی تو یقیناً بہت ہے لیکن بکرے کی ران جو اس ریستوران کی سب
سے مہنگی ڈش ہے نہ صرف یہ کہ روزانہ چوری چھپے پوری کی پوری کھا جاتا ہے بلکہ ہائم کے تمام مکینوں کو ڈبل روٹی مکھن اور انڈوں وغیرہ کے علاوہ بکرے کی
ران والے راشن میں بھی اپنے ساتھ برابر شریک کرتا ہے۔ کئی دفعہ یہ سیروں کے حساب سے دودھ اور دہی بھی سپلائی کرتا ہے اور اوپر سے کہتا ہے کہ نیک
کام کر رہا ہوں ——— اس کے مالک کو پتہ چلے تو ابھی چلتی گاڑی سے اسے نیچے پھینک دے۔"

گاڑی ہائی وے سے اتر کر ایک بل کھاتی چھوٹی سڑک پر آگئی تھی۔ یہ سڑک دونوں طرف سے درختوں میں گھری ہوئی تھی اور ان کی شاخوں نے سائبان

کی طرح سڑک پر سایہ کیا ہوا تھا۔ اب قدرے چڑھائی شروع ہو گئی تھی۔ اور پھر تھوڑی دیر بعد ہم ٹیگرن سی میں تھے۔ مجھے یہاں پہنچ کر یوں لگا جیسے جاگتے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ تاحد نظر پھیلی ہوئی وسیع و عریض "جھیل" کے ساتھ ساتھ پہاڑیوں کے سلسلے تھے جو پھولوں سے لدے ہوئے تھے۔ اگرچہ یہ جگہ زیادہ بلندی پر نہ تھی اس کے باوجود یہاں ابھی خاصی خنکی تھی۔ پرویز کے باس نے اس کے اشارے پر ایک جگہ کار کھڑی کر دی اور ڈکی سے سامان نکال کر "دانکے ویل" (شکریہ) کہتے ہوئے ہم رخصت ہونے لگے تو اس نے گرم جوشی سے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا "اگر تم چاہو تو آج رات میری کاٹیج میں بسر کر سکتے ہو!" میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور پھر اس کی کار خاموش وادی کی پرسکون فضاؤں میں ہلکا سا ارتعاش پیدا کرتی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

اب ہم اس پرسکون بستی کے چھوٹے سے بازار میں تھے۔ یہاں لکڑی کی بنی ہوئی دکانیں تھیں اکا دکا لوگ باسکٹ ہاتھ میں لئے سودا سلف خریدنے میں مشغول نظر آتے تھے۔ ایک دکان پر پوسٹ کارڈز اور اس وادی سے متعلق سووینیرز شوکیس میں سجے ہوئے تھے اور اندر پچیس چھبیس سال کا ایک خوبرو نوجوان کھڑا تھا ـــــ یہ ہانس تھا۔ وہ پرویز کو دیکھتے ہی آگے بڑھا اور کہا "............" یہ ٹھیٹھ پنجابی میں ایک موٹی گالی تھی اور بعد میں پتہ چلا کہ یہ سکھانے والا خود پرویز ہی ہے۔

تعارف پر اس نے مجھ سے اور مسعود سے بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا اور پھر دکان بند کر کے ہمارے ساتھ جھیل کے کنارے چلا آیا۔ اس کی اس حرکت پر میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

"مجھے تو یہ شخص اپنی عادات سے پاکستانی لگتا ہے۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتا کہ یورپ میں کوئی شخص اپنے کسی دوست کی آمد پر یوں دکان بند کر کے اس کے ساتھ چل پڑے۔" میں نے پرویز سے کہا۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں، یہ آدھا پاکستانی ہے۔ اسے یوں بھی پاکستان اور پاکستانیوں سے عشق ہے، یہ کہتا ہے کہ جب تم پاکستان واپس جاؤ تو مجھے بھی اپنے ساتھ لے جانا، میں وہیں آباد ہونا چاہتا ہوں خصوصاً جب سے میں نے اسے بتایا ہے کہ وہاں چرس وافر مقدار میں اور قریباً مفت ملتی ہے تو یہ کہنے لگا ہے کہ جلد پاکستان چلو ورنہ تمہارے غیر قانونی قیام کے بارے میں پولیس کو مطلع کر دوں گا۔"

جھیل کے کنارے ایک ریستوران تھا اور اس کے ساتھ ساتھ دور دور تک کرسیاں بچھی ہوئی تھیں جن پر رنگین سائبان تنے ہوئے تھے۔ یہاں بہت رونق تھی اور شہر کے ہنگاموں سے بچ کر اس وادی میں سکون کے چند لمحات گذارنے کے لئے آئے ہوئے لوگ اپنے بیوی بچوں اور بیاروں کے ساتھ کرسیوں پر ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔

"کیا پیو گے؟" ہانس نے مجھ سے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں پوچھا۔

"آپ جو بھی پلاؤ گے پی لوں گا۔" مجھے مسرت ہوئی تھی کہ جرمنی میں ایک شخص تو ایسا ملا جو غلاموں کے ساتھ ان کی زبان میں بات کر سکتا ہے۔

"ویسے میرا جی چائے پینے کو چاہ رہا ہے؟" میں نے اسے بتایا۔

"اور تم؟" اس نے مسعود سے پوچھا۔

"کوئی ٹھنڈی چیز پلاؤ۔" اس نے کھجلاتے ہوئے کہا دراصل اسے اندرون لوہاری کے حکیم نور احمد نے ہدایت کر رکھی تھی کہ وہ ہمیشہ ٹھنڈی چیزوں کا استعمال کرے۔

"تم سے تو پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں۔" ہانس نے پرویز کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا اور پھر ویٹر کو چائے اور جوس کے علاوہ "ام الخبائث" کا آرڈر دے دیا۔

ایک گھنٹے کی مسلسل مے نوشی کے بعد پرویز اور ہانس چہکنے لگے، خصوصاً پرویز ایک بار پھر مختلف روپ میں نظر آنے لگا تھا۔

"تمہارے باس کا کیا حال ہے؟" ہانس نے اس سے پوچھا۔

"ہم اسی کے ساتھ یہاں آئے ہیں، کل واپسی بھی اسی کے ساتھ ہوگی۔"

"یہ تمہارا باس کیسا آدمی ہے، مجھے تو بہت شریف سا انسان لگتا ہے۔" میں نے پرویز سے پوچھا۔

"یہ اتنا ہی شریف ہے جتنا میں ایماندار ہوں۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا "میں سارے ریستوران میں سب سے زیادہ محنت کرتا ہوں مگر یہ میری مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مجھے سب سے کم پیسے دیتا ہے۔"

"تم اس کے ہاں معمولی سے ملازم ہو مگر میں نے دیکھا ہے کہ وہ تمہارے ساتھ برابری کا سلوک کر رہا تھا۔ پھر اس نے میرے ساتھ بھی خاصے حسن سلوک کا مظاہرہ کیا ہے، خدا جانے تم یہ بات کیسے کہہ رہے ہو؟"

"پاکستان اور یورپ کے سرمایہ دار میں یہی فرق ہے۔" پرویز نے کہا "یہ لوگ حتی المقدور مزدور کی عزت نفس مجروح نہیں ہونے دیتے کیونکہ انھیں ماہرین نفسیات نے بتایا ہے کہ اس صورت میں تم ان سے زیادہ کام لے سکتے ہو اور پھر سوشلزم کے خوف نے بھی انھیں کافی سیدھا کر رکھا ہے چنانچہ اب یہاں "ہنس مکھ سرمایہ داری" نافذ ہے۔ باقی آپ کے ساتھ خوش کلامی کی ایک وجہ وہ بھی تھی جو اس نے بندر اور شیر والے لطیفے میں خود ہی بیان کر دی تھی، ورنہ وقت آنے پر یہ کسی سے کم سؤر نہیں ہے۔"

برابر والی میز پر ایک ادھیڑ عمر جرمن اور اس کی بیوی کھانا کھا رہے تھے۔ مرد نے کھانا کھاتے ہوئے جیب سے رومال نکال کر ناک پر رکھا اور زور سے "سُوں" کیا۔ یہ "سوں" کی آواز اس قدر زوردار تھی کہ ہم لوگوں نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس نے بڑے اطمینان سے ایک بار اور "سوں" اور پھر وہی رومال جیب میں ڈال کر پہلے جیسے یکسوئی کے ساتھ کھانا کھانے میں مشغول ہو گیا۔

"یہ جرمن قوم بھی خالص جٹ ہے۔" پرویز نے ہنستے ہوئے کہا "یہ لوگ رکھ رکھاؤ اور آداب محفل کا کم ہی خیال رکھتے ہیں۔"

"سوں" ایک بار پھر مرد نے ناک سنکی اور اب کے گھن گرج پہلے سے زیادہ تھی۔ اس بار میری ہنسی چھوٹ گئی۔

جب اس نے تیسری بار بھی حرکت دہرائی تو پرویز اپنی جگہ سے اٹھ کر لڑکھڑاتا ہوا اس کی میز کی طرف گیا اور کہا "اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک بار پھر اپنے فن کا مظاہرہ کریں۔ میرا دوست آپ کی اس پرفارمنس سے بہت محظوظ ہوا ہے۔"

مرد نے بُرا سا منہ بنایا اور پھر خاموشی سے کھانا کھانے میں مشغول ہو گیا۔ وہ غالباً جان گیا تھا کہ یہ مردِ ناداں اس وقت نشے میں ہے۔

"پرویز، تم اپنی ان حرکتوں سے کسی دن بُری طرح پٹو گے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"پٹو گے کیا مطلب؟ یہ ایک مرتبہ بُری طرح پٹ چکا ہے۔" ہانس مجھ سے مخاطب ہوا۔ "ایک دن یہ شراب میں بُری طرح دھت تھا، ہائم سے نکلا اور سڑک پر اسے جو پہلی لڑکی نظر آئی، اسے لپٹا کر پٹاخ پٹاخ شروع ہو گیا۔ یہ جو اس کے سر کے ایک حصے سے بال اڑے ہوئے ہیں، یہ اسی واقعے کا شاخسانہ ہے۔"

"پاکستان میں تو یہ ایسا نہیں تھا۔"

"یہاں بھی یہ جب تک ہوش میں ہو بالکل ٹھیک ہوتا ہے۔ البتہ اس کے بعد اس کے بارے میں کوئی پیشین گوئی نہیں کی جا سکتی۔ ایک بار اس کے اصرار پر میں نے ایک لڑکی سے اس کی ڈیٹ طے کی۔ اگلے روز وہ لڑکی میرے پاس آئی اور کہنے لگی کہ اپنے دوست کو سمجھاؤ کہ ڈیٹ پر کپڑے پہن کر آیا کرتے ہیں۔"

اس پر پرویز نے بھرپور قہقہہ لگایا اور کہا "اس کی باتوں پر یقین نہ کرنا۔ اب یہ بالکل من گھڑت بکواس پر اتر آیا ہے۔"

"میں جو کچھ کہوں گا خدا کو حاضر ناظر جان کر کہوں گا۔" ہانس نے عدالت کے حلفیہ بیان کی طرح ہاتھ فضا میں بلند کرتے ہوئے شرارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا "اس کی ان حرکتوں کی تفصیل تو ابھی میں نے بیان ہی نہیں کی۔ ہمارے ہاں ایک لطیفہ ہے اور وہ غالباً اسی کے بارے میں

ہے — کیا تم سننا پسند کرو گے؟"

"سناؤ"، میں نے اس کے اندازِ بیان سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔

"اسی طرح کے ایک نوجوان نے اپنے دوست سے کہا کہ ایک لڑکی پر بُری طرح عاشق ہو گیا ہوں اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں مگر وہ گھاس نہیں ڈالتی، وہ بھی اسی رائڈنگ کلب کی ممبر ہے جس کا میں رکن ہوں چنانچہ روزانہ اسے دیکھتا ہوں اور روزانہ دل پکڑ کر بیٹھ جاتا ہوں۔ دوست نے پوچھا اس کی آنکھیں کس رنگ کی ہیں؟ عاشق زار نے بتایا کہ نیلے رنگ کی ہیں۔ اس پر دوست نے مشورہ دیا کہ تم اپنے گھوڑے کو نیلا رنگ کرالو چونکہ گھوڑا کبھی نیلے رنگ کا نہیں ہوتا اس لئے وہ دیکھ کر چونکے گی اور پھر تم سے پوچھے گی کہ تم نے اسے نیلا رنگ کیوں کرایا ہے؟ اس کے جواب میں تم کہنا کہ چونکہ تمہاری آنکھیں نیلی ہیں اور مجھے تم سے پیار ہے، اس لئے میں نے وارفتگی کے عالم میں اپنے گھوڑے کا رنگ بھی نیلا کر لیا ہے۔ اس پر وہ تمہاری طرف مائل ہو گی، پھر رفتہ رفتہ تم ایک دوسرے کے قریب آتے جاؤ گے اور پھر ایک دن مناسب موقع دیکھ کر اسے کہہ دینا کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے قوی توقع ہے کہ وہ انکار نہیں کرے گی۔ اس نوجوان نے یہ مشورہ پلے باندھا اور گھوڑے کو نیلا کرا کے دوشیزہ کا انتظار کرنے لگا۔ لڑکی نے وہ گھوڑا دیکھا تو حیران ہوئی، اس کے پاس آئی اور پوچھا "تم نے گھوڑے کو نیلا رنگ کیوں کرایا ہے؟" یہ سن کر نوجوان نے عالمِ اضطراب میں اسے کاندھوں سے پکڑا اور کہا "کیونکہ میں نے تم سے شادی کرنی ہے!"

"تم باز آجاؤ، نہیں تو میں بھی تمہاری عجوبۂ روزگار باتیں انہیں بتا دوں گا"۔ پرویز نے ہمارے ساتھ ہنسی میں شریک ہوتے ہوئے کہا۔ "میں انہیں بتاؤں گا کہ تم نے بے شمار لڑکیوں کی خواہش کو ٹھکراتے ہوئے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی۔"

"بتا دو، اس میں چھپانے کی کون سی بات ہے۔"

"تو پھر سنو" پرویز نے چہکتے ہوئے کہا۔ "ہانس کہتا ہے کہ میں اس لڑکی سے شادی کروں گا جس نے کبھی کسی غیر مرد کے فلیٹ میں رات بسر نہ کی ہو۔ پاکستان سے محبت اور وہاں آباد ہونے کی شدید خواہش کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس کا خیال ہے وہاں ایسی عورتیں مل جاتی ہیں۔"

"کیا پرویز سچ کہتا ہے؟" میں نے حیرت زدہ نظروں سے ہانس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں! لیکن اس میں حیران ہونے کی کون سی بات ہے۔" اس نے یوں پوچھا جیسے اس میں حیران ہونے کی واقعی کوئی بات نہیں۔

"مجھے واقعی حیران نہیں ہونا چاہیئے"۔ میں نے اس دلچسپ شخص کی اس دلچسپ خواہش سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا "کیونکہ جب تم ہماری خاطر دکان بند کر کے یہاں چلے آئے تھے اس پر پرویز نے میرے استفسار پر بتایا تھا کہ یہ شخص اپنی عادات سے آدھا پاکستانی ہے، لیکن تمہاری یہ بات سن کر میرا خیال ہے کہ تم آدھے نہیں پورے پاکستانی ہو۔ ہم پاکستانی مرد بھی ساری عمر کاسانووا کی طرح گذارنے کے بعد شادی کے لئے کوئی مریم تلاش کرتے ہیں، تم یورپ میں ہمارے واحد نمائندے ہو۔"

"واحد نہیں، بلکہ اس جیسے اور بھی بے شمار لوگ یورپ میں موجود ہیں، جو اس جوہڑ میں کنول کے پھول تلاش کرتے ہیں اور کسی ایک کو تو واقعی مل بھی جاتے ہیں!" پرویز نے کہا۔

اس اثنا میں سامنے والی میز پر بیٹھے ادھیڑ عمر جوڑے نے کھانا ختم کر لیا تھا۔ مرد نے بل ادا کرنے کے بعد اپنی میز سے اٹھتے ہوئے زور سے کھنکار کر اپنی طرف متوجہ کیا اور جب ہم نے اُدھر دیکھا تو اس نے پرویز پر ایک ستم ظریفانہ نگاہ ڈالتے ہوئے جیب میں سے رومال نکالا اور ناک پر رکھ کر پوری قوت سے "سوں" کر کے دوبارہ جیب میں ڈال لیا۔ اور پھر اپنی بیوی کا بازو تھام کر گھنے درختوں میں سے گذرنے والی پگڈنڈی میں گم ہو گیا!

کھانا کھانے کے بعد ہم لوگ کافی دیر تک بوٹنگ کرتے رہے۔ جھیل کے کنارے کے ساتھ ساتھ دور تک لکڑی کے چھوٹے چھوٹے خوشنما گھر بنے ہوئے تھے جن کے مکین باہر بنچوں پر بیٹھے تھے۔ سرسبز و شاداب پہاڑوں کے دامن میں سے گذرتی ہوئی جھیل کی سیر کرتے ہوئے ہم دور تک نکل گئے

حتیٰ کہ واپسی پر شام ہو گئی، سورج غروب ہونے کا منظر کچھ ایسا دلفریب تھا کہ ہمارے سمیت بہت سے لوگ اس منظر میں کھوئے ہوئے تھے۔ واپسی پر ہانس کی رہائش گاہ کی طرف جاتے ہوئے ہم چھوٹی سی سڑک کے دونوں طرف بنے ہوئے خوبصورت مکانوں کو دیکھ رہے تھے جو سبز بیلوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ لال رنگ برنگے پھولوں سے بھرا ہوا تھا۔ ان مکانوں کے جن حصوں میں پھول اگنے کی گنجائش نہ تھی وہاں گملوں میں پھول سجا دیئے گئے تھے پھولوں کی اس وادی میں تھوڑی دیر بعد چاند اتر آیا تھا۔ اور چاند جیسے چہرے گھنے درختوں کے تاریک سایوں میں سے تھوڑی دیر بعد یوں نمودار ہوتے جس طرح بدلیوں کی اوٹ میں سے چاند نکلتا ہے۔ ذرا آگے چل کے ہم بائیں جانب ایک پگڈنڈی پر مڑ گئے۔ یہ ایک کھلا جنگل تھا جو چاروں طرف سے رنگ برنگے پتوں والے درختوں میں گھرا ہوا تھا۔

"آج کی رات کے لئے میرا گھر اس جنگل میں ہے۔" ہانس نے سامنے ایک خیمے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "کل میرا یہ خیمہ کسی اور جگہ نصب ہوگا اور پرسوں تم اسے کہیں اور دیکھو گے۔"

"جہاں تک میں جانتا ہوں، یورپ میں مخصوص مقامات کے علاوہ کہیں خیمے نصب کرنے کی اجازت نہیں ہے۔"

مجھے بستی کے سارے لوگ جانتے ہیں، وہ بھی جن کا کام محاسبہ کرنا ہے۔ مجھے پرویز نے بتایا تھا کہ پاکستان میں سب چلتا ہے، تم لوگوں کو یہ علم نہیں کہ کچھ نہ کچھ یہاں بھی چلتا ہے۔"

ہم گردن نیہوڑا کر خیمے میں داخل ہو گئے۔

"مجھے ایک بستر ہمیشہ فالتو رکھنا پڑتا ہے تاکہ شادی کے لئے مطلوبہ لڑکی تک کبھی رسائی نہ ہو سکے۔" ہانس نے ہنستے ہوئے کہا "تاہم آج کی رات میرے خیمے میں ایک کی بجائے اکٹھے تین مہمان ہوا گئے۔ ڈڈ"

میں نے خیمے کا جائزہ لیا، اس میں تین افراد تو بخوبی سما سکتے تھے، البتہ پتہ تھے نا مستقبل نا صا مخدوش تھا۔

"میں باہر کھلے آسمان میں پتوں کے بچھونے پر سوؤں گا۔" میں نے ہانس سے کہا۔

"رات کو خنکی اتنی بڑھ جائے گی کہ صبح جولاہے کے جوائی کی طرح ہنستے پائے جاؤ گے۔" مسعود نے مسکراتے ہوئے مجھے صحیح صورت حال سے آگاہ کیا۔

"مجھے خنکی پسند ہے۔" میں نے کہا اور کھڑکھڑاتے پتوں پر بیٹھ گیا۔

"تو پھر میں بھی تمہارے ساتھ ہی سوؤں گا، مجھے حکیم نے ٹھنڈی ......"

"کھڑک!" میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ لیکن بیشتر اس کے کہ میں کوئی عذر تراش کر اسے خیمے میں سونے پر مجبور کرتا، پرویز میری کمک کو پہنچا اور اس نے کہا "مجھے عطا صاحب سے ضروری باتیں کرنا ہیں، تم اندر ہانس کے ساتھ سو جاؤ۔"

پرویز کی آنکھیں نشے سے بوجھل ہو رہی تھیں اور زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

ہانس نے ایک بستر اور کمبل خیمے سے لا کر باہر بچھا دیا۔ بستر تو اس کے پاس فالتو تھا لیکن کمبل ایک ہی تھا اور وہ اس نے اپنے مہمانوں کے لئے سرنڈر کر دیا تھا۔ میں نے ایک بار پھر سوچا کہ یہ شخص پاکستانی ہے اور اس کا نام ہانس نہیں بلکہ عبدالشکور وغیرہ ہے!

"آپ صبح واقعی استنبول جا رہے ہیں؟" پرویز نے میرے برابر لیٹتے ہوئے کہا اس کی آواز میں گہرے غم کی جھلک نمایاں تھی۔ ہانس اور مسعود خیمے میں چلے گئے تھے۔

"ہاں!"

"پھر وہاں سے پاکستان جائیں گے؟"

"ہاں!"

"اس عرصہ میں آپ نے اباجی اور بہن بھائی آپ کے لیے اداس ہوگئے ہوں گے؟"

"ہاں! میں نے اس کے لہجے کے کرب کو محسوس کر لیا تھا، سو میں نے موضوع بدلنے کے لیے کہا۔" تمہیں مجھ سے کچھ ضروری باتیں کرنا تھیں۔

"ہاں!" کے بجائے اس نے گونگا لفظ ادا کیا اور پھر کروٹ بدل کر اپنے بازو میری گردن میں حمائل کر دیے اور اپنا سر میرے سینے میں چھپا لیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا لیکن وہ کچھ کہے بغیر اپنا آپ مجھ میں چھپائے سو گیا تھا۔

اگلے روز پرویز اور مسعود استنبول کو جانے والی اورینٹ ایکسپریس میں مجھے سوار کرانے کے لیے سٹیشن پر موجود تھے۔ گاڑی چلنے کو تھی، مسعود نے کہا "اگر میرے گھر والے میرے بارے میں پوچھیں تو انھیں بتانا کہ وہ وہاں بہت ٹھاٹھ کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ اس کے پاس بھی کار ہے، ٹیلیویژن ہے، ریفریجریٹر ہے اور وہ ایئر کنڈیشنڈ مکان میں رہتا ہے۔ انھیں "بابے دی ہائم" کے بارے میں کچھ نہ بتانا۔"

پرویز نے مجھ سے گلے ملتے ہوئے کہا "میرے بارے میں تم سے کوئی دریافت نہیں کرے گا، اور اگر کوئی پوچھے تو بتا دینا کہ وہ وہاں بھی بابے دی ہائم ہی میں رہتا ہے۔"

گاڑی پلیٹ فارم سے سرکنے لگی تھی اور میں نے بڑے بڑے شیشوں والی کھڑکی میں سے باہر جھانک کر دیکھا تو لگا بابے دی ہائم کے سارے مکین پلیٹ فارم پر جمع ہیں۔ ان کی زبانیں ساکت تھیں اور چہرے بول رہے تھے۔ "بابے دی ہائم کی دیواریں اور چھتیں خستہ ہو گئی ہیں۔ یہ عمارت منہدم ہونے والی ہے۔ ہم زیادہ دیر تک بے گھر نہیں رہیں گے۔ وہ ہمیں زیادہ دیر تک ہمارے گھروں سے دور نہ رکھ سکیں گے۔ ہم اپنے گھروں کو لوٹیں گے۔ ہم اپنے وطن کو لوٹیں گے!" ختم

رفیق خاور جسکانی



بنامِ جنس یہ موجِ سبو ٹھہر جائے
اب آدمی کا یہ بہتا لہو ٹھہر جائے

کوئی سبیل! کہ سیلِ جفا کی راہ رُکے
کوئی گھٹا! کہ بلاخیز لُو ٹھہر جائے

ہر ایک صبح جفا لائی آج حشر کا دن
شبِ حساب اُتر! ہاؤ ہو ٹھہر جائے

یہ سیلِ وقت ہے، جبر و ستم سے کیسے رُکے
خزف سے کیسے رمِ آبجو ٹھہر جائے

خرام! اے مرے جذبوں کی آتشِ سیّال
کسے مجال ترے روبرو ٹھہر جائے

وہیں پکار مجھے جذبِ نارسائی شوق
جہاں مرا سفرِ جستجو ٹھہر جائے

مِلے بھی یا نہ مِلے اب وہ صبحِ عہدِ نجات
کبھی تو کشمکشِ ما و تُو ٹھہر جائے

چمن سے چاہتے ہیں آج صاحبانِ چمن
کہ شاخ شاخ پہ جوشِ نمو ٹھہر جائے

اُسے بتاؤں مآلِ فریبِ چارہ گری
جو چارہ گر سے مری گفتگو ٹھہر جائے

کسی مقام پہ اُس کو قرار تو آئے
کہیں تو وہ بُتِ آشفتہ خُو ٹھہر جائے

لہو بہن کے یہ مٹّی نے دی ہے پھر آواز
عدُو سے وعدۂ تیغ و گلو ٹھہر جائے

رہِ وفا کے اُجالوں کے سامنے خاورؔ
محال ہے کہ شبِ حیلہ جُو ٹھہر جائے

ظہور نظر



اُمیدِ رحم بھی، خطرہِ عتاب کا بھی ہے
طلب گناہ کی، سودا ثواب کا بھی ہے

اُنھی کے ہاتھ ہیں خلقِ خُدا کے خون سے تر
جنھیں شعور خدا کے عذاب کا بھی ہے

رقیب کو بھی ہے شکوہ مری انا کا بہت
یہی گناہ مرے سر جناب کا بھی ہے

یہی نہیں کہ تمھی غیر لگ رہے ہو مجھے
گمان مجھ کو حقیقت پہ خواب کا بھی ہے

لیا ہے قرض بھی کچھ ہم نے کربِ درد بہت
کچھ اس کے ضمن میں گھپلا حساب کا بھی ہے

گھرا تھا مجھ پہ وہ کل رات ابر کے مانند
ہوا میں آج مزا موجِ آب کا بھی ہے

عبورِ بحرِ ملاقات کا کیا، تو کھُلا
ابھی تو راہ میں صحرا حجاب کا بھی ہے

سنبھل کے ہاتھ گلوں کی طرف بڑھا گلچیں!
کہ صحنِ باغ میں پودا گلاب کا بھی ہے

تمام دوش سیہ رات کو نہ دو، یارو!
سحر کے قتل میں ہاتھ آفتاب کا بھی ہے

ہوا تھی تیز تو آیا وجود میں کیوں تھا
قصور اپنی قضا میں حباب کا بھی ہے

نظر ملائے گا وہ جب بھی، میں تو بھولوں گا
کہ اُس کی آنکھ پیالہ شراب کا بھی ہے



گھرا تھا ابر تو گرمی شدید کتنی تھی
پڑا نہ ایک بھی چھینٹا، اُمید کتنی تھی

وہ مجھ کو ڈال کے زنداں میں پوچھتا ہے بتا
تری رہائی کی مہلت مزید کتنی تھی

گلی گلی میں بھرے زلزلے کی صورت لوگ
گرا نہ ایک بھی ایواں، شنید کتنی تھی

زمینِ دشت نے چومے نقوشِ پا جن کے
اُنھی کی شہر میں مٹی پلید کتنی تھی

نہ اُس نے ہاتھ بڑھایا نہ میں نے تھاما ہاتھ
قریب ہو کے بھی منزل بعید کتنی تھی

بچھڑ کے تجھ سے ملا پھر مرا پتہ مجھ کو
ترے فراق کی ساعت سعید کتنی تھی

خوشی نہ آئی میسّر تو خوش خیال ترے
تھے اس پہ خوش کہ خوشی کی نوید کتنی تھی

• پسِ خیال وہی کہنہ سال جذبے ہیں
غزل نظرؔ کی بظاہر جدید کتنی تھی

قتیل شفائی



تھوڑا سا غمِ ترکِ محبت ہے مجھے بھی
شرمندہ جو تو ہے تو ندامت ہے مجھے بھی

میں تیری طرح دل کو سمجھتا نہیں شیشہ
ورنہ اسی دنیا سے شکایت ہے مجھے بھی

میں بھی ہوں اسی دور کا سہما ہوا انساں
تھوڑے سے تبسم کی ضرورت ہے مجھے بھی

جب زخم لگے، رقص کے انداز میں تڑپوں
قاتل کی طرف سے یہ ہدایت ہے مجھے بھی

نازک جو ترا دل ہے تو میں بھی نہیں پتھر
تنہائی میں رو دینے کی عادت ہے مجھے بھی

پہلے ہی قطاریں سی لگی ہیں ترے در پر
میں کیسے کہوں، تجھ سے محبت ہے مجھے بھی

دانا ہیں ترے دوست، پر اے مصلحت اندیش
حاصل دلِ ناداں کی حمایت ہے مجھے بھی

معمول سے اونچی مری پا پوشش بنانا
درکار بڑا سا قد و قامت ہے مجھے بھی

فارغ ہو تو آ جاؤ کہ ہم پیار ہی کر لیں
کچھ روز سے اس کھیل کی فرصت ہے مجھے بھی

جس شخص نے بیچا ہے قتیلؔ اپنی انا کو
اس شخص کی اوقات سے نفرت ہے مجھے بھی

اطہر نفیس



کبھی سایہ ہے، کبھی دھوپ مقدر میرا
ہوتا رہتا ہے یونہی قرض برابر میرا

ٹوٹ جاتے ہیں کبھی میرے کنارے مجھ میں
ڈوب جاتا ہے کبھی مجھ میں سمندر میرا

کسی صحرا میں بچھڑ جائیں گے سب یار مرے
کسی جنگل میں بھٹک جائے گا لشکر میرا

باوفا تھا، تو مجھے پوچھنے والے بھی نہ تھے
بے وفا ہوں، تو ہوا نام بھی گھر گھر میرا

کتنے ہنستے ہوئے موسم ابھی آتے لیکن
ایک ہی دھوپ نے کمھلا دیا منظر میرا

آخری جرعۂ پُر کیف ہو شاید باقی
اب جو چھلکا تو چھلک جائے گا ساغر میرا

رضی اختر شوق

○

یہ کون ڈوب گیا اور اُبھر گیا مجھ میں
یہ کون سائے کی صورت گزر گیا مجھ میں

یہ کس کے سوگ میں شوریدہ حال پھرتا ہوں
وہ کون شخص تھا ایسا کہ مر گیا مجھ میں

عجب ہوائے بہاراں نے چارہ سازی کی
وہ زخم جس کو نہ بھرنا تھا، بھر گیا مجھ میں

وہ آدمی کہ جو پتھر تھا، جی رہا ہے ابھی
جو آئینہ تھا وہ کب کا بکھر گیا مجھ میں

وصال کیا کہ وہ جب بھی قریب سے گزرا
تو یوں لگا کہ کوئی رقص کر گیا مجھ میں

وہ ساتھ تھا تو عجب دھوپ چھاؤں تھی تھی
بس اب تو ایک ہی موسم ٹھہر گیا مجھ میں

○

میں جس کا جہاں بھی ہمسفر ہوں
اک لمحہ ہوں اور عمر بھر ہوں
منزل کا سراغ کب ملے گا؟
اے ناقہ وقت، در بدر ہوں
جب میں ہی نہیں تو عکس کیسے
میں ہی تو تماشہ شیشہ گر ہوں
تو سیل ہے اور بے حقیقت
میں خواب ہوں اور معتبر ہوں
تو رنگ ہے اور رائیگاں ہے
میں خاک ہوں اور کوزہ گر ہوں
یارب! میں سوادِ آگہی تک
پہنچا ہوں کہ اب بھی بے خبر ہوں
اے نکہت میر! کچھ عطا ہو
میں تیرے نفس سے تازہ تر ہوں
کچھ میری طرف بھی، روحِ غالب
میں بھی تری خاکِ رہ گزر ہوں
ہوں شعر میں فیض کے نسب سے
گو اپنی ہی ذات کا ثمر ہوں
مدنی سے عجیب نسبتیں ہیں
وہ دریا ہے اور میں گہر ہوں
جو دھوپ میں جل کے چھاؤں دے شوق
اس نسل کا آخری شجر ہوں

نور بجنوری



مرے سازِ جنوں میں پھر وہی آہنگ آئے گا
وہاں سو گل کھلا دوں گا جہاں اک سنگ آئے گا

ہوا کی بند مٹھی میں انوکھی خوشبوئیں ہوں گی
عروسِ شب کی آنکھوں میں نرالا رنگ آئے گا

ابھی تو پاؤں میں کانٹے چبھیں گے وضع داری کے
ابھی تو راہ میں صحرائے نام و ننگ آئے گا

کلیمِ عصر ہوں گے ہم تو اپنے سانپ لے کر
کبھی کشناگ آئے گا، کبھی ارژنگ آئے گا

سنو! میں آج رد کرتا ہوں ہر جھوٹی شرافت کو
یہاں اب جو بھی آئے گا، وہ بہرِ جنگ آئے گا

میں آئینوں کی بستی میں قدم رکھنے سے ڈرتا ہوں
نظر آیا نہ میں خود کو تو دل پر زنگ آئے گا

لیے پھرتے ہو سچائی کے پتھر نورؔ تم اب تک
تمھیں کب زندگی کرنے کا آخر ڈھنگ آئے گا



سمندر پی کے بھی پیاسا رہوں گا
میں تشنہ لب سدا تشنہ رہوں گا

کوئی منزل، مری منزل نہیں ہے
جیوں گا جب تلک چلتا رہوں گا

ہوا کے ساتھ بھٹکوں گا بنوں میں
خرد مندوں سے رم خوردہ رہوں گا

تلوّن سے مرے جوہر کھلیں گے
کبھی ذرّہ، کبھی صحرا رہوں گا

کبھی تنہائی میں محفل سجے گی
کبھی محفل میں بھی تنہا رہوں گا

اڑے گا لاکھ رہوارِ زمانہ
میں اس کی پشت پر بیٹھا رہوں گا

رہوں گا اس چمن میں نورؔ جب تک
مثالِ برگِ آوارہ رہوں گا

نُورؔ بجنوری



کسی تنور سے لاوا اُبلنے والا ہے
تمام شہر کوئی پل میں جلنے والا ہے

میں سُن رہا ہوں بگولوں میں آہٹیں اُس کی
وہ کارواں جو مرے ساتھ چلنے والا ہے

کچھ اور چیخ کے رونے لگی ہے شہنائی
کسی گلی سے جنازہ نکلنے والا ہے

چھپا نہ یوں وہ ستارے میں اپنی آنکھوں میں
کہ جن کو صبح کا سُورج نگلنے والا ہے

اُٹھو کہ پائے طلب ٹوٹنے ہی والے ہیں
چلو کہ قافلۂ زیست چلنے والا ہے

بھڑک اُٹھی ہے چٹانوں میں آگ، کہتے ہیں
سنا ہے برف کا دریا پگھلنے والا ہے

بلند و پست سبھی جیسے انتظار میں ہیں
مزاجِ گردشِ دوراں بدلنے والا ہے



آم کے بور کی خوشبو تھی ترے ہونٹوں میں
آج بھی ایک مہک سی ہے مرے سانسوں میں

وہ مرے ذہن پہ چھائی ہوئی رنگوں کی گھٹا
بانکپن شام اودھ کا وہ تری زُلفوں میں

عمر بھر میں نے زمانے کو اُجالے بخشے
تُو سمٹ آئی تھی اک پل کو مری باہوں میں

کون سی رات جُدائی کی نہ دیوار گری
کون سی رات نہ تُو آئی مرے خوابوں میں

ہم جو بچھڑے تو ہمیشہ کے لیے بچھڑیں گے
ایسی تحریر تو اُس وقت نہ تھی ہاتھوں میں

میں جو پروائی کے سینے سے لپٹ کر رویا
تیرے آنچل کی صدا آئی مری آنکھوں میں

اے مرے شہر! سنا دینا انھیں مری غزل
کوئلیں کوک رہی ہیں جو ترے باغوں میں

شبنم رومانی



ہوا ڈھونڈتی ہے کہ یہ چور سا کون زینے میں ہے
کرن پوچھتی ہے کہ میری انی کس کے سینے میں ہے

اُدھر بر غباری اُڑاتی ہے آنگن میں چھپا کے پھول
اِدھر میرا سارا بدن ڈوبا ڈوبا پسینے میں ہے

چٹختی چٹانوں کا اب شور ہے آبگینہ آئینہ
دھڑکتا ہوا زلزلہ آج ہر آبگینے میں ہے

اچانک اندھیرے میں ہاتھ آگئی اک مچلتی کرن
سفر در سفر اک عجب تجربہ میرے سینے میں ہے



ذہن و فکر پر پہرے، چشم و لب پہ قدغن ہے
نفس کی شرافت بھی آدمی کی دشمن ہے

آگ میری قسمت بھی، آگ تیری قسمت بھی
زندگی بہر صورت روز و شب کا ایندھن ہے

سانپ جیسے بل کھاتے راستوں کا راہی ہوں
اِرد گرد میلوں تک، خواہشات کا بن ہے

یہ تمام چہرے ہیں پھول میری کیاری کے
یہ بھری پڑی دُنیا میرے گھر کا آنگن ہے

محمد نبی خان جمال سویدا



سوز و گدازِ عشق سے ہم خاک ہو گئے
ایسے بھی آدمی تھے کہ پتھر بنے رہے

آتی تھی جن کی سانس سے مہر و وفا کی بو
ہر راستے میں ایسے کئی اجنبی ملے

دراصل فرطِ تشنہ لبی کا ثبوت ہے
چھوڑ آئے میکدے میں پیالے بھرے ہوئے

شمس و قمر بھی پھرتے ہیں جن کی تلاش میں
وہ آشنائے رازِ جنوں کس طرف گئے

بے رنگیِ حیات کا شکوہ نہیں رہا
جتنے بھی رنگ تھے ترے دامن میں بھر دیئے

واماندگی بھی عشق میں رفتار دے گئی
پیچھے ہٹے ہم ایسے کہ آگے نکل گئے

یہ بھی ستم ظریفیِ تہذیب ہے جمالؔ
ہم وحشیوں کے واسطے شیشے کے گھر بنے

پیر اکرم



خشک تیری چاہتوں کے جب سمندر ہو گئے
ذہن صحراؤں میں کتنے نور پیکر ہو گئے

درد کی بارش سے نکھری یوں فضائے شہرِ دل
دھل گئے دھندلے دریچے، صاف منظر ہو گئے

کرب کے جنگل سے نکلے غول حرف و صوت کے
شہرِ لب کی سرحدیں چھوتے ہی پتھر ہو گئے

سیم و زر سے دے رہے ہیں چاہتوں کی بولیاں
اب امیرِ شہر، بستی کے گداگر ہو گئے

محفلوں میں جو بڑھے تعظیم و استقبال کو
خلوتوں میں جب گئے وہ ہاتھ خنجر ہو گئے

پے بہ پے ہوتے ہیں نازل اب صحیفے درد کے
غم کی سولی پر چڑھے تو دل پیمبر ہو گئے

جمیلؔ ملک



راتوں کی سیاہی میں ضیا بار ہمیں تھے — جب سو گئے سب لوگ تو بیدار ہمیں تھے
یوں تو کئی قیدی تھے تری زلفِ رسا کے — ہاں جرمِ محبت کے سزاوار ہمیں تھے

صدیوں میں نہ پہچان سکیں تیری نگاہیں — ہم اول و آخر تھے، ترا پیار ہمیں تھے
اس دورِ سیہ کار میں یہ جرم نہیں کیا — معصوم تھے اتنے، کہ گنہگار ہمیں تھے

انصاف کا چرچا تو بہت ہم نے سُنا تھا — انصاف ہوا جب تو سرِدار ہمیں تھے
آج اپنی ہی تلوار سے مارے گئے تو کیا — کل تک تو ترے ہاتھ میں تلوار ہمیں تھے

دیوار گرائی تو یہ اب ہم نہ سوچا — جائیں گے کہاں، سایۂ دیوار ہمیں تھے
دیتے رہے ہر ظلم کی ہر روز گواہی — دنیا کے لئے نقش بہ دیوار ہمیں تھے

کس کس کو دکھایا نہیں حالات کا چہرہ — گمراہ تھے سب، آئنہ بردار ہمیں تھے
جو ایک تھا لاکھوں میں مگر سب کی زباں تھا — تاریخ کا وہ آہنی کردار ہمیں تھے

اس گنبدِ بے در میں لگاتے رہے آواز — سورج کی زباں، چاند کا اظہار ہمیں تھے
دیکھا کئے ہم راہ عبث راہنما کی — ہر دور میں خود قافلہ سالار ہمیں تھے

ترسے تو ملا ہم کو صدف بھی تہی آغوش
برسے تو جمیلؔ ابرِ گہر بار ہمیں تھے

جمیل ملک

○

اس کارگہِ زیست میں یہ کام تو کر جا
جینے کا سلیقہ نہیں آتا ہے تو مر جا

اس کوہِ ندا سے کوئی واپس نہیں آیا
جس سمت گئے یار ترے، تو بھی ادھر جا

ساحل پہ بھی لے آئے گی اک روز کوئی موج
مانندِ صدف بحر کے سینے میں اُتر جا

پہلے دلِ صد چاک کو اشکوں سے بھگو لے
پھر صورتِ گل شبنمِ شبنم میں سنور جا

تو میری ہی تخلیق سہی، یوں نہ مجھے دیکھ
لگ جائے نہ تجھ کو کہیں میری ہی نظر جا

ممکن ہے کہ اب کے تو ہی محرابِ نظر ہو
سجدہ گہِ الفت کی طرف بارِ دگر جا

جس مرکزِ ہستی پہ سمٹ آئی ہے دنیا
تو بھی وہاں دل تھام کے بادیدۂ تر جا

چلنا ہے تو پھر منزلِ مقصود کی کیا قید
تا وسعتِ دل ڈوب کے تا حدِ نظر جا

یہ چاند تو راہی ہے اسی منزلِ شب کا
تو منزلِ شب پر نہ ٹھہر، تا بہ سحر جا

تب منزلِ دل پر بھی نہ ٹھہرا تھا سفینہ
اب سرحدِ ادراک سے آگے بھی گزر جا

جس شہر کے لوگوں میں ہیں اب تک ترے چرچے
اس شہر میں لے کر کبھی سوغاتِ ہنر جا

○

رات کی بات کسی خوابِ طرب سے پوچھیں
حال اپنا بھی ترے گوشۂ لب سے پوچھیں

تیری آنکھیں بھی سمندر، ترے عارض بھی گلال
کون ڈوبا ہے کہاں، ہم تری چھب سے پوچھیں

کیسی فرصت میں تراشا ترا پیکر اس نے
سوچتے ہیں کہ کبھی ہم ترے رب سے پوچھیں

ہر کوئی شہر میں تھا چاہنے والا تیرا
راز کی بات بھی ایسی ہے کہ سب سے پوچھیں

لوگ وہ راہ بتائیں کہ بھٹکتے جائیں
گھر کا رستہ بھی ترے شہرِ عجب سے پوچھیں

تو محبت کو بھی اک حرفِ شکایت سمجھے
کیا تھی دستار تری شانِ غضب سے پوچھیں

تو بڑا ہے کہ ترا عشق بڑا ہے تجھ سے
تجھ سے پوچھیں کہ ترے نام و نسب سے پوچھیں

کس طرف سے مرا خورشیدِ سحر ابھرے گا
چاند اترا ہے کہاں، لیلیٰ شب سے پوچھیں

وہ جسے سُن کے جمیلؔ اور بھی شرما جائے
ہم وہی بات بڑے شوق و ادب سے پوچھیں

جمیل ملک





محفلیں خواب ہوئیں، رہ گئے تنہا چہرے
وقت نے چھین لیے کتنے شناسا چہرے

ساری دنیا کے لیے ایک تماشا چہرے
دل تو پردے میں رہے، ہو گئے رسوا چہرے

تم وہ بیدرد کہ مڑ کر بھی نہ دیکھا اُن کو
ورنہ کرتے رہے کیا کیا نہ تقاضا چہرے

کتنے ہاتھوں نے تراشے یہ حسیں تاج محل
جھانکتے ہیں در و دیوار سے کیا کیا چہرے

سوئے بُتوں کی طرح، جاگتی کلیوں کی طرح
خاک میں گم تو کبھی خاک سے پیدا چہرے

خود ہی ویرانیٔ دل، خود ہی چراغِ عقل
کبھی محرومِ تمنا، کبھی شیدا چہرے

خاک اڑتی بھی رہی، ابر برستا بھی رہا
ہم نے دیکھے کبھی صحرا، کبھی دریا چہرے

عیشِ امروز بھی، ہنگامۂ فردا بھی یہی
پیش کرتے رہے، ہر دور کا نقشہ چہرے

دیپ جلتے رہے ہر طاق پہ ارمانوں کے
کتنی صدیوں سے ہیں ہر گھر کا اجالا چہرے

ختم ہو جائے جنہیں دیکھ کے بیماریٔ دل
ڈھونڈھ کر لائیں کہاں سے وہ مسیحا چہرے

داستاں ختم نہ ہو گی کبھی چہروں کی جمیلؔ
حسنِ یوسف تو کبھی عشقِ زلیخا چہرے

صبح اِک قلزمِ سیال ہے، شام آئینہ
کبھی خورشید، کبھی ماہِ تمام آئینہ

حسنِ فطرت کے لیے قید نہیں ہے کوئی
حسنِ انساں کے لیے آپ ہی دام آئینہ

تو تصور میں مرے سامنے کھڑا ہو جیسے
بن گیا دل کے لیے تیرا پیام آئینہ

اس میں شاید تجھے اپنی کوئی پہچان ملے
آنکھ اٹھا، دیکھ لے وہ برسرِ عام آئینہ

دیکھنے آئے وہ رشکِ مہ و خورشید اگر
یہی شبنم، یہی آنسو، یہی جام آئینہ

روح کو جلوۂ محبوب سے صیقل بھی کرو
ورنہ بیکار تڑپ، خواہشِ خام آئینہ

تھا اِدھر جوہرِ منزل کا خزینہ دل میں
اور ادھر ساتھ رہا گام بہ گام آئینہ

میری جلوت کے لیے راہنما، گردِ سفر
میری خلوت کے لیے حسنِ مقام آئینہ

تو گرا دے تو یہ پتھر سے بھی کمتر ٹھہرے
تو اٹھا لے تو بنے نقشِ دوام آئینہ

بات کرنی ہے تو پتھر کی زباں میں نہ کرو
میں محبت کی ادا ہوں، مرا نام آئینہ

فن کو ڈھالا ہے اسی نور کے سانچے میں جمیلؔ
میں ہوں تصویرِ ازل، میرا کلام آئینہ

توصیف تبسم



ہم نصیبو! چُپ رہو، جلتے گھروں کے درمیاں
راستہ کوئی نہیں ہے، پتھروں کے درمیاں

میرا ہی چہرہ ازل کے آئینوں میں منعکس
اور میں حیرت زدہ، صورت گروں کے درمیاں

تھی کبھی شاخِ نشیمن سے بھی اک نسبت ہمیں
ذکرِ بال و پر نہ کر، ہم بے پروں کے درمیاں

خود غرض دنیا میں جز داغِ جنوں رکھتے نہیں
بلنے کیا قیمت پڑے سوداگروں کے درمیاں

خود مری آنکھوں سے پوشیدہ ہے معنی مرے
حرف میں منظر نمایاں ہیں منظروں کے درمیاں

مرے پاؤں تک مری پہچان اب ممکن نہیں
جسم لپٹا ہے لہو کی چادروں کے درمیاں

ہر طرف دہشت زمیں کی اور خلا کا خوف بھی
گھر گیا میں سادہ دل، دو لشکروں کے درمیاں

ریزہ ریزہ حسرتوں کو کس طرح یک جا کریں
ڈھیر ہیں خود ہی شکستہ پیکروں کے درمیاں

تشنگی جاں کی بھی کچھ آنکھوں سے چھلکا چاہیے
گھول کچھ دل کا لہو ان ساغروں کے درمیاں

جاگتا ہے دُور سے زنجیرِ در کو دیکھ کر
کیا دلِ وحشی کو لے جائیں گھروں کے درمیاں

بس ایسی تو نہیں، توصیف، تکمیلِ سخن
شعر کیا پڑھتا ہے تو، دیدہ وروں کے درمیاں



کشیدہ سر ہوئے کچھ لوگ، قامتوں کے بغیر
ہم آسماں ہیں تہہ آب، وسعتوں کے بغیر

سگانِ قریہ، تہِ شاخِ ماد، نوحہ کناں
گھروں میں خلق، تہِ آسماں، چھتوں کے بغیر

سحر کے خوف سے یوں بند ہیں مکاں، جیسے
چٹانیں رات کے ساحل پہ، صورتوں کے بغیر

یہ آدمی ہیں کہ روتے درخت جنگل میں
ہر ایک زخم نمایاں، علامتوں کے بغیر

نفس کی لہر، کنارے پہ لے گئی سب کو
سفینہ موج سے نکلا نہ ساعتوں کے بغیر

تجھے بھی اے غمِ جاں! کم ملیں گے ہم ایسے
متاعِ دردِ معیشت، ضرورتوں کے بغیر

وہ ایک لفظ عطا ہو، سمجھ سکوں جس کو
وہ اک جہانِ معانی، نہایتوں کے بغیر

پڑھو! تمہارے لیے ہی شجر سے اُترا ہے
ورق ورق یہ صحیفہ، عبارتوں کے بغیر

تمہیں ہر اک سے شکایت سہی، مگر توصیف
بتاؤ، جی بھی سکو گے، محبتوں کے بغیر

اسرار زیدی



یہ جانتے ہوئے، صورت جو بام و در کی ہے
مجھے عزیز ہر اک خشت اپنے گھر کی ہے

ہزار زخم چھپائے یہاں تک آیا ہوں
مسافت اتنی بڑے مرحلوں میں سر کی ہے

جہاں سے چاہا، وہیں سے تراش لیں راہیں
یہ آذری بھی مرے تیشۂ ہنر کی ہے

فشارِ جبر سے نکلوں تو کوئی بات کروں
میں وہ صدا ہوں کہ جس میں لپک شرر کی ہے

جمی ہوئی ہے ہر اک آئنے پہ دھول یہاں
ہر ایک شاخ بُریدہ شجر شجر کی ہے

اِدھر بھی ہجر کے سائے، اُدھر بھی درد کی لو
کوئی یہ مجھ کو بتلائے، ہوا کدھر کی ہے

ملال کون کرے اب گئے زمانوں کا
زوالِ شب تو علامت نئے سفر کی ہے



ضمیرِ سنگ سے پیدا شرار ہم نے کیا
وہ راز تھا تو اُسے آشکار ہم نے کیا

کچھ اور بات تھی، ہم اتنے سادہ دل کب تھے
فریب تُو نے دیئے، اعتبار ہم نے کیا

کوئی تو شکل ہو طوفاں سے پار اُترنے کی
ہوا کے دوش پہ کب انحصار ہم نے کیا

سروں پہ اپنے کفن باندھ لیں تو آگے چلیں
چلو چلیں کہ بہت انتظار ہم نے کیا

کہو کہ اپنی سم آلودہ مصلحت سے گریز
ہزار بار کیا، لاکھ بار ہم نے کیا

وجودِ عصر کو ہے اب نئے لہو کی طلب
قدم بڑھاؤ کہ آغازِ کار ہم نے کیا

یہ حادثہ تو نہیں تھا کہ اے عروسِ وطن
لہو سے اپنے تجھے زرنگار ہم نے کیا

اسرار زیدی



اندھیرے گھر میں چراغاں تو جگنوؤں کا ہُوا
کوئی شمار نہ بے خواب ساعتوں کا ہُوا

ہمارے ساتھ چلے ہو تو اتنا دھیان رہے
سفر طویل ہے، دھڑکا بھی رہزنوں کا ہُوا

کچھ اور بڑھ گئی شہرِ اَلم کی ویرانی
چھتیں تک اُڑ گئیں؛ وہ زور آندھیوں کا ہُوا

حصارِ درد سے باہر قدم رکھوں کیسے
ڈسا ہوا جو میں بے سمت راستوں کا ہُوا

رکاب تھام کے چلیے کہ سر تو بچ جائے
وگرنہ حشر جو شہ کے مصاحبوں کا ہُوا!

ہوائے زرد وہی، موسموں کی گرد وہی
کچھ اہتمام بدلتی ہوئی رُتوں کا ہُوا

بجھا رتوں کے جھمیلوں میں یوں نہ دفن کرو
کہ میرا عہد تو زندہ صداقتوں کا ہُوا



کوئی تصویر یہاں آئینہ خانوں میں نہیں
پھر ہدف کون ہو، جب تیر کمانوں میں نہیں

بے حسی جبرِ مسلسل کا نتیجہ ٹھہری
حرف مصلوب ہوئے، نطق زبانوں میں نہیں

لوگ کچھ اتنے حقیقت کے پرستار بنے
یعنی وہ شخص نیا ہے جو پرانوں میں نہیں

ہم کہ ماضی بھی ہیں، امروز بھی ہیں، فردا بھی
ہم سبھی کچھ ہیں مگر قید زمانوں میں نہیں

شاخ در شاخ تراشی گئیں راہیں کتنی
پَر کشادہ تو ہوئے، ربط اُڑانوں میں نہیں

ایسا آشوب تو پہلے کبھی دیکھا نہ سُنا
بھیڑ گلیوں میں ہے، لوگ اپنے مکانوں میں نہیں

وہ محبت ہی محبت ہے، یہ عرفاں بھی ہُوا
اس کا مسکن تو دلوں میں ہے چٹانوں میں نہیں

مسعود قریشی

○

زباں کٹی سو کٹی، بحث مختصر تو ہوئی
جو بات ہم نے کہی تھی وہ معتبر تو ہوئی

یہ دن تو رات میں ڈھلتا نظر نہیں آتا
کڑی تھی شب۔ یہ گزر تو گئی، سحر تو ہوئی

مقابلے میں اُدھر تیغ تھی، اِدھر گردن
میں سُرخرو ہوں کہ تفریقِ خیر و شر تو ہوئی

گری فصیل جو زنداں کی، سر بہت پھوٹے
مچا تو شور مگر خلق کو خبر تو ہوئی

حریف ہو گئے قرباں متاعِ دنیا پر
انھیں بھی جاں سے کوئی شے عزیز تر تو ہوئی

○

اس بڑے شہر میں بے نام و نشاں میں ہی تو ہوں
اس ڈرے شہر کے خوابوں کی زباں میں ہی تو ہوں

میں ہوں بے رُت کی کلی اُجڑے ہوئے گلشن میں
جس کی ہر سانس ہے توہینِ خزاں، میں ہی تو ہوں

لفظ چلتے ہیں مرے نُطق سے خنجر کی طرح
دستِ حق میں جو کڑکتی ہے کماں، میں ہی تو ہوں

کیا عجب مجھ سے جو پرخاش ہے شب زادوں کو
جس نے توڑا سحرِ شب، وہ اذاں میں ہی تو ہوں

تابکاری مرے جوہر کی وفا کا خورشید
باعثِ تاب و تبِ ماہ و شاں میں ہی تو ہوں

پروین فنا سید



دشت میری ہی دہائی دے گا
پھر مجھے آبلہ پائی دے گا

روشنی روح تلک آ پہنچی
اب اندھیرے میں دکھائی دے گا

زرد پتوں کا دھڑکتا ہوا دل
خامشی میں بھی سنائی دے گا

کشف وہم گاہی کے آئینے میں
اپنا بہروپ دکھائی دے گا

توڑ کر دیکھ تو آئینۂ دل
شہر کا شہر دہائی دے گا



اس لہجے کا سُر بدل چکا ہے
یہ کیسا عجیب سانحہ ہے

دیکھوں تو ہے پُرسکون آنگن
سوچوں تو یہ طور جل رہا ہے

اب کے تو خزاں میں بھی رفیقو
وحشت کا چمن کھلا ہوا ہے

اک شان سے جو بسا تھا دل میں
کس شان سے اب جدا ہوا ہے

شبنم کو فنا کی تربیت سے
خورشید بھی خود لرز رہا ہے

مرتضیٰ برلاس



وقت کی تیز تپتی ہوئی ریت پر پڑ گئے پاؤں میں آبلے دوستو
سانس اکھڑا گیا، جسم ٹوٹا گیا، ہم نہ ہارے مگر سو بسلے دوستو

رنگ و بو کی تپش ہے ہوس ہی ہوس، اپنا دستِ سبا دیکھنا چاہیے
ہاتھ جلتے ہوں جب پھول کی آنچ سے، پھر تو پھولوں سے کانٹے بھلے دوستو

میری ناکامیوں کی دبی آگ سے جانے کس کس کے دامن جھلس جائیں گے
بات چھیڑی تو پھر بات بڑھ جائے گی، یہ بھی سوچا کبھی منچلے دوستو

شوقِ صحرا نوردی تو دیکھو ذرا، جس کو دیدارِ منزل گوارا نہیں
جتنی تیزی سے ہم سوئے منزل بڑھے، اور بڑھتے گئے فاصلے دوستو

لوگ ہوں مطمئن جب سیہ رات سے، پھیر لیں اپنی آنکھیں جو حالات سے
عقل کے فیصلے جب ہوں جذبات سے، خاک سمجھیں گے ہم مسئلے دوستو

خود ہی اپنا تحفظ کریں ہمسفر، سب مسافر رہیں جاگتے رات بھر
پھر اسی راہ پر ہم نکل آئے ہیں، لٹ گئے تھے جہاں قافلے دوستو



اشک بن کر کہیں جذبے بہہ جائیں گے، خاک ہو کر کہیں پر بکھر جائیں گے
دشتِ غربت! تری وسعتوں کی قسم اب تجھے چھوڑ کر ہم کدھر جائیں گے

تم تو ہم سے ملے تھے بہت سرسری، یہ نہ سوچا تھا تم نے مگر اجنبی
ہم تو دھڑکن ہیں، دل میں سما جائیں گے، ہم ہیں نشّہ، بدن میں اتر جائیں گے

اپنی محرومیوں کا نہیں کوئی غم، داغِ حسرت بنائیں گے خورشید ہم
تیری تصویر میں، صبحِ ارضِ وطن! ہم تو ایثار کا رنگ بھر جائیں گے

دشمنانِ محبت میں شامل ہیں وہ، جن کو اپنا سمجھتے تھے، قاتل ہیں وہ
کوئی دھڑکا نہیں، گھر کے قاتل ہیں ہم، سر کٹا جائیں گے، بے سپر جائیں گے

کل کی نسلیں نہ ہم پر تأسف کریں، بے حسی پر نہ اس دَور کی تف کریں
دوستو! ہم تو اوراقِ تاریخ میں مرثیہ اشکِ غم چھوڑ کر جائیں گے

(اردو) غالب



یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

ترے وعدے پر جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غمگسار ہوتا

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق اگر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شبِ غم بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

یہ مسائلِ تصوّف، یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

(پنجابی چولا) اسیر عابدؔ



ایڈے کتھوں سی نیک نصیب میرے میری بُکلے دی میرا یار ہوندا
وَدھ جاندے جے ہور وی ساہ میرے ہُندا کیہہ؟ ایہو انتظار ہوندا

تیرے وعدیاں تے جیوندے تاں رہ گئے دلوں کدی یقین کر بیٹھے
نہیں تے چاء وچہ اسی نہ مرجاندے تیرے جیہے دا جے اعتبار ہوندا

میرے دل کولوں کوئی پُچھ ویکھے تیرے ادھ چھک تیر دا مُل کیہہ لے
سینے وچہ نہ وسدیاں اِنجہ رڑکاں جے ایہہ تیر کلیجیوں پار ہوندا

ایہہ کدھروں ریت ہے یاریاں دی جیہڑا یار آوندا متاں دین آوندا
میرے دُکھ دا کوئی اُپاء کردا، دردمند کوئی غم خوار ہوندا

اِنجہ لہو چٹان دی رگوں چھُٹدا کدی ٹمکدا نہ کدی رُکدا نہ
جنھوں پوے جیہے منہ نال غم آکھو جے ایہہ نکھراں وچہ چنگیار ہوندا

بھانویں جان دا ویری اے غم ڈاہڈا پر ایہہ دل بھیڑا غموں نہیں بھجدا
جے ایہہ عشق دا چھٹیا نہ ہوندا ایہنوں ہور ای کوئی آزار ہوندا

کوئی کیہہ جانے کنھوں کیہہ دساں رات غماں دی کیہہ ہنیر پایا
ہینوں جیون توں مرن سوکھڑا سی جے کر مرجانا اِکو وار ہوندا

ہوئے مرن دے نال بدنام ڈُھکے کدا چنگا سی شوہ دریا ڈبدے
نہ کوئی میرے جنازے دی لوڑ پیندی آتا پتا نہ کدھرے مزار ہوندا

تیرے "ہُو" دے ویروے واہ سائیں! اتوں غالبا! لٹک بیان تیرا
جے کر پین دی تینوں نہ مار ہوندی ساڈے لئی توں ولی اوتار ہوندا!

لیث قریشی



ہم اہلِ درد ہیں مظلوم و بے نوا کی طرح
نشانۂ دہر ہے صحرائے کربلا کی طرح
منافقت بھی اگر سیکھ لوں بفرضِ محال
حیات گزرے گی اک جبرِ ناروا کی طرح
زمانہ ساز ہوں، لیکن یہ اور نکتہ ہے
حضورِ دوست ہوں درویشِ باصفا کی طرح
نہ کوئی خوابِ تمنا، نہ کوئی جذبۂ شوق
ہمارا دل بھی ہے اک شہرِ بے نوا کی طرح
دہک رہے ہیں سرِ شاخ کیسے انگارے
یہ کون گزرا ہے چھو کر انھیں ہوا کی طرح
شعورِ زیست ہے مجروح اور انا پامال
میں جی رہا ہوں گدائے شکستہ پا کی طرح
کرن نے چھین لی رعنائیِ گل و لالہ
نقاب ایسی بھی کیا شبنمی ردا کی طرح
کسی کو دیکھ کے خوش، لوگ خوش نہیں ہوتے
یہ عارضہ مری بستی میں ہے وبا کی طرح
میں آفتاب نہیں ہوں کہ لوگ مجھ سے جلیں
میں ایک خاک کا ذرہ ہوں کیمیا کی طرح
سنوں تو کیسے سنوں نغمۂ حیات کہ لیث
ہوں اپنی ذات میں گم حرفِ بے صدا کی طرح



ظلمت گھٹی نہیں ہے جو اٹھتا ہے دھواں اور
ہوتا ہے دل آویز مرا شعلۂ جاں اور
تکلیف کم رنجش پہنچتی ہے سبھی سے
اپنوں سے جو پہنچے تو گزرتی ہے گراں اور
ہم مصلحتاً بھی کسی موضوعِ سخن پر
کرتے ہیں جو منہ بند تو کھلتی ہے زباں اور
نیرنگیِ موسم سے فسردہ نہ ہوں غنچے
بڑھ جائے گا ورنہ ابھی کچھ زورِ خزاں اور
کیا دولتِ احساس کو لٹنے سے بچائیں
اس طرح تو ہوتا ہے خود اپنا ہی زیاں اور
اے مصلحت! اس شخص کو کیا کہہ کے پکاریں
جس شخص کا دل اور، ضمیر اور، زباں اور
ہم جس کو چھپاتے ہیں زمانے کی نظر سے
ہوتی ہے وہی بات زمانے پہ عیاں اور
احساسِ ضرورت بھی دل آزار ہے، لیکن
یہ جذبۂ غیرت ہے مرا دشمنِ جاں اور
اے لیث کسی وضع پہ قائم بھی تو رہیے
یہ کیسی روش ہے کہ یہاں اور وہاں اور

لیث قریشی



سورج کی طرح مجھ کو ابھرنے سے ملا کیا
اے روشنئ فکر و نظر تو نے دیا کیا

ہر شخص ضرورت کے مطابق ہے ہنرمند
کس کس کو بتائیں کہ برا کیا ہے بھلا کیا

الفاظ و معانی میں بھی اب ربط نہیں ہے
ایسے میں گلِ تر سے کہے بادِ صبا کیا

اس عہد میں سقراط بھی ہوتا تو یہ کہتا
اے احمقو اب ہے جامِ صداقت میں دھرا کیا

اک راہ بھی روشن نہ ہوئی تجھ سے ترا دل
تو اپنے اندھیرے میں جلا بھی تو جلا کیا

ہم نے بھی تو دنیا کی کبھی بات نہ مانی
دنیا نے ہمیں چھوڑ دیا ہے تو گلہ کیا

ہر چند تخاطب میں تمسخر کا ہے پہلو
مانا کہ میں شاعر ہوں تو شاعر کی سزا کیا

کانٹوں سے تو مانوس ہو، پھولوں سے گریزاں
میں سوچ رہا ہوں کہ تمہیں لیث ہوا کیا



نہ اجنبی سے نہ لیث آشنا سے ڈرتا ہے
منافقوں کے خلوص و وفا سے ڈرتا ہے

کچھ اہلِ شہر ہی ذوقِ سفر کی شرم رکھیں
امیرِ شہر تو بانگِ درا سے ڈرتا ہے

ہے اپنی ذات میں سمٹا ہوا ہر اک غنچہ
زباں سے کیا کہے، بادِ صبا سے ڈرتا ہے

مری نگاہ میں ہر شخص معتبر ہے، مگر
یہ میرا دل ہے جو ذکرِ وفا سے ڈرتا ہے

اسے عظیم سمجھیے جو کوہکن ہو کر
شکستِ شیشۂ دل کی صدا سے ڈرتا ہے

یہ عشق شعلۂ بے تاب تھا کبھی، لیکن
اب اک چراغِ سحر ہے، ہوا سے ڈرتا ہے

زمانہ لیث کو چاہے برا کہے کہ بھلا
گناہ گار ہے لیکن خدا سے ڈرتا ہے

حسن اختر جلیل



دل کو آمادۂ وفا رکھیے
آندھیاں ہیں، دیا جلا رکھیے

کتنی صدیوں کی برف پگھلی ہے
سیل کا راستہ کھلا رکھیے

بن کے لاوا بہے گا جوشِ نمو
اب نہ اس آگ کو دبا رکھیے

خونِ اہلِ نظر سے گلگوں ہے
خاک کا نام کیمیا رکھیے

جو سحر کی کرن سے پھوٹے ہیں
ان اندھیروں کا نام کیا رکھیے

جلتی شاموں کی اس چتا پہ جلیل
اک نئی صبح کی بنا رکھیے

ظفر ابن متین



گم کر بیٹھے اپنے آپ کو پا کر بھی
راہ نہ پائی ہم نے ٹھوکر کھا کر بھی

خون کا رشتہ توڑ سکے، ناممکن ہے
بیچ ہمارے وہ دیوار اٹھا کر بھی

کمرہ تھا یا ایک الاؤ سوچوں کا
نیند نہ آئی بجلی رات بجھا کر بھی

ہر رستہ اک بند گلی تک جاتا ہے
دیکھ لیا ہر راہ پہ ہم نے جا کر بھی

ہیں وہ سایہ دار شجر ہوں، سنگ زنو
پھل برسائے جس نے پتھر کھا کر بھی

جسم نہیں، کچھ شعلے کچھ انگارے ہیں
کیا پاؤ گے تم آگ میں آگ لگا کر بھی

عاصی کرنالی



نیند کے سب پھول، سب گجرے چرا کر لے گیا
پاسباں شب کا مرے سپنے چرا کر لے گیا

کاروبارِ رہزناں کی آبرو جاتی رہی
ایک سیلِ آب سوئے سنے چرا کر لے گیا

کون غارت گر تھا جو اک قدرِ دولت کے سوا
زندگی کے سارے پیمانے چرا کر لے گیا

میں کھلے میدان میں تھا منتظر تعمیر کا
جو مرا معمار تھا، نقشے چرا کر لے گیا

کیسی کیسی بھیڑ تھی میری دکانِ نغمہ پر
ہر خریدار ایک دو نغمے چرا کر لے گیا

دل کہاں سے لائے گا، جذبہ کہاں سے لائے گا
جو مری فریاد کے لہجے چرا کر لے گیا

اس سے پہلے فن کی یہ بے وقعتی دیکھی نہ تھی
چور زیور کی جگہ دانے چرا کر لے گیا

رات کے پُرخواب لمحوں میں کوئی بے چہرہ شخص
انجمن کے سارے آئینے چرا کر لے گیا

اب کہاں عاصیؔ وہ قربِ خوش جمالاں کی ہوس
وقت اپنے ساتھ وہ جذبے چرا کر لے گیا



یلغارِ ہر اَلم کی دلِ شادماں پہ تھی
پھر یوں ہوا، زمیں کی کمند آسماں پہ تھی

لپٹی ہے یوں بساطِ بہاراں کہ کچھ نہ پوچھ
جتنی متاعِ باغ تھی دوشِ خزاں پہ تھی

آیا ہوں میں تو شہر کے بازار چھان کر
اب کیا بتاؤں جنسِ وفا کس دکاں پہ تھی

یہ کون مجھ کو چھوڑ گیا دشتِ ریگ میں
میری نظر تو منظرِ آبِ رواں پہ تھی

آخر اسے حوالۂ غم ہم نے کر دیا
یہ زندگی بھی ایک بڑا قرض جاں پہ تھی

میں سجدۂ خلوص لیے واپس آ گیا
لوگوں کی اتنی بھیڑ ترے آستاں پہ تھی

تیرے بدن کی ضو سے مجلّا تھیں رفعتیں
سورج تو تھا زمیں پہ، دھوپ آسماں پہ تھی

عاصیؔ رہی اسی سے منوّر فضائے دل
اک آیتِ جمال جو میری زباں پہ تھی

رشک خلیلی



بارشِ سنگ کی مانند گراں بار لگے
قہقہے جتنے بھی مجھ پر سرِ بازار لگے

ظلم کے ردِ عمل کا جو ہو ظالم کو خیال
اُس کو مظلوم کی فریاد بھی للکار لگے

زخم تازہ ہو تو گل رنگ نظر آتا ہے
اور اگر گل بھی ہو پژمردہ، تو بیکار لگے

رونقیں ختم ہوئیں، شہر میں ہے اتنا ہجوم
اب تو ہر شخص مجھے راہ کی دیوار لگے

زندگی کو ذرا نزدیک سے دیکھا تو مجھے
مسکراہٹ ہی نہیں، اشک بھی شہکار لگے

ایک تُو ہے کہ نہیں تجھ کو چراغوں پہ یقیں
ایک میں ہوں، مجھے ظلمت سحر آثار لگے

دائرہ دائرہ تقسیم ہوئے اہلِ قلم
اب یہ عالم ہے کہ فن کار بھی پرکار لگے

پاسِ قانون بجا، رشک یہ لازم تو نہیں
جو سرِ دار نظر آئے، گنہ گار لگے



مثالِ نقشِ کفِ پا مری نظر سے گرے
وہ رہ نورد کہ جو سنگِ رہگزر سے گرے

اٹھا سکے تو غمِ زندگی اٹھا لینا
اگر یہ بارِ گراں تیرے ہم سفر سے گرے

ہیں تنگ دست بھی، تنگ حوصلہ تو نہیں
چُنے نہ ہم نے وہ پھل پھول جو شجر سے گرے

تو اپنے اونچے محل کو نہ یوں غرور سے دیکھ
کہ تیرا تاج طرحدار تیرے سر سے گرے

وہ اشک تھے کہ ستارے، وہ خواب تھے کہ شہاب
تمام رات مرے شہر میں شرر سے گرے

ہماری خاک سے ابھرے نئے نئے شہکار
جہاں جہاں بھی گرے ہم، بڑے ہنر سے گرے

حقیقتاً ہے بشر کا یہی عروج و زوال
کبھی نظر میں سماتے، کبھی نظر سے گرے

خورشید رضوی



وہی ہے آنکھ، وہی شب ہے، خواب بدلا ہے
مٹا کہاں ہے ابھی اضطراب ــــ بدلا ہے

نشہ فراق کا برسوں میں جا کے راس آیا
کشاں کشاں، مرا ذوقِ شراب ـ بدلا ہے

بدل گیا ہے زمانہ بہت، پہ کیا بدلا
یہی کہ حدِّ نظر پر سراب بدلا ہے

اسے کبھی کسی کروٹ نہ مل سکا آرام
سدا عذاب سے دل نے عذاب بدلا ہے

پلٹ پلٹ کے نئی اپنی بازگشت آئی
سوال کا مرے، پیہم جواب بدلا ہے

بدل رہا ہے زمانہ لباس بے آہٹ
کہ دستِ شاخ میں جیسے گلاب بدلا ہے

حیات و موت ہماری نظر میں کچھ بھی نہیں
بس اس قدر کہ ہوا نے حباب بدلا ہے

امجد اسلام امجد



بستیوں میں اک صدائے بے صدا رہ جائے گی
بام و در پر نقشِ تحریرِ ہوا رہ جائے گی

آنسوؤں کا رزق ہوں گی بے نتیجہ چاہتیں
خشک ہونٹوں پر لرزتی اک دعا رہ جائے گی

رُو برو منظر نہ ہوں تو آئینے کس کام کے
ہم نہیں ہوں گے تو دُنیا گردِ پا رہ جائے گی

خواب کے نشے میں جھکتی جائے گی چشمِ قمر
رات کی آنکھوں میں پھیلی التجا رہ جائے گی

بے ثمر پیڑوں کو چومیں گے صبا کے سبز لب
دیکھ لینا، یہ خزاں بے دست و پا رہ جائے گی

احسن زیدی



جان پر آن بنی ہو تو مروّت کیسی
دل میں طوفاں ہو تو لفظوں میں حلاوت کیسی

اپنے ہاتھوں ہی سے کاٹی ہیں طنابیں ہم نے
سائباں خاک بسر ہے تو شکایت کیسی

لگ گئیں برف کے خیموں کی قطاریں ان پر
آ گئی آگ کے دریاؤں پہ ساعت کیسی

موجِ طوفاں کو پڑھنے کی ضرورت کیا ہے
ریت نے لکھی ہے ساحل پہ عبارت کیسی

مُردہ خانے ہیں یہ سب شہر کی بے حس گلیاں
ہر طرف پھیلتی جاتی ہے عفونت کیسی

اب تو ایمان بھی بیچو گے تو کیسے احسنؔ
مال جو گھر میں نہیں، اس کی تجارت کیسی



درخت ٹوٹ چکے، ٹہنیاں بکھر بھی چکیں
وہی ہے زور ابھی تک ہوا کی لہروں میں

وہ زلزلہ تھا، کوئی آنکھ بھی جھپک نہ سکا
سجے سجائے رہے لوگ اپنے شہروں میں

میں بات کس سے کروں، میرا المیہ یہ ہے
گھرا ہوا ہوں میں چاروں طرف سے بہروں میں

کھُلیں گے رات کے غاروں میں نُور کے پرچم
کبھی تو آئے کا پانی اُداس نہروں میں

بتائے ــــ کون بچا، کون غرقِ آب ہوا
کسی کو ہوش تھا کب، موجوں کے قہروں میں

حسن اکبر کمال



اُسے شکست نہ ہونے پہ مان کتنا تھا
جو ریزہ ریزہ ہُوا، سخت جان کتنا تھا

ہے اب دلوں میں یہ دہشت کہ سر پہ آنہ پڑے
زمیں سے دور یہی آسمان کتنا تھا

میں اپنا ظرف بھی دیکھوں کہ اس سے رنجش پر
بُھلا دیا کہ وہی مہربان کتنا تھا؟

بجا ہیں وسعتیں اِس کی مگر چھُٹا جب گھر
کھُلا کہ تنگ۔ ہمیں پر جہان کتنا تھا

بدن کے بھید نہ جب ہم پہ کھولتے تھے لباس
تو شہرِ نفس میں امن و امان کتنا تھا

دیئے تو بجھ گئے، بجلی کے قمقمے نہ بجھے
ہوا کو زور پہ اپنے، گمان کتنا تھا

جہاز تھا کہ فقط ابر پارہ تھا لیکن
اُمید بخش ہمیں بادبان کتنا تھا

جو پھول گود سے اس کی کمالؔ نوچے گئے
اُداس ان کے لئے پھول دان کتنا تھا



سفاک، سراب سے زیادہ
ہے عشق عذاب سے زیادہ

اُترا وہ رگوں میں زہر، جس میں
ہے نشہ شراب سے زیادہ

مقتول کی آنکھ میں چمک تھی
تلوار کی آب سے زیادہ

ہیں اہلِ کتاب کو ہمیشہ
پڑھتا ہوں کتاب سے زیادہ

دنیا میں کسی کو کب ملا ہے
غم، خندۂ حباب سے زیادہ

سینے میں جو اَب ہے ایک پتھر
تازہ تھا گلاب سے زیادہ

دُنیا میں کمالؔ تھے دکھی سب
مجھ خانہ خراب سے زیادہ

صابر ظفر

○

ہر ایک شخص ترے ساتھ گھر سے نکلا تھا
نگر میں کون تھا، جب تو نگر سے نکلا تھا

ترا خیال جو آیا، تو پھر پلٹ آیا
نیا نیا ابھی سودا جو سر سے نکلا تھا

مری طلب میں رہا اک ستارہ، بے چارہ
میں دن چڑھے کہیں، شب کے اثر سے نکلا تھا

پکڑ کے لے گئیں تنہائیاں مجھے واپس
میں ایک عمر کے بعد، اپنے گھر سے نکلا تھا

وہ مجھ کو چھوڑنے آیا تھا میرے ساتھ ظفر
میں اُس گلی سے بڑے کرّ و فر سے نکلا تھا

○

موت کی منزل ہے اور راہِ سفر ختم ہے
زندگی اے زندگی! تیرا سفر ختم ہے

وقت سے پہلے کہیں، پیڑ نہ سب سوکھ جائیں
عقدہ بند کھول اے خدا! کس کا ثمر ختم ہے

لمحۂ موجود پر، رہ نہ سکی دسترس
مجھ کو خبر ہی نہیں، میرا اثر ختم ہے

لکھنا اگر ہے ضرور، ہم سے تو بہتر لکھو
ہم کو یہ دعویٰ نہیں، ہم پہ ہنر ختم ہے

زیست کو اب داؤ پر، آپ لگائیں ظفر
اپنی تو جاں ختم ہے، اپنا تو زر ختم ہے

انور محمود خالد



رُکا نہ اُمڈے ہُوئے وقت کا کبھی دھارا
رہا بہاؤ سمندر کی سمت دریا کا
تھے جاں نثاروں کے جُھرمٹ خروج سے پہلے
ٹھنی لڑائی تو پھر کوئی آس پاس نہ تھا
مُڑ کو آئے نہ میثاق میں بندھے ساتھی
ہوئے شہید تو ہر زخم پر گلاب رکھے
مزا چکھا نہ سکے اُس کو جار جیت کا
جو ہاتھ ہم پہ اُٹھا، اُس کو بڑھ کے چُوم لیا
فرارِ جنگ سے چہرہ تو بے خراش رہا
مگر بدن کا لہو تیری ایڑیوں پہ گرا
رسا تھے ہاتھ ترے بھائیوں کی گردن تک
تو دُشمنوں میں مگر سر جُھکا کے چلتا تھا
اگر تراش بھی لے میرے جسم کا حصّہ
وہ چاہتا ہے کہ میں کر سکوں نہ واویلا
پڑے تھے لوگ کُھلے آسماں کی چھت کے تلے
سڑک پہ پاؤں تھے، فٹ پاتھ پر بچھونا تھا
کسے خبر تھی کہ ہموار سطحِ آب کے بعد
بھنور بھنور مری ناؤ کا راستہ ہو گا
بلندیوں سے گرے آبشار کی مانند
سقوط میں بھی ہمارے شکوہ شامل تھا
بکھر گیا مرا سونا اُفق اُفق خالد
مرا غروب بھی میرے طلوع جیسا تھا

اقبال فریدی

"بارِ خدایا!
چارپایوں کی سرگردانی، راستوں میں ان کی گریہ و زاری اور
خوابگاہوں میں ان کی فریاد پر رحم کر۔"

حضرت علیؓ



اپنی بیاست کی پرستش پہ تری حمد کریں
ہم کہ خود اپنی ہی سازش پہ تری حمد کریں
زندگی یا کسی گمنام حرارت کا فسوں
لوگ بے نام نمائش پہ تری حمد کریں
دن کو روشن رہیں، راتوں کو اندھیرا کھیلیں
رات اور دن کی نوازش پہ تری حمد کریں
ساز ایسا نہ رہیں — سوز کچھ ایسا مر جائیں
ہر نئی موت کی سازش پہ تری حمد کریں
آسماں روز نیا نام لکھے اور مٹائے
سب ہی لاعلمیٔ دانش پہ تری حمد کریں
ہاتھ باندھے ہوئے تارے نئی تعبیریں لائیں
ہم اندھیروں کی نوازش پہ تری حمد کریں
جو تھا کونا ہے خطرناک وہ جنگل ہو کہ گھر
سب اُدھر جانے کی بندش پہ تری حمد کریں
ہم نہ شہزادے نہ شہزادگی اپنا اعزاز
پھر بھی اعزاز کی خواہش پہ تری حمد کریں

پروین شاکر



میرے چھوٹے سے گھر کو یہ کس کی نظر، اے خدا! لگ گئی
کیسی کیسی دعاؤں کے ہوتے ہوئے، بد دُعا لگ گئی

وہ جو پہلے گئے تھے، ہمیں اُن کی فرقت ہی کچھ کم نہ تھی
جان! کیا تجھ کو بھی شہرِ نامہرباں کی ہوا لگ گئی

ایک بازو بریدہ، شکستہ بدن قوم کے باب میں
زندگی کا گماں کس کو تھا، بس یہ کہیے، دوا لگ گئی

جھوٹ کے شہر میں آئینہ کیا لگا ـــ سنگ اُٹھائے ہوئے
آئینہ ساز کی کھوج میں جیسے خلقِ خدا لگ گئی

دو قدم چل کے ہی چھاؤں کی آرزو، سر اُٹھانے لگی
میرے دل کو بھی شاید ترے حوصلوں کی ادا لگ گئی

جنگلوں کے سفر میں تو آسیب سے بچ گئی تھی، مگر
شہر والوں میں آتے ہی پیچھے یہ کیسی بلا لگ گئی

بے نمو، بانجھ تنہائی میں سُرخ پھولوں کا بن کھل اُٹھا
ہجر کی زرد دیوار پر تیری تصویر کیا لگ گئی!



مٹی کی گواہی، خوں سے بڑھ کر!
آئی ہے عجب گھڑی وفا پر
کس خاک کی کوکھ سے جنم ہیں
آئے ہیں جو اپنے بیج کھو کر
کچھ پیڑ زمین چاہتے ہیں
بیلیں تو نہیں اُگیں ہوا پر
کانٹا بھی یہاں کا برگِ تر ہے
باصد کی کلی، ببول، صنوبر
گملوں سے لگے ہوئے شجر ہم
پل بھر میں ہوں کس طرح ثمردار
پیمان ہوا سے باندھتے ہیں
موسم کے مزاج کو پرکھ کر
کیوں عشق گواہ ڈھونڈتا ہے
جیسے کہ نہیں یقین خود پر
اس نسل کا ذہن کٹ رہا ہے
اگلوں نے کٹائے تھے فقط سر
بس اُن کے لیے نہیں جزیرہ
پیر آئے جو کھولتے سمندر

پروین شاکر



(نذرِ ندیم)

تتلیوں کی بے چینی، آبسی ہے پاؤں میں
ایک پل کو چھاؤں میں اور پھر ہواؤں میں

جن کے کھیت اور آنگن ایک ساتھ اُجڑتے ہیں
کیسے حوصلے ہوں گے اُن غریب ماؤں میں

صورتِ رفو کرتے، سر نہ یوں کھُلا رکھتے
جوڑ کب نہیں ہوتے ماؤں کی رداؤں میں

آنسوؤں میں کٹ کٹ کر کتنے خواب گرتے ہیں
اک جوان کی میت آ رہی ہے گاؤں میں

ابر کی طرح ہے وہ، یوں نہ چھو سکوں لیکن
ہاتھ جب کبھی پھیلائے آ گیا دعاؤں میں

جگنوؤں کی شمعیں بھی راستے میں روشن ہیں
سانپ ہی نہیں ہوتے ذات کی گپھاؤں میں

صرف اس تکبر میں اُس نے مجھ کو جیتا تھا
ذکر ہو نہ اس کا بھی، کل کو نارساؤں میں

کوچ کی تمنا میں پاؤں تھک گئے لیکن
سمت طے نہیں ہوتی پیارے رہنماؤں میں

اپنی غمگساری کو مشتہر نہیں کرتے
اتنا ظرف ہوتا ہے درد آشناؤں میں

اب تو ہجر کے دُکھ میں ساری عمر جلنا ہے
پہلے کیا پتا ہیں جنھیں مہرباں چھاؤں میں

سازو رخت بھجوا دیں، حدِّ شہر سے باہر
پھر سرنگ ڈالیں گے ہم محل سراؤں میں



شوقِ رقص سے جب تک انگلیاں نہیں کھُلتیں
پاؤں سے ہواؤں کے بیڑیاں نہیں کھُلتیں

پیڑ کو دعا دے کر کٹ گئیں بہاروں سے
پھول اتنے بڑھ آئے کھڑکیاں نہیں کھُلتیں

پھول بن کی سیروں میں اور کون شامل تھا؟
شوخیٔ صبا سے تو بالیاں نہیں کھُلتیں

حُسن کے سمجھنے کو عُمر چاہیے، جاناں!
دو گھڑی کی چاہت میں لڑکیاں نہیں کھُلتیں

کوئی موجۂ شیریں "چُوم کر جگائے گی"
سُورجوں کے نیزوں سے سیپیاں نہیں کھُلتیں

ماں سے کیا کہیں گی دُکھ ہجر کا، کہ خود پر بھی
اتنی چھوٹی عمروں کی بچیاں نہیں کھُلتیں

شاخ شاخ سرگرداں، کس کی جستجو میں ہیں
کون سے سفر میں ہیں، تتلیاں نہیں کھُلتیں

آدھی رات کی چُپ میں کس کی چاپ اُبھرتی ہے
چھت پہ کون آتا ہے، سیڑھیاں نہیں کھُلتیں

پانیوں کے چڑھنے تک حال کہہ سکیں —— اور پھر
کیا قیامتیں گزریں —— بستیاں نہیں کھُلتیں!

پروین شاکر



اب کیسی پردہ داری، خبر عام ہو چکی
ماں کی ردا تو، دن ہوئے، نیلام ہو چکی

اب آسماں سے چادرِ شب آئے بھی تو کیا
بے چادری زمین پہ الزام ہو چکی

اُجڑے ہوئے دیار پہ پھر کیوں نگاہ ہے
اس کشت پر تو بارشِ اکرام ہو چکی

سورج بھی اس کو ڈھونڈ کے واپس چلا گیا
اب ہم بھی گھر کو لوٹ چلیں، شام ہو چکی

شعلے سنبھالتے ہی رہے مصلحت پسند
ہونا تھا جس کو پیار میں بدنام، ہو چکی

آنکھیں ہیں اور صبح تلک تیرا انتظار
مشعل بدست رات ترے نام ہو چکی

اب یہ کہیں کہ قیمتِ فن کیا لگائی ہے
اتنی سخن نوازی تو انعام ہو چکی

گردِ ندا سے بھی سخن اُترے اگر تو کب
نامسامعوں میں حرمتِ الہام — ہو چکی



پانی پر بھی زادِ سفر میں پیاس تو لیتے ہیں
چاہنے والے ایک دفعہ بن باس تو لیتے ہیں

ایک ہی شہر میں رہ کر جن کو اذنِ دید نہ ہو
یہی بہت ہے، ایک ہوا میں سانس تو لیتے ہیں

رستہ کتنا دیکھا ہوا ہو پھر بھی شاہ سوار
ایڑ لگا کر اپنے ہاتھ میں راس تو لیتے ہیں

یہی غنیمت ہے کہ بچے خالی ہاتھ نہیں ہیں
اپنے پرکھوں سے دکھ کی میراث تو لیتے ہیں

اقبال کوثر



ہم جس حصار میں ہیں، اُسے توڑنا بھی ہے
جب در نکالنا ہے تو سر پھوڑنا بھی ہے

خوابوں کی وادیوں میں سرابوں کے دشت میں
جو خال و خد "گمے" ہیں، انھیں "جوڑنا" بھی ہے

جو ذہن فوت ہو چکے، ہم اُن کو رو چکے
جو فکر سوئے ہیں انھیں جھنجھوڑنا بھی ہے

دیکھیں گے ہم خلاؤں میں گُم ان کو کب تلک
یاروں کا رُخ زمیں کی طرف موڑنا بھی ہے

اک سنگ کا وجود ۔ جسے کاٹنا بھی فرض
اک جسم کا جمود ۔ جسے توڑنا بھی ہے

ہاں توڑنے ہیں ہم کو پرانے مجسمے
دے کر نئی تراش انھیں جوڑنا بھی ہے

بڑھنا ہے ہم کو عصرِ رواں کے شعور سے
بے عہد فلسفوں کا شغف چھوڑنا بھی ہے



سارے امر جھڑیں، سب امکاں جم جائیں
اک لمحہ ٹھہرے تو صدیاں جم جائیں

بکھریں تو راہوں کی اُڑتی دھولیں ہیں
سخت چٹانیں ہیں جب مٹیاں جم جائیں

سارے بہاؤ رُکیں، چلے گر بس اُن کا
بحر بنیں برفستان، ندیاں جم جائیں

ڈھونڈ لیا ہے آخر ڈھونڈنے والوں نے
وہ بھی اِسم کہ جس پر ایماں جم جائیں

سب کے اندر ایک صداقت جاری ہے
تھم جائے یہ رَو تو انساں جم جائیں

ڈھل جائیں ہم پیار کے سانچے میں کوثر
اور اِس میں پیماں پیماں جم جائیں

اقبال کوثر



لوٹ آؤ، لوٹ آؤ کہکشانوں سے اِدھر
اک زمیں بھی بس رہی ہے آسمانوں سے اِدھر

خود کو نیچے بھی اُترنے کی ذرا تکلیف دو
اور بھی مخلوق ہے اُونچے مکانوں سے اِدھر

شہر میں آئے ہو۔ آکر لوٹ جاؤ گے؛ مگر
کچھ خرابے بھی تو ہیں بسنے گھرانوں سے اِدھر

رنگ و بو کی سیر ہی سیرِ حقائق تو نہیں
دشت بھی کچھ منتظر ہیں گلستانوں سے اِدھر

یا مری آنکھیں ہیں کوندے اور خالی آشیاں
یا بکھرے پنجرے ہیں خالی آشیانوں سے اِدھر

خالد احمد



میں کل کا آدمی ہوں، مجھے کل پہ ٹھاں دے
اے دن! مجھے زوال کی حد سے نکال دے

وہ ٹیس جاں جاگ کے پہلو میں سو گئی
وہ ٹیس ہو کہ لاکھ دلوں کو اُجال دے

انگ انگ جھوم جھوم کے ڈھونڈوں جواب میں
ہر شب مرے لبوں کو وہ ایسے سوال دے

اے عصر! میرے عصر سے آگے نکل کے دیکھ
اے ربِ ذوالجلال! دکھوں کو جمال دے

اے گردشِ نجوم! میں گردشِ نجوم
ہر صبح انتظار کو شامِ وصال دے

خالد احمد



وجہِ سفر اور ہو، رنجِ سفر اور ہو
ایک نظر ہو چکی، ایک نظر اور ہو

جبر کی حد اور تھی، صبر کی حد اور تھی
بے خبرو! کیا خبر! ایک خبر اور ہو

سایہ بہ سایہ چلے، سایہ بہ سایہ پھلے
ایک گھنیرا شجر، زیرِ شجر اور ہو

اے نفسِ کربلا! اے جرسِ کربلا!
فرش پہ خاک اور ہو، خاک پہ سر اور ہو

اے زرِ ابرِ ہوس، ارضِ وفا پر برس
اے ہنرِ بے ہنر! ایک ہنر اور ہو

کوئی نیا کام ہو، کوئی نیا نام ہو
پیڑ پہ شاخ اور ہو، شاخ پہ گھر اور ہو

تیر ہدف ہوں اگر، قطرے صدف ہوں اگر
رنگِ شفق اور ہو، رنگِ سحر اور ہو



مُو قلم حلقۂ زنجیر کہاں ہوتے ہیں
نقش تجھ سے سرِ تصویر کہاں ہوتے ہیں

شہر کی دُھول سمٹ آئی ہے کیوں آنکھوں میں
کچھ تو کہہ اب ترے دلگیر کہاں ہوتے ہیں

سر کو گھٹنوں پہ دھرے کون کبھی بیٹھا تھا
ہم سے وحشی یونہی زنجیر کہاں ہوتے ہیں

وہ نگر جن کو جگہ دے نہ خیالوں کی زمیں
وہ حقیقت میں بھی تعمیر کہاں ہوتے ہیں

لفظ مفہوم کی تنہائی کے عُریاں قیدی
لفظ منت کشِ تفسیر کہاں ہوتے ہیں

خواب تو دیکھنے والوں کے ہنر ہیں خالدؔ
خواب خود درپئے تعبیر کہاں ہوتے ہیں

نجیب احمد



آسماں، سورج، ستارے، بحر و بر کس کے لیے
یہ سفر کس کے لیے، رختِ سفر کس کے لیے

وہ ہرے دن، وہ بھرے موسم تو کب کے جا چکے
ہاتھ پھیلائے کھڑے ہیں اب شجر کس کے لیے

دن نکلتے ہی نکل آئے تھے کس کی کھوج میں
شام ڈھلتے ہی چلے آئے ہیں گھر کس کے لیے

تو کسی کا منتظر کب تھا مگر یہ تو بتا
عمر بھر دل کا کھلا رکھا ہے در کس کے لیے

کون دریاؤں کی ہیبت اوڑھ کر اترا نجیب
چیخ اٹھے ہیں سمندر میں بھنور کس کے لیے



اے مرے ہجر! کیا کہیں، کیسی تھکن سفر میں تھی
روپ جو رہگزر کے تھے، دھوپ جو رہگزر میں تھی

لفظ کی شکل پر نہ جا، لفظ کے رنگ بھی سمجھ
ایک خبر، پسِ خبر آج کی ہر خبر میں تھی

رات فصیلِ شہر میں، ایک شگاف کیا ملا
خون کی اک لکیر سی، صبح، نظر نظر میں تھی

میری نگاہ میں بھی خواب، تیری نگاہ میں بھی خواب
ایک ہی دھن بسی ہوئی عصرِ رواں کے سر میں تھی

شہر پہ رتجگوں سے بھی بابِ افق نہ کھل سکا
وسعتِ بام و در نجیب وسعتِ بام و در میں تھی

غلام محمد قاصر



ترا خیال جو خوابوں میں بھی خبر دے گا
تو عشق جاگ کے بیٹھے کو قتل کر دے گا

جو مطمئن ہو تو آنکھوں پہ شکر کرتے رہو
کرو سوال تو وہ دولتِ نظر دے گا

رہِ کمال پہ یہ اُونگھتے ہوئے مہ و سال
زوال ہی انھیں اب جرأتِ سفر دے گا

دلوں کے شہر پہ شب خون مارنے والا
مجھے شکست، نظر کے محاذ پر دے گا

اُلجھ نہ مہر سے تو، لے مری شبِ تاریک
وہ جگنوؤں کے پروں میں شعاعیں بھر دے گا

بدن پہ روح کا ہر کرب لکھ رہے ہو تو کیا؟
وہ مل گیا تو توجہ لباس پر دے گا

فسانہ خوانِ وفا سے مجھے اُمید نہ تھی
کہ نقشِ پا کو بھی وہ نام رہگذر دے گا



پناہ مانگ کے بوسیدہ کاغذات سے وہ
ہوا میں آگ جلاتا ہے احتیاط سے وہ

چمن میں پھیلتی جاتی ہیں زرد تحریریں
اس آرزو میں، کہ رکھ دے کتاب، ہات سے وہ

ہر ایک راہ پہ انگلی پکڑ کے چلتا رہا
بچھڑ گیا ہے مگر پھر بھی اپنی ذات سے وہ

خفا تھے بحر سے کچھ ڈوبتے سفینے مگر
ہوا ہے خشک، جزیروں کی واردات سے وہ

سحر ہوئی تو اندھیرے رگوں میں چلنے لگے
یہ شور تھا کہ بغاوت کرے گا رات سے وہ

جو گن رہا ہے شعاعوں کے بے کفن لاشے
بہت ہی دُور ہے حسنِ جمالیات سے وہ

زباں کی زد میں رہے ذائقہ جدائی کا
ابھی [illegible] ہے گریزاں مذاکرات سے وہ

یوسف حسن



شرفِ شاہ کفِ شاہ پہ دھر آیا ہوں
میں بھی اے خاکِ وطن! خاک بسر آیا ہوں

تم سناتے رہے سنگینیٔ شب کی باتیں
میں دیا لے کے سرِ راہگذر آیا ہوں

میں تہی مایہ بھی آہنگِ دل و جاں لے کر
تیری دہلیز پہ، اے شہرِ ہنر، آیا ہوں

اک قیامت ہے مری جان! تقاضا دل کا
تیرے ہمراہ نہ آنا تھا مگر آیا ہوں

خواب دیکھا ہے تو تعبیر سے نظریں نہ چرا
چاند بن کر ترے آنگن میں اُتر آیا ہوں

کبھی مجھ سے بھی پلٹ کر کوئی پوچھے یوسفؔ
کن سرابوں میں بھٹکتا ہوا گھر آیا ہوں



آگہی، وہم کے سائے میں پلٹ کر آئی
دھوپ کی لہر کہاں شہر کے اندر آئی

دربدر جھانک رہی ہے کوئی دستک لیکن
آشنا چاپ کسی گھر سے نہ باہر آئی

کوئی اعزاز نہیں زیست کا حاصل، نہ سہی
اک تری چاہ کی تہمت تو میسر آئی

تیری تخلیق میں خود کو بھی تراشا میں نے
میری صورت بھی خد و خال بدل کر آئی

راہ نکلی تو ترے گھر کی طرف ہی نکلی
بات آئی تو تری بات ہی لب پر آئی

داورِ حشر کو اپنی ہی پڑی ہے یوسفؔ
خلق بھی سنگ بداماں سرِ محشر آئی

یوسف حسن



یہ دن تو سارے اصل میں شب کا اعادہ ہیں
کردار صرف ایک ہے، چہرے زیادہ ہیں

تُو بھی اگر کہیں سے پکار ے تو کچھ کھُلے
ہم قرب کی حدوں میں کہاں ایستادہ ہیں

بنجرِ بصارتوں سے کہو، اس طرف نہ آئیں
ہم آنے والی صبحِ صداقت کا جادہ ہیں

کیوں شب لباس آنکھ چُرا کر گزُر نہ جائیں
ہم بھی تو روشنی کی طرح بے لبادہ ہیں

یوسفؔ نفس نفس میں ہیں دامِ ہوس مگر
انکار کی صبح صدائیں ابھی پر گشادہ ہیں



آنکھ چہروں کی صداقت سے مکرتی جائے
عُمر سایوں کے تعاقب میں گزرتی جائے

زرد آنگن کے سُلگتے ہوئے سناٹے میں
بے نوا درد کی لے اور اُبھرتی جائے

پھر منڈیروں پہ شفق پھُول رہی ہے شاید
پھر سرِ قریۂ جاں راکھ بکھرتی جائے

وہ مرے قُربِ نظر سے بھی گریزاں ہے مگر
اُس کی خوشبو مری سانسوں میں اُترتی جائے

دن کی دہلیز پہ بُجھا نیند کا نشہ یوسفؔ
خواہشِ خواب کھُلی دھوپ میں مرتی جائے

شہناز پروین سحر



اگرچہ آئینوں جیسی حقیقتیں تھیں بہت
ہمیں کو راہ بھٹکنے کی عادتیں تھیں بہت

وفا پسند تھا لیکن وفا شعار نہ تھا
وہ کچھ بھی تھا مگر اس سے محبتیں تھیں بہت

بچھڑ گیا ہے تو اب یاد بھی نہیں آتا
کبھی وہ دن تھے کہ اس کی ضرورتیں تھیں بہت

وہ جا چکا مگر اپنا طلسم چھوڑ گیا
وگرنہ اُس کو بھلانے کی صورتیں تھیں بہت

اب آج یوں ہے کہ تجھ سے کوئی بھی شکوہ نہیں
وہ ربط بھی تھا کہ تجھ سے شکایتیں تھیں بہت

بڑے سکون کے دن ہیں مگر سکون نہیں
اُس اضطراب میں بھی جی کو راحتیں تھیں بہت

کہاں رہی ہیں سحرؔ اب وہ اُلجھنیں باقی
ہزار روگ تھے جاں کو، قیامتیں تھیں بہت



تو مسئلہ نہ بنا، کس طرح بچھڑنا ہے
یہ طے تو تھا کہ ہمیں ایک دن اُجڑنا ہے

نہیں قبول تری عمر بھر کی ہمراہی
بس ایک لمحے کا جگنو مجھے پکڑنا ہے

مری خوشی کا شکاری ہی میرا دوست بھی ہے
مرا سنورنا، اُسی سے مرا بگڑنا ہے

تمام لوگ گھروں سے نکل کے بھاگ پڑے
ہر اک نے زندگی کی ریل کو پکڑنا ہے

خلوصِ جاں سے محبت کرو، بچھڑ جاؤ
سحرؔ اگر کسی آزاد کو جکڑنا ہے

شہناز پروین سحر



کاشت پتھر میں ہوا پھول سا میرا سپنا
اے مرے خواب! اسی سنگ سے تُو بھی اُگنا

اُس نے بھی دیکھا تھا وہ خُون میں بھیگا ہوا چاند
اُس سے پھر بھی نہیں چُھوٹا مجھے چندا کہنا

چار دن کی تری چاہت بھی تمنّا ہے مجھے
کوئی مشکل تو نہیں تجھ سے بچھڑ کر جینا

میں کبھی سر کو اٹھاؤں تو فلک پاس لگے
جیسے بس میں ہو مرے چاند ستارے چُننا

رینگ کر چلنا پڑا تیز طبیعت کو سحر
کتنا اچھا لگا پر اُس کا سویرے اُٹھنا



دل میں پھر محرومیوں کا درد ہے
آج ہر خواہش کا چہرہ زرد ہے

قافلے بڑھتے گئے بڑھتے گئے
میں ہوں یا پھر راستوں کی گرد ہے

کس کو بتلاؤں میں جی کی وحشتیں
اجنبی اس شہر کا ہر فرد ہے

وہ جو اپنا ہے وہی اپنا نہیں
وہ بھی غیروں کی طرح بیدرد ہے

گرمیِ محفل سحر بے کار ہے
میرا لہجہ مجھ سے بڑھ کر سرد ہے

سجاد بابر



لفظ کا کتنا تقدس ہے یہ کب جانتے ہیں — لوگ بس بات بنا لینے کا ڈھب جانتے ہیں
اتنی پہچان بھلا ڈرتے لفظوں میں کہاں — ضبط کا نشہ لرزتے ہوئے لب جانتے ہیں
سب نے گلکاریٔ دیوار سراہی — لیکن — کتنے دیوار اٹھانے کا سبب جانتے ہیں
شہر والے تو ہواؤں میں گھلے زہر کا حال — رنگ تصویر سے اڑ جاتے ہیں تب جانتے ہیں
کل کے دفنائے ہوئے جرم نے کھینچا ہوگا — آپ کے پار اترنے کا سبب جانتے ہیں
آپ کی آنکھ میں پرچھائیاں لہراتی ہیں — آپ کے دل میں کوئی چور ہے سب جانتے ہیں
آپ چاہیں تو اسے جوششِ نمو کہہ لیجے — ہم مگر برف پگھلنے کا سبب جانتے ہیں

دھوپ کا عکس بھی سجادؔ وہی سایہ ہے
کس طرح دن میں سما جاتی ہے شب، جانتے ہیں



بدلے ہیں جو اب سوچ نے پہلو نظر آئے — آنگن میں رمیدہ کئی آہو نظر آئے
نکلے جو کبھی حرف کی تسخیر کی خاطر — ہم خود کو خلاؤں کے بہم جُو نظر آئے
کچھ بولتی آنکھوں میں اتر جانا تھا لیکن — تصویر کے سمٹے ہوئے بازو نظر آئے
سلجھائے گا اب کون مزاجوں کی یہ گرہیں — ہنسنے میں بھی الجھے ہوئے ابرو نظر آئے
ڈھل جانا ہے صدیوں کا غبار اک گھڑی میں — سوچوں کے خرابے میں اگر تو نظر آئے
روٹھی ہے سماعت کہ کرن چاپ سنیں گے — بینائی مچلتی ہے کہ خوشبو نظر آئے
وہ مجھ سے الگ ہو تو جھلک بھی نہ دکھائے — جب مجھ میں سمایا ہے تو ہر سو نظر آئے

اک درد کے ریزے ہیں نگران کے لیے بھی
ترتیب کچھ ایسی ہو کہ جادو نظر آئے

سجاد بابر



ں نے جب دیکھا کہ گلدان میں انگارے ہیں
ھڑ کے پھول بھی دیوار پہ دے مارے ہیں

پنے تاریک گریبان میں جھانکا تو کھُلا
اُن صبح کوئی ایک نہیں، سارے ہیں

ں کے دُھوپ صفت شہر میں سُن گُن کے لیے
ا بہ جا اُترے ہوئے رات کے ہرکارے ہیں

ر نئی سمت سے زخموں کے نوادر لے کر
ال کے سال جو آتے ہیں، وہ بنجارے ہیں

حن دل، یاد کھلونوں سے ہے آباد ابھی
ماؤں میں رکھے ہوئے کتنے ہی گہوارے ہیں

ن بھی گو نجتا رہتا ہے دھمک سے اِس کی
سماں پر بھی اسی سوچ کے طیارے ہیں



ہر ذرّے میں آسیب نظر آنے لگا ہے
بس اب مجھے تنہائی سے ڈر آنے لگا ہے

پہلو کی گلی میں کوئی تقریب ہے برپا
لیکن یہ دھواں کیوں مرے گھر آنے لگا ہے

کیوں قصرِ خموشی میں اٹکتی ہیں زبانیں؟
الزام یہ کیسا مرے سر آنے لگا ہے

کیوں اُٹھتی ہیں رہ رہ کے نگاہیں اُسی جانب
کیا نخلِ سرِ رہ میں ثمر آنے لگا ہے

محسوس یہ ہوتا ہے بساطِ شبِ غم پر
سوچوں سے نبٹنے کا ہنر آنے لگا ہے

شاید کوئی بستی نظر آجائے گی پل میں
ہر کوس پہ اب ایک شجر آنے لگا ہے

تنویر سپرا



دانا مرے وجود پہ تحقیق بھی کریں
میں ہوں تو میرے ہونے کی تصدیق بھی کریں

تو اپنی بندگی کی کوئی اور دے سند
سجدے تو اُس کو مشرک و زندیق بھی کریں

جو لوگ میرے جسم کے حاجت روا نہیں
وہ خود کو میری روح سے تفریق بھی کریں

ہم لوگ ہی پسند کریں دستکاریاں
ہم لوگ ہی مشین کی تخلیق بھی کریں

تنویرؔ رہبرانِ سیاست سے یہ کہو
کردار سے زبان کی توثیق بھی کریں



دن بھر تو بچوں کی خاطر مَیں مزدوری کرتا ہوں
شب کو اپنی غیر مکمل غزلیں پوری کرتا ہوں

میری گمنامی کا باعث اُن لوگوں کی شہرت ہے
اپنے تن من دھن سے جن کی میں مشہوری کرتا ہوں

کل تک ممکن ہے تم سے بھرپور بغاوت کر بیٹھوں
آج اگرچہ شکوے باطرزِ جمہوری کرتا ہوں

آج بھی سپراؔ اُس کی خوشبو مل مالک لے جاتا ہے
میں لوہے کی ناف سے پیدا جو کستوری کرتا ہوں

تنویر سپرا



پھر اقتدار کے لیے مصروفِ جنگ ہیں
وہ لوگ جن کے ہاتھ میں وعدوں کے سنگ ہیں

خالق سے اپنے حسن میں تخلیق بڑھ گئی
سورج میں ایک، روشنی میں سات رنگ ہیں

نعروں پہ قدغنیں ہیں تو چیخیں بلند کر
اب لوگ اس سکوتِ مسلسل سے تنگ ہیں

لفظوں کی فاختائیں اڑاتے انھیں نہ دیکھ
یہ امن کے وکیل ہی بنیادِ جنگ ہیں

سپرا دبا کے آگہی کا ریگ مال مار
پرزے مشینِ فن کے ابھی زنگ زنگ ہیں



سب وحشیوں کے کام و دہن کو عزیز ہے
محنت کشوں کا خون بہت ہی لذیذ ہے

رنگت ثمر کی دیکھ کے للچا رہا ہے کیوں
اس دلفریب چھال میں گودا غلیظ ہے

جو کر رہا ہے دوسروں کے ذہن کا علاج
وہ شخص خود بہت بڑا ذہنی مریض ہے

—o—

اندھوں کو دے رہا ہے سحر کی بشارتیں
تنویر! صادقین بھی کیا خوب چیز ہے!

گنجے بنا رہا ہے یہ گنجوں کے نقش بھی
تنویر! صادقین بہت بدتمیز ہے

تنویر سپرا



بجھتے ہوئے ضمیر کو شعلہ انائیں دے
اس جاں بلب مریض کو تازہ ہوائیں دے

پتھر نہیں تو خود کو گرا سطحِ آب پر
اِن گنگ منظروں کے لبوں کو ندائیں دے

اُستادِ وقت سے مری اتنی ہے التجا
کمسن سماعتوں کو نہ بوڑھی صدائیں دے

جس جس کے پاس جو نہیں، کر وہ عطا اُسے
مُلّا کو روح کی، مجھے تن کی غذائیں دے

اے ربِّ آخرت! کوئی ایسا خُدا بھی ہے
جو مفلسوں کو زندگی میں ہی جزائیں دے

ان وسوسوں کے اندھے کنوئیں کی جگہ مجھے
اے ذہنِ شہر پسند! یقیں کی ضیائیں دے

جگ مگ کرے گا شاہدِ معنی کا انگ انگ
سپرا وجودِ شعر کو شیشہ قبائیں دے



مہماں ہیں چند روز کی آسائشیں تری
بربادیوں کی زد میں ہیں آرائشیں تری

اس عہد کے نصاب سے بچوں نے پھاڑ دیں
انسانیت کے ماپ کی پیمائشیں تری

گلشن میں اب کھلیں گے مری سوچ کے گلاب
سختی سے روک دی گئیں افزائشیں تری

جلدی سے اپنے نام کی تختی اُتار لے
اس گھر میں اب رہیں نہیں گنجائشیں تری

سپرا حصارِ جبر کے پھاٹک سُنگ اُٹھے
لگتا ہے، کام کر گئیں گرمائشیں تری

گلزار بخاری



احساس کی لو بڑھائے رکھنا
آندھی میں دیا جلائے رکھنا

ہو کتنے ہی زور پر تعفن
خوشبو کا عَلم اُٹھائے رکھنا

گھاٹے میں جو کی تو کیا تجارت
سرمایۂ جاں بچائے رکھنا

سو جائے نہ زندگی کا دریا
طوفان کوئی جگائے رکھنا

جنگل میں رہیں شکاری جب تک
پیڑوں سے طیور اُڑائے رکھنا

ایسا نہ ہو خُود کو بھُول جائے
آئینہ اسے دکھائے رکھنا

ممکن ہے کبھی وہ لوٹ آئے
گلزار مکاں سجائے رکھنا



دیوارِ فسوں میں در نکالیں
کوئی تو رہِ مفر نکالیں

یوں تو نہ خزانہ مل سکے گا
مٹی کو ہٹائیں، زر نکالیں

اُڑنا ہے تو اُڑ پڑیں پرندے
تیروں کا دلوں سے ڈر نکالیں

پھر خیر کا پیڑ بھی اُگے گا
پہلے تو زمیں سے شر نکالیں

ملیے تو جُدائی کا ہو دھڑکا
خدشے وہی دل میں سر نکالیں

امید پہ ستیاں تو دیکھو
ہم برف سے بھی شرر نکالیں

جو درد شناس ہیں صدف کے
گلزار وہی گہر نکالیں

عبدالستار سیّد



اُجڑے ہیں تو ہاتھ مل رہے ہیں
وہ لوگ جو بے عمل رہے ہیں

مجرم کو پسینہ آرہا ہے
مقتل میں چراغ جل رہے ہیں

منزل کی خبر نہیں ہے، پھر بھی
ہم اپنی ہی دُھن میں چل رہے ہیں

جو پیڑ لدے ہوتے تھے پہلے
اب بھی وہی پھول پھل رہے ہیں

مٹی میں دھنسے ہوئے ہیں پاؤں
اور دشتِ خلا میں چل رہے ہیں

احمد صغیر صدیقی



دل اپنی کوششوں پہ پشیمان ہے بہت
خوابوں کے کاروبار میں نقصان ہے بہت

لیلیٰ کا دور، قصۂ پارینہ ہو چکا
مجنوں کو تیرے، فکرِ گریبان ہے بہت

برہم ہے شاخ شاخ، خفا ہے شجر شجر
موسم میں قتل و خون کا سامان ہے بہت

اُوپر سے دیکھ لیجئے اندر نہ جھانکئے
اس خامشی کے غار میں طوفان ہے بہت

دوشیزہ وسعتوں کے بدن کی تلاش میں
پاگل ہوا گھروں میں پریشان ہے بہت

رؤف شیخ



اوڑھ لی ہے خود غرضی شہر کے مکینوں نے
ڈس لیا ہے ذہنوں کو پھیلتی زمینوں نے
بڑھ رہی ہے بیکاری عقل کے حوالے سے
ہاتھ کی لکیروں کو کھا لیا مشینوں نے
قربتوں کے مرکز پر دوریاں سمٹ آئیں
آنکھ کو دیئے دھوکے جب سے دوربینوں نے
ڈوبنا مقدر تھا خاک کے سمندر میں
پالیا سراغ اپنا جسم کے سفینوں نے
حوصلے کی پستی سے سوچ کی بلندی تک
ہر قدم پہ بہکایا مجھ کو نکتہ چینوں نے
آدمی کے چہرے پر خوف سا مسلط ہے
اس کو بے بسی بخشی اس کے ہم نشینوں نے
صبح و شام مایوسی لمحہ لمحہ ظلمت ہے
بخش دی ہیں سوغاتیں سال کو مہینوں نے
وقت کے توسط سے بے طلب بھی بدلی ہیں
پتھروں کی تقدیریں کانچ کے نگینوں نے
بے رخی کے انداز ے اب رؤف کیا ہوں گے
خون کی جگہ لی ہے جسم کے پسینوں نے



حلقۂ ادراک میں محدود تھا
گو فصیلِ جسم میں موجود تھا
ذات سے ٹوٹا ہوا تھا رابطہ
میں انا کے شہر کا معبود تھا
قربتیں بھی لازم و ملزوم تھیں
میں ذریعہ تھا تو وہ مقصود تھا
نرم چہروں پر سفر کی دھول تھی
منزلوں کا راستہ مسدود تھا
تیرگی میں ڈوبنا تھا جسم کو
روشنی کا جا پچنا بے سود تھا
سرنگوں تھا وہ غرض کے سامنے
جو فرشتوں کا کبھی مسجود تھا
اپنی خوشبو سے فضا مسموم تھی
شان و شوکت کا نشاں بارود تھا
گفتگو میں چاشنی تھی مہر کی
جذبۂ انسانیت مفقود تھا
عادتاً بھی لوگ زندہ تھے رؤف
جب شعورِ زندگی نابود تھا

محمد اظہار الحق



ڈھونڈ کر ویران باغوں کے احاطوں میں ہمیں
چومتا ہے کوئی وحشت ناک راتوں میں ہمیں

راز کھلتا ہی نہیں ہے انتہائے عہد کا
کوئی ایسے میں لگا لیتا ہے باتوں میں ہمیں

بارشیں اب کے ہوں ایسی، پینگ آنکھوں میں پڑے
سات ہوں رنگ اور نظر آئے وہ ساتوں میں ہمیں

خون کے طوفاں سے کیا ہو گی وہ مجبوروں کی جنگ
داستاں ملتی ہے اک اکھڑی قناتوں میں ہمیں

ہر قدم حالت بگڑتی جا رہی ہے زخم کی
شام کاش اظہار آ جائے اُس کے ہاتھوں میں ہمیں

○

خون سا ہر دیدۂ کوکب سے ہے نکلا ہوا
غم ترا پھر آج تاب و تب سے ہے نکلا ہوا

اس کے ہیں اپنے وتیرے، یہ لہو کا عہد ہے
آج کا ہر نغمۂ زخم لب سے ہے نکلا ہوا

تیرگی کا فیض لے یارِ پری پیکر! نہ بھول
یہ تبسم بھی تبیعۂ شب سے ہے نکلا ہوا

منتظر ہیں کب سے در وا نہ ہے یہ قرطاس و قلم
فن تمہاری جستجو میں کب سے ہے نکلا ہوا

پھر کسی کونے میں چھپ کر رو رہی ہیں اظہار ہم
پھر وہ غارت گر نرالی چھب سے ہے نکلا ہوا

افتخار عارف

○

لہو کی گردشوں میں جسم و جاں بہم ہوا کریں
بدن کی آگ میں نہا کے تازہ دم ہوا کریں

یہ کیا کہ ہر گھڑی لہو کی حرمتوں کے تذکرے
جبینیں، جسم کے حضور بھی تو خم ہوا کریں

اُمیدوارِ التفات ہیں ہرے بھرے بدن
قلندرانِ شہر مائلِ کرم ہوا کریں

فروغِ ماہتاب سے شگفتِ سحر تک
بدن بدن نصابِ آرزو رقم ہوا کریں

مسافرانِ کوچۂ جنوں کچھ اور بھی تو ہیں
یہ کیا کہ ہر شجر کے سائے صرف ہم ہوا کریں

○

نئے موسم کی خوشبو آزمانا چاہتی ہیں
کھلی باہیں سمٹنے کا بہانہ چاہتی ہیں

فصیلِ جسم کو ہر طور ڈھانا چاہتی ہیں
نمو کی خواہشیں اظہار پانا چاہتی ہیں

نئے صحرا، نئے آہو، نئے خوابوں کے امکاں
نئی آنکھیں، نئے فتنے جگانا چاہتی ہیں

لہو کی روشنی میں جل رہے ہیں پھول سے جسم
ہوائیں شعلوں کی لو بڑھانا چاہتی ہیں

بدن کے سر بھرے باغوں کی نوزائیدہ ہوائیں
نشاطِ گمرہی کے گیت گانا چاہتی ہیں

نگارِ شام بے منزل! بھٹکتی آرزوئیں
بسیرے کے لئے کوئی ٹھکانہ چاہتی ہیں

خادم رزمی



نجومِ صورت چمک رہا ہے وہ شب گرداں میں
سحر کا سودا ابھی جو باقی ہے کچھ سروں میں

وہ کونسا حشر ہے جو اس کو رہائی دے گا
مرا قبیلہ ہے قید نفرت کے مقبروں میں

ہر ایک اپنی ہی ذات کی جنگ لڑ رہا ہے
کہاں سے آئی یہ تنگ فکری ہنروروں میں

کسے خبر! وہ گلاب چہرے کدھر گئے ہیں
جو مشعلیں بانٹتے تھے شب کے مسافروں میں

اُسی تپاکِ نگاہ کی جستجو ہے مجھ کو
کہ جس سے پیدا گداز ہوتا ہے پتھروں میں

بتا رہی ہے قریبِ ساحل کی سبز کائی
ابھی چھُپے ہیں بہت جزیرے سمندروں میں

جو اذنِ پرواز ہو تو آندھی کو چیر جائیں
ابھی تو اتنی سکت ہے ٹوٹے ہوئے پروں میں

یہ خاک و خوں میں رُلے رُلے زرد زرد مسافر
یہی تو بھرتے ہیں رنگ محنت کے منظروں میں



مری سماعت نے پہلی آواز جب سُنی تھی
مرے لیے وہ کڑے سفر کی اذان بھی تھی

ابھی ابھی اک عجیب نغمہ محیطِ جاں تھا
ابھی تصور میں ایک پائل چھنک رہی تھی

تو آ گیا ہے جواب تو خاموش ہو گئی ہے
ابھی تری یاد شاخِ دل پر چہک رہی تھی

نجانے اُس نے شکست کیسے قبول کی ہے
اُسے تو حاصل فریبِ منزل کی ڈھال بھی تھی

وہ کون تھا جو ہواؤں میں گھُل گیا ہے رزمی
میں سوچتا ہوں، مجھے یہ آواز کس نے دی تھی!

سیّد یسٰین قدرت



شب کے آنگن میں بھی تم منظر نکھرتا پاؤ گے
خوف کی وادی میں اک تارا بکھرتا پاؤ گے

ذہن کے اندر سجے گی دودھ سی اک روشنی
اور باہر اک اندھیرا بھی سنورتا پاؤ گے

سخت ہو جائیں گی زنجیروں کی کڑیاں اور بھی
اور خواہش کو تنِ نازک میں مرتا پاؤ گے

گرم تو ہوگا چمک چمکار کا بازار — پر
رونقوں میں ایک چہرہ فق، اُترتا پاؤ گے

پھیل جائے گا فضاؤں میں ہواؤں کا ہراس
روح کے طائر کو تم ایسے میں ڈرتا پاؤ گے

دید کے میدان میں جب گرم ہوں گے معرکے
تیر سا دل کے بدن سے بھی گزرتا پاؤ گے



جبر کا کوہسار پھٹ جائے
تیرگی ریزہ ریزہ چھٹ جائے

وصل کا نُور بن کے برف گرے
جسم کی شاخ شاخ اَٹ جائے

اب چلے موجۂ ہوائے عزم
قسمتوں کی بساط اُلٹ جائے

سوچتا ہوں، مری اَنا کیا ہے
جو مرے سامنے بھی ڈٹ جائے

چاند کی ایک اِک کرن قدرت
رزق بن کر گھروں میں بٹ جائے

اختر کاظمی



وہ مل گیا ہے مگر حادثہ یہ کیسا ہے
دکھوں کے شہر کا وہ بھی سفیر نکلا ہے

چلا ہے چار قدم ہی کہ تھک کے بیٹھ گیا
سفر بھی اس کا سمندر کے جھاگ جیسا ہے

یہاں رہائی فقط بات ہے دکھاوے کی
وگرنہ اُس کا تو ہر حرف ایک پہرا ہے

اُبل ہی پڑتے ہیں آتش فشاں کبھی نہ کبھی
دلوں کا کرب کہاں تک چھپایا جاتا ہے

اُسے گلے سے لگاؤں تو کس طرح اخترؔ
میں جانتا ہوں، وہ گھل مل کے وار کرتا ہے



کونپلیں ہی ابھی پھوٹی تھیں فقط، شاخوں پر
سنگ گرنے لگے، بارش کی طرح پیڑوں پر

ابھی کرنیں نئی سوچوں کی کہاں ہیں واضح
خوف کی دھند مسلّط ہے ابھی ذہنوں پر

ہم کہ جلتے ہوئے لمحوں کے لیے جیتے ہیں
کس لیے روتے رہیں بجھتی ہوئی صدیوں پر

ضبط کے بس میں نہ رہ پائے گی جذبوں کی تڑپ
یہی لکھا نظر آتا ہے سبھی چہروں پر

آؤ چیخوں میں بدل ڈالیں صدائیں اپنی
کون دیکھے گا یہاں ڈوبتی آوازوں پر

وہ جو کہتا تھا کہ گویائی ملے گی اخترؔ
اب کڑے پہرے لگاتا ہے مری سوچوں پر

غلام حسین ساجد

○

ہونٹوں پر ہے بات، کڑی تعزیریں بھی
خاموشی کا رنگ ہوئیں تقدیریں بھی

خوف بھی ہے آنے والی نسلوں کو
ایک عجوبہ ہوں گی یہ تحریریں بھی

موسم کے سو روپ مگر ان آنکھوں میں
خواب وہی ہیں، خوابوں کی تعبیریں بھی

آئندہ کے سانس ہمارے اپنے ہیں
ٹوٹ چکیں اُس وعدے کی زنجیریں بھی

ایک عجب حیرت میں گم صُم رہتی ہیں
دیواریں، دیواروں پر تصویریں بھی

لمحوں کے ہیں رنگ یہی تو لوگوں سے
بیگانہ ہو جائیں گی تقدیریں بھی

پانی کی خاموش صدائیں کون سُنے!
ختم ہوئیں جب مٹی کی تاثیریں بھی

○

وہی رُتیں ہیں، وہی ہے زنجیر بھی گھروں کی
مگر کہاں ہے وہ سرد چھاؤں صنوبروں کی

یہ سوچتا ہوں، مسافرت میں، اُداس ہو کر
چھلک پڑے اب کہیں سے ساحل کے پتھروں کی

نڈھال ہو کر گرا ہوں سُورج کے ساتھ میں بھی
صدا سنائی نہ دے گی اب شام کے پروں کی

ہے بند ہونے کو اب وہ راہِ نجات بھی کیا
جو اُگ رہی ہے زمیں سے دیوار سی سروں کی

اُداس بیلیں کٹور پھولوں سے لد چکی ہیں
مگر ابھی تک وہی خموشی ہے منظروں کی

مجھے تو اپنے ہی سانس کی ڈوبتی رَووں سے
سنائی دیتی ہے گونج گہرے سمندروں کی

جسے ملا ہوں، وہ شخص پتھر کی مُورتی ہے
مجھے گماں تھا یہ جھوک ہے آئینہ گروں کی

لرز اُٹھا ہوں نہ جانے کیا سوچ کر میں ساجد
کبھی سُنی جو کوئی حکایت بہادروں کی

شاہدہ حسن

○

خواب گُم، رُتیں اوجھل، دن میں رت جگا سا کیوں
پھر میں اپنی سوچوں کے اِس سفر پہ تنہا کیوں

جس پہ بار تھی آہٹ، آج اُس سماعت کو
بارشوں کا پاگل پن، لگ رہا ہے اچھا کیوں

بات سے ہراساں ہوں، بات جھوٹ یا سچ ہو
لفظ کی خوشی کیسی؟ حرف کا بھروسا کیوں

پھول جیسی آنکھوں میں اُلجھنیں ہیں رستوں کی
تھک کے اس مسافت سے خوف نے جگایا کیوں

دستکوں پہ کیوں پلٹوں؟ آہٹوں پہ کیوں چونکوں؟
وہ اگر نہیں ملتا، کوئی اس کے جیسا کیوں؟

○

○

سماں ہے مہرباں نہ اب ہوائیں دل پذیر ہیں
یہ خوشبوؤں کے دن ہیں یا خزاؤں کے سفیر ہیں

میں بادلوں کی رُت میں بھی تھکن سے پیاس پیاس ہیں
سدا سے میری تشنگی کے مرحلے اسیر ہیں

اخیر موسموں سے پھر گلے ملے ہیں دو بدن
عجیب رہگذر ہے یہ، عجیب راہگیر ہیں

بکھر چکے جو روز و شب بہت ہی بے مثال تھے
مگر جو ہم رکاب ہیں، یہ دن بھی بے نظیر ہیں

ہے کس کے انتظار میں یہ خواب گہہ کھلی ہوئی
کہ لوگ خواب دیکھنے کے جرم میں اسیر ہیں

○

جمال احسانی



ہر ایک زخم شناسائی اک کہانی ہے
ملے نہیں ہیں جو لوگ اُن کی مہربانی ہے

یہ حوصلہ تو مجھے جیت کر نصیب ہوا
وگرنہ ہار کے گر ہم نے شکست مانی ہے

نہ یاد رکھنے کی خواہش نہ بھول جانے کی
نہ در بنانا، نہ دیوار ہی گرانی ہے

یہاں کسی کا بھی پرسانِ حال کوئی نہیں
یہ کیسا شہر ہے، یہاں کس کی حکمرانی ہے

دیئے کی لَو سے جو [illegible] نے کبھی لکھی
ہوا کے پاس وہ اب تک مری نشانی ہے

سمندروں کا سفر آج تو مزہ دے گا
ہوا بھی تیز ہے، کشتی بھی بادبانی ہے

کنارِ آبِ رواں آئینہ بدست ہے چاند
درونِ آب کبھی عکس کی روانی ہے

جمالؔ کھیل نہیں ہے کوئی غزل کہنا
کہ ایک بات بتانی ہے، اک چھپانی ہے





سردی کی [illegible] رات میں چھتوں پر تمام شہر
اوڑھے ہوئے تھا برف کی چادر تمام شہر

اک شخص جا رہا تھا ہمیشہ کے واسطے
آیا ہوا تھا شہر سے باہر تمام شہر

ہر گھر سلگ رہا ہے محبت کی آگ میں
زندہ رہا ہے برف کے اندر تمام شہر

ایک آدھ ہو تو اس کا کوئی تذکرہ بھی ہو
آیا سفر میں یاد برابر تمام شہر

ہم [illegible] اجنبی کے زخم ہرے کر دیئے گئے
کیوں آ گیا گھروں سے [illegible] تمام شہر

سڑکوں پہ اتنے لوگ نظر آتے ہیں جمالؔ
جیسے مری طرح سے ہو بے گھر تمام شہر



خالد اقبال یاسر



لگے جب پیاس تو رستا لہو پینے نہیں دیتا
ادھر فنا کی کمال، ہجو، میری مجھے جینے نہیں دیتا

تنا سرت کی رد ہو گئی ہے وقت کے در سے
اگر میں زندگی مانگوں: مجھے جینے نہیں دیتا

خود اپنی شکل دیکھے ایک مدت ہو گئی مجھ کو
اٹھا لیتا ہے پتھر، ٹوٹے آئینے نہیں دیتا

دلوں کو کھینچنے والا ترنم کھو چکا ان کا
مگر وہ میرے بے آواز سازینے نہیں دیتا

زمانہ از یہ یاسر ہنگ کی مانند بیٹھا ہے
مجھے میرے جواہر، میرے گنجینے نہیں دیتا

(عمان)

سبط علی صبا



ہر طرف عفریت ہیں اور گھاٹیاں ہیں خوں میں تر
بیشۂ ہستی کی سب پگڈنڈیاں ہیں خوں میں تر

ذہن بچوں کی طرح کچھ بھی سمجھ سکتے نہیں
کیوں ہماری خواہشوں کی تتلیاں ہیں خوں میں تر

منزلیں گردِ سفر، رختِ سفر آزارِ جاں
گھنٹیاں چپ ہیں کہ آگے بستیاں ہیں خوں میں تر

ہیں کہ آدھے جسم کے بارِ گراں سے چور تھا
رینگتا آخر کہاں تک؟ کہنیاں ہیں خوں میں تر

خیمہ زن ہو گا کہاں اب فصلِ گل کا قافلہ
جل رہی ہیں پتیاں اور ٹہنیاں ہیں خوں میں تر

رت جگوں سے اے صبا آنکھیں مری لبریز تھیں
آئینے کہتے ہیں، تیری پتلیاں ہیں خوں میں تر

خالد شریف

○

مہرباں کوئی نظر آئے تو سمجھوں "تو" ہے
پھول مہکیں تو یہ جانوں کہ تری خوشبو ہے

عقل تسلیم نہیں کرتی، یہ دل مانتا ہے
وہ کوئی معجزہ ہے، وہم ہے، یا جادو ہے

اب ترا ذکر کریں گے نہ تجھے یاد کبھی
ہاں مگر دل کے دھڑکنے پہ کسے قابو ہے

کچھ مزاج اپنا ہی بیگانہ ہُوا جاتا ہے
ورنہ اس شخص کی تو نرم روی کی خو ہے

غم رگ و پے میں اترتا ہے لہو کی صورت
درد پلکوں پہ لرزتا ہوا اک آنسو ہے

آج کچھ رنگ دگر ہے مرے ویرانے کا
سوچتا ہوں، یہ تری یاد ہے، یا خود تو ہے

بند کلیوں کو بہار سے ملنے دو اگر تو سہی
بات کر، یہ بھی تو انکار کا اک پہلو ہے

ناصر سلطان کاظمی

○

ترس گئی مری بینائی، کچھ اجالا دے
اگر ستارہ نہیں، کوئی اشک پارا دے

شبِ سیاہ! مجھے انتظارِ صبح نہیں
جو ہو سکے تو مرا چاند مجھ کو لوٹا دے

پلایا کرتا تھا جس میں مجھے مرا ساقی
شراب دے نہ دے، ساغر وہی پرانا دے

کیا ہے تلخیٔ دوراں نے اس قدر بے حس
کوئی خبر نہیں ایسی جو مجھ کو چونکا دے

جو دردِ حاصلِ عشق تھا، وہ تو چھین لیا
اب اس کے بدلے میں تُو چاہے ساری دنیا دے

بلا رہا ہے وہ خوابوں کے چاند سے مجھ کو
بروا تے تیرگی! ہٹ سامنے سے، رستا دے

اگر تو چاہے کہ زندہ رہوں ابھی کچھ اور
دلِ خراب کو یا رب! کوئی تمنا دے

شفیع ضامن



(نذرِ میر)

ہم نے اِسی اُمید پہ عمراں گذاریاں
پوری کبھی تو ہوں گی مُراداں ہماریاں

ہاں! بس اِسی خیال سے ہر ظُلم سہ لیا
آخر گذر ہی جائیں گی راتاں یہ کاریاں

کتنی ہی بار اپنی اُمنگوں کی میّتیں
ہم نے خود اپنے ہاتھوں لحد میں اُتاریاں

آئیں جو اپنے ساتھ محرم سے غم لیے
ایسی بھی ہم نے کتنی ہی عیداں گذاریاں

لفظوں کے آب رنگ سے اے جانِ آرزو!
کیا کیا نہ ہم نے تیری شبیہاں اُبھاریاں

دیکھے نہ ان میں پیار کنول تیرتے کبھی
یہ تیرے نیل نین بھی جھیلاں ہیں کھاریاں

کیا یہ دلیلِ قربِ قیامت نہیں؟ کہ اب
آنکھوں کو اپنی پلکیں بھی لگتی ہیں بھاریاں



اب تو ہے بس یہی دھڑکا ہم کو
مار ڈالے نہ مسیحا ہم کو

رُخ بدلنے پہ ہے مائل پھر سے
پھر ڈبو دے نہ یہ دریا ہم کو

کون قاتل تھا ہمارا آخر
آئینہ کچھ تو دکھاتا ہم کو

رات کس گھور نگر میں آئی
کس گپھا میں ہوا تڑکا ہم کو

حق سدا پہلے بھی ناحق ٹھہرا
تو بھی اب شوق سے جھٹلا ہم کو

اِک یہی غم ہے، یہی ایک خوشی
تُو سمجھ کر بھی نہ سمجھا ہم کو

دل میں اُترا ہے وہ بھالے کی طرح
تُو نے تو پھول ہی مارا ہم کو

شہر کی بھیڑ میں یادوں کا ہجوم
کر گیا اور بھی تنہا ہم کو

دُھند کچھ اتنی گھنی ہے ضامن
کچھ دکھائی نہیں دیتا ہم کو

قائم نقوی



بھید مجھ پر بھی کب کھلا میرا
کیا کوئی دے سکے پتا میرا

آنکھ کی لو میں ہے ضمیر کی لو
مجھ میں زندہ ہے رہنما میرا

گا رہا ہوں میں وقت کی لے پر
لمحہ لمحہ ہے آشنا میرا

خاک ہو کر روش روش بکھروں
جانے کس سمت ہو خدا میرا

تیرے دل کی خبر خدا جانے
تیرے گھر میں بھی کون تھا میرا

ریزہ ریزہ ہوتے ہیں خواب مرے
پھر بھی قائمؔ ہے حوصلہ میرا

احمد ضیا



بازاروں میں سہمے سہمے پھرتے ہو
ذہنی طور سے اب تک تم اک بچے ہو

بالغ ہو اور پھر بھی ضدی بنتے ہو
ہاتھ بڑھا کر تارے توڑا کرتے ہو

دھوپ کی تیزی جسم جلائے دیتی ہے
آخر گھر سے کس برتے پر نکلے ہو

دنیا والے تم پر ہنستے رہتے ہیں
آپ ہی اپنا رستہ روکے بیٹھے ہو

اپنے آپ سے تم کو اتنی نفرت ہے
خنجر لے کر خود کو ڈھونڈا کرتے ہو

زمان کنجاہی



فریب دینے لگی اس قدر، اَنا مجھ کو
کہ آئینے میں دکھائی دیا خدا مجھ کو

چراغِ راہگزر ہوں، خود اپنی اوٹ میں ہوں
بجھا سکی نہ کسی سمت کی ہوا مجھ کو

میں اپنی ذات کے گنبد میں بند ہوں، لیکن
سُنائی دیتی رہی دور کی صدا مجھ کو

وہ شخص مجھ سے ہر رہگزر جدا ہو کر
نہ جانے کتنی ہی راہیں دکھا گیا مجھ کو

اُٹھائے جب بھی قدم اس کی سمت میں نے زماںؔ
صدائیں دیتے ہیں میرے ہی نقشِ پا مجھ کو



اپنی شہ رگ اپنے ہاتھوں کیسی زخمی ہو گئی
آج اِک اِک سانس مجھ پر کتنی بھاری ہو گئی

برف کی چادر میں یوں لپٹا ہوا ہے میرا دل
اِس مکاں پر اس برس جیسے سفیدی ہو گئی

اب کسے جانے، گرمیِ دل کا وہ موسم کیا ہُوا
خواہشوں کی راکھ تک اس بار ٹھنڈی ہو گئی

میں خیالوں میں ترے پیکر کو جب چھونے لگا
اور بھی تنہائی کی دیوار اونچی ہو گئی

جس کے دیکھے سے چمک اٹھتی تھیں آنکھیں اے زماںؔ
ذہن کے البم سے وہ تصویر چوری ہو گئی

گلزار وفا چودھری



منتشر ہو کر رہے، یہ ایسا شیرازہ نہ تھا
خاک ہو جانا مرے ہونے کا خمیازہ نہ تھا

میں بطونِ ذات میں اور تُو خلا میں گم رہا
خاک کے جوہر کا ہم دونوں کو اندازہ نہ تھا

آبپاشی سے رہے غافل شجرکاری کے بعد
اب جو دیکھا ایک پودا بھی تر و تازہ نہ تھا

ہم میں جو آزاد تھا، آزاد تر ہو کر رہا
اب وہی بے گھر ہے جس کے گھر کا دروازہ نہ تھا

جبر کے احساس کی آواز تو پہلے بھی تھی
انقلابِ قسمتِ آدم کا آوازہ نہ تھا



یہ نہیں کہ جال یوں پھیلا نہ تھا
آدمی ایسے کبھی اُلجھا نہ تھا

جڑ میں دیمک تھی تو اس کا کیا سوال
پیڑ کا سایہ گھنا تھا یا نہ تھا

دھوپ کا خیمہ تنا تھا ہر طرف
شہر میں اس کے سوا سایا نہ تھا

آپ کو میں کس طرح پہچانتا
آپ کا اپنا کوئی چہرہ نہ تھا

میں اگر سُولی پہ چڑھ پایا تو کیا
آدمی تھا خاک کا ذرہ نہ تھا

ہم جو اس کے تھے، سدا اس کے رہے
وہ جو اپنا تھا، کبھی اپنا نہ تھا

شجاعت علی راہی



ڈور افق کے پار چھپے ہیں چاند ستارے
دور سمندر پار ہمیں اک دیس پکارے

اس معصوم ہرن سے جنگل سندر سندر
یارو دیکھو کوئی اس کو تیر نہ مارے

ٹھنڈا پانی تیری آنکھ کا نور بڑھائے
تازہ ہوا کا ہاتھ تری زلفوں کو سنوارے

زندہ لہریں خواب ہوئیں اور ہاتھ نہ آئیں
لپٹ گئے پاؤں سے یوں بے جان کنارے

یہ سب تیرے میرے دُکھ کو بانٹ رہے ہیں
یہ شاعر، یہ دُکھ کے فرشتے، یہ بنجارے

ایک پرندہ اُڑتا جائے میرے اندر
میرے باہر اک قینچی لشکارے مارے

آنکھوں کے اندر ہی جن کی عمر کٹی ہے
کس نے دیکھے راہی اُن اشکوں کے دھارے

علی وجدان



سوال پھول تھا، پتھر جواب میں آیا
میں تجھ پہ کر کے بھروسا، سراب میں آیا

وہ بزم چھوڑ کے شہرِ عذاب میں آیا
مثالِ موج ہوا اضطراب میں آیا

جو عکس بن کے مرے دل کے آئینے میں رہا
وہ ایک شخص نظر روز خواب میں آیا

میں شعر کہتا رہا، اُس کی شکل بنتی رہی
یہ مرحلہ بھی جدائی کے باب میں آیا

جو گُل کو چومنا چاہا، تو کر گیا زخمی
وہ ایک خار جو شاخِ گلاب میں آیا

تمام عمر اُسے دیکھنے کو ترسے ہم
تو پھر وصال کہاں سے حساب میں آیا

اُسے بھی سامنے آنے میں ہچکچاہٹ تھی
عجیب لطف مجھے بھی حجاب میں آیا

میں اک عذاب سے گزرا ہوں، تب کہیں وجدان
شعورِ عصرِ ہنر کی کتاب میں آیا

الفت رسول

بات خورشید سی کہنا چاہوں
ورنہ خاموش ہی رہنا چاہوں

ہوں تو دریائے محبت لیکن
میں کناروں میں ہی بہنا چاہوں

رونقِ شہر سے بھاگوں ڈر کر
جانے کس دشت میں رہنا چاہوں

یوں تو کیا بات نہیں کی تجھ سے
کچھ مگر اور بھی کہنا چاہوں

بہترینِ تنت تے حیات
اک ترے پیار کا گہنا چاہوں

جیسے پڑ جاتے کوئی چسکا سا
ہر گھڑی درد ہی سہنا چاہوں

پاسِ تقدیسِ تعلق دیکھو
اس کو اپنا بھی نہ کہنا چاہوں

دل کے نزدیک ہے کتنا الفت
دور جس شخص سے رہنا چاہوں

کر دیتا ہے اقرار بھی انکار میں شامل
یہ فن بھی ہے اس شوخ کی گفتار میں شامل

مانا کہ کھلا ہم پہ مگر یہ نہیں کھلتا
کیا بھید تھا اس راز کے اظہار میں شامل

اب ہم سے شکایت ہے تغافل کی تو کیوں ہے
ہم تھے ترے احباب نہ اغیار میں شامل

جو میرے یہاں عیب ہے اے محترمِ شہر
وہ تیرے یہاں خوبیِ کردار میں شامل

کل شہر میں جو سب سے بڑا حادثہ گزرا
دیکھا تو نہیں آج کے اخبار میں شامل

باہر کی ہوا آپ کے روکے سے رکے کیا
کچھ روزن و در بھی تو ہیں دیوار میں شامل

ماں باپ سے بچھڑا ہوا اک پھول سا بچہ
تھا گریہ کناں، رونقِ بازار میں شامل

اک خواہشِ سرکش کا گلا گھونٹ دیا ہے
اب جیت ہی کر لوں کہ اسے ہار میں شامل

الفت جسے ہم خود ہوں سمجھنے سے گریزاں
کر دیتے ہیں اس بات کو اسرار میں شامل

محسن ننیخ



مسیحائی تری مجبور کیوں ہے
بدن اب تک مرا، ناسور کیوں ہے

میں لبریزی میں بھی کیوں سرسری سا
تُو خالی ہو کے بھی بھرپور کیوں ہے

سماعت بوجھ ہے جب عمر بھر کا
زباں گویائی سے معذور کیوں ہے

میں تجھ سے کٹ کے قیدِ عجز کاٹوں
تو میرے بعد بھی مغرور کیوں ہے

سبھی گمنام سطریں پڑھ رہے ہیں
جو پس منظر ہے، وہ مشہور کیوں ہے

میں اپنی جاں بھی ایندھن دے چکا جب
بدن پھر برف سا تنّور کیوں ہے

کوئی تو آرزو پھل جائے محسنؔ
سدا پتھر کی زد پر بُور کیوں ہے



کس طرح آئے گی کاغذ پہ جوانی تیری
کتنی مشکل ہوئی تصویر بنانی تیری

مفت میں بکنا پڑے اک نئی شہرت کے لیے
اتنی ارزاں بھی نہ ہو جائے گرانی تیری

اور بھی نام کئی آئے ترے نام کے ساتھ
مختصر ہو نہ سکی مجھ سے کہانی تیری

میری آنکھوں میں ہے صورت تری ساحل ساحل
دل کے دریا میں ہے موجود روانی تیری

کتنا شرمندہ ہوں میں تجھ سے شکایت کر کے
بھول جانا بھی تو عادت ہے پرانی تیری

محسن شیخ



ہمارا گھر بھی گیا، اور بھی گھرانے گئے
چھتوں کے ساتھ ہی چڑیوں کے آشیانے گئے

ہماری موت ہوئی، انتقالِ عہد ہُوا
نیا لہو تو مِلا، ولولے پرانے گئے

یہ اور بات، وہ ہم سے بڑا جواری تھا
تمھارے واسطے ہم داؤ تو لگانے گئے

وہ جا چکا تھا تو اپنی انا ہی رہ جاتی
دیارِ غیر میں ہم کیوں اُسے منانے گئے

وہ موج موج سرابوں کا دشت تھا محسنؔ
جہاں بھڑکتی ہوئی پیاس ہم بجھانے گئے



ہری رُتوں کے مناظر تو سب نظر میں رہے
مگر یہ ہم کہ سدا خواہشِ ثمر میں رہے

طویل راہوں میں سُورج تھا سائباں اپنا
ہم ایک عمر کڑی دُھوپ کے سفر میں رہے

ہری تھیں جتنی بھی شاخیں، وہ کاٹ لیں تُو نے
مگر جو چھاؤں کے جذبے تھے اب شجر میں رہے

تھی منزلوں پہ نظر جن کی، سُرخرو بھی ہوئے
بھٹک گئے تو ہمیشہ ہی رہگزر میں رہے

تمام رات اندھیروں سے جو چراغ لڑے ہیں
اُنھی کا نام نہ کیوں مطلعِ سحر میں رہے

علی مطہر اشعر



یہی ہونا تھا آخر انتہا میں
کہ اک پتھر ہے دستِ نارسا میں
میں اک خیرات کے سکے کی صورت
خجل ہوں کاسۂ دستِ گدا میں

خیالوں کو کہاں تک لفظ بخشوں
ہزاروں رنگ بکھرے ہیں خلا میں
وفائیں سلسلہ در سلسلہ ہیں
بہت سے نقشِ پا ہیں کربلا میں

کھلی آنکھوں سے سب کچھ دیکھتا ہوں
مگر جنبش نہیں ہے دست و پا میں
ترے دامن میں پھر بھی کچھ نہیں ہے
بہت کچھ تھا ترے دستِ عطا میں

صورتِ نقشِ کفِ پا نہ اٹھا
جو گھنے سائے میں بیٹھا، نہ اٹھا
جاں بلب قریۂ جاں سے گزرے
ایسا سویا کہ مسیحا نہ اُٹھا

ہر نئی رات نے بدلا ہے مجھے
جیسا سویا، کبھی ویسا نہ اُٹھا
بوجھ کیا کیا نہ اٹھائے میں نے
ہاں مگر ہاتھ میں کاسہ نہ اٹھا

مجھ کو تنہائی کی حسرت ہی رہی
میرے پہلو سے ہیولا نہ اُٹھا
رات بھر جاگنے والا اشعرؔ
کبھی سنئے گا کہ سوتا نہ اٹھا

صغیر ملال



نئے انسان کو ویرانے بساتے دیکھا
کون سی آگ کہاں جا کے بجھاتے دیکھا

روشنی کا ، یہ پرندہ بھلا کیا معنی لے
سائے سے نکلا تو سائے میں ہی جاتے دیکھا

پہلے آتے تھے ترے پاس کہ مایوس نہ تھے
پہلے آتے تھے مگر اب نہیں آتے دیکھا

زخم کھائے ہیں فقیروں نے مگر جیت گئے
کس نے دُنیا کے انھیں وار بچاتے دیکھا

اِک قبیلے میں تھا سردار کا بیٹا شاعر
اُس قبیلے کو کبھی خواب نہ بہلاتے دیکھا



قرینہ سیکھ ہواؤں سے، جن کا گھر ہی نہیں
جو منزلوں کے لیے ہو سفر، سفر ہی نہیں

سحر سے شام تلک ہیں زوال آمادہ
اور ان پہاڑوں پہ صدیوں کا کچھ اثر ہی نہیں

پرانے شہر کی گلیاں عجیب ہوتی ہیں
کہ دھوپ اور ہوا کا جہاں گزر ہی نہیں

وہ حادثے جو کسی کہکشاں میں کب کے ہوئے
زمین والوں کو اُن کی ابھی خبر ہی نہیں

بلندیوں پہ پہنچنے سے یہ ہُوا حاصل
کہ پستیوں کا مرے دل میں کوئی ڈر ہی نہیں

ملالؔ ایسا چمن ڈھونڈتا ہے اپنے لیے
درخت گرتے ہوں خود بھی جہاں ثمر ہی نہیں

احمد ندیم قاسمی



آئے کوئی انقلاب آئے
دل پر نہ مگر حجاب آئے

سیپی کے قفس کو توڑتے ہی
موتی میں بلا کی آب آئے

انساں کی کتابِ زندگی میں
کیوں کرب کے اتنے باب آئے

جب میرا سوال ہے زمیں سے
افلاک سے کیوں جواب آئے

ذرات کا ذکر ہو رہا ہے
کیوں بیچ میں آفتاب آئے

قرنوں پہ محیط علم تیرا
لمحوں کا مجھے حساب آئے

سیلابِ خود آگہی جب اُمڈا
[illegible] بھی زیرِ آب آئے

زنداں سے تو میں نمٹ چکا ہوں
اب اور کوئی عذاب آئے

ہر روز نیا جنم لیا ہے
مجھ پر تو کئی شباب آئے

جو شاخ نفی کرے تنے کی
اس شاخ پہ کیا گلاب آئے!



یوں تو میں دشت پہ بھی پرتوِ گلشن دیکھوں
سایۂ گل میں مگر سانپ کا مسکن دیکھوں

اب تو یہ دستِ تہی کاٹنا جائز ٹھہرا
مدتوں سے کئی پھیلے ہوئے دامن دیکھوں

مر گئے تشنہ دہن، جل گئے کھیتوں کے بدن
اب تو برسات کے امکان کو روشن دیکھوں

کبھی کہسار میں کرتا تھا مَیں معدن کی تلاش
اب زمینوں میں بھی، سینوں میں بھی آہن دیکھوں

مجھ پہ ہے شیخ کی تکریم تو لازم، لیکن
اسے نزدیک سے دیکھوں تو برہمن دیکھوں

اتنا چمکا کہ مجھے افشائے حقیقت کا پڑا
آسمانوں میں بھی روزن، پسِ روزن دیکھوں

اختلافات

مسعود مفتی، اکبر کاظمی، شریف الدین اشرف، ستارہ صابر، شفیع ضامن، یوسف حسن، آصف ثاقب، خیال مینائیؔ، خورشید جاوید، تاثیر وجدان، م ا ت، سیّد انجم جعفری، علی تنہا، محمد امین، گلشن مظفر، ش صغیر ادیبؔ شفیق احمد شفیق،

"مشرقی پاکستان کا المیہ اور اہل قلم" کے موضوع پر "فنون" کے بہرۂ "اختلافات" میں ایک عرصے سے بحث چل رہی ہے مگر بحث کے انداز سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کسی نتیجے تک پہنچنا مشکل ہے۔ اس صورت میں بحث کو جاری رکھنا بیکار ہے چنانچہ اسے ختم کیا جا رہا ہے ——— "ادارہ"

مشرقی پاکستان کا المیہ اور اہل قلم

"مشرقی پاکستان کا المیہ اور اہل قلم" کی بحث جاری ہے جس میں طنز، تیر و نشتر اور نیم دشنام تک کا آزادانہ استعمال بھی جاری ہے حالانکہ صحیح بحث ان کے بغیر بھی ہو سکتی ہے۔ میں ان سب سے پرہیز کرتے ہوئے فقط ایک پہلو کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں۔

ابھی تک جو مراسلے شائع ہوئے ہیں ان سے دو زاویوں کا اندازہ ہوتا ہے۔

پہلا زاویہ تو یہ ہے کہ مشرقی پاکستان میں علیحدگی پسندوں نے حالات سے فائدہ اٹھا کر بغاوت کی تھی۔ غداروں نے ہندوستان سے سازش کی اور جارحی قومی طاقتوں نے ان دونوں کی مدد کی۔ اس سے محب وطن عناصر کمزور پڑ گئے اور نتیجے میں پاکستان ٹوٹ گیا۔ اس عمل میں دونوں طرف سے وہ زیادتیاں بھی ہوئیں جو خانہ جنگی میں ہوا کرتی ہیں۔ مگر یہ خانہ جنگی علاقائی منافرت اور ہندوستان کی سازش کا نتیجہ تھی اور اس طبقاتی کشمکش کا دھارا نہ تھی جو کارل مارکس کے مطابق معاشی حالات سے پیدا ہوتی ہے۔

دوسرا زاویہ ان مراسلہ نگاروں کا ہے جو مشرقی پاکستان کی بغاوت کو جنگ آزادی سمجھتے ہیں اور غداری کے عناصر کو تسلیم نہیں کرتے۔ نہ ہی وہ ہندوستان کا منفی اور جارحانہ کردار تسلیم کرنے کو تیار ہیں۔ وہ فوج کی زیادتیوں کو قابل مذمت اور باغیوں کی زیادتیوں کو قابل تحسین سمجھتے ہیں۔ اس خانہ جنگی کو وہ کارل مارکس والی طبقاتی جد و جہد سمجھتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر والے اصحاب بدقسمتی سے کھل کر بات نہیں کرتے بلکہ پہلے نقطۂ نظر والے اصحاب کی ہر بات کو جذباتی اور سطحی کہہ کر رد کرتے ہوئے اصرار کرتے ہیں کہ انہیں "اصلی" اور "سچی" بات بتائی جائے۔ اصلی اور سچی بات سے ان کی مراد ان کا اپنا نقطۂ نظر ہے۔

چند اختلافات کے باوجود میرا اور صدیق سالک کا تعلق اول الذکر زاویے سے ہے۔

میں مراسلات کا احترام کرتے ہوئے موخر الذکر نقطۂ نظر والے اصحاب سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنے نقطۂ نظر کے مطابق دل کھول کر لکھیں جو بھی وہ محسوس کرتے ہیں۔ خود لکھیں۔ مگر ان کا یہ طرز عمل درست نہیں کہ وہ خود تو کچھ نہ لکھیں اور ہم پر خفا ہوتے رہیں کہ ہم ان کے نقطۂ نظر سے کیوں نہیں لکھتے

انہیں لکھنے سے کسی نے کبھی نہیں روکا۔ اس لئے ان کو بھی چاہئے کہ دوسروں کو لکھنے سے نہ روکیں بلکہ خود ہمت کریں۔ چشم ما روشن دل ما شاد۔
بصد ادب عرض کرتا ہوں کہ ان کے طعن و تشنیع اور گالیوں سے تو ہم اپنا مسلک نہیں بدلیں گے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اپنے زاویے سے کوئی ایسی ٹھوس چیز لکھ دیں کہ ہم اپنے خیالات میں تبدیلی کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ مگر وہ لکھیں تو ——— اور پھر فیصلہ اپنے ہاتھ میں نہ لیں بلکہ مستقبل پر چھوڑ دیں۔

ایک چھوٹا سا واقعہ بھی سن لیں۔

بچپن میں ایک دفعہ والد صاحب کے ساتھ مسجد میں نماز ادا کرنے گیا۔ جماعت کھڑی ہوئی تو امام صاحب قرأت کے دوران بھول کر رک گئے۔ نمازیوں میں سے کسی نے پیچھے سے بلند آواز میں لقمہ دیا تو مولوی صاحب نے تلاوت مکمل کی اور معمول کے مطابق جماعت ختم کی۔

سلام پھیرتے ہی چند لوگ کھڑے ہو گئے کہ یہ نماز ادا نہیں ہوئی اور نہ ہی قبول ہو سکتی ہے کیونکہ لقمہ دینا جائز نہیں۔

چند اور لوگ بھی بول اٹھے کہ لقمہ دینے میں کوئی حرج نہیں اور یہ بالکل جائز ہے۔

چند ہی لمحوں میں وہاں فساد کے آثار نظر آنے لگے۔ والد مرحوم نے لوگوں کو سمجھایا اور کہا کہ جھگڑے کی کوئی بات نہیں۔ جو حضرات سمجھتے ہیں کہ نماز ادا ہو گئی ہے وہ گھروں کو چلے جائیں اور جن کا خیال ہے کہ ادا نہیں ہوئی وہ دوبارہ پڑھ لیں۔

کیا آپ یقین کریں گے کہ سبھی لوگ واپس چلے گئے اور معترضین میں سے کسی نے بھی دوبارہ نماز ادا نہ کی؟

میں سوچ رہا ہوں کہ کیا ہمارے معترضین بھی اعتراض کر کے گھر چلے جائیں گے یا بیٹھ کر کچھ لکھیں گے۔

مسعود مفتی (اسلام آباد)

"مشرقی پاکستان کا المیہ اور اہل قلم" کے زیر عنوان بہت سے حضرات خاصے عرصے سے اپنے اپنے تاثرات کا اظہار کر رہے ہیں۔ تازہ شمارے میں توصیف صاحب نے خط کے روپ میں اس موضوع پر مختصر مگر خوبصورت مضمون لکھ دیا ہے۔ البتہ کچھ باتیں ایسی ہیں جن پر کھل کر بات کرنے کی ضرورت ہے۔ پاکستان کے ساتھ سب سے بڑا المیہ جو پیش آیا ہے وہ یہ ہے کہ یہ ملک اسلام کے نام پر بنایا گیا تھا لیکن اسلام کو یہاں سے نکال دیا گیا حالانکہ اسلام صرف روزہ، نماز اور حج کا نام نہیں ہے۔ اسلام نے انسانیت کا جتنا تحفظ کیا ہے کوئی مذہب اور کوئی ازم بھی اس کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ رسول اکرم صلعم نے اپنی حیات طیبہ میں صرف ایک نماز تاخیر سے ادا فرمائی اور وہ بھی عید قربان کی نماز تھی جسے جلد ادا کرنے کا حکم ہے کہ لوگوں کو قربانی کے فرائض ادا کرنا ہوتے ہیں۔ یہ نماز آپ صلعم نے اس لئے دیر سے ادا فرمائی کہ گھر سے نکلے ہی تھے کہ ایک بچے کو روتے دیکھا۔ اس سے سبب پوچھا۔ بچے نے بیان کیا کہ میرا باپ مر چکا ہے اور مجھے یعنی عید کے دن بھی ماں نے اچھے کپڑے اور اچھا کھانا مہیا نہیں کیا۔ اس پر آپ (صلعم) نے صحابہ کو عید گاہ روانہ فرما دیا اور خود بچے کو گھر لے گئے۔ غسل کرایا، گھر میں حضرت امام حسین علیہ السلام کا ایک جوڑا رکھا تھا، وہ پہنایا، کھانا کھلایا۔ پھر بچے کے گھر سامان خوراک بھجوایا اور تب جا کر عید گاہ کا رخ فرمایا۔ ثابت ہوا کہ اسلام میں سب سے بڑی عبادت نماز بھی اس وقت ملتوی کر دی جاتی ہے جب کسی کو بھوکا دیکھ لیا جائے گویا یہ ایک طرح سے نماز سے بڑھ کر خدا کی عبادت ہے اور اسی کو پاکستان کے مسلمانوں نے بلکہ میں یہ کہوں گا کہ منافق مسلمانوں نے، جو دل سے مسلمان نہیں ہیں نظر انداز کیا۔ پاکستان اسلام کے نام پر مسلمانوں یعنی غریب و بے کس مسلمانوں کے اقتصادی تحفظ کے لئے بنا تھا لیکن یہاں اسلام کے نام پر جتنی لوٹ کھسوٹ ہوئی شاید ہی دنیا میں کسی نام پر ہوئی ہو۔ بیشتر دانشور بھی انہیں منافقوں میں سے ہیں کہ ہوٹلوں اور محفلوں میں بیٹھ کر حکومت کو اور پاکستان کے قوم پرست ادیبوں کو گالیاں دیتے ہیں اور اگر دوسرے روز ریڈیو یا ٹیلیویژن وغیرہ پر ملازمت مل جائے یا کسی رسالے میں دس غزلیں اکٹھی چھپ جائیں تو پھر ایک دم رخ بدل لیتے ہیں کہ اب کس کو گالی دے کر شہرت اور روپیہ اکٹھا کیا جائے۔ کھانا پاکستان کا اور نعرے دوسروں کے حق میں۔ کیا آپ نے کسی کریانہ فروش کو دیکھا ہے کہ وہ دوکان پر دودھ دہی کا بورڈ لگا کر بیٹھے؟

میرا خیال ہے کہ مشرقی پاکستان کا المیہ اسی لئے ظہور پذیر ہوا کہ پاکستان کے فنکاروں میں اکثریت ایسے ہی بکاؤ مال کی ہے۔ اس وقت اہل قلم کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ جس بھی ازم کو مانتے ہیں صداقت اور جرأت کے ساتھ نہ صرف اس کا اظہار کریں بلکہ اپنے قول و فعل اپنے ضمیر و قلم میں

ہم آہنگی پیدا کریں۔

مشرقی پاکستان میں ادب کے نام پر حکومت سے یا رائٹرز گلڈ سے پرمٹ لے کر کتنے ہی اہل قلم جاتے رہے مگر خلوص دل سے کسی نے کوشش نہ کی کہ ذہنی سطح پر مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے پڑھے لکھے لوگوں کو ایک حلقہ کار میں لایا جائے۔ بس ہوٹل بازی اور عیاشی کرتے رہے۔ قابل قدر وہی لوگ ہوتے ہیں جو اپنے نظریۂ حیات پر تادم حیات قائم رہتے ہیں خواہ ان پر کتنی بھی افتاد ٹوٹ پڑے۔ ان کے نظریات سے اختلاف تو ہو سکتا ہے لیکن ان کی شخصیت کا احترام لازم ہے۔ اب اجازت ہو تو یہ بھی عرض کر دوں کہ جس معاشرے کی بنیاد جھوٹ پر قائم ہو اس سے سچائی تلاش کرنا بے توفی ہے۔ وہاں سچائی پیدا کرنے کے لئے جدوجہد کی ضرورت ہے۔ پاکستان مسلم لیگ نے بنایا۔ مسلم لیگ میں جاگیرداروں کی کثرت تھی۔ جب پاکستان بن گیا تو وہ اسمبلیوں میں جا بیٹھے اور اپنی اپنی اجناس کے بھاؤ بڑھانے شروع کر دیئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ پاکستان رفتہ رفتہ بدحالی کا شکار ہو گیا۔ اس ملک سے جب تک جاگیرداری نظام ختم نہیں ہوتا اس وقت تک اہل قلم کی حیثیت ہی کیا ہے اور اس ملک میں انقلاب برپا کرنے کے لئے جس ادب کی ضرورت ہے وہ تو یہ ہے کہ مسدس حالی کے سے انداز میں اس دور کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر سرمایہ دار اور جاگیردار کا خانہ خراب کیا جائے لیکن یہاں تو اس ادب کو فروغ دیا جا رہا ہے جسے عوام کیا خواص میں بھی کم ہی سمجھتے ہوں گے۔ طویل آزاد نظمیں کسانوں، مزدوروں اور کلرکوں کو جگانے کے لئے لکھی جاتی ہیں اور ان کی تشریح خود وہ مصنف بھی نہیں کر سکتا، انہیں کسان بچارا کیا سمجھے گا۔ لہٰذا میری سمجھ میں تو یہی بات آتی ہے کہ جب تک اہل قلم معیشتی اور معاشرتی جبر و تشدد اور ظلم و ستم کے خلاف قلم نہیں اٹھاتے اور اپنے آپ کو سچے دل سے کسی نظریہ کے ساتھ وابستہ نہیں کر لیتے کوئی بات بنتی نظر نہیں آتی۔

اکبر کاظمی (لاہور)

فنونؔ کا سالنامہ

سالنامہ دیکھا تو وجد آ گیا۔ "اللہ کرے زور فنون اور زیادہ!"۔ ادبی مجلّوں کی تاریخ لکھی جائے گی تو اس دور ——— بیسویں صدی کے نصف آخر کے اس دور میں ——— فنونؔ سب سے سربرآوردہ ایستادہ ہو گا۔ کوئی صرف تحقیق کا ہو کر رہ گیا ہے۔ کوئی صرف بقراطیت چھانٹتا ہے۔ کسی کو مابعد الطبیعاتی مسائل سے شغف ہے اور زمین اور اس پر بسنے والوں سے اس کا رشتہ منقطع ہو گیا ہے۔ کوئی صرف "امیرانہ اور ثروت مندانہ ادب" (ایک "ادب" یہ بھی ہوتا ہے!) کا ترجمان ہے۔ بس ایک فنونؔ ہے کہ اردو زبان میں پاکستان کے تخلیقی ادب کا ——— معیاری تخلیقی ادب کا مقیاس ہے۔ کسی نے کہا تھا کہ جس نے لاہور نہیں دیکھا اس نے کچھ نہیں دیکھا۔ میں کہتا ہوں کہ جس نے فنونؔ نہیں پڑھا اسے شعر و ادب کا اچھا قاری تسلیم کرنے سے پہلے ہزار بار سوچنا پڑے گا۔ بہت طوفانی فقرہ ہے مگر فنونؔ کے معیاروں نے مجھے ایسا کہنے پر مجبور کر دیا ہے۔

اپنے تبصرے کا آغاز پھر سے غزلوں سے کر رہا ہوں۔ غزل میری کمزوری ہے۔ اب کے اختصار کا ارادہ ہے۔ میں فنونؔ کے دوسرے قارئین کی حق تلفی نہیں کرنا چاہتا۔ آپ مہربانی کرتے ہیں کہ میرا سارا خط چھاپ دیتے ہیں۔ گلہ یہ ہے کہ میرے منتخب اشعار کاٹ دیتے ہیں۔ اب کے اشعار درج ہی نہیں کرتا۔ صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ ثروت حسین، پروین شاکر، یوسف حسن، شہناز پروین سحر، شفیع ضامن، محسن چشتی اور اظہر عنایتی نے بہت متاثر کیا۔ پروین شاکر کی چھ کی چھ غزلیں مرصع ہیں۔ اتنی مشکل بحر اور اتنی سنگلاخ زمینوں میں اتنی حساس شاعری کرنا پروین ہی کا کام ہے۔ پروین رسمی غزل نہیں کہتی اسی لئے "اختلافات" میں بعض لوگ اس سے چونکے لگتے ہیں۔ مگر جن حضرات کو قدرت نے احساس فن اور احساس جمال ودیعت کیا ہے پروین کے ایک ایک شعر کی گہرائیوں اور رسائیوں سے گھنٹوں لطف اندوز ہوتے ہیں۔ "ٹھہرنے" اور "سینے" کی ردیف والی غزلیں تو صاف اعجاز ہیں جدید غزل کا!

خالد احمد کی ایک غزل "بیٹرے بکھیرے" نے تو مجھ نالائق کو چکرا دیا! البتہ دوسری غزل نے سرشار کیا۔ نجیب احمد ایک غزل کے ساتھ بھی خوبصورت لگ رہا ہے اور علاء الحق قاسمی کی غزل نے تو مجھے بے حد خوشگوار انداز میں حیران کر ڈالا ہے۔ ان سے کہئے اور غزلیں لکھیں۔ "تتلیاں ہجرت کریں گی" والا شعر تو تعلی طور پر بے پناہ ہے۔ راشد متین اچھے غزل گو ہیں مگر پرانی زمینیں کیوں آزما رہے ہیں؟ روحی کنجاہی سے کہئے ایک بار پھر کلاسیکی اردو غزل کا گہرا مطالعہ

فرمائیں۔ ان میں بڑے امکانات ہیں مگر وہ کچھ ٹھٹھر سے گئے ہیں۔ عدیم ہاشمی اپنی راکھ میں سے پھر ابھر رہا ہے۔ صابر ظفر کے ہاں فکر و فن کا امتزاج خوب ہے مگر کہیں کہیں جیسے تساہل کا شکار ہو گئے ہیں۔ سجاد بابر بہت استقامت کے ساتھ ابھرتے چلے آ رہے ہیں۔ گلزار بخاری اگر کسی ایک طرزِ سخن پر قناعت کر لیتے تو کیا ان کے لئے مفید نہ رہتا؟ جمال احسانی یکایک ابھرے ہیں مگر کس حسن اور شان سے! خوب کہہ رہے ہیں۔ شفیع ضامن کیا نئے ہیں؟ اگر نئے ہیں تو اتنے مشاق کیوں ہیں؟ فیصل عجمی اور شرجیل انظر نے اپنے عمدہ معیار کی روایت قائم رکھی ہے۔ یہ شرجیل انظر صاحب اگر اپنا کوئی آسان نام رکھا کریں تو بہتر ہوگا۔ نام کا ترجمہ ہی کر ڈالیں۔ یہ الفت رسول کون ہیں؟ ان کے ہاں کہیں کہیں جگنو چمک رہے ہیں۔ مجھے نسیم مخموری کے علاوہ ابو تراب کی غزل بھی پسند آئی۔

غزل کے پہلے حصے میں شریف کنجاہی، ظہور نظر (ظہور نظر کے تو کیا ہی کہنے!)، احمد فراز، اطہر نفیس، ظفر اقبال، مسعود قریشی، حسن اکبر کمال، حلیم قریشی، تاثیر وجدان اور اقبال کوثر کے دم سے رونق ہے۔ اختر حسین جعفری کی غزلیں (خدا کرے یہ میری ہی فرمائش پر لکھی گئی ہوں!) اس حقیقت کی گواہ ہیں کہ جعفری غزل میں بھی اتنا اونچا اور گھمبیر ہے جیسا نظم میں۔ مرتضیٰ برلاس کی غزلیں صحیح معنوں میں انقلابی غزلیں ہیں مگر ان میں گھن گرج کہیں نہیں، صرف نشتر زنی ہے اور یہی شاعری ہے۔ خاقان خاور آہستہ آہستہ (فنون کے راستے) اس مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں وہ جدید غزل کی ایک بلیغ مثال بن چکے ہیں۔ خود آپ کی غزلیں بے پناہ ہیں۔ زیادہ لکھوں گا تو آپ قلمزد کر دیں گے۔ اس لئے اس ایک جملے پر اکتفا کرتا ہوں۔

نظموں کے حصے پر ظہور نظر، اختر حسین جعفری، پروین سید فنا، راحت نسیم ملک، امجد اسلام امجد، حسن اکبر کمال، پروین شاکر، اقبال فریدی، مسعود مختار اور شاہین مفتی کی نظمیں چھائی ہوئی ہیں۔ نگار صہبائی کے گیت بہت خوبصورت ہیں۔ خالد احمد کی نظم (ایک پس قدم نظم) بہت اچھی ہے۔ صرف عنوان بہت برا ہے۔ ناہید قاسمی کی نظم "تعاقب" طفلانہ حیرت کی عکاس ہے جسے بہت کم شعرا گرفت میں لے سکتے ہیں۔ شہناز پروین سحر کی نظموں کا گہرا، دل کو چیرتا ہوا اثر بہت موثر ہے۔ یوسف حسن اور فرزانہ رضوی کی نظمیں بھی خوب ہیں مگر شرجیل انظر اپنی نظموں میں جدید طرزِ احساس کی نمائندگی کے باوجود کچھ زیادہ ہی جدید ہو گئے ہیں۔ خود آپ کی نظم "دعا" روایتی دعاؤں سے کتنی بدلی ہوئی دعا ہے! ثروت حسین کی نظم "مجید امجد کی یاد میں" مرثیہ نگاری کا ایک فن پارہ ہے۔ پروین شاکر کی مختصر نظمیں تو اپنا جواب آپ ہوتی ہی ہیں مگر اس کی نظم "شرط" میں جو سلیقہ برتا گیا ہے اس کی کوئی مثال پیش کرنا میرے لئے دشوار ہے۔ اپنی شخصیت کو پوری طرح ابھار کر جب پروین شاکر آخری دو مصرعوں پر آئی ہے تو قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں عشق کی بے پناہی کے جذبے میں مسحور ہو کر رہ گیا ہوں —— "تجھے رے وے تو میں جانوں" میں حسرت اور تمنا اور طنز اور دعا —— غرض بہت کچھ ہے۔ اسے کہتے ہیں لفظ لفظ میں شمعیں جلاتی چلی جانے والی شاعری ——

شاعری کی طرح اب کے افسانوں کا حصہ بھی بھرپور ہے۔ روسی افسانہ "تونا کی موت" کو آپ نے بجا طور پر اولیت دی ہے۔ یہ بہت بڑی کہانی ہے اور ساتھ ہی بہت سلیقے سے ترجمہ ہے۔ یہ مختار احمد صاحب کون ہیں کہ ان سے مغربی افسانوں کے ترجمے کا سلیقہ سیکھنا چاہئے۔ باقی تیرہ افسانوں میں سے بارہ افسانے اپنی اپنی جگہ سالنامے کی انگوٹھی میں نگینے کی طرح جڑے ہوئے ہیں۔ رشید فصیح احمد اور آغا سہیل اور صغیر ادیب اور منظر الاسلام اور قمر عباس ندیم اور ضیا بٹ اور طاہر مسعود —— سب کے افسانے کامیاب ہیں۔ غزالہ محمود کا افسانہ تو بے پناہ ہے۔ مرزا حامد بیگ کے افسانے کے آخر میں اگر آپ اس کی شرح بھی درج کر دیتے تو اس سے بہتوں کا بھلا ہو جاتا۔ کمال مصطفیٰ، رشید امجد، زہرہ جبین اور خالدہ ملک کے افسانے گوارا ہیں۔

مقالات میں سید علی عباس جلالپوری کا مضمون "ملامت کی روایت اور شاہ حسین" حسب معمول روشنی بخش ہے۔ رشید ملک نے اہل تحقیق کی واماندگیوں کا بے حد سچا اور حوصلہ مندانہ جائزہ لیا ہے۔ شریف کنجاہی نے میر تقی میر کی شخصیت کے بعض ایسے پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے جنہیں میر کے معتقدین ارادتاً چھپاتے چلے آئے ہیں۔ حالانکہ اس طرح کے شخصی جائزوں سے شاعر کی شاعری زیادہ سمجھ میں آتی ہے۔ مجھے اندازہ ہے کہ میری لوگ اس مضمون پر آگ بگولا ہو جائیں گے مگر مزا تو تب ہے کہ وہ شریف صاحب کے دلائل اور حوالوں کا جواب لائیں۔ محض جذباتیت سے کام نہیں چلے گا۔ ویسے یہ نکتہ قابلِ بیان ہے کہ شریف صاحب نے میر کی شاعری کی کہیں مذمت نہیں کی۔ ان کی شخصیت پر سے بعض حجاب اٹھائے ہیں۔ یہ کوئی گناہ نہیں

ہے اور میں انہیں اس جرأت و عدل پر مبارک باد پیش کرتا ہوں ۔ اظہر قادری کا مضمون کچھ زیادہ ہی جانبدارانہ ہو گیا ہے ۔ اگرچہ مجھے ان کے تجزیے سے اتفاق ہے ۔ ڈاکٹر احسن فاروقی نے قرۃ العین حیدر کے ناول "آگ کا دریا" کے خلاف تنقید کم کی ہے' جلے دل کے پھپھولے زیادہ پھوڑے ہیں ۔ آپ کی مدیرانہ دیانت کی داد دیتا ہوں کہ آپ نے یہ مضمون شائع کر دیا ۔ جی چاہتا ہے اس کے جواب میں ایک "مضمونچہ" لکھوں ۔ مگر میں تنقید پڑھ رہا ہوں لکھنا آ جائے گا تو لکھوں گا اور "فنون" ہی میں لکھوں گا —— "توصیف" صاحبہ کا مختصر سا مضمون بھی ان کے طویل مضامین کی طرح دل میں چھری کی طرح اتر جانے والا ہے ۔

محمد خالد اختر، جو طنز نگار اور مزاح نویس تھے "عروہ پاک" میں ہم غریبوں کو رلانے پر کیوں تل گئے ہیں ؟ ان کے اس "غالبی" خط نے مجھے تو رلا دیا حالانکہ میں جذباتی بالکل نہیں ہوں ۔ مستنصر حسین تارڑ کا سفرنامہ حسب معمول خوبصورت اور دل کو گرفت میں لے لینے والا ہے ۔ مگر حضور، وہ عطاء الحق قاسمی اور محمد کاظم کہاں گئے ؟ آپ ہی نے ہمیں ان کے سفرنامے "چکھائے" تھے ۔ اب ہمیں "بھوک" لگ رہی ہے تو لائیے ان کے چند سفرنامے اور لائیے سخت انتظار ہے ۔

محمد کاظم نے عرب شاعر "ابو نواس" کی دوسری قسط میں البتہ بحیثیت سفرنامہ نگار اپنی غیر حاضری کی تلافی کر دی ہے ۔ ایک بات کہوں ۔ صرف محمد کاظم کے مضامین پڑھتے پڑھتے میں تو عالم آدمی ہو گیا ہوں ۔ میں محفلوں میں انہی مضامین سے حاصل کردہ معلومات اگل دیتا ہوں اور حاضرین کو مرعوب کر کے چلا آتا ہوں ۔ محمد کاظم تو علم و فن کے "کنز مخفی" معلوم ہوتے ہیں ۔ "بین السطور" بہت مختصر مگر خاصا جامع ہے ۔ کیا خالد احمد بہت مصروف آدمی ہیں ؟ یوں لکھتے ہیں جیسے بہت جلدی میں ہیں ۔ ان سے کہیے کہ ہانپتے ہوئے نہ لکھا کریں، سستا کر اور سنبھل کر لکھا کریں کہ ان میں ایک بڑے شاعر کے علاوہ ایک بڑے نقاد کے جوہر بھی موجود ہیں ۔

"حرف اول" میں آپ نے "فنون" کی خدمات اور جدید اہل قلم کی حوصلہ افزائی کا جو ذکر کیا ہے وہ بالکل بجا ہے ۔ یہی تو ایک رسالہ رہ گیا ہے جسے نوجوان جوہر قابل اپنا رسالہ سمجھتا ہے —— مگر جوہر قابل کا "قابل" ہونا ضروری ہے اور اس قابلیت کی اندازہ دانی آپ پر ختم ہے ۔

"اختلافات" میں درج بعض آرا سے مجھے اختلافات ہیں ۔ اول تو میں دست بستہ عرض کروں گا کہ مشرقی پاکستان اور اہل قلم کے موضوع پر "اختلافات" میں بہت بحث ہو چکی ۔ یہ اب آگے نہیں بڑھے گی اس لئے اسے بند کیجئے ۔ کراچی کے منظور احمد کے خط نے سب کو لاجواب کر دیا ہو گا ۔ یہ خط اس بحث کا خاتمہ ہے —— ملتان کے حسین اعجاز کو خالد احمد سے کوئی خاص "دلچسپی" معلوم ہوتی ہے ورنہ وہ محض اس بات پر یوسف حسن سے کیوں شاکی ہوتے کہ انہوں نے اپنے مضمون میں اشعار کا انتخاب دیتے وقت خالد احمد کے شعر سے آغاز کیا ہے ۔ آغاز کسی کے شعر سے تو ہونا ہی تھا ۔ خالد احمد کے شعر سے ہو گیا تو کون سا غضب ٹوٹ پڑا جبکہ خالد احمد بہت پیارا اور گہرا غزل گو بھی ہے ۔ محسن بھوپالی نے ستارہ صابر کے ایک تنقیدی جملے سے کچھ زیادہ ہی شدید اثر لیا ہے ۔ وہ پرانے اور مشاق شاعر ہیں ۔ انہیں حوصلہ مندی کا ثبوت دینا چاہئے ۔ صوفی عبدالرشید کا خط بہت خوبصورت ہے ۔ مسعود مختار کو ظفر اقبال اور پروین شاکر کی ڈھیر ساری غزلوں میں سے بہت کم اشعار نے متاثر کیا ہے ۔ بعض لوگوں کو صرف اقبال پسند آتا ہے اور وہ غالب کو رد کر دیتے ہیں ۔ بعض غالب کو اچھالتے ہیں اور اقبال کو شاعر ہی نہیں مانتے ۔ کہیں مسعود مختار اس انتہا پسندی کی طرف تو نہیں جا رہے ہیں ؟ وہ پروین شاکر کے بارے میں کہہ رہے ہیں کہ وہ اتنی بڑی شاعرہ نہیں ہیں ۔ ہم تو صرف یہ کہتے ہیں کہ وہ بڑی شاعرہ بنیں گی ۔ ان میں عظمت کے تمام آثار موجود ہیں ۔ اگر وہ بھرپور انداز میں کہہ رہی ہیں اور زیادہ کہہ رہی ہیں تو کہنے دیجئے کہ وہ بہت زیادہ اچھا بھی تو کہہ رہی ہیں ۔ نوجوانوں کو نوجوانوں کے سلسلے میں تو فراخ دل ہونا چاہئے ۔

آخر میں مجھے سالنامے کے اس حصے کا ذکر کرنے کی اجازت دیجئے جسے آپ نے سب سے پہلے درج کیا ہے یعنی "نعتیہ" حصہ ۔ اس کا ذکر آخر میں اس لئے کر رہا ہوں کہ اب کے اختصار کا ارادہ تھا اور میں اس حصے پر مفصل عرض کرنا چاہتا تھا ۔ مگر اختصار کے باوجود میرا عریضہ مفصل ہو گیا ہے ۔ یہ سب سالنامے کے مندرجات اور آپ کے حسن ادارت کا قصور ہے ۔ چنانچہ مختصراً عرض ہے کہ سالنامے کا نعتیہ حصہ محض عقیدے کے لحاظ سے ہی نہیں بلکہ فن کے لحاظ سے بھی ایک ایسا حصہ ہے جو نعت گوئی کے رجحانات کو نہایت مثبت انداز میں متاثر کر سکتا ہے ۔ پروین شاکر نے یہاں بھی اپنی انفرادیت اور حسن اظہار کا لوہا

سنوالیا ہے۔ ذہنی سطح سے نہایت ہی دشوار موضوع پر پروین نے جس انتہائی سچائی اور توازن اور عقیدت سے لکھا ہے وہ کچھ اسی کا حصہ ہے۔ پھر ثروت حسین کی بظاہر سلیس مگر بباطن بہت ہی گہرے اور پاکیزہ مفاہیم کی نعتیں ہیں۔ صائمہ خیری اور ناہید قاسمی کی نعتیہ نظموں میں جو حضور صلعم سے دستگیری کی التجا ہے وہ ہم سب کی التجا ہے اور خالد احمد کی نعت کو تو میں جدید نعت کا روشن عنوان قرار دیتا ہوں —— "نعت خود لکھی" بہ پیرایۂ سیرت لکھی" کیا بے پناہ اور بامعنی عقیدت ہے! یہی وہ مقام ہے جہاں اچھی غزل اور اچھی نعت کا اتحاد ہو جاتا ہے اور نعتیہ شاہکار وجود میں آتے ہیں۔

شریف الدین اشرف (چنیوٹ)

سب سے پہلے حصۂ نعت —— جس میں آپ کے جدید تر شعراء نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ STOCK — FRAMEWORK سے باہر نکل کر محض ADJECTIVES کو جوڑے بغیر بھی نعت کہی جا سکتی ہے اور یوں کہ جذبے کی سچائی پھر بھی مجروح نہیں ہوتی۔ پروین شاکر کی نظم "وحی" اگرچہ وجدان کی نسبتاً DETACHED تصویر ہے لیکن آخری لمحوں میں اُس کا INVOLVEMENT اچانک اور پوری شدت کے ساتھ سامنے آجاتا ہے جب وہ کہتی ہے :-

اُس ایک پل میں

وہ میرا اُمّی مدینۃ العلم بن چکا تھا

صائمہ خیری اور ناہید قاسمی نے اپنی اپنی ذات کے حوالے سے اس مشکل کشا کو یاد کیا۔ صائمہ خیری کے لہجے کی شدت چونکاتی تو ہے لیکن ناہید قاسمی کی پکار میں جو بے بسی ہے تحفظ کی جو نسائی آرزو ہے اس میں ایک مثبت سرخوشی بھی ہے جو دکھ کو SUBLIME کی طرف لے جاتی ہے۔ ثروت حسین کا ایک شعر کئی نعتوں پر بھاری ہے :

سارے عالم کو جزیرہ ٹھہراؤں

ایک انساں کو سمندر رکھوں!

لیکن ثروت حسین نے مطلع میں محض CLICHES سے کام چلایا ہے۔ خالد احمد یہاں ایک نئے انداز میں سامنے آئے :

حسن آخر نے کیا حسن کو آخر تجھ پر

آخری روپ دیا، آخری صورت لکھی

حصۂ تنقید میں دو مضامین بحث طلب ہیں۔ شریف کنجاہی نے "میر تشنہ میر" لکھ کر عقیدت اور محبت کی اس فضا میں آندھی اٹھانے کی کوشش کی ہے جس کا سلسلہ ذوق و غالب، آتش و ناسخ، فانی و اصغر سے ہوتا ہوا ناصر کاظمی تک پہنچا ہے۔ اس سارے مضمون میں سوائے اس کے اور کوئی بات نظر نہیں آتی کہ شریف صاحب کو میر کی سیادت پر شبہ ہے۔ شعر کہنے کے لئے نسبتیں اتنی اہم نہیں ہوتیں کہ شاعر کی شناخت اس کی سچائی ہے۔ اگر بڑی شاعری کے لئے محض سید ہونا کافی ہوتا تو اس وقت رئیس امروہوی پاکستان کے سب سے بڑے شاعر ہوتے!

دوسری بات جس پر شریف صاحب معترض ہیں یہ ہے کہ "ذکر میر" میں میر نے اپنے خاندانی حالات پر روشنی نہیں ڈالی AUTOBIOGRAPHY اور HISTORY میں یہی فرق ہے کہ اول الذکر میں جزئیات کا انتخاب مصنف اپنی ذات کے حوالے سے کرتا ہے۔ اب اگر انہوں نے اپنی والدہ اور سوتیلے بھائیوں کو اتنی اہمیت نہیں دی کہ ان کا تفصیلی ذکر کرتے تو اس پر ان کے محققین کو ان کی باز پرس کا کوئی حق نہیں پہنچتا —— میر ایک طرح کی ڈائری لکھ رہے تھے کوئی CHRONICLE FAMILY ترتیب نہیں دے رہے تھے! جہاں تک ان کے والد کی عاشق پیشگی سے متعلق میر کے بیانات ہیں —— ظاہر ہے کہ دس برس کا بچہ ایسی باتوں سے واقف نہیں ہو سکتا! لیکن پہلی بات تو شریف صاحب جو یہ سوچ پاتے نہیں کہ یہ بچہ کوئی معمولی بچہ نہیں تھا برصغیر کا سب سے بڑا غزل گو ہونے والا تھا —— اور محض حادثاتی طور پر شاعر نہیں بنا تھا بلکہ BORN POET

تھا ـــــ دوسری بات یہ کہ "ذکرِ میر" لکھتے وقت میر کی عمر دس برس نہ تھی ـــــ یہ ساری کہانی انہوں نے FLASH-BACK ٹیکنیک میں ایک شاعر کے NOSTALGIA کے ساتھ لکھی تھی ـــــ جہاں "شنیدہ مانند بودہ" ہو سکتا تھا۔

رہی روغن فروش کی داستان تو اس کے لئے میرا خیال ہے کہ SEXUAL CONSCIOUSNESS اتنی ضروری نہیں جتنی عام ذہنی بیداری اور مشاہدہ کی تیزی! مگر شریف صاحب کے بیان سے ایسا لگتا ہے کہ اتنی کم سنی میں عشق آشنا ہو کر میر سے کوئی قابلِ دست اندازیِ پولیس قسم کا بھیانک جرم سرزد ہو گیا ہے۔

"عملی طور پر ان کی تعلیم محض ناظرہ تک تھی۔ کاروبار اور مشغلہ کوئی نہ تھا ـــــ لاڈلے تھے، یتیم تھے اور پریشان حال اور بیکار ـــــ ایسے نوجوانوں کا بہک جانا اچنبھے کی بات نہیں ہوتی۔"

مجھے نہیں معلوم کہ بہکنے سے شریف صاحب کی کیا مراد ہے ـــــ اگر وہ آج کل کے شاعروں کے شب و روز پر نظر ڈالیں ـــــ (جن کی تعلیم بھی ماشاء اللہ از کم گریجویشن تک ہوتی ہے ـــــ کاروبار اور مشاغل بھی گوناگوں ہوتے ہیں، ہاں لاڈلے اور یتیم ہونے کی شرط اضافی ہے) تو شاید سب کو گردن زدنی قرار دے دیں۔

رہی میر کی بد دماغی تو بات صرف اتنی ہے کہ میر صاحب نرے شاعر تھے پبلک ریلیشنگ کے آدمی نہ تھے۔ نہ ہی اپنے PROJECTION کے لئے کسی لابی کے محتاج تھے۔ سو اگر ان کی چال ٹیڑھی اور بات روکھی تھی تو ان پر سجتی بھی تھی!

دوسرا دلچسپ مضمون ڈاکٹر احسن فاروقی صاحب کا ہے جسے پڑھ کر صرف اس نتیجے پر پہنچا جا سکتا ہے کہ ـــــ قرۃ العین حیدر، ڈاکٹر احسن فاروقی کا COMPLEX ہیں!

چونکہ ڈاکٹر صاحب چند ان اردو افسانہ نگاروں اور ناول نویسوں میں سے ہیں جنہوں نے انگریزی ادب، اور بطورِ خاص انگریزی ناول نویسی کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی ہے ـــــ لہٰذا M.A. IN ENGLISH کے اس دردناک قحط میں قرۃ العین حیدر ہی ان کو اپنی مدمقابل نظر آتی ہیں۔

اردو نقادوں کے لئے ان کا رویہ خاصا "بصیرت افروز" ہے ـــــ یہاں تک کہ ـــــ

"اردو کے نقاد کسی ناول پر بھی جو کچھ کہتا ہے وہ اول فول کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا ہے!"

بہرکیف اردو نقادوں کی اس عزت افزائی کے بعد قرۃ العین حیدر کی طرف آتے ہیں۔ قرۃ العین کی علمی صلاحیتوں کی ایک دنیا معترف رہی ہے اور ڈاکٹر صاحب کا سارا مسئلہ ہی یہ ہے! انہوں نے "سنگم" لکھا تو کوئی شور نہ مچا حالانکہ وہ بھی کم و بیش اسی ٹیکنیک میں لکھی گئی تھی ـــــ لیکن "آگ کا دریا" چھپتے ہی برصغیر کے طول و عرض میں ہنگامہ ہو گیا! اس ہنگامے نے ڈاکٹر صاحب کو اتنا ڈسٹرب کیا کہ وہ لوگوں سے کہتے پھرے کہ کوئی اسے ULYSSES کی طرح ریہرس کر دے۔ جب اس طفلانہ حرکت کے لئے 'اردو کا "اول فول لکھنے والا کوئی نقاد" راضی نہ ہوا تو انہوں نے خود یہ کارِ عظیم انجام دے دیا۔ اس دورِ ابتلا میں نیاز فتح پوری کا ایک جملہ ڈاکٹر صاحب کی دستگیری کو پہنچا کہ یہ ناول انزوے پن کا مظاہرہ ہے اس ڈاکٹر صاحب اسے لے اڑے ـــــ اور اس کی مزید تصدیق انہوں نے ایک نہایت "معتبر" ذریعے سے کی ـــــ یعنی قرۃ العین حیدر کی کرامت حسین کالج کی ایک ساتھی سے! "اب وہ اِتراتی ہیں"! قرۃ العین حیدر کے رویے کو ڈاکٹر صاحب نے تریاہٹ قرار دیا تھا ـــــ حیران ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کی ہٹ کو کیا نام دوں! ہندی ضرب المثل بھی یہاں پر خاموش ہے!

ویسے نیاز فتح پوری کے اس فقرے کو ڈاکٹر صاحب نے حرزِ جاں بنا رکھا ہے، اردو افسانہ نگاری پر "سیپ" میں لکھے ہوئے اپنے تازہ مضمون میں بھی انہوں نے اس کا حوالہ دیا ہے۔ دراصل ڈاکٹر صاحب کو گلہ یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ

"قرۃ العین حیدر اس وقت اردو کے ناول نگاروں میں ایک آدھ کو چھوڑ کر سب سے زیادہ تعلیم یافتہ اور قابل ہیں! (اس ایک آدھ میں! میرا خیال ہے ایک تو وہ خود ہیں اور آدھے کا اعزاز پروفیسر حسن عسکری کو بخشا ہے!)"

—— "ان کے سچے افسانہ نگار اور ناول نگار کی اہم فطرت کا ثبوت ہے کہ وہ اس دائرے سے کہیں باہر نہیں جاتیں ——"

"فن کے علم کے ساتھ ایک مخصوص حس —— مگر محدود زندگی کے گہرے مطالعے کا بھی تاثر ان کے یہاں ہے۔"

—— "ان کے کردار ہیں، ہیں نے اعلیٰ ذوق پر قائم رہنے اور زندگی کو اس مخصوص نظر سے دیکھنے کی جو ناول نگاروں سے منسوب کی جاتی ہے، پوری صلاحیت دکھیی ——"

ڈاکٹر فاروقی مصر ہیں کہ:۔

"قرۃ العین، ان کی انٹلکچوئلزم محض وہم ہے یا پوز ہے اور اس کو ادبی طور پر پر اثر بنانے کے لئے وہ علمی اور فنی دونوں حیثیت سے خام ہیں۔"

"پاکستان سے ہمدردی رکھنے والے اس کتاب کو اینٹی پاکستان کہتے ہیں۔ اس سے دشمنی رکھنے والے اس پر بغلیں بجاتے ہیں اور پاکستان میں جو خرابیاں آ رہی ہیں ان کی بابت اسے پیغمبری حکم بتاتے پھرتے ہیں۔ بھئی ہم تو قرۃ العین حیدر کے قائل ہو گئے۔ کیا سچی بات کہی ہے! مجھے یہ سب حماقت معلوم ہوتا ہے۔"

"حقیقت یہ ہے کہ آگ کا دریا ایک محدود العلم اور بے زور کردار کی محض جذباتیت کا مظاہرہ ہے۔"

ان تمام ریمارکس کو ان کے باہمی تضادات کی روشنی میں کیا جذباتی مردانہ رویہ نہ کہا جائے؟

ڈاکٹر صاحب کو ناول کے نام پر بھی اعتراض ہے —— "اگنی کی ندیا کے اور" یقیناً "قرۃ العین کے مزاج سے ہم آہنگی رکھتا ہے، لیکن دریا میں بہاؤ کی جو شدت ہے اسے ندیا کی آہستہ خرامی کہاں چھو سکتی تھی —— اور پھر وہ بھی جہاں معاملہ پانی کا نہیں آگ کا ہو!

کتاب کی عظمت کا تعین یقیناً اس کے موضوع کے سیاسی یا غیر سیاسی ہونے سے نہیں ہوتا لیکن ڈاکٹر صاحب اسے اینٹی پاکستان کہنے والوں سے بہت خوش ہیں۔ پھر یہ بھی کہتے ہیں کہ یہاں پاکستان میں اس کا کوئی ذکر نہیں کرتا —— ایسی بات نہیں ڈاکٹر صاحب! —— اردو ناول نگاری کا ذکر، پاکستان کیا روئے ارض پر کہیں چھڑ جائے، بات قرۃ العین حیدر تک ضرور پہنچے گی!

ڈاکٹر صاحب، قرۃ العین حیدر کی ہندوؤں سے محبت پر بھی چراغ پا ہیں —— میں کہتی ہوں قرۃ العین، ہندوؤں پھوڑ یہودیوں سے محبت کریں —— محبت ہی تو کر رہی ہیں نا! نفرت تو نہیں جو زیادہ غیر انسانی 'غیر ادیبانہ بات ہے۔

یہاں ان کا یہ جملہ قابل غور ہے کہ ادب نقال اور سرقے سے آگے بڑھتا ہے —— یہ لکھ کر جہاں ایک طرف انہوں نے اپنے فن کو معتبر ٹھہرایا وہیں سرقہ کرنے والوں کو کھلی چھٹی دے دی!

ORLENDO کو ناول کا ماخذ بتا کر انہوں نے اسے محدود اور یک طرفہ قرار دیا —— انہیں گلہ ہے کہ کیلاش ہوسٹل اور اس کی لڑکیاں ہر جگہ کیوں آ جاتی ہیں۔ ایک ہی ٹائپ کے کردار کیوں نظر آتے ہیں (پھر یہ بھی کہتے ہیں کہ ایک سچے افسانہ نگار کی طرح وہ اپنے RANGE سے باہر نہیں نکلتیں!) گوتم نیلمبر، ہری شنکر، کمال، چمپا —— اور پھر چمپا سے چمپک، چمپا باجی، چمپا احمد تک، قرۃ العین نے جو کچھ لکھا وہ تاریخ کو محسوس کر کے لکھا —— چمپا دراصل MOTHER INDIA کی تجسیم ہے —— اور اس کی ارتقائی داستان ہی دراصل اس کتاب کا موضوع ہے —— ہاں، چمپا احمد کی زندگی اور اس کے دوستوں اور سہیلیوں میں کیلاش ہوسٹل کی لڑکیوں کی جھلک آ ہی جاتی تھی —— کیونکہ تخلیق اپنے فنکار کی ذات سے بھی بہت کچھ لیتی ہے —— ان کا ذکر تو آنا ہی تھا —— اب لکھنؤ کے کیلاش ہوسٹل میں رہ کر [illegible] بھاٹی گیٹ کے پہلوانوں کے داؤ پیچ پر تو روشنی نہیں ڈال سکتی تھیں! انہوں نے جس دنیا کو اپنی آنکھوں سے دیکھا —— اسی کی تصویر [illegible] یہ کوئی ایسی خامی نہیں، جین آسٹن نے جس زمانے میں شاہکار لکھے NEPOLIAN WAR جاری تھی لیکن اس کا سراغ ہمیں کبھی کبھار جب ہی ملتا ہے جب کوئی طرحدار فوجی نوجوان رقص کی کسی محفل میں نظر آ جائے! پرل ایس بک کی بیشتر ناولیں اور افسانے انقلاب سے پہلے کے چین کی غربت اور

بالخصوص کسانوں سے متعلق تھیں۔ تو اس سے اس کی فنی عظمت پر کیا اثر پڑا! اصل بات تو وہ فنکارانہ سچائی اور خلوص ہے جس کے ساتھ ناول نگار اپنے وژن کو لے کر آگے بڑھتا ہے اور قرۃ العین کے یہاں یہ خوبی بدرجہ اتم موجود ہے۔

اب جہاں تک چمپا احمد کا، پاکستان سے آنے والے کمال سے مل کر، انفرادیت ترک کر دینے کے ارادے کا تعلق ہے —— نہ یہ انفرادیت بورژوا تھی نہ ہی HUSBAND HUNTING کا کوئی حربہ! بلکہ FIFTIES کے ہندوستان کی آدرش پرست لڑکی کی معصومیت تھی —— جو علم کو اپنا محافظ سمجھ لیتی ہے اور بھول جاتی ہے کہ MALE DOMINANT SOCIETY میں (MAL DOMINANT SOCIETY ابھی کہہ سکتے ہیں) ایں کوئی لڑکی تنہا رہنا AFFORD نہیں کر سکتی —— اور اس سے مراد ہرگز سوشلزم کی طرف مراجعت نہیں!

قرۃ العین حیدر خود کو پاکستان سے ایڈجسٹ نہیں کر سکیں —— ان میں اتنی جرأت تھی کہ وہ واپس چلی گئیں —— ڈاکٹر صاحب کو پاکستان ایک بڑا "زندان" نظر آیا —— لیکن وہ اپنے ناول کے ہیرو کی طرح موقع پاکر یہاں سے نکل نہیں سکے۔ یہ سب انتہائی ذاتی مسائل ہیں اور اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں کو بنیاد بنا کر ایک پورے ادبی شہ پارے کو ریجکٹ کر دینا —— نرم سے نرم الفاظ میں بھی تنگ خیالی ہے۔

قرۃ العین حیدر اردو افسانہ اور ناول کی آنکھوں کی روشنی ہیں اور اسے بجھانے کی کوشش ناکام رہے گی۔

اور اب اختر حسین جعفری کی طویل نظم —— "آئینہ خانہ" —— پچھلے شمارے میں اس پر تبصرہ اس لئے نہیں لکھا کہ ادھوری نظموں اور مسلسل ناولوں پر کچھ کہنا قبل از وقت ہوتا ہے۔ ویسے اگر اس نظم کا محض ایک CANTO باقی تھا تو آپ اسے پرانے شمارے میں رکھ سکتے تھے۔ یوں اس کا تاثر نہ ٹوٹتا۔

"آئینہ خانہ" —— ہر اعتبار سے SUBLIMITY کی جانب سفر کرتی ہے —— اس کا موضوع کسی ایک عہد میں سمٹا ہوا نہیں ہے —— بلکہ تاریخ انسانی کا ہر المیہ اس سے اپنی IDENTIFICATION لے سکتا ہے، سانحۂ کربلا —— ۱۸۵۷ —— ۱۹۴۷ —— ۱۹۷۱ —— شمالی ویت نام —— لبنان! اور وہ ان دیکھی ہجرتیں بھی جو درون ذات کہیں رونما ہوتی ہیں۔ ان کا اسلوب اس موضوع کے GRANDOUR کا پورا پورا ساتھ دیتا ہے۔ پابند نظموں میں ایسے رواں مصرعے کسی ہنرمند شاعر کا ہی حصہ ہو سکتے ہیں —— یہاں ان کی ڈکشن بھی حیرت انگیز ہے —— جعفری صاحب کی ڈکشن میں انیسویں صدی کے انگریزی شاعروں کا سا پھیلاؤ اور ایجاز بیک وقت موجود ہے —— اردو میں اس سے ذرا کم درجے مصطفےٰ زیدی کا نام آتا ہے —— عکس آب تحیر، سر مرقد امید حیات، طلسم لیس نگاہ، فراق حسن فنا، زرد صفت چاپ، جسم بے سبز دریچے! —— اور پھر بالکل سامنے کے الفاظ لیکن بالکل نئے REFERENCE کے ساتھ! —— ممکنات کا پانی، دلوں کی شاخ برہنہ، زمینوں کی زلف انی، کوہ بے ارادہ، ارادے کی سبز ٹہنی، ہوشیں کی زمین، طلب کی ہوائیں، انگریز کے پھول!

بہت پہلے "برگ ریز" پر تبصرہ لکھتے ہوئے آپ نے کہا تھا کہ اقبال کے بعد ایسی فارسی تراکیب صرف عرفانہ عزیز کے حصے میں آئی ہیں —— میرا خیال ہے کہ زیادہ اہم بات تراکیب کے نبھانے کی ہے! تشبیہہ اور استعارات اور تراکیب شاعری میں اتنے نامحسوس طریقے پر آہستگی سے در آنی چاہئیں، جیسے موج آب رواں میں چاند کی کرن! تراکیب کو لباس کے سے سلیقے کے ساتھ استعمال کیا جائے تاکہ شعر کی شخصیت کا جزو بن جائے —— لباس کا محض رنگ اور میٹریل ہی اہم نہیں، اس کی تراش خراش بھی موزوں ہو —— کہیں اوپر سے سلائی نظر نہ آئے —— عرفانہ عزیز کے یہاں یہ سلائیاں بہت نظر آتی ہیں۔ لیکن اختر حسین جعفری کے یہاں تو دھنک، بادل اور پھول سے تراشا ہوا لباس جزو بدن بن جاتا ہے۔

نگار صہبائی کے چاروں گیت رنگ خسروی میں رنگے ہوئے ہیں۔ سلیم احمد یوں ایک متنازعہ فیہ شخصیت کے مالک ہیں، اگر ساری کائنات میں ایک شخص کے لئے بھی SOUNCE OF INSPIRATION بن جانا کمال کی بات ہے۔

پروین فنا سید صاحب بہت اچھی مصورہ ہیں اور ہم عصروں کے لئے ان کی محبت اور عقیدت تنگ دلی اور حسد کے اس دور میں ایک خوشگوار

حیرانی سے دوچار کرتی ہے۔ انجم اعظمی کی نظم ——— بہار ——— دوسری بار پڑھی جا سکتی ہے۔ امجد اسلام امجد محنت سے لکھتے ہیں اور ان کی تازہ نظم ——— "منزِ مستاں مری روح میں موجزن ہے" ——— ان کے مخصوص ڈکشن میں ان کی شاعری کے امکانات وسیع تر کر رہی ہے۔ رحمٰن اکبر کمال کی تینوں نظمیں ایک وسیع المشاہدہ شاعر کی تخلیق ہونے کا پتہ دیتی ہیں۔

پروین شاکر کی نظموں نے حسبِ معمول اسیر کیا ——— "شرط" کی آخری لائن ——— "تجھے دے دے تو میں جانوں" DRAMATIC REVELATION کی طرح اس کے قاری کو مبہوت کر دیتی ہے۔ اس شمارے میں پروین کی ایک پرانی نظم ——— "صرف ایک لڑکی" بھی شامل ہے جس کا جواز فہمیدہ ریاض کے جواب کی صورت سمجھ میں آیا۔ ادھر کچھ عرصے سے "فنون" کے توسط سے پروین اور فہمیدہ کا جو MONOLOGUE چل رہا تھا ("خوشبو کی شاعرہ ——— مسئلہ") وہ بالآخر DIALOGUE کی شکل میں سامنے آیا ——— پروین کی بہت سادہ نظم کا اس سے زیادہ پُرکار جواب ممکن نہ تھا۔

"گنج شکر سے کون کہے"، "چلو چلیں ملتان" اور "بڑے جہاد سے چھوٹے جہاد کی طرف رجوع" ——— اقبال فریدی کے سابقہ اندازِ شاعری سے یکسر ہٹ کر لکھی گئی نظمیں ہیں۔ اگر ملتان جانے والا راستہ وجدان کی ایسی گل پوش وادیوں سے ہو کر گزرتا ہے تو سارے شاعر اپنی جیون میں ایک بار ملتان یاترا کو ضرور جائیں۔ اقبال فریدی نے واقعی ڈوب کر لکھا ہے اور "گنج شکر سے کون کہے" پڑھتے وقت تو کانوں میں باقاعدہ چمٹے بجنے کی آواز آنے لگتی ہے!

کیا حلیم قریشی کی نظم "کتنی ہی ملاقاتیں" شائع ہونا بہت ضروری تھی؟ شہناز پروین سحر کی نظم "ایوجی" کا BREATH - TAKING گداز حیران کن ہے۔ "نیا سو مبر" عنوان تو چونکاتا ہے لیکن نظم اپنا خاکہ واضح رنگوں میں نہیں بنا سکی۔ خالد احمد کی نظم اچھی ہے ——— بس ذرا کسی زیرِ زمین تنظیم کا مینی فیسٹو معلوم ہوتی ہے۔ ناہید قاسمی نے اپنی نظم "تعاقب" میں زندگی کو ایک ننھی سی بچی سے تشبیہہ دے کر اسے کس قدر نرم و نازک اور WORTH LIVING بنا دیا ہے! فرزانہ رضوی کی نظم "بہت دن پہلے" میں فہمیدہ ریاض کے ایک زمانے کی نظموں کی بازگشت سی لگتی ہے۔ شرجیل انظر میں بڑے امکانات ہیں۔ ان کی اسی طرح حوصلہ افزائی کرتے رہیئے۔

آپ کی نظم "دعا" کا پہلا شعر ہی (مطلع اس لئے نہیں کہہ سکتی کہ آپ نے اس غزل کو عنوان دے دیا ہے) پوری نظم کی تصویر بنا دیتا ہے:

مجھے زشُروہ کیفیتِ دوامی دے
مرے خدا، مجھے اعزازِ ناتمامی دے

اور "مقطع" نے تو فائنل ٹچز دے دیے:

اگر گروں تو کچھ اس طرح سربلند گروں
کہ مار کر، مرا دشمن مجھے سلامی دے

اور دوسری نظم "صبر" کے لئے قبائے گل کا مسل جانا ——— کتنی بلیغ علامت ہے۔

حنیف فوق نے اب کے غالب کی زمین پر قدم رکھا اور حسبِ توقع توازن برقرار نہ رکھ سکے:

ایسا آباد تھا صحرائے جنوں
کیسی دیوار، نہ دریا دا آیا

میں "عانیہ" "در" کو اتنی بے دردی اور کچے پن سے استعمال کیا گیا ہے کہ اگر غالب عالمِ ارواح سے آ سکتے تو بدست خود اس در کو اکھاڑ پھینکتے!

انجم اعظمی کا صرف ایک شعر یاد رہ سکتا ہے:

عمر گزری تو یہ کھلا کہ کوئی
لاکھ تنہا ہو، مر نہیں جاتا

احمد فراز کی غزل انتہائی مرصع ہے اور مقطع میں تو ONE - ACT PLAY کے FINAL SCENE کی سی قطعیت ہے۔

جمیل یوسف کی غزل تو محض عمر کے تناسب سے جدید شعرا کے حصے میں ڈال دی گئی ــــ ورنہ جدید تر شعرا کی غزلیں بھی ان سے کہیں زیادہ MATURE ہیں۔ جہاں سید محسن نقوی کا یہ شعر نشتر کا سا اثر رکھتا ہے:

اک یاد کو دفن کر کے دل میں
دشمن کو اماں دے رہا ہوں!

وہاں یہ شعر پڑھ کر قاری کشمکش و پیچ میں مبتلا ہو جاتا ہے:

اس شہر میں شعر کہہ کے محسن
صحرا میں اذان دے رہا ہوں

کیونکہ مصرع ثانی جناب سلیم احمد کا ثانی مصرع ہے ــــ واوین بھی استعمال نہیں کئے گئے تو کیا اس شعر کو عہد یوسفی کا ایک توارد سمجھوں؟

افتخار عارف کو آپ نے اب کے صف بزرگاں میں رکھا ــــ اچھا کیا ــــ اگرچہ لہجہ ان کا جدید سا ہے ــــ لیکن جدید تر شعرا میں خالد احمد اور نجیب احمد کے بعد چھپنے سے بہتر ہے کہ وہ جدید شعرا میں لیث قریشی کے بعد چھپیں۔ ویسے غزلیں ان کی دونوں اچھی ہیں۔

اقبال کوثر کا یہ شعر کتنا بلیغ ہے ؎

وہ مجھ سے لڑ رہے تھے کہ میں ماں سے لڑ پڑا
اس نے بھی کس مزاج کے بھائی دیئے مجھے

آپ کی پہلی غزل تو سراسر انتخاب ہے۔ دوسری دو غزلیں بھی اپنے اپنے رنگ میں منفرد ہیں۔ بالخصوص دوسری غزل کا مطلع ؎

ہم کبھی عشق کو وحشت نہیں بننے دیتے
دل کی تہذیب کو تہمت نہیں بننے دیتے

اور پھر یہ شعر ؎

لب ہی لب ہے تو کبھی، اور کبھی چشم ہی چشم
نقش تیرے، تری صورت نہیں بننے دیتے

مگر اس شعر کی معصومیت اور سرشاری پر کچھ کہا تو محسن بھوپالی خفا ہو جائیں گے!

اسی شمارے میں اختر حسین جعفری صاحب کی غزلیں بھی دیکھیں جو ان کی نظموں کی طرح پُرشکوہ تو ہیں لیکن غزل کا لہجہ خطابت کے بجائے سرگوشی کا ہونا چاہئے ــــ زیادہ سے زیادہ گفتگو کا!

ثروت حسین کی دونوں غزلیں واقعتاً اس قابل تھیں کہ دوسرے حصے کی ابتدا ان کے نام سے کی جاتی۔ خصوصاً پہلی غزل کی تو پوری فضا سہاگ رات کی طرح وارفتگی اور نیکی اور تقدس سے معمور ہے۔ صابر ظفر کی شاعری میں ایک عجیب سی جھنجھلاہٹ ہے ــــ جس میں اگرچہ وہ دلآویزی نہیں جو مثلاً شکیب جلالی کے یہاں تھی لیکن دلآویزی کے بغیر بھی صابر ظفر کا لہجہ اپنی الگ پہچان ضرور بنا رہا ہے۔

پروین شاکر کی تمام غزلیں ان کے وژن کے خوشگوار پھیلاؤ کو سامنے لا رہی ہیں۔ شریف الدین اشرف کی طرح میرے دل سے بھی اس بچی کے لئے دعا ہی نکلتی ہے۔

خالد احمد کو کیا ہو گیا ہے؟

علامہ انجم قاسمی کا ایک شعر کمال کا ہے ؎

تتلیاں ہجرت کریں گی موسموں کے ساتھ ساتھ
اور شہرِ گل میں آشوب ہوا رہ جائے گا!

یوسف حسن کی چاروں غزلیں بہت اچھی ہیں اور امکانات کے بہت سے دریچے کھول رہی ہیں۔ شہناز پروین سحر کے بارے میں بھی یہی کہا جا سکتا ہے! جمال احسانی اگرچہ نسبتاً نئے شاعر ہیں لیکن اپنے کئی پیشروؤں کو پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ کیسا نیا شعر ہے!

اس بستی کی رات بھی کتنی روشن ہے
بجھ جائیں گر دیپ تو پہرے دار جلے

شفیع ضامن صاحب کا یہ شعر:

ارم بدوش رہی جن کے دم سے تیری ہوا
کدھر کو لد گئے اے دشت وہ غزال ترے

محلِ نظر ہے —— "واہ" کا احوال نہیں معلوم مگر صاحب! غزالوں کو لدتے ہوئے ہم نے آج تک نہیں دیکھا!

اور اب اختلافات سے کچھ اتفاقات و اختلافات:

محسن بھوپالی صاحب کا مراسلہ پڑھ کر مجھے بے اختیار کانٹ کا ایک فقرہ یاد آگیا جو اس نے مرتے وقت ادا کیا۔

I AM ' HALF AS SCARED OF BEING REFUTED AS BEING MISUNDERSTOOD!

مراسلہ دلچسپ تضادات کا مجموعہ ہے —— کہاں تو وہ میری صنف کا ہی تعین نہیں کر سکے، کہاں نہ صرف یہ کہ "معروف اہلِ قلم" میں شامل کر دیا! بلکہ میرے حلقۂ احباب کی نشاندہی بھی فرما دی! انہیں یہ بھی اعتراض ہے کہ اس سے پہلے کسی بھی ادبی رسالے میں میرا کوئی مراسلہ ان کی نظر سے کیوں نہیں گزرا! میرے نزدیک ادب پر کوئی رائے رکھنے کے لیے مراسلہ نگاری کی روایتی جاتیں پاس کرنا ضروری نہیں۔

انجم اعظمی کی نظم "بیلے کی کلیاں" کو میں نے "زبردستی" قرار نہیں دیا تھا بلکہ میرا جملہ تھا کہ انجم اعظمی کی "بیلے کی کلیاں" کا عنوان اچھی زبردستی ہے! —— اس سے میری مراد نظم اور عنوان کی بے ربطی تھی۔

محشر بدایونی، گوہر ہوشیارپوری اور حنیف فوق بے شک کہنہ مشق شاعر ہیں، لیکن کہنہ مشقی شاعرانہ عظمت کا سرٹیفکیٹ نہیں دیتی۔

احسن علی خاں کے وضاحت میں میرا خیال تھا کہ وہ ان کی کسی ذاتی تخلیق کا حوالہ دیں گے لیکن آپ کے وہ ترکی کے عوامی شاعر امریکہ کی نظموں کے تراجم لے آئے —— بات تو وہی رہی نا —— کلام خورشید حسن مہر کا ہو یا امریکہ کا —— احسن علی خاں کی حیثیت تو مترجم کی ہی ٹھہری نا!

عرفانہ عزیز کی نظم کو میں نے مصنوعی ان معنوں میں نہیں کہا تھا جس کا حرفِ متضاد محسن بھوپالی کے خیال میں اصلی ہوتا ہے —— ادبی اصطلاح میں ہم اسے آورد کہتے ہیں!

اس بات کا فیصلہ تو حسن اکبر کمال ہی کر سکیں گے کہ میرے COMPLIMENTS ان کے لیے کیا تھے۔ مدح بالذم یا ہجوِ ملیح یا SHEER APPRECIATION —— اپ کی شاعری کے سے TWENTIES کی لہر کا مژدہ —— تو اس سے میری رائے میں (جو ضروری نہیں کہ ناقص بھی ہو) ایک عمر کا ریاض اور مشقِ سخن ہرگز معرضِ خطر میں نہیں پڑتا —— یہاں میں نے اس وارفتگی اور سرشاری کی سمت اشارہ کیا تھا —— جو بہار کے اولین شگوفوں کی خوشبو سے وابستہ ہے۔ اتنے لوگوں کے گواہ "چست" بن کر بالآخر موصوف اپنے اصلی مقصد کی طرف آئے —— انہوں نے میرے اس فقرے کو کہ محسن بھوپالی کے شارٹ پوئٹک ڈرامے جنہیں وہ "نظامے" کہنے پر بضد ہیں، نہ پوئٹک ہیں، نہ ڈرامیٹک — ہاں شارٹ ضرور ہیں" —— "اچھی زبردستی قرار دیا ہے۔

محسن بھوپالی صاحب! کبھی اپنے حلقۂ احباب سے نکل کر کسی غیر جانبدار پڑھے لکھے آدمی سے نظامے کا تجزیہ کروایئے —— مجھے

یقین ہے کہ تب آپ مجھ پر اتنے خفا نہیں ہوں گے۔ بھوپالی صاحب! شاعری میں تو آپ کے نقاد کے علاوہ آپ کا قاری بھی آپ سے ایک ایک حرف کا حساب طلب کر سکتا ہے!

گوہر ہوشیارپوری صاحب رقمطراز ہیں کہ میں نے گزشتہ شمارے نکال کر ان چاروں کی غزلیں دوبارہ پڑھیں اور اس نتیجے پر پہنچا کہ محترمہ نے [illegible] کے شوق میں محشر بدایونی، حنیف فوق اور لیث قریشی صاحب کی شاعری کو جس انداز سے DULL شاعری قرار دیا تھا کسی طور پر درست نہیں —— البتہ میری غزلیں واقعی اس قابل تھیں کہ ان پر گرفت کی جائے۔

تو گوہر ہوشیارپوری صاحب! اگر مجھے نام چھپوانے کا شوق ہوتا تو اس مقصد کے لئے "اخبار جہاں" کا صفحہ نمبر ۲ کافی تھا کہ اس کی اشاعت "فنون" سے کئی گنا زیادہ ہے، البتہ اپنے بارے میں آپ جس نتیجے پر پہنچے وہ واقعی درست ہے —— میرا خیال ہے کہ اگر باقی تین حضرات بھی گوہر ہوشیارپوری کی طرح ٹھنڈے دل سے باری باری اپنی غزلیں پڑھ لیں تو اپنے اپنے بارے میں سب کی دیانت دارانہ رائے یہی ہوگی!

آصف ثاقب صاحب! میں نے دربارۂ عروض خالد احمد اپنے اس خدشے کا اظہار کیا تھا —— کہ مجھے ڈر تھا کہ یہ شاعر کہیں فاعلاتن فاعلات کے چکر میں نہ پھنس جائے —— لیکن ساتھ ہی میں نے یہ بھی لکھا تھا کہ —— خالد نے عروض کو شاعری بنا دیا! —— نہیں آصف ثاقب صاحب! میں نے اسے معذرت کا ٹیلیفون نہیں کیا —— یہ رانگ نمبر تھا!

آخر میں —— میں اپنے محترم اور بزرگ نقاد جناب جابر علی سید صاحب کی انتہائی ممنون ہوں کہ انہوں نے میرے پہلے تنقیدی مکتوب کو سراہا —— مجھے افسوس ہے کہ اس بار انہیں وہ ایجاز نہ مل سکا —— دراصل بہت سی باتیں وضاحت طلب تھیں! اور یہاں اختصار —— عذر سمجھ لیا جاتا —— میں فہمیدہ ریاض اور پروین شاکر کے سلسلے میں سید صاحب کے حکم کی تعمیل کرنے کی کوشش کروں گی۔ **ستارہ صابر (کراچی)**

جس دن "فنون" ملا، واہ میں شدید گرمی پڑ رہی تھی لیکن سالنامے کا سرورق دیکھتے ہی یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے دودھ میں بسے ہوئے اور برف میں لگے ہوئے روئی کے ٹھنڈے ٹھنڈے گالے آنکھوں پر رکھ دیئے ہوں۔ موجد نے موسم کی مناسبت سے اتنے پیارے رنگوں کا انتخاب کر کے فنکارانہ بصیرت کا بڑا خوبصورت مظاہرہ کیا ہے۔

'حرفِ اول' میں آپ نے 'فنون' کی منفرد خدمات کا ذکر کرتے ہوئے جو پُراعتماد لب و لہجہ اختیار کیا ہے، ایمان کی بات یہ ہے کہ آپ کو اس کا حق پہنچتا ہے۔ انسان کو اس قسم کا اعتماد "مشق" کے ذریعے حاصل نہیں ہو سکتا اس کے لئے ایک زبردست روحانی قوت کی ضرورت ہوتی ہے جو کشادہ دلی، خلوص، لگن اور محنت کے نتیجے کے طور پر ہونے والے ٹھوس شواہد سے ہم پہنچتی ہے چنانچہ جب آپ یہ کہتے ہیں کہ 'فنون' کے صفحات پر آپ کی لگائی ہوئی پنیری نے اب ایک چھتنار کی صورت اختیار کر لی ہے تو آپ کے اس دعوے کے ثبوت میں امجد اسلام امجد، فہمیدہ ریاض، عدیم ہاشمی، حلیم قریشی، ثروت حسین، صابر ظفر، پروین شاکر، خالد احمد، سجاد بابر، فرزانہ رضوی، نجیب احمد، یوسف حسن، حسن ناصر، سبط علی صبا، شہناز پروین سحر، جمال احسانی اور کئی اور نام بڑی آسانی سے گنوائے جا سکتے ہیں۔

آپ نے نثری نظم کے بارے میں دوبارہ اپنی رائے کا برملا اظہار کر کے شعر و ادب کی نمایاں خدمت انجام دی ہے۔ آپ نے پاکستانی ادب کے واضح خدوخال کو واضح تر کیا ہے اور میرے خیال میں اب وقت آگیا ہے کہ آپ "فنون" کا "پاکستانی ادب نمبر" نکالنے کی تاریخ کا اعلان بھی کریں۔ یہ "قائد اعظم" کا سال ہے اور اگر دسمبر تک یہ نمبر شائع ہو جائے تو اس کی قدر و منزلت عام حالات سے کہیں زیادہ ہوگی۔ اس طرح ادارۂ 'فنون'، 'فنون' میں لکھنے والے اور 'فنون' کو پڑھنے والے سب لوگ مل کر روحِ قائد اعظم کو خراجِ عقیدت پیش کر سکیں گے۔

اس بار 'فنون' میں اکٹھی چھ نعتیہ نظمیں پڑھ کر طبیعت خوش ہو گئی۔ پروین شاکر کی نظم "وحی" ایک بڑا ہی پاکیزہ اور خوبصورت تجربہ ہے۔ شاعرہ نے تخلیق کا سفر سوجھ بوجھ اور ذہانت سے طے کیا ہے اور زمانی و مکانی ماحول اور کیفیات کی بڑی عمدہ عکاسی کی ہے۔ میری دعا ہے کہ خدائے کریم

پروین شاکر کو ایسی بہت سی نظمیں لکھنے کی توفیق دے۔ ثروت حسین، خالدہ احمد، صائمہ خیری اور ناہید قاسمی کا نعتیہ کلام جدید شعراء کے اس مثبت رجحان کی واضح طور پر سمت نمائی کر رہا ہے جس میں سراپا نگاری کی بجائے اسوۂ حسنہ (صلعم) اور انسانیت پر آپ (صلعم) کے بے پایاں احسانات کو تہذیب حاضر کے لائے ہوئے عذابوں کے تناظر میں دیکھنا ہی اوّلین اہمیت کا حامل ہے۔ میرے خیال میں روحِ عصر کا تقاضا بھی یہی ہے اور ان نظموں خصوصاً صائمہ خیری اور ناہید قاسمی کی نظموں میں اس فکری انتشار، ذہنی آوارگی اور جذباتی افراتفری کی تصویر کشی بڑے مؤثر انداز میں کی گئی ہے جس نے ساری دنیا کا سکون چھین رکھا ہے اور جس سے نجات حاصل کرنے کا واحد ذریعہ اسوۂ حسنہ (صلعم) کی پرخلوص پیروی ہے۔

حصۂ نظم میں شامل بیشتر تخلیقات پسند آئیں۔ فارغ بخاری اور ظہور نظر کی مفہوم کے اعتبار سے ملتی جلتی نظمیں پڑھ کر اس رائے کو تقویت ملی کہ صحتمند سوچ رکھنے والے سب شاعر اجتماعی مسائل کے بارے میں ایک ہی جیسا نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔ مجھے یہ دونوں نظمیں بھرپور تاثر کی حامل اور امید افزا نظر آئیں۔ بلکہ میری نظر میں انجم اعظمی کی نظم "پیار"، حسن اکبر کمال کی نظم "خیال"، علیم قریشی کی نظم "الجھنیں اور فیصلے"، سجاد بابر کی نظم "مگر کہاں تک"، سید حسن ناصر کی نظم "ایک دعا، ایک عزم" اور اختر کاظمی کی نظم "اچھے لوگوں کے لئے ایک نظم" بھی اسی قبیل کی نظمیں ہیں اور انسانیت کے بہتر مستقبل کا مژدہ سنا رہی ہیں۔ اختر حسین جعفری کی عظیم نظم "آئینہ خانہ" کا صرف ایک عکس دیکھ کر بہت دکھ ہوا! کیا یہ نظم بس مکمل ہو گئی ہے؟ اگر ایسا ہے تو اسے چودہ اور ایک کی انتہائی غیر متناسب نسبت سے دو قسطوں میں کیوں چھاپا گیا؟ کیا شاعر کو (خدانخواستہ) کسی خارجی مجبوری یا تعطل کا سامنا ہے؟ کاش اس نظم کو سالم صورت میں چھاپا جاتا!! "آشنا رتوں کے نام ایک خط" بڑی عبرت انگیز نظم ہے۔ اپنے چہرے سے منحرف ہونا اور اپنے ورثے سے دستکش ہونا بڑی اندوہناک باتیں ہیں لیکن یہ سزا کی رت جو ہوئی! اس شمارے میں شامل اختر حسین جعفری کی غزلوں کا ذکر بھی بے جا نہ ہوگا۔ شاید اس کا سبب میرا عجزِ فہم ہو لیکن میں نہایت ادب سے یہ کہنے کی جسارت کرتا ہوں کہ ان کی غزلوں میں وہ "تغزل" نہیں ملتا جو ان کی نظموں کی نمایاں بین خصوصیت ہے۔ فرخ درانی، راحت نسیم ملک، حسن اکبر کمال اور احسن علی خاں کی نظمیں بہت عمدہ ہیں۔ پروین شاکر کی نظموں پہ ذہنی مات کی کیفیت کے باوجود ابھی تک تازگی موجود ہے لیکن انہوں نے اپنی مختصر نظم "پہلے پہل" میں اپنی چنچل پہیلی کی وضاحت کر کے نظم کی ایمائیت اور رمزیت کو خاصا نقصان پہنچایا ہے۔ فہمیدہ ریاض کی زندہ نظم "صرف ایک لڑکی" کا کریڈٹ بھی ہم تو پروین شاکر ہی کو دیں گے کیونکہ اگر پروین شاکر "صرف ایک لڑکی" نہ بنتی اور اس کے لہجے میں ایک سہما سہما مشرقی بھولپن نہ ہوتا تو فہمیدہ ریاض اتنی جاندار، اتنی ولولہ انگیز اور اتنی اعتماد افزا باتیں کس سے کہتی اور کس طرح کہتی۔ اقبال فریدی کی نظموں کا گیتوں جیسا نرماہٹ بھرا آہنگ، خود ملامتی کے رنگ میں ڈوبا ہوا نسوانی لہجہ اور محبت و عقیدت سے معمور فضا دل و دماغ پر ایک وجدانی کیفیت طاری کر دیتے ہیں۔ سجاد بابر کی نظم "کلید" فکر و جذبہ کا ایک حسین امتزاج ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس کے پڑھنے سے بہتوں کا بھلا ہوگا۔ شاعر نے احساس کمتری میں مبتلا ان نام نہاد دانشوروں کی خوب خبر لی ہے جو خود اعتمادی اور عزتِ نفس سے اس حد تک محروم ہو چکے ہیں کہ وہ ترقی یافتہ اور مہذب نظر آنے کے شوق میں اپنے یہاں کی ہر چیز کو باہر سے آنے والی چیزوں سے بدل لینا چاہتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ یہاں بھی:

کتنی ہی انگلیاں حسنِ ترتیب سے آشنا ہیں
کتنے ذہن
رنگوں کے پڑھنے کے اعجاز سے بہرہ ور ہیں۔

شاہین مفتی کی نظم "نیا سومنات" حد سے بڑھی ہوئی صنعتیت پسندی، ROMANTICISM اور UTOPIANISM کے خلاف ایک مثبت اور حقیقت پسندانہ ردِ عمل ہے لیکن اس نظم کی یہ لائنیں الجھاؤ کا باعث بنتی ہیں اور نظم ان کے بغیر بھی مکمل نظر آتی ہے:

وہی ہے زرد پہاڑوں پہ — کہ جس کی گونج
یا اسی کی صدا — مرے دل میں سرسراتی ہے۔

یوسف حسن کی بصیرت افروز نظم "سوالی آنکھیں" بہت پسند آئی۔ حبِ وطن کے مقدس موضوع پر کہی گئی نظموں میں یہ ایک خوبصورت اضافہ ہے۔ شاعر نے مادرِ وطن کی محبت کو دوسری ہر ATTRACTION پر ترجیح دے کر جس خلوص کا مظاہرہ کیا ہے وہ قابلِ قدر ہی نہیں لائقِ تقلید بھی ہے۔
ناہید قاسمی نے "ایک ننھی سی بچی" کے "رنگ برنگ تتلیوں" کے پیچھے دوڑنے کی بڑی پیاری تصویر اتاری ہے۔ فرزانہ رضوی کی چھ مختصر نظمیں بہت عمدہ ہیں لیکن پروین شاکر اور فرزانہ رضوی کی ڈکشن میں غایت درجہ کی مماثلت کبھی کبھی الجھن میں ڈال دیتی ہے ——— اور آخر میں مجھے آپ کی نظم "دعا" کے متعلق صرف یہ کہنا ہے کہ اس نظم کو پڑھ کر ایمان تازہ ہو جاتا ہے اور انسانی اقدار کی عظمت دل پر ثبت ہو کر رہ جاتی ہے۔ اگر میرا بس چلتا تو میں اس نظم کو ملک کی نوجوان نسل کا منشور قرار دے دیتا اور سکولوں کے بچے روزانہ مارننگ اسمبلی میں یہی دعا پڑھا کرتے۔

غزلیات کے پہلے حصے میں جناب فارغ بخاری، اختر حسین جعفری، مرتضیٰ برلاس، حزیں لدھیانوی، حلیم قریشی، لیث قریشی، خاقان خاور، محمد نسیم قریشی، خادم رزمی اور احمد ندیم قاسمی کی غزلیں بہت پسند آئیں۔ یہ شعر تو ضرب المثل بن جائے گا۔

فکر و فن کے لئے لازم اگر اچھے شاعر ——— اپنے فن کو کبھی حکمت نہیں بننے دیتے

غزلیات کے دوسرے حصے میں جاندار غزلوں کی تعداد زیادہ ہے۔ ان میں کئی غزلیں تو ایسی ہیں کہ ان کے سب کے اشعار دہرا دینے کو جی چاہتا ہے۔ مثلاً ثروت حسین کی پہلی غزل "پورے چاند کی سج دھج ..... الخ" پھر عدیم ہاشمی کی غزلوں کے بہت سے اشعار اور پروین شاکر کے اشعار:

ہیں تیز بہت ہوا کے ناخن ——— خوشبو سے کہو کہ گھر ہی ٹھہرے
وہ شہر میں ہے ابھی بہت ہے ——— کس نے کہا میرے گھر ہی ٹھہرے

ایسا نہ ہو چاند بھید پا لے ——— پیراہنِ گل، شکن سمیٹے!
سوتی رہی آنکھ دن چڑھے تک ——— دلہن کی طرح تھکن سمیٹے
بکھرنے لگی ہوں ریزہ ریزہ ——— آئے، مجھے میرا فن سمیٹے!

ویسے پروین شاکر کی غزلوں میں اس بار وہ "مولوی مدن کی سی بات" نظر نہیں آتی۔ ان کا لہجہ اور اسلوب پہلے کی طرح دلکش ہے لیکن پچھلے سال "فنون" میں ان کی جو غزلیں چھپی ہیں ان کے بیشتر اشعار "HIT" ہوتے تھے۔ اب اُن کی غزلوں میں ایسے اشعار ڈھونڈنے پڑتے ہیں۔ خالد احمد نے فعلات، فعول، فعولن والی غزل میں جو خدشہ ظاہر کیا تھا وہ صحیح ثابت نہیں ہوا۔

مری سانس اداس سہاگن ——— در جاں ترے پٹ کوئی بھیڑے
کوئی پیار کو پیار نہ جانے ——— تکتے تک گئے نین ادھیڑتے

نجیب احمد کا پُراندیشہ لہجہ بہت متاثر کرتا ہے:

اب تو اک حرفِ تسلی بھی کتابوں میں نہیں ——— کن ہواؤں کے تھپیڑے شہر میں آنے کو ہیں

عطاء الحق قاسمی نے "ایک لانگ ڈسٹینس کال" جیسی خوبصورت نظم کے بعد ایک خوبصورت تر غزل بھی کہہ ڈالی اور یوں اپنے آپ کو FULL FLEDGED شاعر کی حیثیت سے منوا لیا:

چھین لے گی صبح اک آہٹ کا جھوٹا خواب بھی
آنکھ کی سوئی گلی میں رت جگا رہ جائے گا

خالد اقبال یاسر کے ان شعروں نے بڑا لطف دیا:

لفظ کی عریانیوں نے مجھ کو رسوا کر دیا
بات کچھ کی تھی، معانی اور پہنائے گئے

قہقہوں سے ہو گئی خالی مرے گھر کی منڈیر
کچھ پتا کر بھی نہ خوش گفتار ہمسائے گئے

محمد اظہار الحق کا یہ شعر بہت پسند آیا

رو پئے کھل کر نشیب شب غنیمت جانئے
دن نکل آیا تو یہ دریا بہائیں گے کہاں

سجاد بابر کے اندر چھپا ہوا بڑا شاعر اب اپنی پوری آن بان کے ساتھ سامنے آ گیا ہے اور یہ کہہ دینے میں کوئی حرج نہیں کہ یہ نوجوان شاعر اپنے دلکش اسلوب اور متنوع مضامین کی بدولت اب بڑے سے بڑے اجتماع میں بھی پہچانا جا سکتا ہے اور اب وقت آ گیا ہے کہ نئی نسل کے اس سلیم الطبع شاعر کا تفصیلی مطالعہ کیا جائے۔ یوسف حسن اس دور کا ایک اور ابھرتا ہوا شاعر ہے جس کے پاس کہنے کو بھی بہت کچھ ہے اور جسے بات کہنے کا سلیقہ بھی آتا ہے۔ شہناز پروین سحر کی غزلیں بہت پسند آئیں۔ ان میں جذبات کی شدت کے ساتھ ساتھ فکر و خیال کا عنصر بھی واضح طور پر پایا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں ان کے طنز کی کاٹ بھی بڑی بے پناہ ہے۔ نئے شاعروں میں جمال احسانی بہت متاثر کرتا ہے مگر اس کے اسلوب میں ابھی ناہمواریت موجود ہے۔ اور نئے شعراء کے اشعار میں ایسے ایسے SPARKS ہیں جو شعلوں کی خبر دیتے نظر آتے ہیں۔ ہندوستان کی نسیم مخموری صاحبہ کی غزل گہرے تفکر اور بھرپور تاثر کی حامل ہے۔ ان کا غم شخصی نظر نہیں آتا۔ اس میں بڑی وسعت اور پھیلاؤ ہے۔ ان کا لہجہ خاصا دردانگیز ہے لیکن اس میں قنوطیت بہت کم اور رجائیت بہت زیادہ ہے۔ ان کی زبان صاف ستھری اور غزل کے مزاج سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ شاد و محشر کے ہم وطن اظہر عنایتی نے اتنی اچھی غزلیں کہہ کر ان چراغوں کی لو اونچی کر دی ہے جنہیں شاد و محشر نے اپنے خون سے روشن کیا تھا۔ ان کے تیور بتا رہے ہیں کہ وہ مستقبل کے ایک نامور غزل گو شاعر ثابت ہوں گے۔ نسیم مخموری صاحبہ کی طرح ان کی زبان بھی بڑی شستہ اور الفاظ و تراکیب کی بندش بڑی چست ہے۔ ان کے اشعار روایت سے اپنا رشتہ توڑے بغیر بھی تازگی کے حامل ہیں۔

افسانوی ادب میں ش۔ صغیر ادیب کے افسانہ "گوڈو" نے بڑا متاثر کیا۔ اس چھوٹے سے افسانے میں گزشتہ ربع صدی کا سارا کرب سمٹ آیا ہے اور ننھا "ٹوم" اس کرب کا سمبل بن گیا ہے۔ چار سال کے ایک بچے کی ذہنی کیفیات کی عکاسی جس عمدگی سے کی گئی ہے اس سے فاضل افسانہ نگار کی زبردست قوت مشاہدہ کی خبر ملتی ہے۔ مصنف نے "لیزا" کے گھر آنے والے مہمانوں کے نام رکھنے میں بھی بڑی ذہانت دکھائی ہے اور مسز کسینجر نے ننھے "ٹوم" کو جو ٹینک کا کھلونا دیا ہے اس کا تو جواب ہی نہیں۔ مظہر الاسلام کا افسانہ "دھوپ کی منڈیر" بھی بہت پسند آیا۔ مصنف نے افسانہ کے خاتمہ تک جو پراسرار سی فضا قائم کر رکھی ہے اس سے فن پر ان کی ماہرانہ گرفت کا پتہ چلتا ہے۔

ابو ذر اس پر محمد کاظم کے عالمانہ اور محبت بھرے مقالے کی دوسری قسط پڑھ کر روح کو بالیدگی ملی لیکن ساتھ ہی یہ دکھ بھی ہوا کہ یہ مضمون بس ختم ہو گیا ہے۔ ان سے درخواست ہے کہ وہ عرب شعراء کے تفصیلی تعارف کا یہ انتہائی سودمند سلسلہ جاری رکھیں۔ "ملامت کی روایت اور شاہ حسین" پڑھ کر یوں محسوس ہوا جیسے ذہن میں ایک نیا سورج طلوع ہو گیا ہے۔ فاضل مقالہ نگار نے اس روایت کے ہمہ وقتی اور ہمہ گیر وجود کو ٹھوس شواہد سے ثابت کر کے اس سے جو امید افزا اور مثبت نتیجہ اخذ کیا ہے اس کا بخوشی قائل ہونا پڑتا ہے۔ "سچا ادب اور جھوٹا ادب" میں یک طرفہ اور انتہا پسندانہ اپروچ کے باوجود اظہر قادری نے بڑے کام کی باتیں کی ہیں۔ "پتھر کی زبان" سے "بدن دریدہ" تک" فہمیدہ ریاض کی شاعری کے متعلق پیدا شدہ غلط فہمیوں کو دور کرنے کی ایک اچھی کوشش ہے۔ جعفر طاہر نے مجید امجد مرحوم کی شخصیت اور شاعری پر کوثر و تسنیم میں ڈھلی ہوئی زبان میں جو پر مغز مقالہ لکھا ہے اس سے پاک و ہند کے اس بہت بڑے نظم گو شاعر کو سمجھنے کی راہیں کافی حد تک روشن ہو گئی ہیں۔ جعفر طاہر نے اپنے مقالے میں دو بڑے اور ہم عصر شعراء (ندیم اور مجید امجد) کا تقابلی مطالعہ بھی بڑی ذمہ داری اور بالغ نظری سے کیا ہے۔ موصوف کو خوبصورت اور مترنم الفاظ و تراکیب کے انتخاب و استعمال کا جو قابلِ رشک ملکہ حاصل ہے یہ مقالہ اس کی ایک عمدہ مثال ہے۔ فاضل مقالہ نگار نے مرحوم کے ساتھ جس متوازن محبت اور عقیدت کا برتاؤ کیا ہے

وہ قابلِ تقلید ہی نہیں ادبی تنقید کا ایک لازمی عنصر بھی ہے۔

میں جناب شریف کنجاہی کا احترام کرتا ہوں اور ان کی علمی قابلیت کا دل سے معترف ہوں لیکن میں نہایت ادب سے یہ کہہ دینے کی جسارت کر رہا ہوں کہ انہوں نے میر کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ اس محفل میں اس مقالے کا جواب لکھنا ہرگز میرے پیشِ نظر نہیں۔ برصغیر پاک و ہند میں ایسے سینکڑوں فضلاء موجود ہیں جو میر کے متعلق مجھ سے ہزار گنا بہتر معلومات رکھتے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ میر کا کوئی نہ کوئی مداح اس مقالے کا ضرور نوٹس لے گا۔ اس وقت میرا مقصد صرف یہ ہے کہ میں شریف کنجاہی صاحب کے رویّے اور مقالے کے CONCLUSION کے بارے میں کچھ عرض کروں۔ عام طور پر ادبی تحقیق و تنقید کو "اپریشن" کے عمل سے مشابہ سمجھا جاتا ہے۔ اسی شمارے میں شاعر ابونواس پر جناب محمد کاظم کا مقالہ اس کی ایک عمدہ مثال ہے اتفاق سے "جنسی ذوق" کی حد تک ابونواس کا کردار بھی "میر تشنہ میر" سے کافی حد تک ملتا جلتا ہے اور محمد کاظم نے ابونواس کی جنسی بے راہروی کو EXPOSE کرنے میں کوئی رعایت بھی نہیں برتی لیکن انہوں نے کسی مرحلہ پر بھی اپنے رویّہ کو نفرت اور حقارت سے آلودہ نہیں ہونے دیا اور شروع سے آخر تک ایک ایسے ہمدرد سرجن کا کردار ادا کیا ہے جو کسی جیتے جاگتے انسان کا اپریشن کر رہا ہو۔ اس کے برعکس جناب شریف کنجاہی نے میر کے بارے میں جو روش اختیار کیا ہے اسے "اپریشن" تو کیا پوسٹ مارٹم بھی نہیں کہا جا سکتا۔ اسے تو صرف "MUTILATION" کا نام دیا جا سکتا ہے

فاضل مقالہ نگار کے مقالے کا "CONCLUSION" یوں ہے:۔

"زندگی کی بہت سی پیچیدگیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مزاج کی تشکیل اور اس میں تبدیلی کہاں تک ہماری شعوری کوشش کی مرہونِ منت ہوتی ہے اور کہاں تک لاشعور اس سلسلے میں من مانی کرتا ہے اسی سے یہ طرزِ فکر بھی ہیں بارہا ابھرتی ملتی ہے کہ مرض سے نفرت اور مریض سے محبت کرو اور جب تک ماحول وراثت پر پوری طرح تسلط قائم نہیں کر پاتا اور خود ماحول انسانی مشیت کے آگے گردن نہیں ڈال دیتا دوسروں کی خامیوں کو اپنی خامیوں کی طرح گوارا کرتے ہوئے ہی رویّہ رکھو

حالی سے کام ہم کو عیبوں سے اس کے کیا کام
اچھا ہے یا برا ہے، پر یار ہے ہمارا

اور اسلاف کے اسی مثبت رویّے نے گذشتہ ڈیڑھ دو سال کے عرصہ میں میر کو بددماغی کے باوجود بار جانا اور ناسخ سے لے کر حسرت تک ہر کوئی اس کے شیوۂ گفتار کا معتقد رہا۔"

اس پیراگراف کی ژولیدگی بالکل واضح ہے۔ خط کشیدہ سطور سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فاضل مقالہ نگار "مرض سے نفرت اور مریض سے محبت کرو" جیسی طرزِ فکر کو صرف مصلحتی اور عارضی طور پر ہی مثبت سمجھتے ہیں اور جب ماحول وراثت پر پوری طرح تسلط قائم کرے گا اور خود ماحول انسانی مشیت کے آگے گردن ڈال دے گا تو اس وقت مثبت رویّہ یہ ہوگا کہ مرض کے ساتھ ساتھ مریض سے بھی نفرت کی جائے اور "حالی" کی گردن مار دی جائے یا پھر یہ کوئی ایسی یوٹوپیا ہوگی جس میں صرف فرشتے بستے ہوں گے۔

آخری سطر میں ان کے اندازِ تحریر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسلاف نے میر کو اس کی بددماغی کے باوجود یار جان کر خواہ مخواہ سر پر چڑھائے رکھا ہے اور ناسخ، ذوق، غالب، حالی اور حسرت نے اس کے شیوۂ گفتار کا معتقد رہ کر اس پر کوئی ایسا احسان کیا ہے جس کا وہ ہرگز مستحق نہ تھا۔ میری ناقص رائے یہ ہے کہ میر کی مقبولیت اور عظمت اس کے اپنے فن کی مرہونِ منت ہے (اور یہ انکشاف تو مجھ پر یہ مقالہ پڑھ کر ہی ہوا ہے کہ میر کو صرف اسلاف نے یار جانا ہے اور آج کل سب لوگ اسے اپنا دشمن سمجھتے ہیں)

میر وہ تھا جس نے اردو غزل کو "اک بات لجر سی بزبان دکنی تھی" کی پستیوں سے اٹھا کر عظمت کے ان آسمانوں تک پہنچایا جہاں تک عوامی پیل اور وسعتِ مضامین کے لحاظ سے اردو شاعری کی کوئی صنف نہیں پہنچ سکی۔ اور جس میں آج خود شریف کنجاہی صاحب بھی "میر تشنہ میر" ہی کی پسندیدہ بحروں میں شعر کہہ رہے ہیں۔ میر فرشتہ نہیں تھا انسان تھا اور اگر اس کے کردار میں کمزوریاں تھیں تو انسان ہونے ہی کی وجہ سے تھیں اور اتنی نہیں تھیں جتنی

مقالہ نگار نے گنوا ڈالی ہیں۔ اپنی تمام (مفروضہ یا حقیقی) کمزوریوں اور خامیوں کے باوجود میر خدائے سخن تھا اور اس کا یہ منفرد اعزاز اس کی ذات پر کیچڑ اچھال کر، اس کی سیادت کو مشکوک ٹھہرا کر اور اس کے جنسی ذوق کے اشتہار لگا کر بھی نہیں چھینا جا سکتا۔

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی سے معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

شفیع نامسن (ادہ کینٹ)

مشرقی پاکستان کے المیہ اور اہل قلم کے کردار پر توصیف اور خورشید جاوید کے تجزیاتی خطوط مجموعی طور پر سنجیدہ اور مضبوط دلائل رکھتے ہیں —— اس موضوع پر انور محمود خالد کی تحریر کئی بار پڑھنے کے بعد نرم سے نرم لفظوں میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ جذباتیت پر مبنی، تاریخی سماجی شعور سے خالی صرف ایک خاص گروہ سے "اتفاق برائے اتفاق" ہے جس میں حسن اتفاق کا بھی کوئی شائبہ نہیں۔ المیہ مشرقی پاکستان کے سائنسی سماجی تجزیے سے عوام کی توجہ ہٹانے کے لئے اسی گروہ نے نعرہ لگایا تھا کہ "شراب نے ملک کو تباہ کر دیا ہے" اب انور محمود خالد اس المیے کو عاقبت نااندیش سیاستدانوں کی (انفرادی) غلطیاں کہہ کر دانستہ یا نادانستہ طور پر اس معاشرتی و معاشی نظام کی سلامتی چاہتے ہیں جو بنگلہ دیش بننے کا سب سے بڑا محرک ہے۔ اسی طرح "قتل کرنے کے عمل میں لذت حاصل کرنے" کو بنگالیوں کی نفسیات قرار دے کر مسعود مفتی ایک رسمی الزام دہرا رہے ہیں۔ اس سلسلے میں "ہمہ یاراں دوزخ" (از صدیق سالک) بھی زیر بحث ہے۔ شگفتہ نگاری، دردمندی اور حوصلہ مندی اس کتاب کے نمایاں اوصاف ہیں۔ شگفتگی کا انداز "بجنگ آمد" (از کرنل محمد خان) کا سا ہے اور یہ عیب یا دست قومی المیے کی درد انگیزی میں چھپ جاتا ہے۔ دردمندی میں واقفیت ہے اور یہی وصف ہمیں زیادہ متاثر کرتا ہے۔ اب رہ گئی حوصلہ مندی نصف حوصلہ مصنف نے ایام اسیری میں ہندوستانی ہتھکنڈوں کے مقابل حب وطن پر صرف کیا ہے جو واقعی قابل فخر و ستائش ہے اور نصف حوصلہ انہوں نے ان حقائق کو چھپانے میں استعمال کیا ہے جن کا اظہار وہ شاید ملازمت کی مجبوری کی وجہ سے نہ کر سکے۔

فنون کے دیگر مندرجات کے بارے میں مختصر مختصر عرض ہے۔ لگتا ہے شاعر مینا و جام ابونواس کچھ زیادہ ہی آؤٹ ہو گیا تھا کہ محمد کاظم چھ سات ماہ بعد اسے زور زن ورد [?] میں لا سکے۔ محمد کاظم کے سفرنامہ جرمنی کی گزشتہ مطبوعہ قسط دوبارہ پڑھی تاکہ قریب الاشاعت تازہ قسط سے تسلسل ذہن نشین رہے۔ سید علی عباس جلالپوری اپنے زیر قلم موضوع کا حق ادا کر دیتے ہیں "علامت کی روایت اور شاہ حسین" بھی ایسا ہی معیاری مقالہ ہے۔ "آگ کا دریا" عبور کرتے ڈاکٹر محمد احسن فاروقی ترقی پسندوں پر خواہ مخواہ بھڑک اٹھے ہیں۔ فرماتے ہیں "ترقی پسندی کی تحریک تو ہوائی کی طرح کھل کر جل چکی مگر اس کی جلی ہوئی لکڑیاں اب بھی باقی ہیں۔" پھر یہ کہ "تمام ترقی پسند ادیب، وہ شاعر ہوں یا افسانہ نگار، روتے ہی نظر آتے ہیں اور رونا یا خوف و حزن کے عالم میں تلملاتے رہنا ان کے حساب زندگی کی ترجمانی اور حالات کی عکاسی ہے۔"

مذکورہ مقالے میں اگر ان الزامات کو حوالوں سے ثابت نہیں کیا گیا تو فاروقی صاحب دو وجہوں سے مجبور تھے۔ اولاً یہ کہ اپنے مقالے میں ان الزامات کا ضمناً ذکر کرتے ہوئے وہ تفصیل بیان کرنے سے قاصر تھے۔ ثانیاً یہ کہ ترقی پسند ادب ان الزامات کی نفی کرتا ہے۔ حیرت اس پر ہے کہ فاروقی صاحب نے جدیدیت کی تین اقسام تو دریافت کر لیں (اور یہ دریافت بالکل بجا ہے) مگر نئی ترقی پسندی انہیں کہیں نظر نہ آئی حالانکہ وہ آج جدیدیت کی نسبت زیادہ روشن اور توانا ہے۔

اطہر قادری کا مقالہ سچے ادب اور جھوٹے ادب کی بنیادی شناخت کے سلسلے میں اہم کوشش ہے۔ "ریزۂ درد" کے زیر عنوان جعفر طاہر نے مجید امجد اور ندیم کی شاعری پر بڑی بامعنی باتیں کی ہیں —— غلام محمد قاصر اپنے مقالے میں مرتضیٰ برلاس کی شاعری کے مرکزی رویے کو سامنے لائے ہیں۔ "تیشۂ کرب" منظر عام پر آنے پر مزید پہلوؤں کے متعلق سیر حاصل گفتگو ہو سکے گی۔

امجد اسلام امجد کے لکھے ہوئے چاروں تبصرے اس کی بے پناہ ذہانت کے آئینہ دار ہیں۔ فقرہ مارنے میں امجد کا جواب نہیں اور اس کا تبصرہ پڑھ کر مصنف اپنی تصنیف کے "جملہ حقوق" سے دستکش ہو جائے تو کچھ تعجب نہیں۔ خالد احمد "بین السطور" میں صاف اور سچی باتیں کہہ ڈالتا ہے۔ ان پر اختلاف کی

گنجائش تو ہوتی نہیں۔ بجا کہ اگر بات میں الجھاؤ نہیں ڈال سکتے تو اس میں ذرا سا دروغ تشنہ انگیز ہی ملا دیا کریں تاکہ گلہ تو ہو۔

مختار احمد (مترجم) "لونا کی موت"، مظہر الاسلام، زہرہ جبیں اور نیا بھٹ کے افسانوں کے سوا سارے افسانے کسی نہ کسی پہلو سے کمزور اور گہرے تاثر سے محروم ہیں۔ اس کمی کو مستنصر حسین تارڑ کے سفرنامہ نے پورا کیا۔ وہ قاری کو قابو میں رکھنے اور خود بھی بے قابو نہ ہونے کا ہنر خوب جانتا ہے اور اس کے خاص خاص فقروں کی بازگشت سے قوس در قوس بڑھتی ہوئی تحریر کے حسن و تاثر کی کوئی مثال نہیں۔

تازہ شمارے کی نظمیں غزلیں معیار اور مقدار دونوں اعتبار سے شاندار ہیں۔ جن شاعروں کی نظمیں بھی اور غزلیں بھی پسند آئیں ان میں ظہور نظر، اختر حسین جعفری، خالد احمد، پروین شاکر، شہناز پروین سحر اور اختر کاظمی کے نام شامل ہیں۔

خالد احمد کی غزل نظم اور لغت بالترتیب خوب اور خوب تر ہیں۔ اس خوب کو خوب کہنے پر "خرابا" کی جو حالت ہوتی ہے اس کے مطابق خالد احمد کی پہلی غزل کا مقطع یوں کہنے کو جی چاہتا ہے

ترے نام پہ خالد احمد
"کوئی منہ کو، ناک سکیڑے"

قریب قریب ساری اردو شاعری ہجر کی رات کے ستارے گننے پر مشتمل ہے۔ حسرت کے بعد فراق اور چند دوسرے شاعروں نے وصل کی کیفیات کو منعکس کیا۔ پروین شاکر کی شاعری میں اس روایت نے تازہ اور بھرپور نکھار پایا ہے۔ شہناز پروین سحر کی تخلیقات گہرے دکھ کی خبر دیتی ہیں اور قاری کو بھی اس دکھ میں شریک کر لیتی ہیں۔ اختر کاظمی دنیا کا جھوٹ سچ اس کے منہ پہ مارنے والا شاعر ہے۔ اساتذہ کی غزلوں میں احمد فراز، ظفر اقبال، مرتضیٰ برلاس، محسن نقوی، حسن اکبر کمال، لیث قریشی، افتخار عارف، خاقان خاور، اقبال کوثر، امجد اقبال، ثر، غلام محمد قاصر اور احمد ندیم قاسمی کی غزلیں ان کے مزاج و معیار کی نمائندگی کرتی ہیں۔ مرتضیٰ برلاس اپنا کرب پورے خلوص سے بیان کرتے ہیں اور مزاح کی آمیزش سے اسے مضحکہ خیز نہیں بنانے۔ اقبال کوثر کی غزلوں میں اپنی مٹی سے باوقار جذباتی و فکری رشتہ استوار ملتا ہے۔

جوانوں اور نوجوانوں میں ثروت حسین، راشد مفتی، نجیب احمد، عطاء الحق قاسمی، گلزار بخاری، سلیم طاہر، سبط علی صبا، حسن رضوی، جمال احسانی اور الفت رسول کی غزلیات بار بار پڑھنے کے قابل ہیں۔ راشد مفتی عزم و استقلال کا شاعر ہے۔ گلزار بخاری کی حقیقت پسندی نکھر رہی ہے۔ سبط علی صبا کی غزلوں سے محسوس ہوتا ہے جیسے پہلی جنگ عظیم کے کسی مرحوم فوجی سپاہی کی روح نئے جسم میں آ گئی ہو۔ روحی کنجاہی انتہائی منفرد شاعر ہے۔ فارغ بخاری، ادیب سہیل، اسرار زیدی، فرخ درانی، فہمیدہ ریاض، سجاد بابر، سید حسن ناصر، جمیل الرحمٰن اور فرزانہ رضوی کی نظمیں ہر لحاظ سے پسندیدہ ہیں۔

تازہ فنون مکمل طور پہ پڑھ چکا ہوں بلکہ بہت سی تخلیقات کئی بار پڑھی ہیں۔ آئندہ پرچے میں تاخیر ناقابل برداشت ہے۔

یوسف حسن (جہلم)

نرگس اپنی بے نوری پر مائل بہ گریہ ہی تھی کہ دیدہ ور آ پہنچا۔ "فنون" کا سالنامہ دیدہ وری کا وہ شیشہ گر نکلا کہ اس کی خیرگی کے آگے میرا الیاس تو لیدہ فکر تمہید کلام سوچتا رہ جائے۔ ایسا جنت نگاہ کہ ذوق نظر کی سیر کا ہمہ سامان موجود۔

ہندوستانی دوستوں کی تحریروں کی اشاعت کے ضمن میں آپ کا یہ ارشاد نہایت دل خوش کن ہے کہ "اگر ہمیں ان کی کوئی ایسی تخلیق مل جائے جس کا مجموعی تاثر پاکستانیت کے خلاف نہ جاتا ہو تو ہم اسے فخر کے ساتھ "فنون" میں درج کریں گے۔" مقام افسوس!! پاکستان کے بعض اعلیٰ ادبی جرائد ہندوستان کے ان حضرات کی تخلیقات بھی بہ دل و جان شائع کر رہے ہیں جو ۱۹۷۱ء میں پاکستان کو پیٹ بھر بھر کر گالیاں دیتے رہے ہیں اور جذبۂ پاکستانیت کے خلاف لکھ رہے ہیں۔ ان لوگوں نے احمد ندیم قاسمی کے شعری تشخص اور پاکستانیت کے خلاف وہ شور مچایا، وہ غضب بکھیرا کہ توبہ ہی بھلی —— اب جانے انہوں نے کون ڈھنگ ڈالا ہے کہ ان کا نیا بھیس "ہمارے بعض جرائد" کی آنکھوں میں بھرنے لگا۔ ہاں البتہ پاکستان کے چند ایک مشاہیر ادب پر ان صاحبوں کی

"عنایات" ضرور شاملِ حال رہیں۔

تبصرہ نگار ہوشیار رہیں، امجد اسلام امجد کیل کانٹے سے لیس اس دروازے سے بھی اندر آگیا ہے۔ اب یہ دیکھنا کہ اس کی تحریری کاٹ کتنے سرِ قلم کرتی ہے۔ سبحان اللہ! "بہ سلامت روی" پر میرزا ادیب کا تبصرہ شکر میں لپٹی کڑوی گولی محسوس ہوا۔ یقین جانیے یہ کڑوی گولی حفظِ صحت کے اقدامات میں سے ہے۔ ہوا کچھ ایسی چلی ہے کہ سفرناموں کے لئے جنس کا چٹخارہ شرط ٹھہر رہا ہے۔ کرنل محمد خان اپنی تمام "معصومیت" کے باوجود اس جوہر کو عام کرتے ملتے ہیں۔

غزلیں بہت اچھی ہیں، الا پہلے حصے کی دو غزلیں۔ میری مانیں تو عرض کروں۔ جناب مدیر کو غزلوں میں شعروں کے انتخاب کا حق ملنا چاہیے۔ اس طرح مجھ سمیت بہتوں کا بھلا ہوگا۔ آپ جانیں حسنِ انتخاب کئی سروں پر دستارِ فضیلت رکھ دیتا ہے۔ اس کارِ خیر پر ناک بھوں چڑھانا انا پرستی کی بہتر تمثیل کا منظر پیش نہیں کرتا۔

احمد ندیم قاسمی کے مصرعے کے لفظ "چاہتا" میں الف کے سقوط پر اعتراض وارد ہوا ہے۔ گذارش یہ ہے کہ ہندی الفاظ کے آخر میں "حروفِ علت" کا گرنا قابلِ گرفت کسی رنگ میں نہیں۔ آپ نے غور کیا ہوگا کہ عام بول چال میں بھی ہندی الفاظ کے آخر میں یہ صورت حال پیدا ہو جاتی ہے یہاں "چاہتا" کا الف دوسرے رکن کے پہلے حرف کی حرکت بن رہا ہے۔ اس میں "نصف و تیغ" کی اٹھان موجود ہے۔ میرے نزدیک بعض مقامات پر ہندی الفاظ کے آخر پر یہ "اٹھان" (یا حرکت - ی - ا) کانوں کو بھلی لگتی ہے۔ کیا فرماتے ہیں جناب جابر علی سید دربارۂ سقوط این جہت۔

جابر علی سید نے میری اختلافاتی غزل کو قابلِ توجہ سمجھا۔ شکریہ ان کا۔ اپنے خط میں غزل کے "اندراج" کے بعد میں نے اپنی بدخطی سے ڈر کر یہ جملہ لکھا تھا:

"ارکان کی سلامتی کی خاطر، مصرعوں کے حروف کی کتابت میں احتیاط ہو تو بحر کے بھی مقامات واضح ملیں گے"۔ اس پر غور ہوتا تو "رسیدگی" کی نوبت "بر این جا" نہ درپیش ہوتی۔ یہ مسئلہ کتابت سے پیدا ہوا ہے۔ مطلع کے پہلے مصرعے کی فضا ایسی ہے کہ دوسرے مصرعے میں لفظ "جو" کا محل نکلتا ہے۔ "جو" مارے کتابت کے رہ گیا۔ "جو" کے بغیر شعر درِ لخت ہو جائے۔ وہ مصرع یوں ہے۔

بھائی کو جو بھائی نے ہی قتل کیا ہے

تقطیع — مف تع لُن - فاعلات - مف تع لُن - فع

بھا ء ک جو . بھا ء نے ہ - قت ل ک یا - ہے

دوسرے مصرعے میں خوں نہیں خون ہے اعلان نون کے ساتھ۔ یوں سے "ع" یا یوں کی یک حرفی صورت اساتذہ کے کلام میں موجود ہے۔ مصرع اس طرح ہے: دردم رہے خون میں یوں ہانپ رہا ہے۔

مف تع لُن - فاعلات - مف تع لُن - فع

در دم رہے - خون مے ی - ہانپ رہا - ہے

یہ بحر مشکل سہی، مگر فراغِ خاطر اور اجتماعِ حواس سے، جو شرطِ شاعری ہے، اسے برتنا اتنا کٹھن نہیں —— آخر میں ایک سرگوشی!! —— اس مقام پر فاعلات سے فاعلن کو وارد کرنا بھی سہل الحصول نہیں بشرطیکہ ساری بحر "دوپہلو" التزام سے ہو۔ ذکر تھا کتابت کا۔ جابر علی سید کے مکتوب میں بھی کلیم الدین احمد —— کلیم اللہ احمد بن گئے۔ اگر ہم نے تو انگشتِ گرفت نہیں رکھی۔

"آگ کا دریا" کے بارے میں مضمون پڑھا۔ بظاہر چوٹ لگی۔ دیکھئے کیسے کیسے انداز سے ذاتی رنجشیں اور کدورتیں "اجتماعیت" کے لباس میں پیش کی جا رہی ہیں —— خدا حافظ۔

آصف ثاقب (ایبٹ آباد)

"فنون" کا سالنامہ ملا۔ اس دور میں اتنا خوبصورت اور جاذبِ نظر نمبر چھاپنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ بے شمار غزلیں، بے شمار نظمیں، ایک درجن سے زیادہ افسانے اور پھر طنز و مزاح، سفرنامہ، مقالات اور اختلافیے ——— سب کچھ مل کر ایک ادبی دستاویز بن جاتے ہیں جو ایک قابلِ ستائش کارنامہ ہے۔ ابھی تک میں نے اس کو جستہ جستہ دیکھا ہے۔ کہیں پر تو لاوے کی گرمی میں ہاتھ جلتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں اور اس حمام میں سب ننگے ہیں کا استعمال بھی تشکیک بن کر ابھرا ہے اور کہیں قطبِ شمالی کے منجمد ماحول سرد ہواؤں اور ایک جیسے موسم میں کھو جانے والی زندگی کے پس منظر میں برف کی چٹانوں میں یخ بستہ ویل کی دم ہی نظر آتی ہے۔ باقی جسم سمندر میں مستور رہا ہے۔ کچھ ایسا ہی معاملہ قرۃ العین حیدر کی آگ کا دریا پر ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کے انتقادی اور انتقامی مقالے کا ہے۔ ڈاکٹر احسن فاروقی بلاشبہ ایک ناول نگار اور نقاد ہیں لیکن وہ "آگ کا دریا" کی مقبولیت کے وائرس کا شکار معلوم ہوتے ہیں۔ انہوں نے بار بار ورجینا وولف کے دامن میں چھپ کر رشک و حسد کی آگ کو دبانے کی کوشش کی لیکن پھر بھی ان کا دامن جلنے لگا۔ قرۃ العین حیدر اس دور کی ایک عظیم ناول نگار ہیں۔ ان کے ناول کا کینوس کئی صدیوں پر چھایا ہوا ہے۔ ان کے فارم میں جو علمیت عظمت اور MUSICAL NOTATIONS ہیں وہ ان کے علاوہ کسی اور کا مقدر نہیں۔ ان کے سیاسی تجزیہ سے اتفاق بھی کیا جا سکتا ہے اور اختلاف بھی۔ لیکن ان کے تخلیقی رجحان اور کردار نگاری کی تعریف نہ کرنا اپنی کم مائیگی کے خول میں بند ہو جانے کے مترادف ہے۔

حصہ غزل میں مرتضیٰ برلاس چھایا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کے پیچھے ہیں کرب ناکی اور وطن دوستی کی روایت ہیں احتساب نفس کے عمل میں رہنمائی کا جو منفرد احساس نظر آتا ہے۔ وہ صد درجہ حسین و جمیل ہے۔ آپ کی غزل (دی تو کیا بھی تو کیا) کے تمام اشعار پسند آئے۔

خیال مینائی (میانہ گوندل گجرات)

"آگ کا دریا" اور ڈاکٹر فاروقی

"فنون" کے سالنامے میں جناب محمد احسن فاروقی کا "آگ کا دریا" پر تبصرہ شائع ہوا ہے۔ اس میں عالمانہ تجزیے کی بجائے "چلتے چلتے" رائے قائم کر دینے کا انداز ہے کیونکہ فاروقی صاحب کی ناول سے دلچسپی اور اس موضوع پر ان کے مقام کی وجہ سے ان کے قارئین کی توقعات پوری نہیں ہوئی ہوں گی اس سے نئے قاری کی معلومات میں کوئی اضافہ ہو تو علیحدہ بات ہے مگر ناول سے خصوصی دلچسپی رکھنے والوں کو کوئی نئی بات نہیں ملے گی۔ تبصرے کا زیادہ حصہ قرۃ العین حیدر سے اپنی ملاقاتوں، لوگوں کی ان کے بارے میں رائے یا ان کے عورت ہونے پر استہزاء پر مشتمل ہے۔ انہوں نے "آگ کا دریا" کے کرداروں، موضوع اور فارم کا تجزیہ کیا ہے جب کہ ناول بنیادی طور پر سماجی تاریخ کا عکس ہے جس میں کردار معاشرے کے فرسودہ اور ظالمانہ رسم و رواج اور متعین ضابطوں کے خلاف جدوجہد کرتے ہیں۔ فنکار کا کینوس اس جدوجہد سے پیدا ہونے والی خوشیوں، امیدوں، حسرتوں، دکھوں اور دوسرے جذبوں کا احاطہ کرتا ہے۔ اس لئے ناول کا تجزیہ کرنے سے پہلے فنکار کے معاشرے کے بارے میں رویے کا تجزیہ کرنا چاہئے۔ فاروقی صاحب نے قرۃ العین کے نظریات کو اہمیت تو دی ہے مگر انہوں نے بنیاد ان کے "اینٹی پاکستانی" ہونے کو بنایا ہے۔ اگر قرۃ العین حیدر کو اینٹی پاکستان کہا جا سکتا ہے تو اس وجہ سے کہ وہ ہندوستان کی تقسیم سے خوش نہیں ہیں۔ ورنہ انہوں نے قیام پاکستان کے بعد کی معاشرتی توڑ پھوڑ، افراتفری اور ذہنی بحران و انتشار کو پوری سچائی سے پیش کیا ہے۔ جس پر انھیں پاکستان کا مخالف نہیں سمجھا جائے گا۔ تعلیم کے لئے بھاگ دوڑ، نو دولتیے طبقے کا نمو، سیاستدانوں، بیوروکریسی وغیرہ کی امریکہ نوازی، انٹی قدروں کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کا مسئلہ اور قومی تشخص کے بحران کو انہوں نے "آگ کا دریا" میں بھی لیکن اپنی "ہاؤسنگ سوسائٹی" میں زیادہ CONCENTRATION سے پیش کیا ہے۔ اگرچہ فاروقی صاحب پاکستان کو ہندوستان سے بڑا زنداں سمجھتے تھے لیکن انہوں نے قرۃ العین حیدر کو اس لئے تنقید کا نشانہ بنایا ہے کہ ان کے کردار اس ماحول سے فرار کیوں چاہتے ہیں؟ قرۃ العین کے کردار پاکستان سے نکل بھاگنا چاہتے ہیں تو وہ ایسا آئیڈیل اور حقیقت کے درمیان تضاد کی وجہ سے کرتے ہیں۔ وہ لوٹنا چاہتے ہیں کیونکہ وہ نظریے اور زمین سے وفاداری کے بحران میں مبتلا ہیں۔ قرۃ العین حیدر نے اپنے حال کو پیش کیا تھا مگر وہ اس حقیقت کو سمجھتی تھیں جس کا اظہار ان کا کردار کمال کرتا ہے

کہ ان فاصلوں اور بحرانوں کا مسئلہ آئندہ نسل کے لئے نہیں ہوگا۔ ہر فنکار کا سیاسی و معاشی نظریات سے پہلے انسان اور زندگی کے بارے میں ایک نظریہ اور رویہ ہوتا ہے مگر فاروقی صاحب نے قرۃ العین حیدر کے انسان اور زندگی کے بارے میں رویے کو اہمیت ہی نہیں دی حالانکہ وہ اپنے اس انسان اور زندگی کے نظریے کی روشنی میں ہی تاریخی اور سماجی مسائل کا تجزیہ کرتی ہیں۔

قرۃ العین کے نظریات و فن سے اختلاف ممکن ہے مگر ادب میں ان کی حیثیت اور ان کے مقام سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ جیسا کہ فاروقی صاحب بھی تبصرے میں کہتے ہیں "ناول کے سلسلے میں جو مستقل قدم اٹھائے گئے ہیں ان میں "آگ کا دریا" کی اہمیت مسلّم ہے" —— اور "یہ خام خیالی اور اس کے نتیجے میں خام فن کا مظاہرہ سہی مگر اس میں شک نہیں کہ یہ ایک نئی راہ ضرور کھولتی ہے جس پر آگے لوگ زیادہ صحت، زیادہ مستعدی اور زیادہ فنکارانہ زور کے ساتھ چل سکیں گے" مگر وہ اسی تبصرے میں کہتے ہیں "ادب کا عظیم کارنامہ کیا اسے ادب بھی کہنے کو جی نہیں چاہتا۔" اس فکری تضاد پر کیا کہا جا سکتا ہے سوائے اس کے کہ کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی۔ بہر حال "آگ کا دریا" کی اہمیت کو استہزا اور انا پرستی میں اڑا دینا اچھی بات نہیں۔

اگر فاروقی صاحب تاریخ کے موجودہ دور میں بھی عوام کے نظریے کے مخالف ہیں اور نطشے کے سپرمین (SUPERMAN) کے تصور پر یقین رکھتے ہیں تو انہیں اس کا حق حاصل ہے۔ اگر وہ ترقی پسند تحریک کے مخالف ہیں تو بھی بجا ہے لیکن مخالفت میں حقائق کو نظر انداز کر دینا ضرور قابلِ اعتراض ہے۔ فاروقی صاحب ہندوستانی ادب اور پاکستانی ادب کی تقسیم کا ذکر تو کرتے ہیں لیکن نجانے وہ کیوں اس وقت تخصیص روا نہیں رکھتے جب وہ ترقی پسندوں کو پاکستان کی مخالفت کا "مجرم" ٹھہرانے لگتے ہیں۔ نہ ہی وہ ان ترقی پسندوں کا ذکر کرتے ہیں جنہوں نے قرۃ العین حیدر کو ترقی پسند ادیب قرار دیا ہے۔ فاروقی صاحب کے نزدیک ترقی پسند ادیب کی صفت افسردگی اور ڈھلاہٹ ہے۔ حالانکہ جو ادب افسردگی، ڈھلاہٹ یا منفی نظریات کا اظہار کرے وہ ترقی پسند ادب نہیں ہو سکتا۔ ترقی پسند ادب کی اساس تو انسان اور زندگی سے محبت، عوام کی تخلیقی قوتوں اور زندگی کی ارتقا پذیری پر یقین ہے جبکہ فاروقی صاحب بدلتی ہوئی قدروں پر عقیدہ سے وجود میں آئے ادب کو آفاقی نہیں سمجھتے کیونکہ بقول ان کے "یہ شاہکار بدلتی ہوئی قدروں ہی پر عقیدہ سے وجود میں آئے ہیں اور وقت کے ساتھ ان کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے"۔ حالانکہ ٹالسٹائی کی "جنگ اور امن" (WAR & PEACE) "گورکی کی ماں" اور "شولوخوف کی" "اور ڈان بہتا رہا" بدلتے ہوئے حالات کی عکاسی اور بدلی ہوئی قدروں پر یقین رکھتی ہیں مگر ان کی عظمت اور قبولیت آج بھی ویسی ہے جس سے فاروقی صاحب بھی انکار نہیں کریں گے۔

فاروقی صاحب نے اپنے تبصرے میں فرمایا ہے "اور وہ تمام امور سے جنہوں نے ۱۹۲۹ء سے ہندو مسلمانوں کے درمیان کشمکش کو ابھارا اور یہاں تک بڑھایا کہ الگ الگ ہو جانے کے علاوہ انہیں کچھ دکھائی نہ دیا۔" دسمبر ۲۸ء کے آخری ہفتے میں ایک اجلاس میں نہرو رپورٹ پیش ہوئی جس میں جوہر اور جناح نے ترامیم پیش کیں لیکن ان کے خلاف غنڈے کے نعرے گے اور ان کی تجاویز کے بارے میں مخاصمانہ رویہ روا رکھا گیا۔ ۱۹۲۹ء میں قائدِ اعظمؒ نے چودہ نکات پیش کئے۔ کیا فاروقی صاحب پاکستان کو ذاتی مخاصمت کا نتیجہ بتانا چاہتے ہیں؟ کیا فرماتے ہیں "نظریۂ پاکستان کے محافظین" بیچ اس مسئلے کے جن کے بقول پاکستان اسی دن قائم ہو گیا تھا جب ہندوستان میں پہلا شخص مسلمان ہوا تھا۔ جبکہ فاروقی صاحب قیامِ پاکستان کی وجہ ۲۹ء کے امور کو بتاتے ہیں۔

خورشید جاوید (واہ کینٹ)

سالنامے کا ایک افسانہ

ویرا انبر کی کہانی "تونیا کی موت" (ترجمہ مختار احمد) اپنی اصل و اساس میں تو روسی سماج کی ایک کہانی ہے لیکن بالواسطہ طور پر ہر سماج کی، کیونکہ ہم عصر معاشروں کے مسائل، مقامی اور تاریخی اختلافات کے باوجود تقریباً مشترک ہوتے ہیں۔ کہانی کے پس منظر میں کچھ بھدی اور کریہہ المنظر حقیقتیں

ہیں جو سیاسی اور سماجی زندگی کے عدم توازن اور زوال آمادگی کی نشاندہی کرتی ہیں۔ کچھ میلے کچیلے اسالیب عمل اور بوڑھے بانجھ رویئے ہیں جن کا ناتہ ملک کے تعلیمی نظام سے ہے۔ اس تعلیمی نظام میں یہ گنجائش اور امکان موجود نہیں کہ وہ نئی زیر تعلیم نسلوں کی نفسیاتی ساخت اور ان کے ازلی میلانات کی سمت و سمجھ کر تعلیم و تدریس کے مروجہ کرم خوردہ پیرایوں کو بدل لے اور انہیں نئے ذہنوں سے ہم آہنگ کرلے۔

کہانی میں طبیعیات کا کہن سال استاد فوما (جو دنیا کی سٹیج سے رخصت ہوتی ہوئی نسل کا نمائندہ ہے) تعلیم و تدریس کی پرانی روایات کی ایک تجسیم ہے۔ وہ سائنسی معروضیت اور ریاضیاتی غیر جانبداری کے رویوں کی مثال ہے اور شخصی حرارت اور ہمدردی سے عاری! اس کے اندر اپنے طلبہ کے ساتھ اندرونی طور پر ہم آہنگ، ہم رنگ اور پوری طرح مماثل و منطبق ہو جانے کا وہ رویہ کہیں نہیں جسے نفسیات و جمالیات میں (EMPATHY) کہا گیا ہے اور جو کسی معلم کے تدریسی عمل کو نتیجہ خیز اور بامعنی بنا دیتا ہے بلکہ اس کے ہاں تو صحیح معنوں میں اپنے طلبہ کے ساتھ وہ فعال ہمدردی (ACTIVE SYMPATHY) بھی نہیں جس کا تصور میکڈوگل نے دیا تھا۔ اس کا باطن پتھریلا اور ساکن ہے۔ روس ہی کا ایک عظیم معلم اور انیسویں صدی کا عظیم ناول نگار لیوٹالسٹائی اپنے طلبہ کو کلاس روم کے غیر مؤثر اور انفعالی تدریسی عمل سے بچانے کے لئے ہرے بھرے جنگل میں لے جاتا ہے تاکہ انہیں ان کے ذاتی مشاہدے اور تجربے سے حسن اور افادے کی قدروں کا تصور دلا سکے (ٹالسٹائی کی کتاب 'فن کیا ہے' کا پہلا باب ملاحظہ ہو) طلبہ کے میلانات اور ان کی خواہشات کی یہ پاسداری استاد فوما کے ہاں قطعاً ناپید ہے۔ یہاں تو جماعت میں کتاب "طوفان باد و باراں کی طرح کھلتی ہے" اور استاد فوما یاد نہ کرنے والی بچیوں کو مارتا ہے۔ تعلیم نئی نسلوں کے لئے ایک ناخوشگوار اور تلخ تجربہ بن جاتی ہے۔

فوما سکول کی عمر کی بچیوں کو بے ہوا خلا کا تصور دلانے کے لئے ایک ننھی منی چڑیا کو شیشی کے نیچے رکھتا ہے اور شیشی کے اندر کی ہوا کو آلے کے ذریعے خارج کر دیتا ہے۔ معصوم پرندہ پھڑپھڑا کر مر جاتا ہے۔ یہ المناک سانحہ بچیوں کے ذہن کی اثر پذیر اور حساس سطح پر دکھ اور کرب کی ایک گہری لکیر کندہ کر دیتا ہے۔ چڑیا کی اچانک موت پر جب ایک بچی روزالیہ جو چڑیا ہی کی طرح معصوم ہے، فرطِ جذبات سے رونے لگتی ہے تو استاد شور مچانے کے جرم میں اس کا سخت مواخذہ کرتا ہے اور فیصلہ کن انداز میں بتاتا ہے ——

"اس پرندے کا ختم ہو جانا ناگزیر تھا، سائنس نزاکت طبع سے متنفر ہے۔ یا تم کانپے بغیر اپنا ہاتھ حصول علم کی آگ میں جھونکو یا پھر گھر پر بیٹھو اور مرتبہ اچار ڈالو۔ سائنس کی ترازو ایک بار بھی نہیں جھکتی۔"

فوما کے لئے انسانی دل ایک ایسا خلیہ ہے جو صرف سائنسی تجربوں کے لئے بنا ہے اور انسانی زندگی تجربہ گاہ کے امریکی چوہے (GUINEA PIG) سے پرے کوئی مفہوم نہیں رکھتی۔ فوما کو تسخیر خلا کا خبط ہے۔ وہ بچوں کو رصدگاہ میں اپنی محبوبہ لونا (چاند) بھی دکھاتا ہے۔ جہاں سکوت اور موت کے ابدی سائے منڈلاتے ہیں۔ بچے قبر کے خوف میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ہمارا سائنسدان نہایت بے پروائی اور بے احتیاطی سے یہ بات بتا کر بچیوں کے خوف میں اور اضافہ کر دیتا ہے کہ ——

"ایک روز ان گنت صدیوں کے بعد مستقبل بعید میں ہماری زمین بالکل چاند کی طرح مر جائے گی۔ پھر ہماری زمین پر بھی تاریک سائے گم شدہ تہذیبوں کی طرح پھیل جائیں گے اور ہم سب —— جو اس وقت زندہ ہوں گے اور جو مر چکے ہوں گے —— ایک مردہ سیارے پر مٹی اور مسام دار راکھ میں تبدیل ہو جائیں گے۔"

فوما کی اس اطلاع پر بچے اپنی مختصر سی زندگی میں پہلی بار موت کے بارے میں سوچتے ہیں اور داخلی طور پر لہولہان ہو جاتے ہیں۔ وہ کرۂ ارض پر انسانی زندگی کے مستقبل کے بارے میں تشکیک اور بے یقینی کا شکار ہو جاتے ہیں اور ایک دوسرے سے سوال کرتے ہیں کہ آئندہ دس برسوں میں حالات کیسے ہوں گے۔ اس پر نیلی آنکھوں والی ایک بچی تانزی جواب دیتی ہے ——

"میں آئندہ دس برسوں میں اٹلی میں ہوں گی، وہ میرا آبائی وطن ہے، میں روم میں رہوں گی جو ابدی شہر ہے، چاروں طرف آثار قدیمہ ہوں گے اور میں بہت خوش ہوں گی۔"

یہ جملے اپنی علامتی حیثیت کی وجہ سے بے حد معنی خیز ہیں۔ آبائی وطن اور روم کے ابدی شہر سے مراد وہ قبل پیدائشی گھر (PRE-NATAL EXISTANCE) ہے جہاں کرۂ ارض کی بے گھر نسلیں اپنے مستقبل سے مایوس ہو کر واپس پلٹ جانا چاہتی ہیں۔ یہ جملے بچیوں کے ہاں نوسٹلجک ہیج کا پتہ دیتے ہیں۔ نئی نسلوں کے ہاں مراجعت اور فرار کے ان منفی رویوں کی ساری ذمہ داری تدریسی اقدار کے اس کھوکھلے نظام اور اس معاشرے پر ہے جسے نہ یہ خبر ہے کہ وہ کس عمر کے بچوں کے لئے نصابِ تعلیم کے کیا اجزا تجویز کرے اور نہ یہ شعور کہ ان کے خام اور نرم ذہنوں کے نفسیاتی مطالبوں سے رعایت برتتے ہوئے طریقۂ تعلیم کونسا اپنائے۔

افسانہ دو متضاد ذہنی رویوں کے درمیان عدم مطابقت کا ایک خوبصورت مطالعہ ہے۔ عدم مطابقت کے عمل کا تجزیہ ایک خاص عہد کے سیاسی اور سماجی پس منظر میں کیا گیا ہے جس کی وجہ سے یہ افسانہ سیاسی اور سماجی ماحول کی جبریت پر نقد و احتساب کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ افسانے کے عقب سے سیاسی تشدد بھی جھانکتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

افسانے کا ترجمہ مختار احمد نے کیا ہے جو عمدہ ہے۔ SUPER-NATURALISM اور ABSENT-MINDEDNESS کا ترجمہ اگر مافوقیت اور غائب دماغی ہوتا تو زیادہ اچھا تھا۔ انہوں نے علی الترتیب مافوق الفطری پن اور غیر حاضر دماغی کیا ہے۔ یوں تو اس دور میں ہر ترجمہ ہی موزوں ہے۔ کون پوچھے گا تاہم مجھے متعدد ارکان پر مشتمل یہ دونوں الفاظ بہت طویل اور انسانی کنٹرول سے باہر نکلتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔

تابش وجدان (ملتان)

مرتضیٰ برلاس کی غزل

فنون کے تازہ شمارے میں غلام محمد قاصر کا مضمون "عہد کا روپ غزل کا درپن" نظر سے گزرا۔ مضمون اگرچہ بڑے خلوص سے لکھا گیا ہے لیکن اس کا دائرہ صاحبِ مضمون نے تنگ کر دیا ہے کہ غزل اور بالخصوص جدید غزل کے بارے میں وہ کھل کر بات نہیں کر سکے۔ اس لئے میں یہ چند سطریں لکھنے پر مجبور ہوا ہوں۔ مضمون دو اعتبار سے قابلِ توجہ ہے۔ ایک تو اس میں غزل کی ثقافتی اور تہذیبی اہمیت کو تسلیم کیا گیا ہے۔ دوسرے صاحبِ مضمون نے مرتضیٰ برلاس کی شاعری کو موضوعِ بحث بنایا ہے۔

ہمارے یہاں ہمعصر شاعروں پر لکھنے کا رواج کم ہے اور پھر ایسے شعرا جن کا مجموعۂ کلام شائع نہ ہوا ہو ویسے بھی عموماً نظر انداز کئے جاتے ہیں۔ اس پس منظر میں مضمون کے لئے مرتضیٰ برلاس کی شاعری کا انتخاب انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ مرتضیٰ برلاس یقیناً ان جدید شعرا میں سے ہیں جنہوں نے غزل گو شعرا میں جلد ہی بہت بلند مقام حاصل کر لیا ہے۔

غلام محمد قاصر نے مرتضیٰ برلاس کے کلام میں شعورِ عصر کی جو نشاندہی کی ہے وہ بجا ہے لیکن مرتضیٰ برلاس کی شاعری کو چند سماجی سانحوں تک محدود کر دینا درست نہیں۔ یہ شاعری عصری تقاضے پورے کرتی ہے لیکن یہاں عصر سے مراد صرف سامنے کا زمانہ نہیں بلکہ وہ پورا زمانی تسلسل ہے جس میں ہماری کئی نسلوں کی تہذیبی تاریخ چھپی ہوئی ہے۔ مرتضیٰ برلاس کی شاعری میں یہ تاریخی شعور جگہ جگہ جھلکتا ہے اور اسی تاریخی شعور کی بنیاد پر وہ حال کے لمحے کو سمجھنے کی کوشش بھی کرتا ہے اور آنے والے زمانے کی مدھم چاپ بھی سنتا ہے:

کل کی نسلیں نہ ہم پہ تاسف کریں — بے حسی پر نہ اس دور کی تف کریں
اس لئے ہم تو اوراقِ تاریخ میں — ورثۂ رشکِ غم چھوڑ کر جائیں گے

یہی رشکِ غم کا ورثہ اور کرب کا رشتہ مرتضیٰ برلاس کی شاعری میں ماضی، حال اور مستقبل کی ہم آہنگ ساعتوں کو ایک ابدی معنویت کے ساتھ نکھار کر سامنے لے آتا ہے۔ یہی صورتحال جیسے احساس کے حوالے سے مرتضیٰ برلاس کے قومی شعور کو آفاق گیر ادراک کا رنگ دیتی ہوئی نظر آتی ہے۔

مرتضیٰ نے جس ہنرمند فنکارانہ طاقت کے ساتھ قومی تقاضوں کو اپنی غزل میں جگہ دی ہے، صاحبِ مضمون نے اسے تسلیم کیا ہے۔ البتہ وہ اس

بات کو فراموش کر بیٹھے ہیں کہ مرتضیٰ برلاس کے یہاں خاص ترقی پسند شعور اس طرح بھی منعکس ہوتا ہے کہ وہ کائنات کے دکھ کو اپنا دکھ بنا لیتا ہے یا اپنے دکھ کو کائنات کے دکھ کے درجے پر پہنچا دیتا ہے۔ دکھ جب انسان کے محسوسات میں گم ہو کر پوری ذات کے ساتھ شفقت ہوتا ہے تو پھر اسے یہ کہنا ہی پڑتا ہے:

آنکھیں ہیں سرخ، ہونٹ سیہ، رنگ زرد ہے
ہر شخص جیسے میرے قبیلے کا فرد ہے

کرب کی اک مشترک تحریر ہر چہرے پہ تھی
اجنبی لوگوں سے پل بھر میں شناسائی ہوئی

یہ پیغام کسی طرح ترقی پسند تقاضوں سے متصادم نہیں بلکہ اس ہمہ گیر انسانی آشوب کو مخلصانہ طور پر سمجھنے کی کامیاب کوشش ہے جس سے عہدہ برآ ہوئے بغیر کوئی فنکار آج کی دنیا کا فنکار نہیں ہو سکتا۔

یوں محسوس ہوتا ہے کہ غلام محمد ناصر صاحب کے سامنے مرتضیٰ برلاس کی چند ہی غزلیں تھیں اور انہی کی بنیاد پر انہوں نے کچھ فیصلے صادر فرما دیے ہیں۔ اگر وہ مرتضیٰ برلاس کی پوری شاعری کا مطالعہ کرتے تو ان کی غزل کے مجموعی پیکر کو سمجھ سکتے تھے۔ مرتضیٰ برلاس کی غزلوں میں ایک طرف یگانہ، ندیم اور شکیب کے لہجے کی مہک رچی ہوئی ہے تو دوسری طرف وہ غزل کے کلاسیکی رچاؤ کا بھی امین نظر آتا ہے۔ اس امتزاج نے اس کی شاعری کو ایک منفرد اسلوب بخش دیا ہے جس پر اس کی پرشکوہ اور دلآویز شخصیت کی مہر ثبت ہے۔ اس کی آواز میں دھمک بھی ہے گونج بھی اور نغمگی بھی۔ اس کے ہاں لفظ، سچ اور حسن کی ایک علامت گویائی کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔

میں نے ناصر صاحب کے مضمون کے بارے میں یہ سطور کسی خاص جذبے کے تحت نہیں بلکہ محض اس لئے لکھی ہیں کہ معاصر شعراء کے بارے میں لکھنے کی روایت کم ہے۔ ایذرا پاؤنڈ نے کہا ہے کہ میرے ہمعصر وہ بادل ہیں جو اڑ جاتے ہیں۔ کسی ہمعصر سوچنے والے کی طرف سے یہ تحریر پہلے اتفاقی چھینٹے کی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن مجھے خدشہ یہ ہے کہ شاعر کے کلام کو اس پر لکھے گئے ابتدائی تنقیدی مضامین ہی میں بعض مخصوص اصطلاحوں اور رویوں میں محدود کر دیا جائے تو اس کی شاعری کا مجموعی تاثر گم ہو جاتا ہے اور لوگ بہت دیر تک انہی باتوں کی تکرار کرتے رہتے ہیں۔ مرتضیٰ برلاس کی شاعری یقیناً اس بات کی مستحق ہے کہ اس کی مجموعی قدر و قیمت کو سمجھا جائے۔ اس سلسلے میں ایک تفصیلی مضمون لکھنے کا ارادہ رکھتا ہوں مگر اس سے پہلے یار لوگوں سے کچھ اور باتیں سننے کا منتظر ہوں۔

م۔ا۔ن (میانوالی)

غلام محمد ناصر کا مضمون "تیغ کا روپ غزل کا درپن" ایک جاذب نظر تحریر ہے۔ اس روپ کے ہر خال کی مناسبت کو کیفیت نے جس جس رنگ میں چاندنی بکھیری ہے میرا ذہن اس کے مزے لوٹ رہا ہے اور اس درپن میں صداقتوں کے جتنے عکس نقاب کشا ہوئے ہیں ان سے میری جلوہ جو آنکھیں بصیرت کا مزاج درست کر رہی ہیں۔ مجھے حیرت ہے کہ آپ کے موقر جریدے میں برلاس کا بھی تنقیدی ذکر خیر آیا ورنہ عموماً لوگ بلند قامتوں کے ہوتے اوروں کو نظر انداز کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ مرتضیٰ برلاس نہایت سادہ مزاج، وسیع القلب اور درویش منش انسان ہیں اور شاید ان چند فنکاروں میں سے ایک جن کی افسری ان کے فن پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ میں نے غلام محمد ناصر کے مضمون کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ پورے مضمون میں کوئی بات ایسی نہیں جس کی تعریف نہ کی جا سکے۔ لیکن جو سب سے زیادہ قابل تعریف پہلو مجھے مرتضیٰ برلاس کی شاعری میں نظر آیا اس کا حوالہ ناصر صاحب کے مضمون میں درج نہیں۔ ناصر صاحب نے برلاس صاحب کو ملک و ملت کا مرثیہ خواں تو قرار دے دیا ہے لیکن ان کی فقید المثال حب الوطنی کا اعتراف نہیں کیا حالانکہ وہ اس رخ سے جانے پہچانے ہیں اور عملی زندگی میں بھی یہی جذبۂ حب الوطنی ان کی شخصیت پر شاعری کی طرح محیط ہے۔ برلاس صاحب اسی پاکستان اور پاکستانیت کے نقیب ہیں جو آپ کے فکر و فن کے ذریعہ متعارف ہے جس پاکستانیت اور جس یکجہتی کا نعرہ آپ نے بلند کیا ہے برلاس بھی حقیقتاً اسی کے علمبردار ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ کی روایت بڑے توانا ذریعے سے آگے بڑھ رہی ہے۔ مرتضیٰ برلاس کی شاعری کے متعدد پہلو ہیں لیکن ان میں سے سب سے

نمایاں پہلو ان کا جذبہ حب الوطنی ہے۔ وہ کرب جو ان کی پوری شاعری میں ہمیں جھلکتا نظر آتا ہے، اسی جذبۂ تقدس کا مرہون منت ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس پہلو سے بھی ان کی شاعری کا بالتفصیل جائزہ لیا جائے۔ آپ نے صوبائی عصبیت، علاقائی تنافر، لسانی منافرت و ادبی و شعری منافقت کے خلاف جو صفیں آراستہ کی ہیں، ان میں مرتضےٰ برلاس بھی اپنے شعری قامت سے نمایاں نظر آتے ہیں۔

سید انجم جعفری (میانوالی)

کلاسیکی موسیقی

برصغیر کی کلاسیکل موسیقی کے عمیق اثرات کی اصل یہ نہیں کہ اس نے محض قواعد و ضوابط کی ایک دشوار گزار راہ نکالی اور اس پر مختلف گھرانے قابض رہے اور نہ ہی دنیا میں کوئی فن اپنی جزیں اصولوں کی بندشوں یا مقررہ منہاجوں تک محدود رکھ کر زمانوں پر اپنا ثبات قائم رکھ سکتا ہے بلکہ ہر عظیم فن کی آفاقیت اس کے وسیع منابع اور اعلیٰ اقدار سے متصف ہوتی ہے جو عصر کے مزاج سے اپنے بہاؤ کی تراش خراش کرتا ہے۔ ہر چند اس سے یہ مراد نہیں کہ فن کے سانچے سے انحراف ہی فنون لطیفہ کی نئی منزلوں کی خاص ہے۔ یقیناً ہر فن اپنے اصولوں کی بو باس کی سخت مند مقاومت سے ہی نکھار یا منفرد زاویوں کی بالیدگی کی شکل اپناتا ہے۔

برصغیر میں کلاسیکی موسیقی کے ابتذال کی وجوہ بھی یہی ہیں کہ مختلف دبستانوں اور گھرانوں نے اپنے ڈھب اور فن کے روپ کو خواص تک محدود رکھا۔ سو یہ ہزار جہات صوت کی صورت خود اس کے زعماء کے ہاتھوں مسخ ہو کر رہ گئی۔ یہی باعث ہے کہ محترم رشید ملک صاحب جیسے جید عالم موسیقی کو ہماری نئی نسل کلاسیک موسیقی کی روح سے بیگانہ اور اس کی صادق انفسیت سے بے بضاعت معلوم ہونے لگی ہے۔ البتہ ان کا یہ ارشاد کہ مجھے ناموں سے شناسائی نہیں تو عرض ہے کہ واقعی میں ناموں میں تیقن سے نفور ہوں بلکہ فن کی طراوتوں اور ہر اولوں کے باطن پر یقین رکھتا ہوں۔ البتہ میرے کرم ملک صاحب نے پاکستان میں کافی گائن کی عہد ساز گائیکہ زاہدہ پروین اور ہند کی ہیرا بائی بڑودکر، رسولن بائی، بیگم اختر، گنگو بائی ہنگل، پنڈت جسراج اور حسن لعل سے لے کر مہندر سنگھ تک کو بھلا دیا جن سے جدید کلاسیکل موسیقی کی بلوغت کی حیات بچے۔

اپنی تسوید میں ملک صاحب نے سلامت علی خاں کو فن کی سرحدوں تک کو نہ چھونے کا اظہار فرمایا ہے اور ساتھ ہی میری تشفی کو ناممکن کہا ہے۔ نہیں ملک صاحب مجھے اطمینان ہے مگر اس بات پر کہ سلامت علی خاں نے فن کی سرحدوں کو نہیں اس کی آفاقی جہات کو چھوا ہے۔

سلامت علی خاں نے اگر کہیں قواعد کے ہیر میں لغزش کی ہے تو اس کو ہم اس کی مجموعی گائیکی کی رنگینی سے معنون نہیں کر سکتے۔ کلاسیکی موسیقی کی ابتری کا ایک پہلو یہ بھی رہا ہے کہ بحیثیت فن علیم اس کا تشخص عام نہ ہو پایا جبکہ کلاسیکی موسیقی تو اپنے تئیں ملکوتی حسن کے جمیع ملکات کا نام ہے مگر بیشتر کلاسیک گانے والوں نے اسے محض تان پلٹوں کے اتمام کو خلق فن جانا اور کبر کا شکار ہو گئے۔ نتیجہ یہ کہ اس اتحاد اور لسبیلہ وسعتوں کے تمام باب مختوم ہو گئے۔ بلکہ معاصر کلاسیکی موسیقی کو میں سلامت علی خاں اور بھیم سین جوشی کی بے داغ اور فرحت گائیکی کی نزاکت اور ملائمت سے متصف گردانتا ہوں کہ ان سے کلاسیکل گائیکی کے مستقبل کے حسن کی گواہی ممکن ہوئی ہے۔

علی تنہا (لاہور)

ایک غزل کی بحر

خالد احمد بڑی اچھی غزلیں کہتے ہیں۔ اس شمارے میں ان کی نعت، نظم اور غزلیں پسند آئیں۔ انہوں نے وزن و بحر کے کامیاب تجربے کئے ہیں۔ اس شمارے میں ان کی ایک غزل "کتنے تک گئے زمین ادھڑے" کی بحر میں ہے جس کے ارکان انہوں نے خود یوں متعین کئے ہیں:

فعلات فعول فعلن

یہ بحر پہلے سے موجود ہے۔ اس لئے نئے ارکان متعین کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ اس کے ارکان ہیں: فعلن فعلن فعلن فع۔ بکسرہ عین۔ جو

فاعلن فاعلن فاعلن فع کی مجنون صورت ہے۔ حوالے کے لئے دیکھئے "شاعری کی دوسری کتاب" از خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی **محمد امین** (ملتان)

نئے لکھنے والے

کچھ نئے لکھنے والے "فنون" کے تازہ شمارے میں نظر آئے اور آپ کے لئے دل ہی دل میں عقیدت کے پھول کھلنے لگے۔ آپ نے آج سے پہلے فہمیدہ ریاض اور اسی طرح کئی دوسرے لکھنے والوں کی تصدیق کی جسے آج تک کسی نے نہیں جھٹلایا۔ تازہ شمارے میں بھی چند نئے لکھنے والے سامنے آئے ہیں۔ جن میں ثروت حسین، راشدہ مفتی، پروین شاکر، جمال احسانی، الفت رسول شامل ہیں۔ ان میں سے پروین شاکر اور ثروت حسین زیادہ دیرپا نظر آتے ہیں۔ سوچتا ہوں ادب کا قاری آپ کے احسانات کیسے اتارے گا۔ اس دور پرآشوب میں اس معیار کا شمارہ نکالنا اور ان میں اچھے اچھے نئے لکھنے والوں کو جگہ دینا آپ ہی کا حصہ ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ لکھنے والے مستقبل قریب میں ملک گیر شہرت کے مالک ہوں گے۔ **گلشن مظفر** (حیدرآباد)

حرف اول اور بین السطور

"حرف اول" میں آپ نے جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے وہ حقیقت افروز بھی ہے اور تقاضائے وقت بھی۔ نئے لکھنے والوں کے سلسلے میں آپ کے جو احساسات و نظریات ہیں وہ قابل قدر ہیں۔ اگر آپ جیسے لوگ زیادہ تعداد میں پیدا ہوں تو پھر کسی کو بھی یہ نہیں کہنا پڑے گا:

شرمندہ کیا جوہر بالغ نظری نے   اس جنس کو بازار میں پوچھا بھی کسی نے

"فنون" ایک تحریک کی حیثیت رکھتا ہے جس سے صرف نئی نسل ہی نہیں بلکہ پرانی نسل بھی متاثر ہے۔ پرانی رگوں میں نیا خون دوڑانا، زندگی کی نامیاتی قدروں نیز احساس و فکر کی تہذیب و تربیت کرنا ایک بڑا ہی مشکل اور صبر آزما فریضہ ہے، اور میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس فرض سے "فنون" بحسن و خوبی عہدہ برآ ہوتا رہا ہے۔ منہ پر تعریف اچھی بات نہیں سمجھی جاتی مگر اعتراف حقیقت سے گریز بھی کوئی صحتمند رویہ نہیں۔ لہٰذا اس میں شک نہیں کہ "فنون" کی قدر اور ہی اس کی شخصیت کے تنوع، اس کی گہرائی و گیرائی میں ایڈیٹر کی ذات کو بڑا دخل ہے۔ آپ نے جس طرح اپنے خون جگر سے فن اور "فنون" کی آبیاری کی ہے جس طرح اسے صوری و معنوی حسن بخشا ہے وہ روز روشن کی طرح عیاں ہے۔

"کومیٹڈ ادیب اور کومیٹڈ ادب" ایک اہم موضوع ہے۔ اس پر خالد احمد کا اظہار خیال جو انہوں نے "بین السطور" کے تحت کیا ہے، ہمیں دعوت فکر دیتا ہے۔ ادب میں وابستگی کی مختلف تعبیریں اور تاویلیں پیش کی جا رہی ہیں۔ نیا ذہن اس سلسلے میں الجھ کر رہ گیا ہے۔ اس موضوع پر آپ کوئی تفصیلی اور جامع مضمون شائع کریں۔ ویسے میں ذاتی طور پر ادب میں وابستگی کا قائل ہوں۔ بغیر نظریہ اور نصب العین کے بڑا ادب پیش کرنا مشکل ہوتا ہے ویسے "آن کومیٹڈ" ہونا اور اس پر اصرار کرنا بھی ایک طرح کی وابستگی ہے۔ نظریہ نہ رکھنا بھی ایک نظریہ ہے۔ **شفیق احمد شفیق** (کراچی)

تین اہم نکات

ابھی پرچہ پورا پڑھا نہیں۔ کہیں کہیں سے دیکھا ہے۔ مندرجات اس بار بھی ہر بار کی طرح اپنے عمدہ تنوع، معیاری اور فکر و فن کے آئینہ دار ہیں۔ آپ کا اداریہ خصوصی طور پر اہم ہے اور دعوت فکر دیتا ہے۔ بلاشبہ آپ نے ایک بہت ہی اہم اور ضروری موضوع پر بروقت قلم اٹھایا ہے۔ پاکستان کے ہر ادیب شاعر اور دانشور کو اس مسئلے پر غور کرنا چاہئے۔ اردو زبان میں رسائل و کتب متعدد ممالک سے شائع ہوتے ہیں یوں سارا اردو ادب اردو ادب ہی کہلائے گا۔ لیکن اس میں پاکستانی ادب کی پہچان لازمی اور ضروری ہے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب پاکستانی فنکار ادب تخلیق کرتے وقت اپنے ملک اور قوم کی تہذیبی اور ثقافتی انفرادیت کو پیش نظر رکھے۔ مجھے یقین ہے کہ ایسا ضرور ہو گا۔ "فنون" تو پہلے ہی اس اہم فریضے کو بحسن و خوبی انجام دے رہا ہے۔

حسب معمول سب سے پہلے "استدراکات" پڑھے۔ رشید امجد صاحب نے جو بحث شروع کی تھی، اب وہ کافی اہمیت اختیار کر گئی ہے۔ ایک عام پاکستانی

ہر حیثیت سے میں بھی سقوطِ مشرقی پاکستان کے اصل اسباب جاننے کے لئے بے چین ہوں۔ لیکن اس مسئلے پر اب تک جو مضامین شائع ہوئے ہیں وہ دلچسپ تو ضرور ہیں لیکن ان سے کوئی نتیجہ نکلتا نظر نہیں آتا۔ بحث میں حصہ لینے والے صاحبان اب دانشوری کی بھول بھلیوں میں راستہ بھولتے نظر آرہے ہیں۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے اصل اسباب جاننے کے لئے اپنے گریبان میں جھانکنے کی جرأت کی ضرورت ہے جس کا بدقسمتی سے فقدان نظر آتا ہے۔ اس ضمن میں محترمہ نزہت نے چند کام کی باتیں کہی ہیں مگر آخر میں وہ بھی بھٹک گئیں۔ انہوں نے تمام پاکستان سے اب تک صرف یہ سنا ہے کہ پاکستان مسلمانوں کی ترقی کے لئے بنا ہے۔ میں ان کی خدمت میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ میں نے بھی آزادی کے بعد ہوش سنبھالا ہے اور بچپن سے اب تک یہ سنتا اور پڑھتا چلا آرہا ہوں کہ پاکستان اسلام اور مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت کے تحفظ اور ترقی کے لئے بنا ہے ——— خدا جانے ہم دونوں میں سے کس کی معلومات درست ہیں۔ پاکستان کی تاریخ ابھی زیادہ پرانی نہیں ہوئی لہٰذا بہتر ہے کہ "سنی سنائی" باتوں پر اعتبار نہ کیا جائے اور پرانے اخبارات کی پرانی فائلوں کا مطالعہ کریں۔ اس کے علاوہ تحریکِ پاکستان کے لیڈروں کی تقاریر بھی ابھی محفوظ ہیں ان کا مطالعہ بھی سودمند ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ قائدِ اعظم کا یہ واشگاف اعلان کسی نہ کسی کتاب یا اخبار میں محترمہ نزہت کی نظروں سے ضرور گزرے گا کہ ———

"پاکستان کی قومی زبان صرف اور صرف اردو ہوگی۔"

میں ذاتی طور پر یہ سمجھتا ہوں کہ اگر واقعی المیہ مشرقی پاکستان کے اسباب کی تلاش مقصود ہے تو اردو اور بہاریوں کو الزام دینا بند کیجئے کہ اس سارے معاملے میں نہ اردو کا کوئی قصور ہے اور نہ بہاریوں کا۔ اسی طرح "ڈرائنگ روم" کی دانشوری اس عظیم سانحے کی وجوہات کی تلاش میں کوئی مدد نہیں کر سکتی۔ اس کے لئے "خود احتسابی" کی ضرورت ہے۔ میں آپ سے بھی یہ گذارش کروں گا کہ مناسب ہو تو اداریے میں بھی آپ اس مسئلے پر اظہارِ خیال کیجئے۔

مشرقی پاکستان کی بحث تو چل ہی رہی ہے۔ اب سنا ہے کہ جناب ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کا مضمون "قرۃ العین کی آگ کا دریا" بھی ایک اور گرما گرم بحث کا موضوع بنے گا۔ ڈاکٹر صاحب ایک مدت سے لکھ رہے ہیں اور انہوں نے بعض بڑے کامیاب افسانے لکھے ہیں۔ ان کا ناول "شامِ اودھ" بدقسمتی سے میں نے نہیں پڑھا لیکن سنا ہے کہ اچھا ناول ہے اور اردو کے عمدہ ناولوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ اسی بنا پر ان کے لئے میرے دل میں عزت ہے۔ مگر انہوں نے جو کچھ "آگ کا دریا" اور خاص طور پر ترقی پسند تحریک کے بارے میں فرمایا ہے اسے پڑھ کر میری طرح بے شمار لوگوں کو صدمہ پہنچے گا۔ مجھے اپنے عجزِ فہم اور کم علمی کا اعتراف ہے لیکن ان کے مضمون کے مطالعے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب قرۃ العین اور "آگ کا دریا" پر صرف اس لئے برہم ہو رہے ہیں کیونکہ ڈاکٹر محمود نے ان کے ناول "سنگم" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھ دیا تھا کہ ——— "مگر وہ "آگ کا دریا" کی گرد کو بھی نہیں پہنچتی" ——— اور یہ بات انہیں اتنی ناگوار گزری کہ انہوں نے "آگ کا دریا" کے بارے میں یہاں تک فرما دیا ——— "ان کے سب سے اہم کارنامہ کو کیا اسے ادب بھی کہنے کو جی نہیں چاہتا۔"

"آگ کا دریا" سے نظریاتی اختلاف تو کیا جا سکتا ہے لیکن یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ فنی لحاظ سے یہ ایک بہترین ناول ہے اور ناول نگاری کے تمام تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ یہ میری ناقص رائے ہے مجھے امید ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو بارِ خاطر نہ ہوگی۔

ش۔ صغیر ادیب (بلیک برن۔ انگلینڈ)

ایک ضروری تصحیح

فنون کے گذشتہ شمارہ میں صفحہ ۱۴۲ پر تیئسویں سطر میں "عمرو بن کلثوم" کی جگہ "امراء القیس" چھپ گیا ہے جن کا اس داستان سے کوئی تعلق نہیں جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے اور نہ اس کی ماں سے متعلق جس کا نام غلطی سے درج ہو گیا ہے۔ قارئین فنون سے اس کے لئے معذرت خواہ ہوں اور محمد کاظم صاحب کا ممنون ہوں جنہوں نے اس سہو کی طرف اشارہ کیا۔

شریف کنجاہی (لاہور)

تبصرے

محمد کاظم، محمد خالد اختر، میرزا ادیب، عزیز اثری،
امجد اسلام امجد، سیّد محمد تقی، اسرار زیدی، رشید امجد،

عام فکری مغالطے (مضامین)

مصنف: سید علی عباس جلالپوری — ناشر: آئینہ ادب، چوک مینار، انارکلی، لاہور — قیمت: بارہ روپے

آج کے ماحول میں جبکہ ہمارے اہل علم و دانش زیادہ تر یا تو نام و نمود اور مادی منفعتوں کے پیچھے پڑے ہیں یا پھر انھوں نے زندگی میں جہد و عمل کی راہ چھوڑ کر عافیت و مصلحت کا دامن تھام لیا ہے، جناب سید علی عباس جلالپوری کا دم بہت غنیمت ہے کہ انھوں نے ایسے ناموافق حالات میں بھی فکر و خرد کی شمع روشن کر رکھی ہے، اور اپنی کتابوں میں، اپنے مضامین میں، اپنے لیکچروں میں اور عام گفتگو میں ہمیں برابر یہ احساس دلائے جاتے ہیں کہ ہم انسانوں کا وہ منصب جس کی بنا پر ہم طبقۂ حیوانات سے امتیاز پاتے ہیں، سوچنا اور فکر کرنا ہے۔ سید صاحب نے اپنی زندگی میں جتنا کچھ پڑھا اور مشاہدہ کیا ہے (اور وہ اپنی مقدار میں بے پایاں ہے) اس سے زیادہ انھوں نے اس کے بارے میں سوچ بچار کیا ہے، اس کو ہضم کر کے اپنے ذہنی و فکری وجود کا جزو بنا لیا ہے، اور پھر اس سارے علم و فہم کے ساتھ زندگی اور اس کے مسائل کے بارے میں اپنا ایک نقطۂ نظر ترتیب دیا ہے، اپنی اقدار متعین کی ہیں ——— دوسرے الفاظ میں اپنا خاص فلسفۂ حیات وضع کیا ہے جو ان کی تحریروں اور تقریروں میں ایک واضح پس منظر کے طور پر ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ سید صاحب نے اپنے وقت کی پونجی کو جس انضباط اور کفایت شعاری سے استعمال کیا ہے اور اب بھی کرتے ہیں، وہ قابلِ رشک ہے۔ ان کی چیزیں پڑھ کر یا ان کی باتیں سن کر ذاتی طور پر مجھے ہمیشہ کچھ اس طرح کا احساس ہوا ہے کہ میں نے اپنی زندگی کا ناس ہی مارا ہے۔ زندگی کے ایسے میں جب چڑیاں بہت سا کھیت چگ گئی ہوں، اس طرح کا احساس کافی تکلیف دہ ہوتا ہے!

سید علی عباس اپنے رویے میں آزاد خیال (FREE THINKER) ہیں اور اس کے ساتھ وہ آزادیٔ رائے کے پرزور حامی اور مبلغ ہیں۔ رجعت پسند اور روایت پرست معاشروں میں آزاد خیالی تو کسی طور پنپ لیتی ہے کہ یہ عموماً شخصی اور انفرادی دائرے میں محدود رہتی ہے، لیکن آزادیٔ رائے اپنی سزا بھگتے بغیر نہیں رہتی اور بہت کم ایسا ہوا ہے کہ وہ اپنے انجام سے بچ کر نکل گئی ہو۔ سید صاحب کو بھی اپنی آزادیٔ رائے کے لئے بڑا بلیدان دینا پڑا ہے۔ اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں وہ جب اس مرتبے کو پہنچے جہاں ان کے علم و دانش اور تجربے کے لوگوں کے لئے مغرب کی یونیورسٹیوں میں خاص مسندیں (CHAIRS) قائم ہوتی ہیں، انھیں ایک مہمل روٹین میں پنشن پر بھیج دیا گیا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر وہ مغربی جرمنی میں آخن یا ورزبرگ یونیورسٹی میں ہوتے تو آج ایک LEHRSTUHL (اعلیٰ مسندِ تعلیم) پر متمکن نظر آتے! ——— سید صاحب سے اب تک جو قصور سرزد ہوا ہے وہ یہ ہے کہ وہ انگریزی محاورے کے مطابق بیلچے کو بیلچہ ہی کہتے ہیں اور کوئی بات لگی لپٹی نہیں رکھتے۔ ہماری مذہبی، تہذیبی اور ثقافتی روایات میں انھیں جہاں کوئی تضاد کھٹکتا ہے، یا کوئی بات خلافِ عقلِ سلیم دکھائی دیتی ہے وہ اسے سامنے لاتے ہیں اور اس کے بارے میں لوگوں کو سوچنے پر اکساتے ہیں۔ پھر یہ کہ اپنی رائے کے اظہار میں وہ اکابر شخصیات سے کبھی مرعوب نہیں ہوتے اور نہ ان شخصیتوں کے وسیع حلقۂ معتقدین کی ناراضی کا خوف انھیں ان کے بارے میں سچ بات کہنے سے باز رکھتا ہے ——— لیکن ان ساری چیزوں کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ سید صاحب نے اپنی اصل بات ابھی نہیں کہی، اور ان کا وہ فلسفۂ زندگی جو ان کی تحریروں میں ایک زیریں رو بن کے دوڑتا ہے، اسے ابھی کھل کر اور راست انداز میں سامنے آنا ہے۔

دیکھیں سید صاحب کب اپنے آپ کو اس کام پر آمادہ کر پاتے ہیں۔ یہ ایک کڑی آزمائش اور جوکھوں کا کام ہوگا اور سید صاحب کا اسے یوں ٹالتے چلے جانا قابلِ فہم ہے۔ لیکن وہ اس منصوبے کو کتنا ٹالیں میرا خیال ہے ایک دن آئے گا جب انھیں بالآخر یہ فیصلہ کرنا پڑے گا کہ اُٹھ کر "انا الحق" کا نعرہ لگائیں، اور اپنی صلیب آپ اٹھانے کے لئے تیار ہوں ——— اس لئے کہ اندھیرا روز بروز گہرا ہو رہا ہے۔ گھٹن وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی جاتی ہے۔ اور کوئی دن جاتا ہے کہ انسان کے یہاں سانس لینا بھی دوبھر ہو جائے گا!

پچھلے چھ سات برسوں میں سید علی عباس جلالپوری کی یہ پانچویں کتاب ہے، جو منظرِ عام پر آ رہی ہے۔ ان کی پہلی کتاب "روحِ عصر" تھی جس میں انھوں نے تاریخِ عالم کے مختلف ادوار (زمانۂ قبل از تاریخ سے عصرِ حاضر تک) کا جائزہ لیتے ہوئے اُن کے غالب رجحانات سے بحث کی تھی۔ تاریخ کے کسی دور کے غالب رجحان کو جرمن اصطلاح میں ZEITGEIST کہتے ہیں جس کا ترجمہ فاضل مصنف نے اردو میں "روحِ عصر" کیا۔ یہ کتاب انسانی تہذیب و تمدن کا ایسا تجزیاتی مطالعہ پیش کرتی تھی جو یہاں کے اکثر قارئین کے لئے بالکل نیا اور فکر انگیز تھا۔ ان کی دوسری کتاب "روایاتِ فلسفہ" تھی جس میں سید صاحب نے چند اہم اور نمایاں مکاتبِ فلسفہ (مثلاً مادیت پسندی، مثالیت پسندی، نوفلاطونیت، ارادیت وغیرہ) کو ایک اوسط ذہنی سطح کے قاری کے لئے آسان پیرائے میں بیان کیا تھا، اور اس طرح یہ کتاب اپنے موضوع میں انسان کے عہد بعہد مذاہبِ فکر کی تفہیم و تشریح تھی۔ اپنی تیسری کتاب "مقاماتِ وارث شاہ" میں سید صاحب نے پنجاب کے عظیم عوامی شاعر وارث شاہ کے اُس محیر العقول فن کا ایک عالمانہ اور مبصرانہ جائزہ لیا تھا جو اُس کی طویل نظم "ہیر" میں روحِ پنجاب کو ہمیشہ کے لئے زندہ کر گیا ہے۔ "ہیر وارث شاہ" کے بعض ٹکڑے میں لوک گویوں کی زبانی ایک عرصے سے سنتا چلا آتا تھا لیکن پنجاب کے اس شاعر کی فنی قامت کا صحیح اندازہ مجھے اس کتاب کے پڑھنے کے بعد ہی ہوا اور اس انکشاف سے مجھے بہت خوشی ہوئی کہ عالمی سطح کے قد آور شاعر صرف یورپ اور مغرب میں ہی نہیں ہوئے، اپنے ہاں کی یہ سرزمین بھی انھیں جنم دیتی رہی ہے۔ یہ کتاب لکھ کر سید علی عباس نے ایک طرف تو اپنی گہری ناقدانہ بصیرت اور موضوع کے ساتھ اپنی بے پایاں لگن اور دردمندی کا ثبوت دیا اور دوسری طرف انھوں نے ابھرتے ہوئے پنجابی ادب کو بصیرت و ادراک کے ساتھ لکھی ہوئی ایک ایسی کتاب مہیا کر دی جس کے بغیر میں سمجھتا ہوں اس ادب کا کوئی مطالعہ مکمل نہیں ہو سکے گا۔ "اقبال کا علم کلام" سید صاحب کی چوتھی کتاب تھی۔ اقبال کو سید صاحب ایک عظیم شاعر مانتے ہیں لیکن اپنی فکر اور اپنے نظامِ عقائد کے اعتبار سے وہ ان کے نزدیک ایک فلسفی کی تعریف میں نہیں آتے بلکہ متکلمِ اسلام ٹھہرتے ہیں۔ چنانچہ اس کتاب میں مصنف نے علمِ کلام کے وسیع تاریخی و فکری پس منظر میں اقبال کی الٰہیات اور افکار و نظریات، اُن کے مآخذ اور مختلف ادوار میں انھیں پیش آنے والے نشیب و فراز سے خالص علمی انداز میں بحث کی تھی۔ واضح اسباب کی بنا پر اس کتاب کے مباحث کچھ نزاعی قسم کے اور شہ دینے والے (PROVOCATIVE) تھے۔ چنانچہ کتاب کے چھپتے ہی ماہنامہ "فنون" کے صفحات پر سید علی عباس اور ایک اور فاضل جناب بشیر احمد ڈار کے درمیان ایک طویل مباحثہ چل نکلا۔ اس مباحثے کو ادب کے سنجیدہ قارئین نے شروع میں تو بہت دلچسپی اور انہماک سے پڑھا لیکن بات جب جبل کر دقیق مباحث اور فلسفہ و الٰہیات کے گہرے پانیوں میں چلی گئی تو پڑھنے والے اس کا ساتھ نہ دے سکے، اور یہ بحث کسی نتیجہ تک پہنچے بغیر ختم ہو گئی۔ کوئی شک نہیں کہ "اقبال کا علم کلام" شاعرِ مشرق کی فکر کے بارے میں چند مسلمات کو زیرِ بحث لاتی ہے اور اس سے بعض عقیدت مند جبینوں پر بل پڑ جانا ایک قدرتی امر ہے، لیکن حقیقت اور صداقت کی جستجو بھی ہو تو اس کا تقاضا اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس کتاب کو تنقیدی نگاہ سے جانچا اور پرکھا جائے اور اگر اس میں کوئی بات خلافِ حقیقت ہو تو اس کو دلائل کے ساتھ رد کیا جائے۔ یہ کام موضوعِ اقبال پر تحقیق و تصنیف کرنے والے افاضل کا تھا۔ لیکن ہمارے علم کے مطابق ان میں سے کسی نے بھی اس کام کو ہاتھ میں نہیں لیا۔

—— اپنی اس پانچویں اور تازہ ترین کتاب "عام فکری مغالطے" میں سید علی عباس جلالپوری نے اپنی بحث کا دائرہ پچھلی کتابوں کے مقابلے میں زیادہ وسیع کیا ہے، اور افکار و عقائد کی دنیا میں مروج چند فکری مغالطوں کو لے کر انسان کی پوری تمدنی و تہذیبی تاریخ کے پس منظر میں ان کا تجزیہ کرتے ہوئے انھیں باطل قرار دیا ہے۔ ان کے اس تجزیے کے ضمن میں تاریخ، عمرانیات، فلسفہ، سائنس، نفسیات، مذہب، تصوف اور ادب و فن کے بعض اہم مسائل بھی زیرِ بحث آ گئے ہیں اور ان کے بارے میں ہمیں سید صاحب کے نقطۂ نظر کو نسبتاً زیادہ واضح صورت میں دیکھنے اور جانچنے کا موقع ملا ہے۔ یہ فکری مغالطے تعداد میں چودہ ہیں،

اور ہر مغالطے کے لئے فاضل مصنف نے ایک الگ باب باندھا ہے۔ کتاب کے مباحث کا ایک اندازہ قائم کرنے کے لئے ان مغالطوں کی فہرست پر ایک دفعہ گذر جانا ضروری ہوگا۔ یہ فہرست یوں ہے:

۱- یہ کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے
۲- یہ کہ بے راہ روی کا نام آزادی ہے
۳- یہ کہ ماضی کتنا اچھا زمانہ تھا
۴- یہ کہ فلسفہ جالِ بلب ہے
۵- یہ کہ انسانی فطرت ناقابلِ تغیر ہے
۶- یہ کہ وجدان کو عقل پر برتری حاصل ہے
۷- یہ کہ دولت مسرت کا باعث ہوتی ہے
۸- یہ کہ تصوف مذہب کا جز ہے
۹- یہ کہ عشق ایک مرض ہے
۱۰- یہ کہ اخلاقی قدریں ازلی و ابدی ہیں
۱۱- یہ کہ عورت مرد سے کہتر ہے
۱۲- یہ کہ فن برائے فن کار ہے
۱۳- یہ کہ انسان فطرۃً خود غرض ہے
۱۴- یہ کہ ریاست اور مذہب لازم و ملزوم ہیں

اوپر دیئے ہوئے بعض عنوانات (مثلاً یہ کہ دولت مسرت کا باعث ہوتی ہے، یہ کہ عشق ایک مرض ہے، یہ کہ عورت مرد سے کہتر ہے) کو دیکھ کر قارئین کو شاید یہ خیال گذرے کہ ان موضوعات پر کچھ ہلکے پھلکے اور تفریحی انداز میں بحث کی گئی ہوگی، لیکن اس وہم کو آپ اپنے ذہن سے جتنا جلدی نکال دیں اتنا اچھا ہوگا، اس لئے کہ اس کتاب میں کوئی بات بھی ہلکے پھلکے اور تاثراتی انداز میں نہیں کی گئی۔ کتاب کے ان عنوانات میں سے ہر ایک عنوان پر سید صاحب کے بحث کرنے کا اسلوب یہ ہے کہ وہ پہلے تو ایک مغالطے کا تعین کرتے ہیں کہ وہ اصل میں ہے کیا، اور اس سے کیا کچھ متفرع ہوتا ہے، پھر انسانوں کے رویے میں اور عام معاشرے پر اس مغالطے کے اثرات کی نشاندہی کرتے ہیں، اور اس تمہید کے بعد وہ اس مغالطے کا عالمانہ تجزیہ کرنے اور اس کے شروعات و مآخذ کا کھوج لگانے کے لئے پڑھنے والے انسانی تمدن کی تاریخ میں بہت دور تک پیچھے لے جاتے ہیں، اور اُن ابتدائی زمانوں سے آغاز کر کے، جب انسان درختوں پر بسیرا کرتا تھا، وحشت و بربریت کے مختلف ادوار سے گذرتے ہوئے زرعی معاشرے کے دور میں داخل ہوتے ہیں جسے انسانی تہذیب کا بنیادی دور کہنا چاہئے، اور یہاں سے وہ پہلے صنعتی معاشرے اور پھر صنعتی انقلاب کے اس موجودہ زمانے میں آنکلتے ہیں۔ سید صاحب نے یہ طریقِ عمل (MODUS OPERANDI) بلا استثنا ہر مغالطے کے باب میں اختیار کیا ہے، اور اس وجہ سے میں اس کتاب کے پڑھنے والوں کو یہ مشورہ دوں گا کہ وہ ایک نشست میں ایک باب سے زیادہ نہ پڑھیں، ورنہ اس امکان کا خدشہ ہے کہ انہیں کتاب کے مباحث میں یکسانیت کا احساس ہو، اور ایک ہی وقت میں دو تین یا زیادہ ابواب پڑھنے کے بعد انہیں اکتاہٹ سی ہونے لگے، سید صاحب کے اسلوب نگارش کی وجہ سے نہیں، بلکہ اتنے خوبصورت اسلوب کے علی الرغم اُن کے اس پابند طریق بحث کی وجہ سے۔ یوں بھی اس کتاب کا ہر باب اپنے اندر اتنا ٹھوس علمی و فکری مواد رکھتا ہے کہ انسان کو اسے پوری طرح سمجھنے اور اپنے اندر جذب کرنے کے لئے کچھ وقت چاہئے اور پڑھنے والا اس کے بارے میں کئی روز تک سوچ بچار کر سکتا ہے۔

سید صاحب کے ان مقالات میں ایک غالب سُر (PREDOMINANT NOTE) جو جگہ جگہ اُبھر کر باقی سب سُروں پر حاوی ہو جاتا ہے صنعتی انقلاب کے بعد کے اشتراکی معاشرے کے بارے میں ان کی تخیل پرستی (ROMANTICISM) ہے۔ متعدد مقالات میں سید صاحب جب انسانی تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے صنعتی انقلاب کے دور میں پہنچتے ہیں تو ہمیں بتانے لگتے ہیں کہ اس انقلاب کے نتیجے میں جو اشتراکی معاشرہ دنیا کے بعض حصوں میں قائم ہوا ہے، وہ انسانیت کے سارے دکھوں کا مداوا ہے۔ تاریخِ انسانی کے پچھلے سب دور تاریکی، ظلم اور جبری استحصال کے دور تھے، اور اب جبکہ معاشرے کی تشکیل جدید معاشی انصاف کی بنیادوں پر ہو گئی اور شخصی اور اجتماعی مفادات کے درمیان ایک مثالی مفاہمت کی راہ نکل آئی تو اب دنیا کے سامنے ایک روشن مستقبل ہے اور انسانیت کی شب تاریک کی سحر پھوٹ چکی ہے جب اشتراکیت کا لایا ہوا معاشی انصاف پوری دنیا میں رائج ہو گیا تو کوئی مجبور و مظلوم نہیں رہے گا، ایسے حالات میں لوگ جسمانی اور ذہنی طور پر صحتمند ہوں گے اور ان کے اخلاق بھی اپنے آپ سدھر جائیں گے۔ سید صاحب کے اپنے الفاظ میں:

"نئے صنعتی معاشرے میں افراد کو نیک بننے کی محض زبانی تلقین نہیں کی جائے گی بلکہ ایسا اجتماعی ماحول پیدا کیا جائے گا جو معاشی و عمرانی عدل و انصاف پر مبنی ہوگا اور جس میں ہر شخص کی جائز ضروریات بدرجۂ اتم پوری ہوں گی۔ اس نوع کے معاشرے میں بدی کے محرکات کا از خود خاتمہ ہو جائے گا اور انسان صحیح معنوں میں بااخلاق زندگی گذار سکے گا۔"
(اخلاقی قدریں۔ص ۱۰۷)

یہ صنعتی معاشرہ جس کی دل خوش کن جھلکیاں سید صاحب نے اپنی کتاب میں جگہ جگہ دکھائی ہیں، معلوم نہیں یہ کوئی نظری یا مثالی معاشرہ ہے جو ابھی اس زمین پر قائم ہونا ہے، یا یہ وہی معاشرہ ہے، جو دنیا کے ایک بڑے حصے میں بالفعل قائم ہو چکا ہے، اور روس، مشرقی یورپ، چین، کوریا، ویت نام اور بعض دوسرے ممالک کے باشندے اس کی برکات سے پہلے ہی بہرہ ور ہو رہے ہیں۔ اگر سید صاحب کے ذہن میں یہی مؤخر الذکر معاشرہ ہے تو میں اس بارے میں کچھ معروضات پیش کرنے کی اجازت چاہوں گا۔

روس میں اس معاشرے کو قائم ہوئے اب تقریباً ساٹھ برس ہونے کو آئے ہیں، لیکن اس ملک کے باشندوں کی زندگی کی جو تصویریں آہنی پردے سے گذر کر ہم تک پہنچتی رہتی ہیں اُن میں ہمیں وہ رنگ، وہ روشنی اور چمک دمک دکھائی نہیں دیتی، جو سید صاحب کی کھنچی ہوئی تصویر میں نظر آتی ہے۔ میں خود تو روس نہیں گیا اور نہ غالباً سید صاحب کو اب تک یہ موقع ملا ہے، لیکن میرے کچھ ہم پیشہ رفیق روس میں فنی تمدیت کا ایک طویل عرصہ گذار کر آئے ہیں، اُن کی زبانی میں نے جو کچھ سنا وہ یہی ہے کہ وہاں لوگوں کے چہروں پر بجائے خوشی اور بے فکری کی تمتاہٹ کے، ہر وقت ایک متفکر اور سہمی سہمی سی کیفیت دیکھنے میں آتی ہے جیسے کوئی زندگی سے لطف اندوز نہ ہو رہا ہو، بلکہ چار و ناچار زندگی بھگت رہا ہو! یہ ٹھیک ہے، انھوں نے بتایا کہ روس میں قحبہ خانے نہیں ہیں اور سڑکوں کے کنارے کال گرلز کھڑی ہوئی نہیں ملتیں لیکن اگر تمہارے پاس امریکی ڈالر اور نائلون کی جرابیں یا نوسٹڑ اور اچھے سگریٹ ہوں تو تمہیں اپنے گرد و پیش میں ایسی لڑکیاں مل جائیں گی جو ان تحائف کی خاطر تمہارے لئے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں! اس صنعتی معاشرے کی ایک جھلک ـــــ دور کی جھلک ہی سہی ـــــ میں نے مشرقی برلن میں خود بھی دیکھی تھی۔ وہاں جب ایک موقع پر ہماری جرمن گائیڈ ہمیں روسی سورماؤں کی یادگار دکھا رہی تھی تو ہمارے ایک ساتھی نے ایک بے تکا سا سوال کر دیا "فرولائن! یہ بتاؤ کہ جو جرمن سورما اس جنگ میں کام آئے تھے ان کی یادگار بھی کہیں ہے؟" اس سوال کے جواب میں اس جرمن عورت کے چہرے پر بے بسی اور حزن کی جو پرچھائیں گذر گئی وہ کوئی بھولنے والی چیز نہیں۔ اس کے سلے ہوئے ہونٹوں اور کتراتی ہوئی نگاہوں میں ہم نے اپنا جواب صاف پڑھ لیا تھا، اور وہ اس کے بعد سے ہمارا خاص خیال رکھنے لگی تھی ـــــ اسی طرح مغربی جرمنی کے شہر روتن برگ کی گوئٹے انسٹی ٹیوٹ میں مجھے چیکوسلوواکیہ کا وہ جوان اور خوبصورت جوڑا کبھی نہیں بھولے گا جو کسی طرح آہنی پردے سے نکل کر بھاگ آیا تھا، اور جن کے چہروں پر خوف و ہراس کی چھاپ اس طرح سے چسپاں ہو گئی تھی جیسے ان کی تقدیر ان کے تعاقب میں ہو! اپنی گفتگو میں، جو بہت مختصر اور محتاط ہوتی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ اشتراکی معاشرہ کتابوں میں بالکل ٹھیک ہے، لیکن اس میں رہنا کیا ہوتا ہے، یہ آپ ہم سے نہ پوچھیں تو بہتر ہے!

"فن برائے فن کار" کے باب میں سید صاحب فرماتے ہیں:

"جدید دور میں فن کا معیار عوام متعین کریں گے جس سے نہ صرف فن کاروں کا سرچشمۂ فیضان بدل جائے گا، بلکہ اظہار و بیان کے اسالیب بھی بدل جائیں گے۔ فن زرعی معاشرے کے دور آخر کی زوال پذیر یا درائیت سے آزاد ہو جائے گا اور اس کے فرسودہ رگ و پے میں از سر نو زندگی کی حرارت دوڑ جائے گی۔"

اس اعتبار سے روس میں بالشویکی انقلاب کے بعد کے ساٹھ سالہ دور میں اس فن کے چشمے پھوٹ نکلنے چاہئیں تھے، اور ادب کے شعبے میں زندگی کی حرارت سے بھرپور تخلیقات پر مشتمل ایک پورا لٹریچر تیار ہو جاتا ـــــ لیکن یہ سارا لٹریچر کیا ہوا؟ اور ایسے صحت مند اور اعلیٰ معیار کے لٹریچر سے ہم اب تک کیوں متعارف نہ ہو سکے؟ اس طرح کے لٹریچر کو تو اب تک دنیا فتح کر لینی چاہئے تھی۔ اس کے برعکس ایسا کیوں ہے کہ اس طویل عرصے میں جو دو قد آور اور عالمی سطح کے ادیب روس کے صنعتی معاشرے میں سے ابھر کر سامنے آئے ان پر بغاوت کی تہمت لگی اور وہ اپنی حکومت کے عتاب کا نشانہ بنے۔ چنانچہ ان میں سے ایک کا ہمیشہ کے لئے گلا گھونٹ دیا گیا، اور دوسرے کو مکھی کی طرح

نکال کر ملک سے باہر پھینک دیا گیا ـــــ سولژے نتسن نے اپنی کتاب "گلاگ آرگی پلاگو" میں جو کچھ لکھا ہے وہ ایک متعصب اور منتقم مزاج آدمی کی ہرزہ سرائی ہی سہی (اور جو شخص ایک نجی خط میں سٹالین کے خلاف دو فقرے لکھ دینے کی پاداش میں پورے سولہ برس مشقتی کیمپ میں قید رہا ہو اسے متعصب ہونے کا کچھ حق تو آپ دیں گے ہی!) لیکن کون صحیح الذوق آدمی ہے جو اس کی ادبی قامت کا منکر ہوگا، اور آج دنیا کے تختے پر کتنے ادیب ہیں جو سولژے نتسن کے سے انداز میں انسانی زندگی کے اتنے سچے اور ہو بہو عکس اپنی کہانیوں میں دکھا سکتے ہیں؟ سوال یہ ہے کہ سولژے نتسن جیسا ادیب روس کے صنعتی معاشرے کی منفی پیداوار کیوں ہوا، مثبت پیداوار کیوں نہ ہو سکا؟

میں نہیں کہہ سکتا لیکن یہ عین ممکن ہے کہ اس کتاب کے صفحات پر انسانیت کو خوش آئند مستقبل کا مژدہ دیتے وقت سید صاحب کے ذہن میں کوئی نظری اور مثالی صنعتی معاشرہ ہو جو ابھی قائم ہونا ہے، یا جو کسی دوسری جگہ ابھی اپنے نمو و ارتقاء کے مراحل میں ہے۔ مثلاً اس طرح کا معاشرہ جو کارل مارکس کے ذہن میں تھا، لیکن جب لینن اور سٹالن کے ہاتھوں اس کا قیام عمل میں آنے لگا تو ترتیب میں کچھ گڑبڑ ہو گئی، اور بجائے اس کے کہ انقلاب کے بعد ایک عبوری دور میں پرولتاری طبقہ پہلے ملک میں اکثریت حاصل کرتا اور پھر اس کی ڈکٹیٹر شپ قائم ہوتی، ہوا یہ کہ پرولتاری طبقہ جو ابھی اقلیت میں تھا ملک کی زمام اقتدار پر قابض ہو گیا اور اپنا یہ اقتدار ہر صورت قائم رکھنے کے لئے اس نے ایک گھناؤنے اور بدترین قسم کے استبداد کا سہارا لیا، اور یہیں سے پوری مملکت میں خون خرابے جبر و تعذیب اور مشقتی کیمپوں کے ایک طویل سلسلے کی ابتدا ہو گئی۔

اشتراکی نظام اور اس کے اصول و مبادی اور تفاصیل کے بارے میں میرا مطالعہ سید علی عباس صاحب کے مقابلے میں صفر کے برابر ہے، اور اگر میں اس موضوع پر ان سے نظریاتی بحث کرنے چلوں تو یہ ایک مضحکہ خیز بات ہو گی لیکن ایک چیز جو میں نے اپنے وجدان اور تجربے سے اخذ کی ہے اور اس پر میرا ایمان روز بروز مضبوط ہوتا جاتا ہے یہ ہے کہ انسان کے لئے آزادی ـــــ فکر و خیال، نقل و حرکت، اور انتخاب عمل کی آزادی ـــــ ہوا، پانی اور روٹی کی بنیادی ضروریات کے بعد اس کی سب سے اہم ضرورت ہے اور ایک ایسی چیز جس کے بغیر وہ اس زندگی میں "مسرت" کا مزا نہیں چکھ سکتا۔ میرے نزدیک وہ معاشرہ جو انسان کو پیٹ کی روٹی اور تن کا کپڑا دے کر اس سے اس کی آزادی ـــــ اس کی مسرت کا سب سے بڑا چشمہ ـــــ سلب کر لیتا ہے یا اُسے ایک چوکھٹے میں محدود کر دیتا ہے، کبھی مثالی اور فطری معاشرہ نہیں ہو سکتا۔ اور اس لئے وہ اس زمین پر زیادہ دیر قائم بھی نہیں رہ سکتا۔

سید صاحب کو اگر اس نئے صنعتی معاشرے میں اتنی خوبیاں اور بھلائیاں دکھائی دیتی ہیں تو ان کی یہ رائے ضرور کسی ٹھوس بنیاد اور طویل فکری عمل پر قائم ہو گی، اور ان کے پاس میرے اوپر کے سوالوں کا جواب بھی ضرور ہو گا۔ مجھے اس بارے اُن سے صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ انھوں نے اس اشتراکی معاشرے پر رومان کا رنگ کچھ زیادہ ہی چڑھا دیا ہے۔ وہ جب انسانی تہذیب کے مختلف ادوار کا جائزہ لیتے ہوئے اس معاشرے کے ذکر پر آتے ہیں تو ان کے انداز بیان سے مجھے قدیم رومانی داستانوں کا یہ اختتامی جملہ یاد آتا ہے کہ "بالآخر شہزادے اور شہزادی کی شادی ہو گئی اور اس کے بعد وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خوش و خرم رہنے لگے"[1] (حالانکہ شادی کے بعد انسان کتنا عرصہ خوش و خرم رہتا ہے، یہ سب حقیقت پسند جانتے ہیں) سید صاحب کی باتوں سے اگر اتنا ہی لگتا کہ نیا صنعتی معاشرہ تمدنِ انسانی کے ارتقاء کی ایک تازہ کڑی ہے جس کی اپنی کچھ خوبیاں ہیں، اور اپنے نقائص و معائب بھی، اور پچھلی منازل کی طرح انسان ایک دن اس سے بھی گزر کر کسی نئی منزل کی طرف چل نکلے گا، تو میں اس موضوع پر سید صاحب کے سامنے زبان کھولنے ضرورت محسوس نہ کرتا، لیکن اسے کیا کیجئے کہ وہ اسے انسان کی سیاسی فکر اور تمدن و تہذیب کی آخری معراج قرار دیتے ہیں جس کے بعد یوں لگتا ہے کہ مزید ارتقاء کے لئے کوئی گنجائش نہیں رہ گئی۔ چنانچہ موضوع چاہے عشق کا ہی ہو، اس میں بھی جب سید صاحب اس معاشرے کے ذکر پر آتے ہیں تو اُن کی بات کا لہجہ یہ ہوتا ہے:

"اشتراکی معاشرہ ترقی پذیر ہے اور تضادات سے بری ہے۔ اس میں معاشی عدل و انصاف قائم کر دیا گیا ہے۔ مرد و عورت کی مساوات دکھائی دیتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کا احترام کرتے ہیں۔ اس میں امرد پرستی یا روحانی عشق کی مریضانہ صورتیں، جو حسرت و محرومی پر مبنی ہوتی ہیں بار آور نہیں ہو سکتیں۔ اس معاشرے

---

[1] AND THEY LIVED HAPPILY EVER AFTER.

کے مرد عورتیں، جو جسمانی، اور ذہنی لحاظ سے تندرست و توانا ہوتے ہیں قدرتاً ایک دوسرے میں جنسی کشش محسوس کرتے ہیں، جو ذہنی و ذوقی لگاؤ کے ساتھ مل کر صحت مند عشق کی صورت اختیار کر لیتی ہے، معاشرہ چاہنے والوں کے راستے میں حائل نہیں ہوتا۔ باہمی احترام اور جنسی توافق میاں بیوی کو گہری مسرت سے سرشار کر دیتے ہیں۔ یہ اُنس اور لگاؤ ہی اس معاشرے کا عشق ہے ...." (یہ کہ عشق ایک مرض ہے۔ ص: ۱۴۹)

یہ سراسر رومانیت ہے! اور ہم سید صاحب کے حقیقت نگار قلم سے کچھ دوسری طرح کی چیزیں پڑھنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ سید صاحب اب ہمیں یہ تو نہ بتائیں کہ اشتراکی معاشرے میں انسان اپنی جبلت بھی تبدیل کر لیتا ہے، اور میاں بیوی کے درمیان جو اُنس و لگاؤ ہوتا ہے اس میں عشق کی سی گرمی اور سرمستی پائی جاتی ہے۔ اُن سے زیادہ اس حقیقت سے کون آگاہ ہوگا کہ عشق ایک ایسی آگ ہے جو ہجر و فراق کے ایندھن سے جلتی ہے اور جو حجلۂ عروسی میں پانی کا پہلا چھینٹا پڑتے ہی ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔ کیا اشتراکی معاشرے میں عشق جیسا ازلی جذبہ بھی اپنی خاصیت بدل لیتا ہے؟!

فکری مغالطوں کی اس فہرست میں سے تین چار مغالطے ایسے ہیں جن کے سلسلے میں افسوس ہے میرے لئے سید صاحب کے ساتھ اتفاق کرنا بہت مشکل ہے۔ دوسرے الفاظ میں میرے نزدیک وہ مغالطے، مغالطے نہیں بلکہ حقیقت ہیں۔

اول یہ کہ انسانی فطرت ناقابلِ تغیر ہے۔ سید صاحب نے اس باب میں تاریخ کے حوالے سے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ صدیوں کے گذرنے کے ساتھ معاشرتی سیاسی اور اقتصادی نظام بدل گیا ہے اور ماحول کے سانچے کے بدلنے کے ساتھ ساتھ انسانی فطرت بھی بدلتی رہتی ہے لیکن ان کی اس دلیل کو دل کسی طرح تسلیم نہیں کرتا۔ اس کے برعکس حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ انسان اس کرۂ ارض پر جب تک اس جسمانی اور عضویاتی ترکیب کے ساتھ موجود ہے، اس کی فطرت ناقابلِ تغیر رہے گی، اس کے جذبات اور احساسات، اس کی اُمنگیں اور آرزوئیں ایک سی رہیں گی، البتہ ان کے اظہار کی صورتیں اور مواقع ماحول کے ساتھ ساتھ بدلتے رہیں گے۔ اس باب کے آخری حصے میں سید صاحب نے پھر ایک رجائی سُر لگایا ہے۔ فرماتے ہیں:

"کرۂ ارض روز بروز ایک بہت بڑے شہر کی صورت اختیار کر رہا ہے جس کے شہری ایک دوسرے سے نفرت کرنا بھول جائیں گے۔"

شہری بے چارے تو اب بھی ایک دوسرے سے نفرت نہیں کرتے لیکن انسان کی قائم کردہ سیاسی اور اجتماعی تنظیموں کی یہ فطرت کہ وہ اپنے معاملات میں ہر طرح کے جھوٹ فریب، خود غرضی اور بے انصافی سے کام لیتی ہیں، اتنی آسانی سے کہاں بدلے گی۔

دوسرے یہ کہ عورت مرد سے کمتر ہے۔ سید صاحب اسے بھی مغالطہ قرار دیتے ہیں اور اپنے نظریے کی تائید میں دلائل پر دلائل دیے چلے جاتے ہیں، لیکن ایسا لگتا ہے کہ روزمرہ حقیقت دوسری طرف کھڑی ان کی اس ساری فکری و منطقی کاوش پر مسکراتی رہتی ہے۔ ذہنی و جذباتی طور پر عورت مرد سے کمتر ہے یا نہیں، اس سوال پر دو رائیں ہونا ممکن ہے، لیکن سید صاحب جوشِ خطابت میں عورت کو جسمانی طور پر بھی مرد سے کمتر قرار نہیں دیتے۔ ان کے نزدیک روس کی ایک ہواباز خاتون کا خلا میں جا کر واپس آ جانا اس امر کا کافی ثبوت ہے کہ صنعتی معاشرے میں عورت نے "مرد کی جسمانی برتری کا طلسم بھی توڑ دیا ہے" ـــــ کیا ہم اس سے یہ سمجھیں کہ عالمی اولمپکس میں ہر دفعہ مردوں اور عورتوں کے مقابلے جو الگ الگ منعقد ہوتے ہیں تو یہ محض تکلف اور ایک بے معنی جنسی تفریق ہے، ورنہ کھیل کے ہر شعبے میں عورتیں مردوں کا مقابلہ کر سکتی ہیں! ـــــ میں عورت کے مقابلے میں مرد کی جسمانی برتری کا ہی قائل نہیں ہوں، اس کی ذہنی اور دماغی برتری کا بھی قائل ہوں، اس لئے کہ میرے نزدیک ذہن اور عقل کی توانائی کا ایک گہرا تعلق جسمانی توانائی سے ہے۔ عورت کا ذہن اپنی کیفیت (QUALITY) میں بے شک مرد کے ذہن کے برابر ہو سکتا ہے، لیکن اپنی توانائی اور قوتِ کار کے اعتبار سے وہ مرد کے ذہن کے ہم پلہ نہیں ہو سکتا۔ اس ضمن میں میرے پاس بھی تقریباً اتنے ہی دلائل ہیں جتنے سید صاحب نے اپنے مقدمے کے حق میں دیے ہیں، لیکن اب یہاں ان کے بیان کرنے کی گنجائش نہیں رہی۔

"یہ کہ فن برائے فن کار ہے" ـــــ یہ بھی سید صاحب کے نزدیک ایک مغالطہ ہے، اس لئے کہ ان کے خیال میں فن وہی صحت مند اور زندگی سے بھرپور ہو سکتا ہے جو ایک اشتراکی معاشرے میں "عوام کی امنگوں اور تمناؤں کی ترجمانی کرتا ہے۔" گویا ادب و فن وہی معتبر ٹھہرا جو ایک اشتراکی ریاست میں امداد باہمی کے فارموں پر جنم لے اور نئے زرعی نظام کے فوائد و برکات کی عکاسی کرے۔ ایک معاشرے میں جب عشق میاں بیوی کے درمیان ہی پروان چڑھنے لگے گا تو ادبا و شعراء کے لئے موضوع

یہی اجتماعی کھیتی باڑی اور صنعت کاری کے رہ جائیں گے۔ اس صحت مند اور زندگی سے بھرپور ادب کی حمایت کے جوش میں سید صاحب نے مغرب کے اب تک کے بیشتر ادب پر یہ کہہ کر پانی پھیر دیا ہے کہ یہ سقیم موضوعیت کی پیداوار ہے۔ فرماتے ہیں:

"جدید مغربی آرٹ اور ادب پر جس گہری یاسیت اور کلبیت کا غلبہ ہے وہ بیمار موضوعیت کی پیداوار ہے جو سرمایہ دارانہ معاشرے کو گھن کی طرح چاٹ رہی ہے، اور جس نے اسے تنزل پذیری کے راستے پر ڈال دیا ہے"

چنانچہ ایک ہی ہلے میں دوستوفسکی، سارتر، کیمو، آندرے ژید، ڈی۔ ایچ۔ لارنس، ورجینیا وولف، گراہم گرین، کافکا، گنٹر گراس، اور دوسرے بے شمار اہل قلم صاف ہوئے، اور میدان میں صرف وہی ادیب رہ گئے جو بیویوں سے عشق کرتے ہیں اور کھیتوں میں کام کے دوران چھوٹی چھوٹی لال کتابوں سے انسپائر ہو کر شعر کہتے اور کہانیاں لکھتے ہیں! —— فن برائے فن کار ہونا تو میرے نزدیک بھی پوری طرح صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ ایک فن کار جو کچھ بھی تخلیق کرتا ہے وہ محض اس کی ذات کے لئے نہیں ہوتا۔ اگر ایسا ہو تو کتابوں اور رسالوں کے چھپنے کا جواز باقی نہ رہے، موسیقی کو ریکارڈ کرانے کی ضرورت پیش نہ آئے، تصویروں کی نمائشیں نہ لگائی جائیں لیکن دوسری طرف یہ بھی صحیح ہے کہ یہ کوئی ضروری نہیں کہ جو فن بھی تخلیق کیا جائے اس کا خطاب اور اس کی اپیل پورے معاشرے کے لئے ہو، اور وہ ہر طرح کے لوگوں کی ذوقی ضروریات بیک وقت پوری کرتا ہو —— میں سمجھتا ہوں کہ فن ایک طرف تو فن کار کے لئے ہوتا ہے کہ وہی سب سے پہلے اس کے کرب کی لذت سے گذرتا ہے، اور دوسری طرف وہ معاشرے کے ایک خاص طبقے کے لئے ہوتا ہے جو اس فن کا شناسا اور قدردان ہو!

اگر میں ایک بالکل ہی بے تکا اندازہ نہیں لگا رہا ہوں تو یوں لگتا ہے کہ سید علی عباس صاحب نے اس کتاب کے چند ایک ابواب محض لوگوں کو ابھارنے اور جوش دلانے کے لئے لکھے ہیں، اور ممکن ہے وہ ان کے بارے میں اپنے موقف پر اتنی سختی اور سنجیدگی سے قائم نہ ہوں جتنا وہ نظر آتے ہیں۔ کتاب کے پیش لفظ میں سید صاحب لکھتے ہیں:

"راقم نے عام فکری مغالطے لکھ کر سوچ کے ٹھہرے ہوئے پانی میں چند کنکر پھینک دیئے ہیں، اس امید کے ساتھ کہ سطح آب پر اٹھتی ہوئی چند ننھی منی لہریں کناروں تک پھیل جائیں گی۔"

سطح آب پر سوچ کی ایک ننھی سی —— لیکن شریر اور گستاخ —— لہر تو یہ ہے جو ان کی کتاب کے اس جائزے میں بہہ نکلی ہے۔ میرا خیال ہے اس کتاب قارئین میں سے دوسرے لوگوں کو بھی جنھیں سید صاحب کی آرا مطمئن نہ کرتی ہوں آگے آنا چاہئے، اور اپنا نقطۂ نظر بیان کرنا چاہیئے۔ اس طرح فکر کے ٹھہرے ہوئے پانی میں کچھ ہلچل پیدا ہوگی، اور بند خیالات کو ہوا لگے گی، اور یہی سید صاحب چاہتے ہیں۔

مذکورہ بالا تین چار ابواب کو چھوڑ کر جن میں بحث و اختلاف کی گنجائش موجود ہے، اس کتاب میں متعدد ابواب ایسے ہیں کہ جن میں سید صاحب کے ساتھ مباحثہ و مناقشہ کرنا بہت دشوار ہوگا۔ مثلاً

'یہ کہ فلسفہ جاں بلب ہے'
'یہ کہ وجدان کو عقل پر برتری حاصل ہے'
'یہ کہ تصوف مذہب کا جوہر ہے'
'یہ کہ ریاست اور مذہب لازم و ملزوم ہیں'

یہ کتاب کے معرکۃ الآرا ابواب ہیں، اور ان میں سے ایک ایک با سا ہے کہ جس میں سید صاحب نے پوری پوری کتاب کے موضوع کو چند صفحات میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔ یہ ان کے اسلوب تحریر کا اعجاز ہے، اور اس کے ساتھ یہ کہ انھیں اپنے موضوع پر پوری گرفت حاصل ہوتی ہے اور وہ اس کے لئے جمع کئے ہوئے مواد کو اتنے سلیقے اور مہارت سے برتتے ہیں کہ دیکھ کر انسان مبہوت رہ جاتا ہے۔

چوتھی صدی ہجری کے اوائل میں جب اپنے وقت کے لغوی عبدالرحمن الہمذانی نے "الالفاظ الکتابیہ" کے نام سے عربی میں مترادف اور ہم معنی الفاظ ایک رسالے میں جمع کر دیئے تو ابن بویہ کے ادیب اور عالم وزیر الصاحب بن عباد نے کہا کہ اگر ہمذانی مجھے مل جاتا تو میں اس کا ہاتھ قلم کر دیتا۔ پوچھا گیا، "کس لئے؟" جواب دیا: اس لئے کہ اس نے لغت کے ایسے جواہر جو شائقین علم کو برسوں کی محنت و ریاضت کے بعد ہاتھ آتے تھے، ہر خاص و عام پر لٹا دیئے۔ انسانی

تمدن و عمران، فکر و فلسفہ، تاریخ کے لعل و جواہر سید صاحب نے جس فیاضی اور بے پروائی سے اس کتاب کے صفحات پر لٹائے ہیں، میرا خیال ہے اسے دیکھ کر ہمارے پیشہ ور اہلِ علم بھی صاحب بن عباد کی طرح اپنے دل میں پیچ و تاب کھاتے ہوں گے!!

محمد کاظم

تین بہنیں (ڈرامہ)

مصنف: چیخوف　　　　مترجم: محمد سلیم الرحمٰن

ناشر: مجلسِ ترقی ادب، کلب روڈ، لاہور　　　　قیمت: دس روپے

چیخوف کا نام اردو پڑھنے والوں کے لئے انوکھا اور اجنبی نہیں۔ اس کی کہانیاں ایک زمانے میں موپساں کی کہانیوں کی طرح اکثر ترجمہ کی جاتی تھیں۔ اور ادبی رسائل میں چھپتی تھیں۔ وہ بڑے روسی مصنفین میں سے ہے ــــ طالسطائی اور دوستووسکی کی طرح کا ادبی دیو نہیں کیونکہ اس میں ان کی فراواں اور محیر العقول تخلیقی قوت اور زور آوری نہ تھی، مگر جین آسٹن کی مانند اس کی اپنی ایک چھوٹی ضلعی دنیا تھی، اور عام متوسط الحال گھریلو لوگوں کی خوشیوں، غموں اور امیدوں میں جھانکنے کی ایک پراسرار نظر۔ چیخوف نے کوئی ناول نہیں لکھا ــــ جیسے ہمارے سعادت حسن منٹو نے نہیں لکھا۔ شاید ان دونوں میں وہ روزانہ لگاتار مشقت کی ہمت بے انتہا صبر آزمائی، اور اپنے ذہنی پیکروں میں ایک بڑے کینوس پر رنگ بھرنے کی صلاحیت نہیں تھی۔ شاید ان کی بُری اور گرتی ہوئی صحت (یا سیمابی بے چینی!) ان کو کسی بھی لمبے کام میں ہاتھ ڈالنے سے روکے رہی۔ چیخوف نے کئی سو کہانیاں لکھیں، اور متعدد ڈرامے بھی جن میں سے بیشتر ان کی زندگی ہی میں سٹیج پر کھیلے گئے۔ کہانیاں (ان میں سے کئی ایک اچھوتے حسن کے شاہکار ہیں) اس نے آسانی اور روانی سے لکھیں ــــ وہ ایک قدرتی لکھنے والا تھا، اور پیدائشی افسانہ طراز۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے اپنے چند ایک بے مثل ڈرامے بڑی دقت سے، بڑی جان جوکھوں سے لکھے۔ یا بنائے۔ ڈرامہ نگاری ہمیشہ اس کے لئے ایک کٹھن چڑھائی رہی۔ ان میں پوری کیفیت بھرنے کی لگن میں اس نے انتھک جانکاہی کی، اور خون و پسینہ بہایا۔ ان کا ہر ایک لفظ، ہر ایک فقرہ دل کے لہو سے لکھا ہوا ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ ایسے ڈرامے لکھنا چاہتا تھا جو سٹیج ہو سکیں (ورنہ ڈرامہ لکھنے کا فائدہ!) ــــ اور انھیں لکھتے ہوئے دکھائی نہ دینے والے تماشائی اس کے پیشِ نظر تھے۔ ڈرامہ نگاری کا فن ایک مشکل فن ہے، جس کے لئے ایک خاص مزاج، ایک گھٹی میں پڑی مناسبت درکار ہے۔ اور یہ کوئی محض اتفاق نہیں کہ بہت کم بڑے ناول نویسوں اور مختصر افسانہ نویسوں نے اچھے قابلِ ذکر ڈرامے لکھے ہیں۔ موپساں نے کبھی کوئی ڈرامہ نہ لکھا۔ اور طالسطائی نے دو تین ڈرامے لکھے جو اس کی زندگی میں سٹیج ہوئے مگر جنھیں اب کوئی نہیں جانتا۔ انگریزی ناول نویسوں میں صرف آلیور گولڈ سمتھ کا SHE STOOPS TO CONQUER اب تک سٹیج کیا جاتا ہے۔ اور سومرسٹ ماہام نے تین چار اچھے ڈرامے لکھے، مگر پھر اپنے اصل ــــ مختصر افسانہ کی جانب لوٹ گیا۔ زندہ ناول نویسوں میں جے۔ بی۔ پریسٹلے نے یقیناً کئی اچھے ڈرامے ضرور لکھے ہیں لیکن ایسی ہمہ فنی غیر معمولی ہے۔ پھر اس کا الٹ بھی سچ ہے کہ بڑے ڈرامہ نگار اچھے مختصر افسانے یا ناول نہیں لکھ پائے۔ ولیم شیکسپیئر اور برنارڈ شا کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ آرتھر ملر، ٹینسی ولیمز، یوجین اونیل اور دوسرے مشہور ڈرامہ نگاروں نے وقتاً فوقتاً مختصر افسانے لکھے۔ وہ میری نگاہ سے نہیں گذرے مگر مجھے یقین ہے کہ وہ نہ لکھے جاتے تو بہتر ہوتا۔ چیخوف ایک ایسا لکھنے والا ہے جس کا مرتبہ مختصر افسانے میں بھی اتنا ہی اونچا ہے جتنا ڈرامہ میں۔ ہر دو اصناف میں اس کو ایک جیسی قدرت اور مشاقی حاصل رہی۔ اس کے بعض افسانے اور "چیری آرچرڈ" اور "تھری سسٹرز" جیسے ڈرامے سدا بہار ہیں۔ اور ان کی پُر فریب سادہ پُرکاری دل کو موہ لیتی ہے۔

سُنے ہوئے گیت مدھر ہوتے ہیں۔ مگر ان سُنے گیت سُنے گیتوں سے بھی مدھر ہوتے ہیں۔ بڑا فن سب کچھ کہہ دینے میں نہیں بلکہ بہت کچھ اَن کہا چھوڑ دینے میں ہے اور چیخوف اس سچائی کو اچھی طرح جانتا تھا۔ اسی لئے اس نے اپنے ڈراموں میں باتوں کو نہ کہنے کے فنکارانہ جتن کئے اور اس کے بیشتر ڈرامے تین تین چار چار بار لکھے گئے۔ وہ ان میں مسلسل کاٹ چھانٹ کرتا رہتا۔ اور اپنی تخلیق سے کبھی مطمئن نہ ہو پاتا۔ وہ ایک پیہم بے سکونی کی حالت میں رہتا تھا اور تکمیلِ فن کی فکر میں اس کی راتوں کی نیند حرام ہو جاتی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ "سٹیج پر ہر بات، بیک وقت اتنی ہی پیچیدہ اور اتنی سیدھی سادی ہونی چاہئے جتنی کہ وہ زندگی میں ہے۔" زندگی کی گمبھیر

الجھاہٹوں کو کھول کر رکھ دینے والی یہ سادگی کیسے قابو میں لائی جائے! ایک فن کار کے لئے اس سے زیادہ مشکل کام اور کوئی نہیں اور یہ پری ہر ایک کے شیشے میں نہیں اترتی۔ بڑے فن کار ہی اسے اپنی خوش نصیبی کے لمحات میں حاصل کر پائے ہیں۔ اور خبطی چھوٹے دوکاندار کا بیٹا انتون چیخوف ایک بہت بڑا فن کار تھا۔ وہ جینیس تھا۔

ہاں انتون چیخوف ایک جینیس تھا ـــــ اقبال کی طرح جو سیالکوٹ کے ایک ٹوپیاں بیچنے والے دوکاندار میاں نتھو کے گھر پیدا ہوا۔ (میں جانتا ہوں کئی امارت پسند کھوکھلے لوگ اقبال کے بارے میں میرے اس بیان سے سیخ پا ہوں گے ـــــ وہ لوگ، جو اس کی مجلد تصنیفات کو اپنے ڈرائنگ روم میں سجاوٹ کے لئے رکھتے ہیں اور انہیں کھول کر دیکھنے کی نوبت نہیں آتی ـــــ اور یہ یقین کرتے ہیں کہ اقبال بھی ان کی مانند متمول، معزز کھاتے پیتے والدین کی اولاد تھا!) انتون چھ بھائی بہنوں میں تیسرا تھا۔ اور کنبے کی گذران عزت و عسرت میں ہوتی تھی۔ ان کی بدقسمتی کہ ان کے باپ پاول کو فنون عالی سے طبعی لگاؤ تھا۔ اور جیسا کہ ہم جانتے ہیں، سچے آرٹسٹ فن کے حصول کے شوق میں اپنے بیوی بچوں کو فاقوں سے مرنے دینے میں زیادہ حرج نہیں سمجھتے۔ اس دھن میں پاول کا کاروبار تقریباً چوپٹ تھا اور اس کی دوکان نام ہی کو چلتی تھی۔ اولڈ پاول نے بڑی لگن سے اپنے آپ کو وائلن بجانا سکھلایا (یہ اس بے چارے کا قصور نہیں تھا کہ وہ بیتھوون یا باخ نہ تھا!) اور مقدس مورتیوں پر نقش و نگار رنگنے میں کافی مہارت بہم پہنچائی (اگر وہ مائیکل اینجلو نہ تھا تو ہم اسے الزام نہیں دے سکتے)۔ مذہبی راگ کا یہ جوش پاول کے سر پر یوں بھوت بن کر سوار تھا کہ مدرسے جانے کی عمر سے پہلے ہی اس نے اپنے بیٹوں کو کلیسا میں کیرول گانے کی تربیت دی۔ اس کے بچوں کو پو پھٹتے ہی بستر سے اٹھنا اور ہر موسم میں اپنے باپ کے پیچھے لین ڈوری میں کلیسا کی طرف پیدل گھسٹنا پڑتا تھا۔ ہمارے انتون نے ۱۸۹۲ء میں جب اس کی عمر تیس سال کی تھی اور وہ افسانے اور ڈرامے میں اپنے جوہر دکھا چکا تھا، ایک بار لکھا: "جب میرے بھائی اور میں تگڈم میں گرجے میں گاتے تھے تو لوگ ہمیں پرتحسین نظروں سے دیکھتے اور ہمارے والدین پر رشک کھاتے معلوم ہوتے۔ ہمارا یہ حال کہ ہم ننھے مجرموں کی طرح محسوس کرتے جو قید بامشقت کی سزا بھگت رہے ہوں۔"

اولڈ پاول قدرے خبطی اور اپنی بیوی اور اپنے بچوں کے لئے بگ بیر تھا اور وہ اس سے سہمے رہتے اور خوف کھاتے۔ وہ چھوٹے انتون اور اس کے بھائیوں کی اکثر بید سے تواضع کیا کرتا۔ اور بڑے ہونے پر چیخوف اس تلخی اور ذلت کو کبھی نہ بھول سکا۔ پاول ان کی ماں سے اکثر بدسلوکی اور سختی سے پیش آتا۔ یہ خوفناک گھریلو تماشے چیخوف کے ذہن پر ہمیشہ کے لئے اپنا نقش چھوڑ گئے۔ انتون چیخوف نے ۱۸۸۹ء میں اپنے بھائی الیکسندر کے نام ایک خط میں لکھا: "میں چاہتا ہوں تم اس استبداد اور الزام تراشی کو کبھی نہ بھلاؤ جس نے ہماری ماں کی جوانی کو تباہ کیا۔ اسی استبداد اور الزام تراشی نے ہمارے بچپن میں زہر بھر رکھا۔ میں اپنے بچپن کا سوچتا ہوں تو مجھے ہول آتا ہے اور طبیعت الٹنے لگتی ہے۔ اس دہشت اور کراہت کو یاد کرو جو ہم اس وقت محسوس کرتے تھے جب کھانے پر ہمارا باپ اس بات پر کہ شوربے میں نمک زیادہ ہے غصے سے بے قابو ہو کر ہماری بے چاری ماں پر بے طرح برس پڑتا تھا، کیسی جلی کٹی وہ سناتا تھا اسے ـــــ استبداد، ظلم ـــــ یہ اصل جرم ہے۔"

میرا خیال ہے ہمیں چیخوف کی ان تحریروں سے پاول گھرانے کا زیادہ تاریک تاثر قائم نہیں کرنا چاہیے۔ بہت سے والدین اور بہت سے گھرانے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ گھریلو ماحول جیسا بھی تھا اس نے چیخوف کو تباہ نہیں کیا۔ اس کے شعلے کو نہ بجھایا۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ ان کا باپ تلخیٔ ایام کا شکار تھا۔ اس کی اپنی محرومیاں، مایوسیاں، ہزیمتیں تھیں اور وہ ان کا غصہ گھر آ کر اپنے بیوی بچوں پر نکالتا تھا اور پھر وہ کاروباری آدمی سے زیادہ ایک آرٹسٹ تھا ـــــ زندگی کی معاشی جدوجہد میں بے عمل اور غیر موثر ـــــ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ آرٹسٹ ہونے کے باوجود اس نے اپنے بیوی بچوں کی کفالت سے ہاتھ نہ کھینچا۔ ان کے رہنے کے لئے چھت اور کھانے کے لئے جو تھی موٹی روٹی مہیا کی اور انہیں گلی میں نہیں پھینکا۔ نہیں پاول ایک ذمہ دار باپ تھا۔ اپنی نااہلی کے باوجود اس نے ایک سخت سوسائٹی میں اپنی روزی کمانے کے لئے ہاتھ پاؤں مارے۔ اور اپنے کنبے کا پیٹ پالا۔ اس تنگی میں بھی جب بچے بڑے ہوئے اس نے انہیں سکول میں تعلیم دلائی اور چیخوف پڑھ لکھ کر ڈاکٹر بنا۔ چیخوف کو جو ڈاکٹر سے زیادہ ایک افسانہ نویس اور ڈرامہ نگار تھا یہ فنی مزاج یقیناً ورثے

پادری سے وراثت میں ملا جو اپنے بیٹے کی "ایچیومنٹ" پر بے حد نازاں تھا۔ چیخوف نے شاید اسے بھی معاف نہیں کیا مگر پھر کتنے ہی گھرانے (ہم سب جانتے ہیں!)

سڑ پھول اور جنگ و جدال کی آماجگاہ ہیں ـــــ دم گھونٹ دینے والے جہنم۔ ایسے ہی جہنموں میں پھول کھلتے ہیں اور جینیس بھی جنم لیتے ہیں!

انہی بچپن اور لڑکپن کے تاثرات سے چیخوف میں زارسٹ روس کے متوسط الحال خاندانوں (یا ڈربوں) کی بے مصرف زندگی کی ڈگر کے خلاف وہ شدید نفرت پیدا ہوئی، جو پھر کبھی نہ گئی۔ اس کی کہانیوں اور ڈراموں میں ایک اداسی، بے حسی، شکست خوردگی کی جھٹپٹی فضا تیرتی ہے۔ ہم ہمیشہ زندگی کی تگ و تاز، اس کے سوز، اس کے حسن کے دقتی اور چند روزہ ہونے کو بھول نہیں سکتے۔ چیخوف کو پڑھتے ہوئے ہم جانتے ہیں کہ بلبل باغ میں سدا نہیں بولے گی اور جلد ہی پت جھڑ میں درختوں کے پتے جھڑنے لگیں گے اور یاروں کی محفلیں سونی ہو جائیں گی۔ چیخوف ایک دھیمی لے کا فن کار ہے۔ وہ عام آدمیوں کی مسرتوں، حسرتوں، امنگوں سے اپنی کہانیوں اور ڈراموں کے لطیف سبک تانے بانے بُنتا ہے۔ اس کے صفحات میں بادلوں کی کڑک دمک اور طوفانوں کا شور کہیں نہیں۔ ڈراموں میں اس کے کردار عام سادہ سے انداز میں بات کرتے ہیں۔ اس سادگی میں انسانی زندگی کی کتنی ہی پیچیدگیاں اپنی جھلک دکھا دیتی ہیں۔ اور کردار ہمارے سامنے اپنی حسرتوں اور خواہشوں کے ساتھ اس طرح روشن ہو جاتا ہے جیسے تیز سرچ لائٹ نے اسے آ ڈھونڈا ہو۔ چیخوف کے ڈراموں میں کوئی دھوم کا ڈرامہ نہیں۔ دھواں دھار تقریریں اور توپوں کی گھن گرج ـــــ نہیں میں غلط کہہ رہا ہوں، چیخوف کے ڈراموں میں وہ سب ڈرامہ ہے جو ہم عام انسانوں کی بظاہر بے کیف، پھیکی، بیزار زندگیوں میں تڑپتا رہتا ہے۔

"تین بہنیں" چیخوف کے اچھے ڈراموں میں سے ہے (یہ نہیں کہ اس نے کوئی بُرے ڈرامے بھی لکھے)۔ اس نے یہ ڈرامہ سنہ ۱۹۰۰ء میں لکھا (وہ اس وقت چالیس سال کا تھا اور ایک مانا ہوا مقبول ڈرامہ نویس) اسے یہ ڈرامہ لکھنے میں تقریباً ایک سال لگا۔ وہ اس ڈرامے سے خوش اور مطمئن نہیں تھا۔ اسے ڈر تھا کہ یہ اداس، طویل، بے ڈھنگم سا ہے اور ماسکو کے تماشائیوں کے مزاج کو نہیں بھائے گا۔ ایکٹرس سرجیکایا کو اپنی بے اطمینانی کا اظہار کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے: "بے ڈھنگم سے یوں کہتا ہوں کہ اس کی ہیروئنیں تین ہیں، بلکہ چار۔ اور ایک تیرہ و تار یاس انگیزی کی کیفیت اس میں رچی ہے" ـــــ یاس انگیزی اس ڈرامے میں ضرور ہے مگر پھر زندگی میں یاس انگیزی کے سوا کیا دھرا ہے۔ اور چیخوف کو غالباً اس بات کا یقین نہ تھا کہ اس نے ایک لطیف، خوبصورت شاہکار لکھا ہے جسے موت نہیں آسکتی۔

"تین بہنیں" میں ہم فانی انسانوں کے سارے کرب و اندوہ کی تصویر اس لطافت اور خوبصورتی سے کھینچی گئی ہے کہ ڈرامہ کا تاثر HAUNTING ہے ہماری عمر بھر کی محرومی، بے اجر محبت، روح کو کچلنے والے ازدواجی بندھن، دوبارہ ملنے کی امید کے بغیر جدائیاں ـــــ انسانی زندگی کا سارا ڈرامہ ـــــ اور سچا ڈرامہ ـــــ اس مکمل مرقع میں پرکاری سے سمو دیا گیا ہے۔ بہت کچھ نہیں کہا گیا، لیکن سب کچھ کہہ دیا گیا ہے۔ کہانی فقط اتنی ہے کہ تین بہنیں، ایک بھائی اور اس کی بیوی، ایک ضلعی بے رونق سے شہر میں رہتے ہیں۔ بڑی بہن آولگا جو کچھ کچھ کنبے کی ماں کا رول ادا کرنے لگی ہے۔ وہ سکول مسٹرس ہے۔ منجھلی ماشا لڑکوں کے ہائی سکول میں ایک ماسٹر کولاگن سے بیاہی ہے جو ماشا پر جان چھڑکتا ہے، اور ماشا اس نیک دل، موٹے، غیر ضروری طور سے پرجوش، باتونی شوہر سے قطعی بیزار اور بور ہے اور جھنجھلاہٹ کے بغیر بے چارے سے بات نہیں کرتی۔ ایرینا سب سے چھوٹی ایک جوان چنچل، رومینٹک تمناؤں سے بھری لڑکی ہے ہر ایک کی لاڈلی۔ وہ ڈاک خانے میں ملازم ہے۔ ان کا بھائی آندرے شہر کا کونسلر ہے، اور بڑا اپنی بہنوں کے اکلوتے بھائی بے چارے برآمویل کی طرح بے مصرف نکما نکھٹو۔ اس کی بہنیں اس کی سرفرازی کی بڑی آس لگائے ہیں۔ مگر آندرے نے برآمویل کی طرح ان کی امیدوں کو مٹی میں ملا دیا ہے۔ اس کی بیوی نتاشا کسی قدر بے ذوق، بدتمیز بیوی اور ماں ہے، گھر کی مالکن بننے کی ترکیبیں لڑانے والی۔ بھائی اور بہنیں ہر وقت ماسکو لوٹ جانے کی پُرحسرت باتیں کرتے ہیں، جہاں انھوں نے اپنے مرحوم بریگیڈیر باپ کے گھر میں بڑے عیش دیکھے تھے۔ بریگیڈیر باپ اس ضلعی شہر میں ایک گیریزن کا جرنیل بن کر تعینات ہوا اور [illegible] واقع ہو گئی۔ وہ اس بے جان ضلعی شہر سے نفرت کرتے ہیں اور ماسکو جانے کی اس طرح تمنا کرتے ہیں جس طرح

برف کے تودوں میں پھنسے جہاز کے ملاح بہار کے آنے کی۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ان کی امنگیں ولولے اس بے جان شہر میں دب رہے ہیں اور ماسکو جاتے ہی ان کے دکھ، اور رنج مٹ جائیں گے اور ہر ایک چیز مختلف ہو جائے گی مگر خوشی قوس قزح کی مانند جہاں کہیں بھی ہم کھڑے ہوں وہاں سے کچھ دور ہی رہتی ہے۔ آندرے ایک جگہ ضلع کے دفتر کے بوڑھے چپراسی کے سامنے پھٹ پڑتا ہے (جو اس کو نہیں سمجھ سکتا) "آہ! میری وہ ساری پچھلی زندگی کہاں گئی۔ وہ دن جب میں نوجوان اور ہنس مکھ اور ہوشیار تھا۔ وہ جو میں اس وقت ایک سے ایک عمدہ خواب دیکھتا تھا اور بڑے بلند پایہ خیالات رکھتا تھا، اور حال اور مستقبل میں ہر طرف امید کا اجالا نظر آتا تھا، وہ اب کہاں؟ اس کی کیا وجہ ہے کہ ہم ابھی ٹھیک طرح جینا شروع بھی نہیں کر پاتے کہ بے دل اور گھٹیا اور غیر دلچسپ بن کر رہ جاتے ہیں؟ ہماری اس سستی، بے تعلقی، بیکاری اور ناخوشی کا سبب کیا ہے۔ یہ شہر دو سو سال سے موجود ہے۔ اس میں ایک لاکھ انسان آباد ہیں لیکن کوئی ایسا نہیں جو باقیوں سے ذرا بھی مختلف ہو۔ اس جگہ کبھی کسی عالم یا فنکار یا ولی نے جنم نہیں لیا۔ کبھی کسی شخص کو اتنی امتیازی حیثیت بھی حاصل نہیں ہوئی کہ تمہارے دل میں اس کی برابری کرنے کا ولولہ ہی اٹھ سکے۔۔۔ یہاں لوگ کھانے پینے اور سونے کے سوا کچھ نہیں کرتے۔۔۔ پھر وہ مر جاتے ہیں اور ان کی جگہ ان ہی جیسے اور آ جاتے ہیں اور وہ بھی کھاتے پیتے اور سوتے رہتے ہیں۔ چونکہ بیکار پڑے رہنے کی وجہ سے کوڑھ مغز ہو جانے کا ڈر ہے۔ اس لئے گھناؤنی خوش گپیوں اور ووڈکا نوشی اور قمار بازی اور مقدمہ بازی میں پڑ کر اپنی زندگیوں کو چوں چوں کا مربہ بنائے رکھتے ہیں۔ بیویاں شوہروں کو جل دیتی ہیں، شوہر بیویوں سے جھوٹ بولتے ہیں اور ظاہر یہ کرتے ہیں جیسے انھوں نے کچھ دیکھا اور سنا ہی نہیں۔ اور یہ تمام بے امان خفیف الحرکتی اور عامیانہ پن بچوں کے حق میں زہر قاتل ہے اور ان میں اگر کچھ جولانی ہو بھی تو اسے باقی نہیں رہنے دیتی۔ چنانچہ وہ بھی بالکل ایک دوسرے کی طرح اور بالکل اپنے والدین کی طرح ناشاد اور نیم جان مخلوق بن کر رہ جاتے ہیں ۔۔۔" (جب چیخوف نے آندرے کے منہ سے یہ الفاظ کہلوائے تو کیا وہ تاگن روگ کے چھوٹے دکاندار اپنے باپ بوڑھے پاؤل کا سوچ رہا تھا؟)

ڈرامے میں سب کردار جیتے جاگتے ہیں، اکہرے، دوہرے اور تہرے۔ مجھے سب سے اچھا کردار پچاس سالہ توپ خانے کے کمانڈر لفٹننٹ کرنل ویرشی نن کا لگا اور میں چاہتا ہوں کہ ڈرامے میں کہی گئی اس کی باتیں چیرمین ماؤ یا چیرمین بھٹو کے اقوال کی طرح ایک کتابچے میں فراہم کر کے چھاپ دی جائیں۔ وہ ایک پُرشفقت، سلجھا ہوا، سرد و گرم چشیدہ فوجی ہے ۔۔۔ ایک خوبصورت آدمی جسے زندگی کے حزن و اندوہ نے بددل اور تلخ کام نہیں بنایا۔ محرومیوں نے اس کے وجود میں زہر نہیں بھرا۔ اس کی باتوں میں پھولوں کی خوشبو ہے، اور کتنی اچھائی، دانائی اور حقیقت! وہ مجھے ڈاکٹر سیموئیل جانسن کی یاد دلاتا ہے۔ ان دونوں میں، میں سمجھتا ہوں بہت سی باتیں سانجھی ہیں۔ جانسن الہامی لَے میں فیصلہ کرتا ہے۔ ویرشی نن میٹھی معقولیت کے انداز میں۔ دونو اور ROBUST فلسفی ہیں۔ ویرشی نن جو اپنی جوانی میں دل پھینک میجر مشہور تھا اور جو اب دو بچوں کا باپ ہے۔ ان تینوں بہنوں کے پھولوں اور روشنی کے کنج میں آکر صحیح معنوں میں خوشی محسوس کرتا ہے۔ آؤ جاتے جاتے لفٹننٹ کرنل الکساندر اگناتے وچ ویرشی نن کی باتوں کا مزہ لیتے چلیں۔

ماشا ویرشی نن کے سامنے اپنا دکھڑا روتی ہے کہ اسے اپنے خاوند سکول ماسٹر کولائی غن سے کوئی شکایت نہیں کیونکہ وہ اب اس کی عادی ہو چکی ہے "جب میری کسی ایسے آدمی سے ملاقات ہوتی ہے جو نفاست اور آداب اور شائستگی سے بالکل بے بہرہ ہو تو مجھے سچ مچ اذیت پہنچتی ہے۔ جب دوسرے استادوں کے ساتھ جو میرے میاں کے یار دوست ہیں، اٹھنے بیٹھنے کا اتفاق ہوتا ہے تو اتنی کوفت اٹھانی پڑتی ہے کہ کیا کروں۔"

"ہاں یہ ظاہر ہے۔" ویرشی نن جواب دیتا ہے "لیکن میں یہ سمجھوں تو کیا برا ہے کہ اس شہر میں یہ جیسا کیسا بھی ہے۔ شہری اور فوجی دونوں ہی یکساں طور پر غیر دلچسپ ہیں۔ ان میں انیس بیس کا فرق بھی نہیں۔ یہاں کسی پڑھے لکھے آدمی سے فوجی ہو یا عام شہری بات کرو تو بالعموم یہی سننے میں آئے گا کہ وہ عاجز آ چکا ہے: کس سے عاجز آ چکا ہے؟ یا تو بیوی سے یا گھر بار سے یا جائداد سے یا اپنے گھوڑے سے یا کسی اور چیز سے ۔۔۔ ہم روسیوں کے خیالات تو بڑے ارفع و اعلیٰ ہوتے ہیں ۔۔۔ تو پھر عملی زندگی میں ہم اتنی پست ہمتی کا ثبوت کیوں دیتے ہیں؟ اس کا کیا سبب ہے۔ ایسا کیوں ہے؟"

اور ویرشی نن ماشا اور ایرینا اور نتاشا کی محفل میں ماشا کے دکھڑے کے جواب میں کہتا ہے "میں نے ابھی ابھی فرانسیسی کابینہ کے ایک وزیر کی ڈائری پڑھی جو اس نے قید خانے میں لکھی تھی۔ اسے پناما نہر والے فراڈ کے سلسلے میں سزا ہو گئی تھی۔ جب قید خانے کی کھڑکی سے چڑیاں اڑتی دکھائی دیتی ہیں تو ان کا ذکر کرتے وقت وہ بڑی

جو "بلی خوشی" کا مظاہرہ کرتا ہے ــــ اور جب کلاپینہ کا وزیر تھا تو ان ہی چڑیوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا تھا۔ ظاہر ہے اب جو وہ رہا ہو چکا تو اسے آئندہ بھی ان چڑیوں کا خیال تو آنے سے رہا ــــ اور بالکل اسی طرح تمہارے ایک بار ماسکو پہنچنے اور وہاں دوبارہ آباد ہو جانے کی دیر ہے۔ پھر ماسکو تمہارے لئے کچھ بھی نہ رہے گا۔ ہم لوگ خوشی سے محروم ہیں۔ اور خوش رہنا ممکن بھی نہیں ہمیں خوشی کی صرف تمنا ہی تمنا ہے:

مگر اس طرح تو میں دیرشی نن کو کوٹ کرتا ہی چلا جاؤں گا۔ دیرشی نن کو ہی نہیں۔ فوجی ڈاکٹر چیوتائی کن کو بھی (آندرے کی بات پر کہ شادی وبال جان ہے۔ چیوتائی کن کہتا ہے: "شادی وبال جان ہی ہو شاید۔ مگر تنہائی کے بارے میں کیا خیال ہے۔ تنہائی بڑی ڈراؤنی شے ہے!) اور لفٹنٹ سیرن توزن باخ کو ــــ اور تینوں بہنوں کو ــــ اور میرا یہ ریویو ختم ہونے میں نہیں آئے گا اور مجھے اسے ختم کرنا چاہیے۔ ریویو اتنے لمبے نہیں ہونے چاہئیں جبکہ کتابیں موجود ہیں۔

چیخوف کا یہ خوبصورت ڈرامہ ہمارے پاس دھیمے کم گو سکالر اور شاعر محمد سلیم الرحمٰن کے بے عیب اردو ترجمے کے روپ میں آیا ہے۔ یہ ترجمہ در ترجمہ ایلیساویتا فین (ELISAVETA FEN) کے انگریزی ترجمے کا اتباع کرتا ہے۔ میں اسے اردو میں کئے گئے چند ایک عمدہ ترجموں میں شمار کروں گا۔ محمد حسن عسکری کے "مادام بواری"، "سرخ و سیاہ"، اور موبی ڈک کے ترجمے شیق الرحمٰن کا "ہیومن کامیڈی" کا ترجمہ۔ ابن انشا کے ایڈگر ایلن پو اور او ہنری کے افسانوں کے ترجمے سب نسٹے دیت ہیں۔ اور سلیم الرحمٰن کا یہ ترجمہ اسی گروہ میں جگہ پائے گا۔ البتہ یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں۔ (ویسے کہنے کی ضرورت بھی نہ تھی) کہ احمد شاہ بخاری پطرس کا گالزورڈی کی کہانی "اچیل تری" کا ترجمہ ابھی تک غالباً اردو زبان میں سب سے خوبصورت ترجمہ ہے ــــ واحد ترجمہ جو اورجنل کی شاعری اور لطافت کو دو چند کرتا ہے۔

مجلس ترقی ادب نے یہ کتاب اپنے جدید ڈراموں کے سلسلے میں اپنی معمولیانہ و عامیانہ روش سے ہٹ کر بڑے دیدہ زیب اجلے ٹائپ میں چھاپی ہے اور انھیں اس پر مبارکباد دینی چاہیئے۔ یہ البتہ میں نہیں سمجھ سکا کہ کتاب انھوں نے اتنی کم تعداد میں کیوں چھاپی ہے۔ صرف چھ سو نسخے! کیا عالمی ادب کے شاہکاروں کو پڑھنے والے اتنے تھوڑے ہیں؟ چیخوف کا ڈرامہ زارسٹ روس کا ڈرامہ ہی نہیں، اس میں ایک جہت گیری ہے اور اس کے کردار ہمارے ماحول اور معاشرے میں اب بھی چلتے پھرتے، سانس لیتے پہچانے جا سکتے ہیں، وہ ہماری زبان میں باتیں کرتے ہیں، اور ہمارے درمیان رہتے ہیں۔

محمد خالد اختر

عکس (جدید عربی نظموں کا منظوم ترجمہ)

مترجم: امجد اسلام امجد
ناشر: مجلس ترقیِ ادب، کلب روڈ، لاہور
قیمت: ۱۰ روپے

فلسطین، صیہونیت اور ہجرت ــــ یہ محض تین الفاظ نہیں بلکہ عالمی سطح پر اپنی بے پناہ اثر انگیزی کی بنا پر ایک بہت بڑے حادثے کے تین اجزا بن چکے ہیں۔ تین ایسے اجزا جن کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ فلسطین صدیوں سے ان مسلمانوں کا وطن تصور کیا جاتا تھا اور بالکل جائز طور پر جنھوں نے اس سرزمین کے ذرے ذرے میں اپنے دلوں کی دھڑکنیں سمو دی تھیں۔ ان مسلمانوں کے مجاہد بزرگوں نے برسوں کی نہیں، صدیوں کی مسلسل تگ و دو کے بعد اس ارض پاک پر رہنے بسنے کا حق حاصل کیا تھا اور کوئی انسانی ضمیر بھی ــــ بشرطیکہ وہ حقیقت کو حقیقت اور سچائی کو سچائی سمجھنے کی صلاحیت سے یکسر محروم نہ ہو چکا ہو۔ اس حق کو تسلیم کرنے میں تردد برابر تامل سے بھی کام نہیں لے سکتا۔ یہ حق اپنے سینے میں تاریخ کی صداقت لئے ہوئے ہے۔ مگر یہودیت کی ایک گھناؤنی سازش نے جسے عرف عام میں صیہونیت کہا جاتا ہے۔ دنیا کی عرب دشمن اور اسلام دشمن قوتوں کے بل بوتے پر فلسطین کو ارض موعود بنا کر فلسطین کے رہنے والوں پر عرصۂ حیات اس طرح تنگ کر دیا کہ آج یہ بدنصیب لوگ مختلف ملکوں میں پناہ حاصل کر کے گوناگوں مصائب کا سامنا کر رہے ہیں۔ صیہونیت نے فلسطین کے ان حقیقی باشندوں کو ایسی ہجرت پر کیوں کر مجبور کیا اور اس کے نتیجے میں لاکھوں بے گناہ انسانوں کو کیا کچھ پیش آیا اور پیش آرہا ہے۔ یہ تاریخ انسانی کا ایک نہایت المناک باب ہے۔
ایک بہت بڑا المیہ ہے ــــ ایک بہت بڑا سوال ہے جس کا جواب دینے سے صیہونیت کی حامی قوتیں ہچکچا رہی ہیں۔

اس حادثے نے عرب شاعروں کے دل و دماغ ہلا ڈالا ہے اور وہ اس ظلم کے خاموش تماشائی نہیں رہے بلکہ انھوں نے اپنے سینے کی آگ کو اپنے شعروں میں منتقل کر دیا ہے۔ یہ مجموعہ ان میں سے چھ شاعروں کی آتش نوائی سے عبارت ہے اور امجد اسلام امجد نے اس آتش نوائی سے ہم آہنگ ہونے کی ایک بڑی قابلِ قدر کوشش کی ہے اور یوں وہ آوازیں جو آج عراق، شام، مصر، لبنان اور خود فلسطین کی فضاؤں میں طوفان کی صورت گرج رہی ہیں، ہمارے دلوں تک بھی پہنچ گئی ہیں۔

یہ چھ شاعروں کی نظمیں ترجمے کے ذریعے اردو زبان میں کس طرح ڈھل سکیں، محمد کاظم نے اپنے بصیرت افروز اور فکر انگیز مقدمے میں اس کا ذکر کافی تفصیل کے ساتھ کیا ہے اور میں یہاں اس سلسلے میں ایک اقتباس پیش کرتا ہوں:

"عربی شاعری کے ان ترجموں کا سلسلہ کیوں کر شروع ہوا؟ اس کی بابت مجھے جو کچھ یاد ہے وہ یہ ہے کہ بیروت کے "الآداب" میں جب میں نے اس مجموعے کی پہلی نظم عبدلوہاب البیاتی کی بکاء الی شمس حزیران" (آفتاب جون کی نذر۔ ایک نوحہ) پڑھی تو اس نے مجھے غیر معمولی طور پر متاثر کیا اور میں نے اس کا اردو نثر میں ترجمہ کر کے امجد اسلام امجد کو دیا جس نے اس بارے میں مجھ سے کوئی تقاضا بھی کر رکھا تھا۔ بیاتی کے اس نوحے نے شاعر امجد کے دل کے تار بھی ہلا دیے اور اس نے اسے ایک درد و کرب کے اندر ہی اردو نظم میں ڈھال لیا — ایک ایسی نظم میں جس کا لب و لہجہ اور مزاج یہاں کی عام نظموں سے بالکل مختلف اور اس لئے اپنے اندر ایک نیا پن اور تازگی لے ہوئے تھا۔ میں نے امجد کی اس نظم کو ایک تنقیدی نظر سے دیکھا، یہ جاننے کے لئے کہ ترجمے کے عمل سے گزر کر بیاتی کی حساسیت نے کتنا کچھ کھو دیا ہے لیکن یہ دیکھ کر مجھے ایک خوشگوار حیرت ہوئی کہ اردو میں آ کر بھی بیاتی — بیاتی ہی رہا تھا، اور جو بات اس نے بکاء میں کہنی چاہی تھی وہ نوحے میں بھی اسی شدت، اسی گہرائی، اسی حسرت اور درد کے ساتھ موجود تھی۔"

بیاتی کی یہ شدتِ احساس، گہرائی، حسرت اور درد اردو نظم میں کیسے در آیا اور بیاتی کے علاوہ باقی چھ عرب شاعروں کے جذبات کس طرح اپنی نزاکتوں، لطافتوں، رنگوں، سایوں کے ساتھ عکس ریز ہو گئے۔ یہ سوال اپنی جگہ بڑا اہم ہے لیکن جواب کی تلاش میں کسی قسم کے تردّد کی ضرورت اس بنا پر پیش نہیں آتی کہ گو امجد ان شاعروں سے مکانی طور پر بہت دور ہے لیکن ان شاعروں کے جذبات — امجد کے اپنے جذبات ہیں۔ کسی زبان کا نثر پارہ تو دوسری زبان میں ترجمہ کرنے کے لئے کسی مترجم کی لسانی اور فکری صلاحیت کا محتاج ہوتا ہے مگر کسی زبان کی نظم بڑی ظالم چیز ہوتی ہے۔ یہ صرف ذہن کے راستے پر نہیں دل کے راستے پر بھی سفر کرتی ہے اسی لئے میں نے عرض کیا ہے کہ ان عرب شاعروں کے جذبات، شاعروں کی حساسیت کے ساتھ اسی وجہ سے اردو نظم میں آ گئے ہیں کہ ان کے لئے امجد کے دماغ کا دروازہ بھی کھلا تھا اور دل کا دروازہ بھی۔

"عکس" حقیقتاً عکس ہے محمد کاظم اور امجد اسلام امجد کی مشترکہ مساعی کا، اور دونوں نے عربی زبان کے ان نمائندہ چھ شاعروں کی شعری تخلیقات کی روح تک پہنچنے اور پھر اس روح سے اردو کو پُر ثروت بنانے کے لئے ایک دوسرے سے بھرپور اور نہایت مخلصانہ تعاون کیا ہے۔ اس تعاون کی عدم موجودگی میں عربی نظموں کا منظوم ترجمہ تو ہو سکتا تھا لیکن ان نظموں کے پس پردہ جو پُر خروش لب و لہجہ بر سرِ عمل ہے اور جو جذباتی ہیجان موجزن ہے اس سے اس ترجمے کو کوئی تعلق نہ ہوتا۔ محمد کاظم کے الفاظ میں میں بھی یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ امجد کے منظوم ترجمے میں صرف بیاتی ہی بیاتی نہیں رہا، ہر عربی شاعر وہ کچھ رہا ہے جو وہ تھا۔

ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو یہ ٹکڑا البیاتی کی نظم "آفتاب جون کی نذر — ایک نوحہ" میں سے لیا گیا ہے۔

اے جون کے آفتابِ گراں
تو نے کیوں ہم کو دنیا کی ہر آنکھ پر یوں برہنہ کیا
کیوں سگانِ گرسنہ کی خاطر ہمیں بے کفن سرد لاشوں میں چھوڑ گیا
ہمارا وطن ایک مصلوب ہے اور چاروں طرف آبرو کی بکھرتی ہوئی راکھ ہے
میرے ہر زخم پر مکھیاں بھنبھناتی ہیں، ان کو ہٹا دو، مگر یہ زرا دنہیں

بیسیتی اپنے کرب کو کم کرنے کا آرزومند نہیں۔ وہ اسے بڑھانا چاہتا ہے :

میرے ہر زخم پر مکھیاں بھنبھناتی ہیں، ان کو عزیز وا ڑا ڑو نہیں"

کیوں؟ اس کا جواب نازک الملائکہ کی نظم کے آخر میں مل جاتا ہے

تو اگر آگ ہے ہم لوگ ہیں ایندھن تیرا
ہو وہ یافا کہ جنین

اے غضب جوش میں آ
اپنی چھوٹی ہوئی مٹی کا ہر اک ذرۂ پاک

رات کا عہد ستارے کی طرح ٹوٹ کے گمنام ہوا
دستِ دشمن سے ہمیں لینا ہے

سالہا سال کی رسوائی بھری خاموشی
انتقام اور غضب کے شعلے! اور بھڑک

اور برداشت کا غم ختم ہوا
ہم عرب لوگ ہیں انگار ترے

اے چمکتی ہوئی پیشانی کے داغ
ہم ترے ساتھ ہیں اور ساتھ رہیں گے تیرے

دیکھ اس ریت کے ٹیلوں میں بھٹکتی ہوئی اس قوم کا دل
اور بھڑک

آگ کا زخم ہوا
انتقام اور غضب کے شعلے —— اور بھڑک

منظوم ترجمے کے متعلق میں یہ عرض کروں گا کہ امجد اسلام امجد نئی نسل کے ان شاعروں میں سرفہرست ہے جو اردو ادب کی شعری کلاسیکی روایات کے صحت مند حصے کو اپنا گراں قدر اثاثہ جانتے ہیں۔ وہ شاعری کی بنیادی خوبیوں کا قایل ہے اور عملاً قایل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے ہاں خوبصورت شاعری ملتی ہے۔ ایسی خوبصورت شاعری جس میں داخلی آہنگ بھی ہے لفظوں کا حسن انتخاب بھی، اور شاعرانہ لطافت بھی۔ ترجمے میں شعری آہنگ کو برقرار رکھنا بڑی اعلیٰ درجے کی ہنرمندی سمجھی جاتی ہے اور امجد اسلام امجد کے ترجمے میں یہ بڑی اعلیٰ درجے کی ہنرمندی موجود ہے۔ میرزا ادیب

چھتنار (نظمیں)

مصنف: قتیل شفائی ناشر: مکتبہ عالیہ، ایبک روڈ، انار کلی، لاہور قیمت: ساڑھے بارہ روپے

"ہریالی" سے "چھتنار" تک کا سفر کیسے قتیل شفائی کا سفر نہیں بلکہ یہ ہماری اردو شاعری اور اس کی پوری روایات کا انوکھا پرپیچ اور ارتقائی سفر ہے۔ فنی ارتقا کے زینے اتنے صاف ستھرے اور ہموار سطح نہیں کہ ان پر پاؤں دھرا اور اٹھتے چلے گئے۔ ان پر قدم رکھنے جمانے اور اوپر اٹھانے کے لئے بار بار خون جگر کے چھینٹے دینے پڑتے ہیں۔ اور گذشتہ کچھ عرصے میں جبکہ بڑے بڑوں کا پتہ پانی ہوگیا ہے، قتیل بڑی بے جگری اور ثابت قدمی کے ساتھ آگے بڑھتا اور اوپر اٹھتا رہا ہے۔ "چھتنار" اس کی فنی رفعت، نظر کی وسعت اور فکر کی گہرائی کا دلنواز اور منہ بولتا ثبوت ہے۔

قتیل نے اپنی زندگی اور شاعری دونوں میں ایک ساتھ اور مسلسل ریاضت شروع کی تھی۔ اسی دوطرفہ ریاضت کے طفیل اس نے زندگی کے کسی حصے میں نہ تو الفاظ کی شعبدہ بازی ہی دکھائی ہے اور نہ اسے سوداگری کا وسیلہ ہی بنایا ہے۔ بے شک اس نے آسائشیں بھی پائی ہیں لیکن ان آسائشوں کے ہجوم میں یا ان کی خاطر کسی مصلحت کی دہلیز پر اپنے فن کی ناک نہیں رگڑی۔ اس نے جوانی بلکہ نوجوانی ہی کے عالم میں زخم کھائے اور خوب خوب کھائے ہیں۔ پھر جب ان زخموں پر وقت نے مرہم رکھا تو اسے یہ عمل اندمال پسند نہیں آیا —— اس نے بار ہا ان زخموں کو کریدا اور ان کے رستے ہوئے لہو کو نوک قلم سے ٹپکا ٹپکا دیا۔ کہ پھر زندہ سکے اور شعر کہہ سکے۔

احساس کے تعلق میں ہر آن جلتا ہوا شاعر جب ادراک کی سرحدیں داخل ہوتا ہے تو اس سرزمین میں بہت آگے نکل جاتا ہے۔ قتیل کے اندر سسکتا ہوا آدمی باہر کے ان گنت پھٹے حال انسانوں سے گلے ملتا ہے تو وہ کہہ اٹھتا ہے :

بول مٹی کب گونجے گا آخرِ شب کا نقارہ
مارے گا شبخون کبھی تو اندھیاروں پر اجیارا

اندھیاروں پر شبخون مارنے کی لگن اور تڑپ قتیل کو اتفاقی یا معجزاتی طور پر ودیعت نہیں ہوئی بلکہ یہ سب کچھ اس کے اس آدرش کی رہین ہے جو اس نے اپنے جذبہ و فکر کی مکمل ہم آہنگی سے حاصل کیا ہے۔

قتیل انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام اور ادبی تاریخ کی اس سب سے عظیم تحریک میں شروع ہی سے شریک رہا۔ اس وادیِ پر خار میں آبلہ پائی کرتے ہوئے اس نے کئی چیزوں کو بہت قریب سے دیکھا —— اور پھر جب آج وقت کی گرد نے ان میں سے بعض چہروں کے نقوش دھندلا دیئے ہیں قتیل کے نظریہ حیات اور نظریہ فن میں کوئی تغیر رونما نہیں ہوا —— دھندلے یا مسخ ہونے والے ایک ایسے ہی چہرے کو دیکھ کر اس کا تلخ شگفتہ قلم پکارتا ہے۔

آج کل ہیں نو دولتیوں کے پانچ سواروں میں شامل
چودھری صاحب "سوشلزم" کے سخت مخالف ہیں
اور پانچوں وقت مصلے پر لاکھوں کی باتیں کرتے ہیں

قتیل نے پچھلی چوتھائی صدی کے پر آشوب اور تخلیق کش دور میں بھی جہاں چاروں طرف سے ترغیبات اور آلائشوں کی یلغار تھی، اپنی صداقت کو محفوظ اور قائم رکھا ہے۔ وہ ہمیشہ کی طرح آج بھی ادب کے ترقی پسندانہ نظریہ حیات کو سینے سے لگائے ہوئے ہے۔ اسی کے طفیل اس کا بیدار شعور جب اسے دورِ حاضر کا آئینہ دکھاتا ہے تو وہ "ضمیر" کا نوحہ لکھے بغیر نہیں رہ سکتا —— اللہ کو پیارا ہونے والا یہی ضمیر:

کچھ ایسے نامور پاپیوں کے پیٹ بھر گیا
کہ جن کے کاسہ ہنر کی دھوم دور دور ہے

قتیل کے سینے پر جیسے جیسے زخموں کے تمغے سجتے گئے، جیسے جیسے معاشرے میں خیر و شر کی آویزش شدید اور ظالم و مظلوم کے درمیان ٹکراؤ نمایاں ہوتی گئی ویسے ویسے قتیل کا جرمِ صداقت بڑھتا اور اس کا نشترِ طنز تیز سے تیز تر ہوتا گیا ہے۔ نظم "سبحان اللہ"، "ضمیر" اور "بہی کھاتہ" اسی گہرے اور تیکھے طنز کی خوبصورت مثالیں ہیں۔

قتیل کا بیدار تاریخی شعور "سامراج" کو "زندگی کا غلیظ دشمن" قرار دے کر اسے اذنِ فنا دیتا ہے اور دوسری طرف ویٹ نام کے جیالے مجاہدوں کو ان الفاظ میں خراجِ تحسین ادا کرتا ہے:

ظلم سے وہ کب ڈرتے ہیں
ظالم سے کب ہرتے ہیں
بسے ہیں جن کے ذہنوں میں
لینن، ماؤ، ہوچی منہ

قتیل نے نہ تو کبھی اپنے جذبِ دل کی آنچ مدھم ہونے دی ہے اور نہ کبھی فکر و نظر کے چراغ ہی بجھنے دیئے ہیں۔ وہ سناتا ہے اپنی بیٹی کی سماعت سے دائمی محرومی پر اپنی روح کا سارا کرب اور بے بسی کے آنسو کاغذ پر بکھیر کر ایک حسین نظم کو جنم دیتا ہے، دوسری طرف اپنے وطنِ عزیز میں ہونے والے ناٹک کا یہ منظر دکھاتا ہے:

ہائے کیا اپنا دیس ہے کہ جہاں
خون سستا، شراب مہنگی ہے

اور پھر اسی دیس کے باسیوں کو خود ان کی بہبود اور "دفاع" کی خاطر یہ مشورہ دیتا ہے:

کاغذ کا یہ دور بھی
بہتر ہے تم اپنے اپنے تن لوہے سے ڈھانپو
پر سیدھے سادے لوگو!
کاغذ کے اس دور میں جینے کا اک ڈھنگ یہی ہے

"چھتنار" کی نظمیں پڑھتے ہوئے جیسے جیسے میں آگے بڑھا ہوں مجھے محسوس ہوا ہے قتیل کا سفرِ مملکت ادراک میں کافی دور اندر تک چلا گیا ہے۔ اُس کے احساس کے الاؤ میں سے فکر و شعور کا ایک نیا اور البیلا نور پھوٹنے لگا ہے۔ اس کا علم خود قتیل کو بھی ہے؛

حسنِ معنی مرے احساس پہ چھایا جب سے — میرے احساس کے ہاتھوں پہ ہے رعشہ طاری

مصرفِ خونِ جگر پوچھ رہا ہوں سب سے — وسعتِ ارض میں اک تیشۂ بے ضرب لئے

اور میں یہ کہنے کی جسارت کرتا ہوں کہ قتیل کا تیشہ اب زیادہ دیر تک بے ضرب نہیں رہے گا۔ اُس کا خون یقیناً اُسی نسان کو ملے گا جو خود اُس کے الفاظ میں نسل در نسل اُسے آگے بڑھائے گا اور یہی شخص وہ کوہکن ہو گا جس کا تیشہ دیوہیکل پہاڑوں کا سینہ چیرے گا اور جو اپنا سر پھوڑنے کی بجائے غاصبوں کا پنجہ مروڑ کر اپنی مسرتوں کی شیریں کو چھین لے گا ــــ اور تب میں اس لمحے آخر شب کا نقارہ گونجے گا، اور قتیل کے شعروں کی طرح حسین ہنستی گاتی مسکراتی ہوئی صبح طلوع ہو گی ــــ پھر کبھی غروب نہ ہونے کے لئے۔

عزیز انڑی

زرگذشت (مزاح)

مصنف: مشتاق احمد یوسفی — ناشر: مکتبہ دانیال، کراچی — قیمت: ۲۵ روپے

میرے پسندیدہ اردو مزاح نگاروں کی ایک ہاتھ پر گنی جانے والی محدود اقلیت میں سے دو "صاحب" ایسے ہیں جن کے بارے میں آج تک میں اس شبے میں مبتلا ہوں کہ کسی اور سے لکھواتے ہیں۔ میری مراد محمد خالد اختر اور مشتاق احمد یوسفی سے ہے۔ محمد خالد اختر کے بارے میں میرا دعویٰ ہے کہ کوئی ناواقف شخص (محمد خالد اختر سے، اُن کے ادب سے نہیں) کم از کم پہلی چھ ملاقاتوں کے بعد (دورانیہ فی ملاقات ــ کم از کم ایک گھنٹہ) یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس شخص نے زندگی میں ایک مزاحیہ جملہ لکھا ہو گا ــ مشتاق احمد یوسفی سے میری بالمشافہ ملاقات نہیں ہے لیکن اُن کے بارے میں بھی رپورٹیں کچھ اسی طرح کی ملی ہیں۔ یوسفی کے بارے میں اشفاق احمد کا کہنا ہے کہ اس اکیلے شخص نے اپنے پیٹ میں اتنے السر (ULCER) پال رکھے ہیں کہ درمیانی صحت کے پورے پورے قبیلوں کو نصیب نہیں ہوتے۔ ایسے بیمار جسموں کی اس قدر شگفتہ تحریریں پڑھ کر "صحت مند جسم صحت مند ذہن" کے مقولوں سے ایمان اُٹھ سا جاتا ہے بلکہ کبھی کبھی تو باقاعدہ بیمار ہونے کو جی چاہتا ہے۔ یوسفی کی تازہ ترکتاب "زرگذشت" پر کچھ لکھنے کے بجائے میرا جی چاہتا تھا کہ واہ واہ سبحان کے بعد اس کے اقتباس در اقتباس درج کرتا چلا جاتا کہ جادو وہی ہے جو آپ کے سر پر بھی چڑھ کر بولے۔ مگر اس اقدام سے پہلے مجھے اپنی طالب علمی (نصابی طالب علمی) کا ایک تجربہ یاد آ گیا اور یوں معاملہ ٹل گیا۔ تجربہ کچھ یوں تھا کہ میں ایک زبردست قسم کے نقاد (استاد) کی تنقیدی کتاب پڑھ رہا تھا (امتحان پاس کرنے کے لئے ان کتابوں کے پل صراط سے گذرنا ہی پڑتا ہے) سوا چھ سو صفحے کی کتاب تھی۔ میں موصوف کے علم سے زیادہ اُن کی مشق تحریر سے متاثر ہوا کیونکہ کتاب سے دیگر ناقدوں کے اقتباسات (جو ضمناً ہو کر ان نقادوں میں زیادہ تر اُن کے اپنے ہم پیشہ و ہم مشرب بزرگ تھے) منہا کر لیے جاتے تو فلیپ اور فہرست سمیت باقی کتاب ساڑھے تین صفحات کی رہ جاتی تھی۔

مزاح کے ضمن میں "آمد اور آورد" کا جھگڑا شاعری سے بھی زیادہ الجھا ہوا ہے۔ ذاتی طور پر میرے دل کو وہ مزاح زیادہ کھینچتا ہے جو SPONTANIOUS ہو (اس لفظ کا صحیح متبادل تلاش نہ کر سکنے پر شرمندہ نہیں ہوں کیونکہ مجھے اردو سے پیار ضرور ہے مگر میں اسے مکمل ترین زبان سمجھنے کے وہم میں گرفتار نہیں ہوں)۔ ایسا مزاح جو بقول کسے "سبزے پر آبِ رواں کی طرح پھیلتا چلا جائے" ــــ بناوٹ، ساختگی اور پنجابی محاورے کے مطابق کھینچ کر زور لگا کر لکھا ہوا مزاح میرے حلق سے نہیں اترتا لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ SPONTANIOUS مزاح میں غیر معیاری مزاح کا اتنا ہی امکان ہوتا ہے جتنا محنت سے ترتیب دیئے ہوئے مزاح میں خوبصورتی اور گہرائی کا۔ کرنل محمد خان کی "بجنگ آمد" اور یوسفی کی "چراغ تلے" اول الذکر انداز نگارش اور ان ہی دونوں کی بسلامت روی

ئے بے ساختہ کے بارے میں کیا خیال ہے؟ ــــ ادارہ

اور "خاکم بدہن" ثانی الذکر کی مثالیں ہیں اور میرے نزدیک دونوں حضرات کی پہلی کتابیں بلاشک وشبہ دوسری والی سے بہتر ہیں اور ان کی کامیابی میں ان کے اسلوب کو گہرا دخل ہے۔

یوسفی کی "زرگزشت" اس لحاظ سے خصوصی توجہ کی مستحق ہے کہ اس کا مزاج نہایت محنت، سلیقے اور ذہانت سے ترتیب دیا گیا ہے مگر مصنف کی تخلیقی صلاحیت اتنی زوردار ہے کہ اس نے آورد میں آمد کا سا لطف پیدا کر دیا ہے۔ اس کتاب سے ثابت ہوتا ہے کہ بعض اوقات گلدان میں لگا ہوا پھول بھی چمن کے خودرو پھول سے زیادہ خوبصورت ہو سکتا ہے (پھول اور گلدان کی خوبصورتی پیش نظر رہے)، یہاں میں یہ واضح کر دوں کہ آمد اور آورد کو میں مولانا حالی کے معنوں میں استعمال نہیں کر رہا۔ اصل مسئلہ یہ نہیں کہ مصنف نے جذبوں اور خیالات کو من وعن پیش کر دیا ہے یا انہیں جدید تراش خراش کے سوٹ پہنا کر پیش کیا ہے، بلکہ یہ ہے کہ اس کے جذبے اور خیالات ہیں کیا — اگر تونسوی "باپ" مزاح اور یوسفی کے مزاح میں بنیادی فرق آمد اور آورد کا نہیں، اچھے اور برے کا ہے، معاف کیجئے، برے اور اچھے کا ہے۔

"زرگزشت" اردو کے مزاحیہ ادب میں ایک بہت اہم، بہت بڑا اضافہ ہے۔ یوسفی نے کوشش کر کے اس کی ہر سطر، ہر پیرا، ہر صفحہ اور ہر باب دلچسپ بنانے کی کوشش کی ہے اور اگر یہ عیب ہے تو اس عیب میں سب سے بڑا ہنر یہ ہے کہ یوسفی اپنی کوشش میں سو فیصدی کامیاب ہے —! یوسفی نے اس کتاب میں فن مزاح نگاری کے ترکش کا کم وبیش ہر تیر استعمال کیا ہے اور قاری کو یہ شکوہ نہیں ہوتا کہ "ہے ایک تیر جس میں دونوں چھدے پڑے ہیں" بلکہ مصنف نے دل وجگر، ہر دو اعضائے رئیسہ پر باقاعدہ چاندماری کا اہتمام کیا ہے۔

"زرگزشت" یوسفی کے بقول "سوانح نوعمری" ہے لیکن یہاں مصنف غالباً تکلف سے کام لے گئے ہیں کیونکہ اس نوعمری میں بھی وہ چار عدد اطفال کے والد گرامی تھے۔ البتہ یہ اعلان انہی خصوصیات سمیت کسی خاتون کی طرف سے ہوتا تب اور بات تھی۔ یوسفی جملہ معترضہ اور رعایت لفظی کے ماسٹر ہیں۔ ضرب الامثال اور شعروں میں تحریف کا فن ان کے گھر کا لونڈا ہے (اور وہ ہرگز اس سے لونڈوں والا سلوک نہیں کرتے!) — بات سے بات خوب نکالتے ہیں اور بعض اوقات تو نکالتے ہی چلے جاتے ہیں۔ کردار کی تصویر کشی میں پانچوں حیات سے کام لیتے ہیں چنانچہ آپ مسٹر اینڈرسن، عبادالرحمٰن تالب، بشاس پاشا کنجو اور خان سیف الملوک خان وغیرہ کو نہ صرف دیکھ سُن اور چھو سکتے ہیں بلکہ سونگھ اور چکھ بھی سکتے ہیں۔ مس ریمزڈن کے سلسلے میں البتہ میں عملی مظاہرے کے نتائج کی ذمہ داری نہیں لے سکتا۔ دیکھا جائے تو یہ کتاب یوسفی کی ملازمت کے ابتدائی چھ سالوں کی ایک روداد ہے جس میں واقعات کم اور کردار زیادہ ہیں۔ ایک ذہین، شوخ اور چنچل شخص کس طرح کاموں میں اپنے لئے گلزار کھلا دیتا ہے۔ یہ کتاب اس کا ایک زندہ ثبوت ہے۔ یہ ایک جسمانی طور پر بیمار، مصائب میں گرفتار، بنک کے ایک بظاہر معزز مگر غریب اہل کار کی سرگزشت ہے جس میں زر اگر کہیں ہے بھی تو گذشت ہی گذشت ہے۔ یوسفی نے اپنے اردگرد مختلف کرداروں میں ایسے ایسے مضحک پہلو تلاش کئے ہیں کہ ان کی بصارت / بصیرت کا قائل ہونا پڑتا ہے — اب موقع ہے کہ ایک اقتباس دے دیا جائے۔ اگرچہ یہ حکایت اتنی لذیذ ہے کہ "دراز تر گفتم" کو جی چاہتا ہے لیکن اس ڈر سے مختصر کرتا ہوں کہ کوئی ہونہار طالب علم (ادب کا) اس مضمون سے اقتباس (ذات) علیحدہ کر کے گننے نہ بیٹھ جائے۔ کتاب یوں شروع ہوتی ہے:

> "کراچی میں سردی اتنی ہی پڑتی ہے جتنی مری میں گرمی۔ اس سے ساکنان مری کی دل آزاری نہیں، بلکہ عروس البلاد کراچی کی دلداری مقصود ہے۔ کبھی کبھار شہر خوباں کا درجہ حرارت جسم کے نارمل درجہ حرارت یعنی ۴ء۹۸ سے دو تین ڈگری نیچے پھسل جائے تو خوبان شہر لحاف اوڑھ کر ایرکنڈیشنر تیز کر دیتے ہیں۔ حسن خودبین وخودآرا جب ۴۳ نمبر کے مشمولات کا ۳۲ نمبر کے سویٹر میں خلاصہ کر کے آئینہ دیکھتا ہے تو حیا کی سرخی رخساروں پر دوڑ جاتی ہے جسے موسم سرما کے خون صالح پر محمول کیا جاتا ہے۔"

پاکستان کے ابتدائی دنوں میں ہمارے بنکوں کی کیا حالت تھی! آج کے بینک دیکھیں تو یقین نہیں آتا (مگر ہمیں تو یہ یقین بھی نہیں آتا کہ آج سے صرف چالیس برس پہلے دیسی گھی ایک روپے سیر اور دیسی گندم کا آٹا ڈیڑھ روپے من سرعام بکا کرتا تھا) یوسفی کا بینک اپنی اصل میں کانجی ہاؤس سے متاثر نظر آتا ہے۔ فرق

صرف اتنا ہے کہ اس میں داخلے کے لئے آوارگی سے زیادہ انٹرویو اور انٹرویو سے زیادہ سفارش کی ضرورت تھی (داخلے کی شرائط تک آج کل بھی حالات کم و بیش وہی ہیں)۔ اینڈرسن کا کردار اس قدر حقیقی ہے کہ فکشن بن گیا ہے اور اردو فکشن میں شفیق الرحمٰن کے "روفی"، محمد خالد اختر کے چچا عبدالباقی" اور کرنل محمد خان کے "بیم لفٹین" کی طرح ہمیشہ زندہ رہے گا۔ ایک مغلوب الغضب انسان اور مستقل شرابی ہونے کے علاوہ اینڈرسن ایک بہت چالاک، زمانہ ساز، برخود غلط اور "انگریز" افسر بھی تھا — "زرگزشت" میں اس کی شخصیت کے یہ مختلف اور کہیں کہیں بظاہر متضاد پہلو یوسفی نے نہایت فن کارانہ چابکدستی سے ایک ایک کرکے دکھائے ہیں لیکن کسی بھی جگہ ان کا رویہ جانبدارانہ نہیں ہوا۔ ان کے انداز نظر کی اسی معروضیت نے ان کے شگفتہ طرز بیان سے مل کر اس کردار میں مولوی مدن کی سی بات پیدا کردی ہے۔ اینڈرسن سے پہلی ملاقات جو مصنف کا انٹرویو برائے ملازمت بھی تھی، سطر سطر قہقہہ ہے مشتے از خروارے دیکھئے:

"اور تم RIMLESS GLASSES کیوں لگاتے ہو؟ تمہاری صورت مرا سٹیفرڈ کرپس سے ملتی ہے۔"

"ذرہ نوازی کا شکریہ!" ہم نے خوش ہو کر کہا۔

"مجھے اس باسٹرڈ کی صورت سے نفرت ہے۔"

"کتنی بیویاں ہیں؟" اس نے سوال کرکے ہونٹ بھینچ لئے۔

"ایک"

"مجھے تو چار پر بھی اعتراض نہیں، لیکن چار بیویوں میں قباحت یہ ہے کہ چار دفعہ طلاق دینی پڑتی ہے۔"

"تم پائلٹ ہو؟"

"نہیں تو! ایئر کریش میں وفات پانے کے لئے آدمی کا پائلٹ ہونا ضروری نہیں۔"

یوسفی نے یہ کتاب ایک طرح کی FREE ASSOCIATION میں لکھی ہے۔ وہ یوں کہ کسی موضوع پر بات کرتے کرتے وہ کوئی لفظ، کوئی واقعہ یا کوئی صورت حال لیتے ہیں اور پھر اپنے ذاتی ماضی یا علمی و دیگر معلومات کی دنیا میں غوطہ زن ہو کر اس سے ملتی جلتی باتیں چھیڑ دیتے ہیں اور کئی کئی صفحوں کے بعد اسی طرح چھوڑی ہوئی بات کو پکڑتے ہیں جس طرح مولوی حضرات وعظ کے دوران "ٹائم پاس" کرتے ہیں کہیں کہیں تو یہ FLASH BACK اتنے دلچسپ ہو جاتے ہیں کہ اصل واقعے کے ساتھ "تو من شدم من تو شدی" کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ قبلہ احمد ندیم قاسمی سے روایت ہے کہ ایک دن بازار میں دو آدمی ایک دوسرے کی خاتون رشتہ داروں کے ساتھ مزید رشتہ داریاں جوڑنے میں مصروف تھے۔ لڑنے والوں میں سے ایک صاحب کا کوئی واقفکار گزرا اور اس نے صورت حال کو سمجھے بغیر سلام داغ دیا۔ سلام وصول کرنے سے پہلے وہ صاحب، مخالف کو آدھی گالی دے چکے تھے لیکن سلام کا جواب بھی فرض تھا چنانچہ دیا گیا۔ مکمل جملہ کچھ یوں بنا:

"الو کے ——— وعلیکم السلام ——— پٹھے"

ایمانداری کی بات یہ ہے کہ یوسفی کے قلم کی جولانیوں اور غیر معمولی شگفتگی نے کچھ ایسی فضا پیدا کردی ہے کہ تکنیک اور کہانی قسم کی فضولیات کی طرف ذہن منتقل ہی نہیں ہوتا۔ ایک سیلاب قہقہہ ہے کہ قاری کو اپنے ساتھ بہائے لئے چلا جاتا ہے اور جب کتاب ختم ہوتی ہے اور مژگاں کھلتی ہیں تو شہر کو سیلاب لے کر کب کا جا چکا ہوتا ہے۔ بلاشبہ "زرگزشت" ایک عمدہ کتاب ہے اور یوسفی ہمارے شکریے کے مستحق ہیں۔ ان سے ایک ہی شکایت ہے کہ وہ بہت کم لکھتے ہیں لیکن اگر وہ وعدہ کریں کہ وہ ہر پانچ برس میں ایسی ایک کتاب لکھ دیا کریں گے تو آئندہ شکایت کرنے والا کافر — اس مختصر تبصرے کی وسعت بقدر شوق نہیں چنانچہ میں بہت سی باتیں ایک مفصل مضمون کے لئے الگ باندھ کے رکھ رہا ہوں۔ البتہ جاتے جاتے یوسفی کے فن

تحریف نگاری کی چند مثالیں ضرور پیش کرنا چاہوں گا۔ پوری کتاب میں انھوں نے جگہ جگہ اس فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ ان کی کامیابی کا اوسط سو فیصد ہے اور یہ تو غالباً آپ کو پتہ ہوگا کہ ایک سو میں سو فیصد سے زیادہ کی گنجائش نہیں ہوتی۔

"بندۂ مزدور کے اوقات"

"کم خرچ بالا خانہ نشین"

"پیسے پیسے اور زنانِ شبینہ کو محتاج ہو گئے"

"جوش صاحب کی طرح ساری داستان امیر غمزہ سنانے اور اپنے دامن کو خود ہی آگے سے پھاڑنے کے بعد"

"خاندانی منصوبہ بندی کے مطابق دستور العمل بنایا جاتا"

"کیا قدوسی کیا قدوسی کا شوربہ"

"چالیس سفید گھوڑیاں علیحدہ اصطبل میں بند کی جاتی تھیں، جہاں مردوں کا داخلہ ممنوع تھا"

"تجھے اٹھکیلیاں سوجھی ہیں، ہم بیدار بیٹھے ہیں"

اور اب آخر میں بالکل ہی چلتے چلتے چند جملے بھی "چلتے چلتے" آپ کے اور میرے لئے ہے، جملوں کے لئے نہیں)

"ایجاد اور اولاد کے لچھن پہلے ہی سے معلوم ہو جایا کرتے تو دنیا میں کوئی بچہ ہونے دیتا اور نہ ایجاد"

"قرضہ جات کو پرزہ جات میں ڈھالنا اس صاحب ایجاد کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا"

"جس کی انگریزی اس کے چال چلن سے بھی زیادہ ٹوٹی پھوٹی تھی"

"ڈان اخبار کی ردی نکلی۔ چند لاشیں بھی برآمد ہوئیں۔ یہ ان چوہوں کی تھیں جو اخبار مذکور الصدر کا ایڈیٹوریل کھاتے ہی ڈھیر ہو گئے"

"ہماری چال شطرنج کے گھوڑے ایسی ہو گئی"

"مگر ہم نے جو کھیل دیکھا اس میں تو پرتھوی راج گھوڑے کے بجائے سنجوگتا کے ایڑ لگا رہا تھا"

"ہمارے ہاں کوئی بی اے فرسٹ ڈویژن میں پاس کرے تو پرائمری اسکول میں ماسٹر ہو جاتا ہے اور فیل ہو جائے تو فوج میں کپتان!"

"دو تین غزلیں ہمیں بھی سنائیں۔ ۲۵ فیصد اشعار وزن سے گرے ہوئے تھے، بقیہ تہذیب سے"

"مال بردار جہاز سے پیسنجر کس طرح چھڑایا جاتا ہے"

"بحری جہاز کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس کا ایئر کریش نہیں ہوتا"

"ایک انگلی سے بجے کو کر کے اس طرح ٹاپ کی جیسے ملکہ پکھراج اور طاہرہ سید گانا ٹاپ کرتی ہیں"

"سب جانوروں اور پرندوں کو پشتو میں گالی دیتے تھے لیکن کبوتر سے اردو میں خطاب فرماتے کہتے تھے کبوتر سید ہوتا ہے"

"صاحبو! گیلا غسل شدہ کتا سوکھے کتے سے کہیں زیادہ پلید ہوتا ہے"

"ہم نے کہا یہ تو پطرس کی سائیکل معلوم ہوتی ہے" ——— "نہیں تو ——— میری ہی ہے۔ کیا وہ بھی چاکیواڑہ میں رہتا ہے"

قصہ مختصر یہ کہ "زرگذشت" میں "چراغ تلے" اور "خاکم بدہن" کے یوسفی نے عمدہ مزاح کی ایک ایسی بلند سطح تک رسائی حاصل کی ہے جو فی الوقت اردو مزاح نگاری کی بلند ترین سطح ہے۔

امجد اسلام امجد

ہمہ رنگ و نغمہ انساں (نظم)

مصنف: قمر ہاشمی — ناشر: آدرش پبلی کیشنز، ۶۰۵، قمر ہاؤس، کراچی ۲ — قیمت: ۵ روپے

"ہمہ رنگ و نغمہ انساں" ایک طویل نظم ہے جناب قمر ہاشمی کی جس میں عظمت انسانی اور حیات کے کرب، تڑپ اور جہد مسلسل کا نغمہ سنایا گیا ہے۔ شعر اپنی ساخت اور فضا میں بمشکل ہی پیغام اور تبلیغ سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔ اس لئے کہ شعر تجربہ حیات کی وہ فکری خوشبو ہے جو ایکا ایکی اٹھتی ہے۔ اور الفاظ کی نغمگی کا پیرہن پہن لیتی ہے۔ اس لئے مکمل منصوبہ بند فکری سرگرمی فلسفہ و سائنس سے تو میل کھا سکتی ہے ادب اور خاص طور پر شاعری سے نہیں تبلیغ اور پیغام وہی منصوبہ بند عمل کا نام ہے جو میکانکی جملوں میں تو سما سکتا ہے، شعر کی غیر مرئی فضاؤں سے ربط نہیں پاتا۔

ترقی پسند تحریک پر بڑا اعتراض یہی رہا کہ وہ شعر کو ایک میکانیکی عمل خیال کرتی ہے، تخلیق کی خود رو ئیدگی نہیں سمجھتی۔ ترقی پسند ادب کے خاصے بڑے حصے پر یہ اعتراض پوری طرح وارد ہوتا رہا تاہم ساری ترقی پسند تحریک کو میکانیکی شعر سازی سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا بڑا حصہ ایمائیت و اشاریت، جذبے کے اخلاص اور خیال کے بانکپن پر مشتمل ہے۔

ترقی پسند تحریک کے بعد انسانی نسل تجربات کی جن وسعتوں اور گتھیوں میں پھنس گئی ہے۔ اُن سے نئی تخلیق ابھر رہی ہے۔ جو کسی خاص تحریکی فریم میں محدود ہونے کو تیار نہیں۔ تجربات کی یہ گوناگونی ترقی پسند تحریک کی صحت مند انسان پرستی کے جلو میں حیات و سماج کے نئے شعور و نظریات کو اپنا رہی ہے۔

قمر ہاشمی کی تازہ نظم انہی نئے تجربات کے سائے میں وجود میں آئی ہے۔ اُن کی ترقی پسندی جو انسان کے ایک المیے سے ابھری تھی اب حیات کی بے کنار گتھیوں سے گذرتی انسانی عظمت کے مستقبل سے لو لگاتی ہے اور کبھی سنگ میل یا چہروں میں عظمت انسانی کی جھلک دیکھتی ہے۔ یہ بات بڑی دلچسپ ہے۔ بیسویں صدی کے بھیانک المیے بھی قمر ہاشمی کی بھرپور رجائیت کو شکست نہ دے سکے۔ یہ اُن کی تخلیق کا سکون بیز پہلو ہے۔ جو اس دور کو جینے کا حوصلہ دیتا ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ یاس انگیز تجربوں کا تسلسل اُن کی رجائیت سے کب تک مات کھاتا ہے۔

قمر ہاشمی ماضی کی طاقتور روایت کی نمائندگی حال کی ادبی آزادمنشی کے ماحول کے ساتھ ساتھ کرتے ہیں، جو ان کی بھرپور تخلیق کاری اور پختہ نگہی کی علامت ہے۔ پھر یہ پختہ نگہی اور تخلیقی کرب کی فراوانی پچھلے برسوں میں بڑی تیزی سے آگے بڑھی ہے جس کے صاف معنی یہی نکلتے ہیں کہ ان کا تخلیقی بہاؤ اپنے سامنے طویل مستقبل رکھتا ہے جو ہمارے ادب کے لئے عمدہ علامت اور فن نوازوں کے لئے ایک خوشخبری ہے۔

سید محمد تقی

شبنم کا پتا (پشتو افسانوں کے اُردو تراجم)

مصنفہ: زیتون بانو — ناشر: مکتبۂ اورنگ (ظہیر آباد) پشاور — قیمت: ۷ روپے

آج کے افسانے کی رفتار کیا ہے؟ اور معیار کیا ہے؟ یہ سوالات ایک عرصے سے گفتگو کا موضوع بنے ہوئے ہیں مگر اب بھی بدستور بحث طلب ہیں قاری شکوہ کناں ہے کہ جدیدیت کے نام پر آج جو افسانہ لکھا جا رہا ہے، تجریدیت اور علامت نگاری کے حوالے سے جو تجربے ہو رہے ہیں، اُس میں اور کچھ ہو سو ہو کم از کم ابلاغ کا فقدان ضرور ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آج کا افسانہ نگار قاری سے کٹ کر رہ گیا ہے۔ جدید افسانے کا بالعموم ایک اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ اس کا "کہانی پن" غائب ہو گیا ہے جس کے نتیجے میں اس کی تشکیل اور ترتیب عملاً ہیئت نگاری کی محتاج ہو کر رہ گئی ہے۔ یہاں کہانی کے فقدان اور اسلوب میں ہیئت نگاری کی بات محض رسماً نہیں کہی جا رہی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہیئت پرستوں کی ایک مخصوص تعداد اپنے اس رویے پر مصر ہے کہ جدید افسانہ نہ صرف یہ کہ تجریدیت اور علامت نگاری سے عبارت ہے بلکہ موجودہ معاشی، معاشرتی اور تہذیبی صورت کے سبب افسانے میں کہانی کا وجود کچھ ایسا ضروری بھی نہیں، رہا میری رائے میں یہ انداز فکر غیر حقیقی اور غیر فطری ہے بلکہ زندگی اور اس کے گوناگوں مسائل سے گریز کا آئینہ دار بھی ہے۔

یوں تخلیقی عمل میں ہیئت کے تجربے ماضی میں بھی ہوتے رہتے ہیں اور آئندہ بھی ہوں گے کہ ہیئت نگاری کوئی شجرِ ممنوعہ نہیں لیکن اگر کسی تخلیقی فن پارے میں ابلاغ کے مسئلے کو نظر انداز کرکے اُس کی اساس محض ہیئت پر استوار کی جائے تو یہ رویہ انسانی حقیقتوں سے گریز اور فرار کا زاویہ بن جاتا ہے اس کا مقصد شعوری اور غیر شعوری طور پر محض اتنا ہی رہ جاتا ہے کہ قاری کی توجہ اصل مسائل سے ہٹا کر بے مقصد تجریدیت تک محدود کر دی جائے۔ دیکھا جائے تو ہیئت کے جدید رویوں کا مقصد صرف اسی قدر ہے کہ خارج کو اپنی پسند کے معنی پہنائے جائیں اور داخلی تضادات کو منظرِ عام پر لانے کی بجائے انہیں چھپانے کے عمل کو بروئے کار لایا جائے۔ اس صورت میں بات وہیں پہنچے گی کہ ہم کیوں لکھتے ہیں؟ ہماری تحریروں میں اگر قاری کے لئے کوئی کشش نہیں یا پھر ہم اُس کو اِن کے مطالعے پر آمادہ نہیں کر پاتے تو مفہوم یہی لیا جائے گا کہ کہیں نہ کہیں خامی ضرور ہے جس کے باعث لکھنے والے اور قاری کے درمیان فاصلے بڑھ گئے ہیں۔

جدید افسانے کے ضمن میں ذرا پیچھے مڑ کر جب ہم اس صدی کی سب سے زیادہ جاندار اور توانا ترقی پسند ادب کی تحریک کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ اس تحریک کے زیرِ اثر پورے ادب نے اور بالخصوص افسانے نے جو ترقی کی اس میں جو نت نئے اور بامقصد تجربے کئے اس کے سبب اس دور کا افسانہ نہ صرف یہ کہ ابھی تک زندہ ہے بلکہ اس کی حیثیت سنگِ میل کی سی ہے۔ پھر اسی تحریک کے زیرِ اثر ترقی پسند اور غیر ترقی پسند افسانہ نگاروں کی اتنی بڑی کھیپ ہمارے درمیان موجود ہے جو کسی بھی زبان اور اُس کے ادب کو زندہ رکھنے کے لئے کافی ہو سکتی ہے۔ اُن دنوں جو افسانوی مجموعے شائع ہوئے اور جتنی بڑی تعداد میں شائع ہوئے آج کے افسانوی ادب میں اُس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے علاوہ اگر گذشتہ چند سالوں میں ادب کی جملہ تصانیف کا اشاعتی جائزہ لیا جائے تو یہ طے ہے کہ اردو میں سب سے کم کتب افسانوی ادب سے متعلق ہوں گی۔ ظاہر ہے کہ یہ صورتِ حال کسی طرح بھی حوصلہ افزا نہیں ہے۔ یوں تخلیقی بنیاد پر ادب کے مختلف شعبوں میں نشیب و فراز آتے رہتے ہیں چنانچہ یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں، جو مایوسی کا سبب بنے لیکن آج کے افسانے کی المناک صورت یہ ہے کہ اس کا حال تو الگ رہا مستقبل بھی بظاہر زیادہ روشن نظر نہیں آتا۔ تاہم اپنی تمام تر خامیوں اور کوتاہیوں کے باوجود افسانہ ابھی زندہ ہے۔ یوں بھی مجھے یقین ہے کہ نام نہاد جدیدیت، تجریدیت اور علامت نگاری کے ہمنوا اپنی ہر ممکن سعی و کوشش کے باوجود اسے موت کے گھاٹ نہیں اتار سکتے۔

اس پس منظر میں اگر کبھی کبھار کسی نئے افسانوی مجموعے کی شکل دکھائی دیتی ہے تو اس سے اہلِ ذوق کو نہ صرف طمانیت کا احساس ہوتا ہے بلکہ ایک طرح کی تقویت بھی پہنچتی ہے۔ پھر زیرِ تبصرہ تصنیف "شیشم کا پتا" تو اس لحاظ سے اور بھی زیادہ اہم ہے کہ اس کی کہانیاں پشتو کی ممتاز افسانہ نگار زیتون بانو کی تخلیقات کے تراجم پر مشتمل ہیں۔ ان کہانیوں کے مطالعے سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ زیتون بانو اپنے اسلوب اور رویوں کی بنیاد پر افسانے میں نئے اور بامقصد تجربوں کی تو قائل ہیں لیکن اُس نام نہاد جدیدیت کی منکر ہیں، جو زندگی سے گریز کا سبب بنے۔ بانو کی قریب قریب تمام کہانیوں میں علامتوں سے بھی بقدرِ ضرورت کام لیا گیا ہے اور ابلاغ کے مسئلے کو بھی اہمیت دی گئی ہے۔ سب سے زیادہ یہ کہ ان افسانوں میں "کہانی" پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔ اس مجموعے میں بارہ افسانے شامل ہیں جن کو رحیم گل، خاطر غزنوی، تاج سعید، فقیر حسین ساحر اور سعد اللہ جان برق نے پشتو سے اردو میں منتقل کیا ہے۔

میری معلومات کے مطابق پشتو ادب میں کہانی اگرچہ کوئی نئی چیز نہیں ہے لیکن پشتو افسانے کی عمر کچھ زیادہ بھی نہیں۔ یہی زیادہ سے زیادہ چالیس پچاس سال! اس کے باوجود زیرِ تبصرہ مجموعے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اپنی کم عمری کے باوجود پشتو افسانہ کم از کم زیتون بانو کی تخلیقات کی حد تک کسی دوسری زبان سے پیچھے نہیں۔ عالمی اور قومی بنیاد پر افسانوی ادب میں تکنیک کے جو تجربے ہوئے ہیں ان کو قبول کرتے اور اپنی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے پشتو افسانہ نگاروں نے ان کے اثرات کو اپنانے میں کہیں بخل سے کام نہیں لیا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ پشتو افسانوں کے اردو تراجم کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمیں اجنبیت کا قطعی طور پر احساس نہیں ہوتا۔

"شیشم کا پتا" کی بیشتر کہانیوں میں میرے نزدیک جو بات قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہے وہ ہے مصنفہ کا اپنی دھرتی سے والہانہ پیار، اُن کا سماجی شعور اور حقیقت پسندانہ طرزِ اظہار۔ بانو نے پختون باشندوں کے رنگارنگ کردار، رسم و رواج اور اپنی سرزمین کے اقدار کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا ہے۔ اپنے زندہ کرداروں کے حوالے سے اُن معاشرتی تضادات کو واضح کیا ہے جن کو کوئی بھی باشعور فنکار نظرانداز نہیں کر سکتا۔ اگرچہ ان تضادات کے اظہار میں بانو کا اپنا کرب بھی شامل ہے لیکن یہ کرب محض ان کی ذات تک محدود نہیں رہتا بلکہ بالواسطہ طور پر قاری تک منتقل ہوتا ہے۔ وہ اس کرب میں اپنے قاری کو شریک کر کے آگے بڑھتی نظر آتی ہیں۔ سرحد کے باشندوں کی سماجی، مجلسی اور تہذیبی زندگی میں گذشتہ برسوں سے جو تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں، بانو کو ان تبدیلیوں کا مکمل طور پر ادراک ہے۔ دم توڑتی قدیم اور فرسودہ روایات، پرانے رسم و رواج اور ان کی جگہ لیتی ہوئی نئی اور ترقی پسند سوچ کی نشاندہی ان کہانیوں میں جابجا کی گئی ہے۔ بانو نے ایک اور مسئلے کو اپنی تحریروں میں بہت زیادہ اہمیت دی ہے اور وہ ہے آج کی پختون عورت کی زندگی! میرے نزدیک بانو کا یہ رویہ قطعی طور پر حیرت کا سبب نہیں بلکہ خود عورت ہونے کے ناتے ان کا یہ طرزِ عمل بالکل فطری اور حقیقت پسندانہ ہے۔ یہ بھی نہیں کہ ان کی کہانیوں میں "مرد" موجود نہیں البتہ یہ ضرور ہے کہ انھوں نے مرد کو عورت کے حوالے سے اور عورت کی نگاہ سے دیکھا ہے۔

زیتون بانو کی زیرِ تبصرہ تصنیف متقاضی تو اس امر کی تھی کہ اس کے افسانوں کا فرداً فرداً جائزہ لیا جائے لیکن اس سلسلے میں دو باتیں مزاحم ہیں۔ ایک تو طوالت کا مسئلہ ہے اور دوسری مشکل یہ ہے کہ کتاب میں شامل بارہ افسانوں کا کم از کم پانچ ادیبوں نے ترجمہ کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر لکھنے والے کا اپنا اسلوب ہوتا ہے۔ اس کی جھلک ان تراجم میں بھی ملتی ہے۔ دراصل ترجمے کا ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ جب تک دونوں زبانوں پر کامل عبور حاصل نہ ہو اور ساتھ ہی مصنف اور اس کی تصنیف کی حقیقی روح تک نہ رسائی ہو، صحیح ترجمہ ممکن نہیں ہوتا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ بانو کی بعض کہانیوں کا ترجمہ اتنا معیاری نہیں جتنا ہونا چاہئے تھا۔ اس کی وضاحت ان سطور میں یوں بھی ممکن نہیں کہ "خیالِ خاطرِ احباب" کا معاملہ بھی ہے اور آبگینوں کو ٹھیس لگنے کا خدشہ بھی!

اس تبصرے میں اگر پشاور کے معروف شاعر اور ادیب تاج سعید کا ذکر نہ کیا جائے تو یہ ناانصافی کے مترادف ہوگا۔ تاج سعید نے کچھ کرنے کے لامحدود جذبے کی بنا پر یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ مقصد میں خلوص ہو تو محدود وسائل اور ناکافی ذرائع عمل میں مزاحم نہیں ہوتے۔ انھوں نے "شیشم کا پتہ" شائع کر کے ایک ایسی درخشندہ روایت کو تقویت پہنچائی ہے جو قومی اور علاقائی ادب کے فروغ کے علاوہ ادیبوں کو باہمی طور پر روشناس کرانے اور ایک دوسرے کو قریب لانے میں بڑی حد تک مددگار ثابت ہوگی۔ تاج سعید اس کارنامے کے لئے یقیناً مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ایسے نام نہاد ادیبوں کے لئے ایک قابلِ قدر مثال قائم کی ہے، جو علاقائی زبانوں کے استحصال کے کھوکھلے نعرے لگا کر اور ذاتی مفادات کی بنیاد پر اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد تعمیر کرنے میں مصروف ہیں جن کا مقصد لسانی تعصبات کو ہوا دے کر زیادہ سے زیادہ کنفیوژن پھیلانا ہے۔ تاج سعید نے زیتون بانو کی کتاب شائع کر کے جس کارِ خیر کا آغاز کیا ہے میرے نزدیک قومی زبان کے ساتھ ساتھ علاقائی زبانوں کی ترویج و ترقی کا اس سے مؤثر اور کوئی ذریعہ نہیں ہو سکتا کہ زیادہ سے زیادہ ادبی کتب کے تراجم اردو اور چاروں علاقائی زبانوں میں شائع کئے جائیں۔ ظاہر ہے کہ یہ سب کسی ایک فرد کی ذمہ داری نہیں ہے۔ یوں بھی یہ کام محبِ وطن اور باشعور ادیبوں کے کرنے کا ہی ہے کہ کسی کاروباری ناشر سے اس کی توقع عبث ہے۔ بہرحال تاج سعید نے جس اہم کام کا آغاز کیا ہے اس کے مقابلہ ایک وسیع دائرۂ کار اُن کے سامنے موجود ہے اور مجھے یقین کامل ہے کہ اس عمل میں ان کے قدم پیچھے نہیں ہٹیں گے بلکہ تیزی کے ساتھ آگے بڑھتے جائیں گے۔

اسرار زیدی

تمثال (نظمیں)

مصنف: تبسم کاشمیری ناشر: ارسلان پبلی کیشنز، لاہور قیمت: سولہ روپے

تبسم کاشمیری کی نظمیں فکری انتشار کے اُس نقطے سے جنم لیتی ہیں، جو ہماری شاعری میں ۱۹۵۸ء کے مخصوص سیاسی اور سماجی ردِعمل کے طور پر علامت

اور تجرید کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ جب چیزیں روایت کے ڈکس سے نکل جاتی ہیں تو انہیں نئے رویوں اور نئے جذبوں کے حوالے سے دیکھنا پڑتا ہے۔ یہی نئے رویے اور نئے جذبے کسی دور کے ادب کی وہ روایت بنتے ہیں جن سے نئی شاعری اور نئے افسانے کا خمیر اٹھتا ہے۔ ۵۸ء میں ہمارے معاشرے نے کوئی بڑی کروٹ تو نہیں لی تھی، لیکن جمہوریت، لولی لنگڑی جیسی بھی تھی کے ذرا بعد فوجی آمریت کی تلوار نے بظاہر تو کوئی بڑا زخم نہیں لگایا تھا۔ لیکن اندر ہی اندر تخلیق اور رویوں کے بہت سے سوتے خشک ہو گئے تھے۔ اس صورت حال کے پس منظر میں شعری افق پر جس نئی تحریک نے جنم لیا۔ موضوعات کے نئے پہلوؤں اور لسانی تشکیلات کے راستوں سے گزر کر وہ آج کی نئی ادبی روایت کا حصہ ہے۔ آج کی نسل اس نئی فکری اور اسلوبی تحریک کی پروردہ ہے اور اس لحاظ سے "تمثال" کی شاعری سے میرا رشتہ، ایک بدہیئت اور منافق عہد میں اپنی تلاش کا وہ مشترکہ احساس ہے جو تبسم کاشمیری کے حوالے سے، پاکستان میں خصوصاً اور پورے گلوب پر عموماً، نئی نسل کا آشوب ہے۔ شاید یہ صورت حال، کچھ حصوں کو چھوڑ کر، پورے گلوب کی ہے، لیکن خصوصاً اس حصے میں تو ہم ابھی پیدا ہی نہیں ہوئے۔ ہم پیدا ہونے کی تمنا میں بے معنویت کی اس کوکھ میں کلبلا رہے ہیں اور لنگڑے لفظ ہمارے اظہار کے بوجھ کو اٹھانے سے معذور ہے۔ اس بے شناختی میں فکر کی ساری روایتیں اور اظہار کے سارے سکہ بند کھوٹے پھیکے اور بے اثر ہو چکے ہیں۔ یہی ہمارے دور کا المیہ ہے کہ ہم میں سے ہر ایک، ایک جزیرہ ہے اور ہمارے اظہار کے سارے وسیلے بنجر ہیں۔

اجتماعی سوچ اور عمل کی موت تنہائی کے اُس آشوب کو جنم دیتی ہے جس میں چیزوں کے ساتھ افراد بھی بے نام ہو جاتے ہیں۔ تبسم کاشمیری نے اسی بانجھ فکری صورت حال میں سے اپنی پہچان کا سفر شروع کیا ہے اور اپنے آپ کو جاننے کے لئے جو غیر بدنی ہجرت کی ہے، وہی "تمثال" کی نظموں کا فکری مواد ہے۔ "تمثال" کی نظموں کا معاشرتی اور سیاسی پس منظر ۵۸ء سے شروع ہوتا ہے، جب مخصوص سیاسی جبر کے ردعمل میں معاشرے نے ایسی کروٹ لی تھی جس میں ہر چیز باہر کی طرف پھیلنے کی بجائے اپنے اندر سمٹنے لگی تھی۔ خرد کے ساتھ ساتھ فکر، سوچ اور عمل نے بھی معاشرے سے اپنا رشتہ توڑ لیا کیونکہ شناخت کے سارے ذریعے جو کسی معاشرے میں قومی یکجہتی کی علامت بنتے ہیں، دھندلا چکے ہیں۔ ایسے میں شناخت صرف اندر کے حوالوں سے مکمل ہوتی ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ حوالے قومی سوچ اور فکر میں ایک منفعل اور بے عمل رویے ہی کو جنم نہیں دیتے، بلکہ فرد کو الگ تھلگ جزیرہ بنا کر اجتماعی عمل اور قومی پہچان کو بے شناخت بھی بنا دیتے ہیں۔ فکری زوال کے یہ لمحے شعر و ادب میں مرثیہ گوئی کا سبب بنتے ہیں۔ یہی ہوا بھی کہ ہمارے شاعروں نے علامت اور تجرید میں زوال کے اس مرثیہ کا کورس شروع کر دیا۔ میرے نزدیک محض مرثیہ گوئی بڑی شاعری نہیں۔ زوال کے لمحے قوموں پر وارد ہوتے رہتے ہیں۔ فن کار کا کام یہ ہے کہ اس زوال میں جب قومیں اپنی شناخت کھو چکی ہوتی ہیں، پہچان کی شمع روشن کرے، اجتماع کے حوالے سے نہ سہی، اپنے ذاتی حوالے ہی سے سہی، کہ اُس کی اپنی ذات بھی تو اسی معاشرے کا ایک حصہ ہے، اور فرد کا دکھ کسی نہ کسی طرح معاشرے ہی کا دکھ ہے۔ سو ہمارے فکری زوال کی اس تاریکی میں جن شاعروں نے اپنی پہچان کے عمل کو جاری رکھا ہے، ان میں تبسم کاشمیری بھی شامل ہے۔

فکری رویوں کے اس پہلو کے ساتھ ساتھ تبسم کی نظموں کا اسلوب بھی نئے ذائقے کی وجہ سے اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ کسی شاعر کا اسلوب خود اس کی اپنی پہچان ہی نہیں، بلکہ اس کے حوالے سے اپنے اجتماعی، ثقافتی، لسانی اور سماجی رویوں کی بازگشت بھی ہے۔ ان رویوں کی تبدیلی کے ساتھ لفظ کی نشست و برخاست کے مروجہ طریقے ہی نہیں بدلتے، نئے لفظی رشتوں اور نئی لفظی معنویت کے پھول بھی کھلتے ہیں۔ علامت جو اپنے دور کی صورت حال سے جنم لیتی ہے، اسلوب کا حصہ بن کر اسے عہد کی خوشبو سے ہم آہنگ کرتی ہے۔ اس لئے کسی فن پارے کا اسلوب اس کے عصر کا تعین ہی نہیں کرتا اس کے عصر کی سیاسی اور اقتصادی صورت حال کا ترجمان بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ ہر دور کی لسانی تشکیلات اس دور کی ضرورتوں سے جنم لیتی ہیں لیکن اب اسے کیا کہا جائے کہ فیشن پرستی لباس ہی میں نہیں شعر و ادب میں بھی ہے۔ ہمارے یہاں بہت سے شاعروں نے لفظوں کی اس ٹوٹ پھوٹ کو نعرہ سمجھا اور محض لفظوں کی ساختہ تجریدی کیفیت سے بڑی شاعری پیدا کرنا چاہی۔ تبسم کا اسلوب اپنے عہد کی معاشرتی صورت حال اور لسانی تجربوں کی اکائی ہے اور اس کے یہاں جو زبان تشکیل پاتی ہے، وہ اس کے فکری مواد سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ اور اسے پڑھتے ہوئے نئے

"شیشم کا پتا" کی بیشتر کہانیوں میں میرے نزدیک جو بات قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہے وہ ہے مصنفہ کا اپنی دھرتی سے والہانہ پیار، اُن کا سماجی شعور اور حقیقت پسندانہ طرزِ اظہار۔ بانو نے پختون باشندوں کے رنگارنگ کردار، رسم و رواج اور اپنی سرزمین کے اقدار کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا ہے۔ اپنے زندہ کرداروں کے حوالے سے اُن معاشرتی تضادات کو واضح کیا ہے جن کو کوئی بھی باشعور فنکار نظرانداز نہیں کر سکتا۔ اگرچہ ان تضادات کے اظہار میں بانو کا اپنا کرب بھی شامل ہے لیکن یہ کرب محض ان کی ذات تک محدود نہیں رہتا بلکہ بالواسطہ طور پر قاری تک منتقل ہوتا ہے۔ وہ اس کرب میں اپنے قاری کو شریک کر کے آگے بڑھتی نظر آتی ہیں۔ سرحد کے باشندوں کی سماجی، مجلسی اور تہذیبی زندگی میں گذشتہ برسوں سے جو تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں، بانو کو ان تبدیلیوں کا مکمل طور پر ادراک ہے۔ دم توڑتی قدیم اور فرسودہ روایات، پرانے رسم و رواج اور ان کی جگہ لیتی ہوئی نئی اور ترقی پسند سوچ کی نشاندہی ان کہانیوں میں جابجا کی گئی ہے۔ بانو نے ایک اور مسئلے کو اپنی تحریروں میں بہت زیادہ اہمیت دی ہے اور وہ ہے آج کی پختون عورت کی زندگی! میرے نزدیک بانو کا یہ رویہ قطعی طور پر حیرت کا سبب نہیں بلکہ خود عورت ہونے کے ناتے ان کا یہ طرزِ عمل بالکل فطری اور حقیقت پسندانہ ہے۔ یہ بھی نہیں کہ ان کی کہانیوں میں "مرد" موجود نہیں البتہ یہ ضرور ہے کہ انھوں نے مرد کو عورت کے حوالے سے اور عورت کی نگاہ سے دیکھا ہے۔

زیتون بانو کی زیرِ تبصرہ تصنیف متقاضی تو اس امر کی تھی کہ اس کے افسانوں کا فرداً فرداً جائزہ لیا جائے لیکن اس سلسلے میں دو باتیں مزاحم ہیں۔ ایک تو طوالت کا مسئلہ ہے اور دوسری مشکل یہ ہے کہ کتاب میں شامل بارہ افسانوں کا کم از کم پانچ ادیبوں نے ترجمہ کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر لکھنے والے کا اپنا اسلوب ہوتا ہے۔ اس کی جھلک ان تراجم میں بھی ملتی ہے۔ دراصل ترجمے کا ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ جب تک دونوں زبانوں پر کامل عبور حاصل نہ ہو اور ساتھ ہی مصنف اور اُس کی تصنیف کی حقیقی روح تک نارسائی ہو، صحیح ترجمہ ممکن نہیں ہوتا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ بانو کی بعض کہانیوں کا ترجمہ اتنا معیاری نہیں جتنا ہونا چاہئے تھا۔ اس کی وضاحت ان سطور میں یوں بھی ممکن نہیں کہ "خیالِ خاطرِ احباب" کا معاملہ بھی ہے اور "آبگینوں کو ٹھیس" لگنے کا خدشہ بھی!

اس تبصرے میں اگر پشاور کے معروف شاعر اور ادیب تاج سعید کا ذکر نہ کیا جائے تو یہ ناانصافی کے مترادف ہوگا۔ تاج سعید نے کچھ کرنے کے لامحدود جذبے کی بنا پر یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ مقصد میں خلوص ہو تو محدود وسائل اور ناکافی ذرائع عمل میں مزاحم نہیں ہوتے۔ انھوں نے "شیشم کا پتہ" شائع کر کے ایک ایسی درخشندہ روایت کو تقویت پہنچائی ہے جو قومی اور علاقائی ادب کے فروغ کے علاوہ ادیبوں کو باہمی طور پر روشناس کرانے اور ایک دوسرے کو قریب لانے میں بڑی حد تک مددگار ثابت ہوگی۔ تاج سعید اس کارنامے کے لئے یقیناً مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ایسے نام نہاد ادیبوں کے لئے ایک قابلِ قدر مثال قائم کی ہے جو علاقائی زبانوں کے استحصال کے کھوکھلے نعرے لگا کر اور ذاتی مفادات کی بنیاد پر اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد تعمیر کرنے میں مصروف ہیں جن کا مقصد لسانی تعصبات کو ہوا دے کر زیادہ سے زیادہ کنفیوژن پھیلانا ہے۔ تاج سعید نے زیتون بانو کی کتاب شائع کر کے جس کارِ خیر کا آغاز کیا ہے میرے نزدیک قومی زبان کے ساتھ ساتھ علاقائی زبانوں کی ترویج و ترقی کا اس سے موثر اور کوئی ذریعہ نہیں ہو سکتا کہ زیادہ سے زیادہ ادبی کتب کے تراجم اردو اور چاروں علاقائی زبانوں میں شائع کئے جائیں۔ ظاہر ہے کہ یہ سب کسی ایک فرد کی ذمہ داری نہیں ہے۔ یوں بھی یہ کام محب وطن اور باشعور ادیبوں کے کرنے کا ہی ہے کہ کسی کاروباری ناشر سے اس کی توقع عبث ہے۔ بہرحال تاج سعید نے جس اہم کام کا آغاز کیا ہے اس کے لئے ایک وسیع دائرۂ کار اُن کے سامنے موجود ہے اور مجھے یقینِ کامل ہے کہ اس عمل میں اُن کے قدم پیچھے نہیں ہٹیں گے بلکہ تیزی کے ساتھ آگے بڑھتے جائیں گے۔

اسرار زیدی

تمثال (نظمیں)

مصنف: تبسم کاشمیری — ناشر: ارسلان پبلی کیشنز، لاہور — قیمت: سولہ روپے

تبسم کاشمیری کی نظمیں فکری انتشار کے اُس نقطے سے جنم لیتی ہیں، جو ہماری شاعری میں ۱۹۵۸ء کے مخصوص سیاسی اور سماجی ردِعمل کے طور پر علامت

اور تجرید کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ جب چیزیں روایت کے ڈکشن سے نکل جاتی ہیں تو انہیں نئے رویوں اور نئے جذبوں کے حوالے سے دیکھنا پڑتا ہے۔ یہی نئے رویے اور نئے جذبے کسی دور کے ادب کی وہ روایت بنتے ہیں جن سے نئی شاعری اور نئے افسانے کا خمیر اٹھتا ہے۔ ۵۸ء میں ہمارے معاشرے نے کوئی بڑی کروٹ تو نہیں لی تھی، لیکن جمہوریت، لولی لنگڑی جیسی بھی تھی کے ذرا بعد فوجی آمریت کی تلوار نے بظاہر تو کوئی بڑا زخم نہیں لگایا تھا، لیکن اندر ہی اندر تخلیق اور رویوں کے بہت سے سوتے خشک ہو گئے تھے۔ اس صورت حال کے پس منظر میں شعری افق پر جس نئی تحریک نے جنم لیا، موضوعات کے نئے پہلوؤں اور لسانی تشکیلات کے راستوں سے گزر کر وہ آج کی نئی ادبی روایت کا حصہ ہے۔ آج کی نسل اس نئی فکری اور اسلوبی تحریک کی پروردہ ہے اور اس لحاظ سے "تمثال" کی شاعری سے میرا رشتہ، ایک بے ہیئت اور منافق عہد میں اپنی تلاش کا وہ مشترکہ احساس ہے جو تبسم کاشمیری کے حوالے سے، پاکستان میں خصوصاً اور پورے گلوب پر عموماً، نئی نسل کا آشوب ہے۔ شاید یہ صورت حال، کچھ حصوں کو چھوڑ کر، پورے گلوب کی ہے، لیکن خصوصاً اس حصے میں تو ہم ابھی پیدا ہی نہیں ہوئے۔ ہم پیدا ہونے کی تمنا میں بے معنویت کی اس کوکھ میں کلبلا رہے ہیں اور لنگڑے لفظ ہمارے اظہار کے بوجھ کو اٹھانے سے معذور ہیں۔ اس بے شناختی میں فکر کی ساری روایتیں اور اظہار کے سارے سکے بند کھوٹے، پھیکے اور بے اثر ہو چکے ہیں۔ یہی ہمارے دور کا المیہ ہے کہ ہم میں سے ہر ایک، ایک جزیرہ ہے اور ہمارے اظہار کے سارے وسیلے بنجر ہیں۔

اجتماعی سوچ اور عمل کی موت تنہائی کے اس آشوب کو جنم دیتی ہے جس میں چیزوں کے ساتھ افراد بھی بے نام ہو جاتے ہیں۔ تبسم کاشمیری نے اسی بانجھ فکری صورت حال میں سے اپنی پہچان کا سفر شروع کیا ہے اور اپنے آپ کو جاننے کے لئے جو غیر بدنی ہجرت کی ہے، وہی "تمثال" کی نظموں کا فکری مواد ہے۔ "تمثال" کی نظموں کا معاشرتی اور سیاسی پس منظر ۵۸ء سے شروع ہوتا ہے، جب مخصوص سیاسی جبر کے رد عمل میں معاشرے نے ایسی کروٹ لی تھی جس میں ہر چیز باہر کی طرف پھیلنے کی بجائے اپنے اندر سمٹنے لگی تھی۔ خرد کے ساتھ ساتھ فکر، سوچ اور عمل نے بھی معاشرے سے اپنا رشتہ توڑ لیا کیونکہ شناخت کے سارے ذریعے جو کسی معاشرے میں قومی یک جہتی کی علامت ہوتے ہیں، دھندلا چکے ہیں۔ ایسے میں شناخت صرف اندر کے حوالوں سے مکمل ہوتی ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ حوالے قومی سوچ اور فکر میں ایک منفعل اور بے عمل رویے ہی کو جنم نہیں دیتے، بلکہ فرد کو الگ تھلگ جزیرہ بنا کر اجتماعی عمل اور قومی پہچان کو بے شناخت بھی بنا دیتے ہیں۔ فکری زوال کے یہ لمحے شعر و ادب میں مرثیہ گوئی کا سبب بنتے ہیں۔ یہی ہوا بھی کہ ہمارے شاعروں نے علامت اور تجرید میں زوال کے اس مرثیہ کا کورس شروع کر دیا۔ میرے نزدیک محض مرثیہ گوئی بڑی شاعری نہیں۔ زوال کے لمحے قوموں پر وارد ہوتے رہتے ہیں۔ فن کار کا کام یہ ہے کہ اس زوال میں جب قومیں اپنی شناخت کھو چکی ہوتی ہیں، پہچان کی شمع روشن کرے، اجتماع کے حوالے سے نہ سہی، اپنے ذاتی حوالے ہی سے سہی، کہ اس کی اپنی ذات بھی تو اسی معاشرے کا ایک حصہ ہے، اور فرد کا دکھ کسی نہ کسی طرح معاشرے ہی کا دکھ ہے۔ سو ہمارے فکری زوال کی اس تاریکی میں جن شاعروں نے اپنی پہچان کے عمل کو جاری رکھا ہے، ان میں تبسم کاشمیری بھی شامل ہے۔

فکری رویوں کے اس پہلو کے ساتھ ساتھ تبسم کی نظموں کا اسلوب بھی نئے ذائقے کی وجہ سے اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ کسی شاعر کا اسلوب خود اس کی اپنی پہچان ہی نہیں، بلکہ اس کے حوالے سے اپنے اجتماعی، ثقافتی، لسانی اور سماجی رویوں کی بازگشت بھی ہے۔ ان رویوں کی تبدیلی کے ساتھ لفظ کی نشست و برخاست کے مروجہ طریقے ہی نہیں بدلتے، نئے لفظی رشتوں اور نئی لفظی معنویت کے پھول بھی کھلتے ہیں۔ علامت جو اپنے دور کی صورت حال سے جنم لیتی ہے، اسلوب کا حصہ بن کر اسے عہد کی خوشبو سے ہم آہنگ کرتی ہے۔ اس لئے کسی فن پارے کا اسلوب اس کے عصر کا تعین ہی نہیں کرتا، اس کے عصر کی سیاسی اور اقتصادی صورت حال کا ترجمان بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ ہر دور کی لسانی تشکیلات اس دور کی ضرورتوں سے جنم لیتی ہیں لیکن اب اسے کیا کہا جائے کہ فیشن پرستی لباس ہی میں نہیں شعر و ادب میں بھی ہے۔ ہمارے یہاں بہت سے شاعروں نے لفظوں کی اس ٹوٹ پھوٹ کو نعرہ سمجھا اور محض لفظوں کی ساختہ تجریدی کیفیت سے بڑی شاعری پیدا کرنا چاہی۔ تبسم کا اسلوب اپنے عہد کی معاشرتی صورت حال اور لسانی تجربوں کی اکائی ہے اور اس کے یہاں جو زبان تشکیل پاتی ہے، وہ اس کے فکری مواد سے پوری طرح ہم آہنگ ہے یا دراصل بڑھتے ہوئے نئے

بونتے کمرا احساس ہوتا ہے۔

ہمارے بہت سے نئے شاعروں نے اسلوب اور ہیئت کے نئے نئے تجربے بھی کیے ہیں لیکن بغیر کسی فکری تحریک کے ایسے سارے تجربے زبان و بیان اور اظہار کے نئے پہلوؤں کو تو سامنے لے آتے ہیں مگر ان سے عظیم ادب پیدا نہیں ہوتا۔ اسی طرح صرف موضوع یا اپنے دور کی محض تصویر کشی بھی بڑا ادب نہیں۔ بے سمتی، ٹوٹ پھوٹ اور ذات کی شکست و ریخت سے کوئی بھی بڑی شاعری اس وقت تک پیدا نہیں ہوتی جب تک شاعر کی اپنی سوچ اور نظریہ اس میں شامل نہ ہو کہ یہی سوچ اور نظریہ بے سمت فکر کو جہت عطا کرتے ہیں۔ ہمارے یہاں پچھلے دس پندرہ برس میں جو شاعری ہوئی ہے اس میں سے بہت سا حصہ اسی لیے میرے نزدیک، خام مواد ہی کی سطح پر رہ گیا ہے کہ بہت سے شاعروں نے عکاسی ہی کو فن کی معراج سمجھ لیا تھا۔ ایسی عکاسی صرف منجمد تصویریں ہیں جن میں تاثیر اور جذبے کی گرمی نہیں۔ تبسم کاشمیری نے اسی بے معنویت سے اپنا خام مواد حاصل کیا ہے لیکن وہ صرف تصویریں ہی نہیں بناتا بلکہ بے سمتی کے اس احساس کو ایسی شکل عطا کرتا ہے جس میں اس کے اپنے ہونے کے احساس کی شمع جلتی رہتی ہے، اور اس حوالے سے تبسم کاشمیری کے ساتھ میرا ایک گہرا رشتہ ہے، جو اس بدبختی اور قومی زوال میں خود کو زندہ اور متحرک رکھنے کی مشترکہ جستجو سے عبارت ہے۔

رشید امجد


روٹی

[illegible] پبلشر نے محمد شریف کے اہتمام سے طفیل آرٹ پرنٹرز، ۱۷ سرکلر روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر "فنون" ۴۷ - انار کلی لاہور سے شائع کیا۔

REGD. L. NO. 7579

Phone No. 695